قاضی امام ابو یوسف کی دینی و علمی خدمات کا تحقیقی مطالعہ

مقالہ نگار

اسماء بیگم

نگرانِ مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر فضل احمد

شعبہ قرآن و سنہ

کلیہ معارفِ اسلامیہ

جامعہ کراچی

بسم

الله

الرحمان

الرحيم

اَللّٰهُمَّ صَلِّ

عَلٰى سَيِّدِنَا

وَمَوْلَانَا

مُحَمَّدٍ

وَبَارِكْ وَسَلِّمْ

انتساب

محسنِ انسانیت آقائے نامدار

حضرت محمد مصطفیٰ احمدِ مجتبیٰ

صلی اللہ علیہ وسلم کے نام

جن کی ذات سارے علوم کا سرچشمہ ہے۔

BOARD OF ADVANCED STUDIES & RESEARCH
UNIVERSITY OF KARACHI

CERTIFICATE

I have gone through the thesis titled

قاضی امام ابو یوسف کی دینی و علمی خدمات کا تحقیقی مطالعہ

submitted by ~~Dr.~~/Mr./ ~~Mrs.~~/ Miss Asma Begum for the award of ~~M.Phil.~~/Ph.D. degree and certify that to the best of my knowledge it contains no plagiarized material.

Department of Qura'an & Sunnah
University of Karachi
Karachi-75270

Signature & Seal of Supervisor

Name: Prof. DR. Fazal Ahmed

Department: Qur'an & Sunnah

Date: ____________________

تصدیق

تصدیق کی جاتی ہے کہ اسماء بیگم بنت محمد اسلم خان نے میری نگرانی میں اپنا تحقیقی مقالہ بعنوان **"قاضی امام ابو یوسف کی دینی و علمی خدمات کا تحقیقی مطالعہ"** مکمل کرلیا ہے۔ ان کا کام تحقیقی اور تخلیقی نوعیت کے حوالے سے اپنی مثال آپ ہے، جو انتہائی محنت اور کاوشوں سے مکمل ہوا ہے اور پی ایچ ڈی کے معیار کے مطابق ہے۔ میں ان کے کام کی تحسین وستائش کرتے ہوئے اس مقالے کو پی ایچ ڈی کی ڈگری کے حصول کے لئے پیش کرنے کی اجازت دیتا ہوں۔

Department of Qura'an & Sunnah
University of Karachi
Karachi-75270

پروفیسر ڈاکٹر فضل احمد

قرآن وسنہ

کلیہ معارف اسلامیہ

جامعہ کراچی

فہرست مضامین

عنوان | صفحہ نمبر

اظہار تشکر

طویل دورانئے پر مشتمل یہ تحقیقی کام بحمد للہ تعالیٰ تکمیل کے مراحل میں داخل ہو چکا ہے، اس موقعہ پر دل جس خوشی و تشکّر کے ملے جلے جذبات سے سرشار ہے انہیں بیان کرنے کے لئے میرے پاس موزون الفاظ نہیں ہیں۔ تحقیقی کام کے دوران جن مشکلات سے گزرنا پڑا اسے فقط وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو اس قسم کے تحقیقی کام کرنے کا تجربہ رکھتے ہوں، آج جب سالوں پر محیط اس لمبے سفر پر نظر ڈالتی ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ اگر اللہ رب العزت کی مدد و نصرت شاملِ حال نہ ہوتی تو اس تحقیقی کام کو بروقت مکمل کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوتا۔ بنابریں سب سے پہلے میں اس قادرِ مطلق ہستی کے سامنے نہایت عاجزی کے ساتھ سجدہ ریز ہوں کہ اس نے محض اپنے فضل و کرم سے بندہ کو یہ تحقیقی مقالہ تحریر کرنے کی توفیق عنایت فرمائی۔ **اللّٰھمّ لک الشکر ولک الحمد**

اس کے بعد اپنی مادرِ علمی جامعہ کراچی اور اساتذہ کرام بالخصوص اپنے ریسرچ سپروائیزر محترم جناب پروفیسر ڈاکٹر فضل احمد صاحب کی ممنون ہوں جن کی مذکورہ کام کے دوران نگرانی و معاونت میرے لئے بہت بڑا اعزاز ہے۔ نیز میں اس موقعہ پر اپنے محترم بہن بھائیوں اور ان تمام ساتھیوں کی شکر گزار ہوں جنہوں نے اس لمبے سفر میں دامے درمے سخنے تعاون کر کے ناچیز کا حوصلہ بڑھایا۔ اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کو اپنے شایان شان اجرِ عظیم عطا فرمائے۔

آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس مقالے شرفِ قبول عطا فرمائے اور اسے میرے لئے ذخیرہ آخرت اور لوگوں کے لئے نافع بنائے۔ آمین

وللہ الحمد اوّلاً و آخراً

اسماء بیگم

جامعہ کراچی

﴿بسم اللہ الرحمان الرحیم﴾

قاضی امام ابو یوسف کی دینی وعلمی خدمات کا تحقیقی مطالعہ

مقدمہ

حضرت اقدس قاضی القضاۃ امام ابو یوسفؒ کی ذات گرامی سے متعلق کام کرتے ہوئے ایک روحانی خوشی محسوس ہورہی ہے کہ اس سے پہلے امام صاحب پر اردو زبان میں کوئی مستقل کتاب یا مقالہ نہیں لکھا گیا، اس مقالے میں اولاً امام قاضی ابو یوسف سے قبل فقہ کی تاریخ اور کوفے کی سرگرمیوں پر ایک نظر ڈالی گئی، اس کے بعد امام ابو یوسف کے حالات زندگی بیان کئے گئے، اس کے بعد حضرت کے مقام کا اندازہ جاننے کے لئے ضروری تھا کہ کچھ فقہ اور اصول فقہ کی ابتدائی معلومات ہوں اس لئے کچھ ضروری مباحث امام ابو یوسف کے فقہی مقام کو جاننے کے لئے بیان کئے گئے، آخر میں امام قاضی ابو یوسف کے تفقہ اور انکی علمی خدمات پر بحث کی گئی۔

مقالہ کی تحقیق کی راہ میں حائل مشکلات

تحقیقی مقالہ کے سلسلہ میں ایک طالب علم کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، انتظامی امور میں داخل ہوتے ہی ان کی ابتداء ہو جاتی ہے۔ مقالہ کا عنوان متعین اور منظور ہونے اور باقاعدہ رجسٹرڈ ہونے کے مراحل طے کرنے کے بعد مواد جمع کرنا ایک طویل مرحلہ ہے جبکہ اس موضوع سے متعلق تحقیق کے لئے اردو زبان میں مواد اور وہ بھی ہر مکتبہ فکر کے خیالات کے مطابق جو پاکستان میں رائج ہیں میسر نہ تھا۔ تو ایسے میں ان سب حضرات کی رائے لے کر ایک جگہ جمع کرنا۔ پھر اس کام کے سلسلہ میں لوگوں سے بالمشافہ ملاقاتیں کر کے مواد جمع کرنا بلاشبہ ایک ایسا مشکل کام ہے جس کا محققین ہی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ گویا کہ ایک علمی کام کے لئے یہ ساری مشقتیں اگرچہ اذیت ناک ہوتی ہیں لیکن اتنی ہی لذت بھی حاصل ہوتی ہے۔

مقالہ کی تحقیق کا طریقہ کار اور ترتیب

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں مقالہ کی تحقیق کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے جو ڈھانچہ بنایا گیا اس کا طریقہ کار حسب ذیل ہے۔

باب اول

امام قاضی ابو یوسف سے قبل فقہ کی تاریخ اور کوفے کی سرگرمیوں پر ایک نظر

یہ باب مندرجہ ذیل ابحاث پر مشتمل ہے:

عرب قبل از اسلام، قرآن کی مکی اور مدنی سورتیں، اجتہادِ رسول ﷺ، رسول اللہ ﷺ کے بعض اجتہادی معاملات، اجتہادِ صحابہ رضی اللہ عنہم دور رسالت میں، رسول ﷺ کے بعد اشاعت اسلام، وفات رسول کے بعد اجتہاد صحابہ کے مصادر، اختلافِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے اسباب، دور صحابہ رضی اللہ عنہم میں فقہ کا مزاج، خلافت عثمان رضی اللہ عنہ میں ممالک اسلامیہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم کا پھیل جانا، عامۃ الناس کا اپنے درمیان رہائش پذیر صحابہ رضی اللہ عنہم پر اعتماد، کوفے میں ابن مسعود کا قیام اوران کا کارنامہ، عراق کی ثقافتی میراث، فقہائے کوفہ کی رائے میں توسع کے اسباب، کوفے اور مدینے کے مکاتبِ فکر میں فرق، ابراہیم نخعی اوران کا کارنامہ، ابراہیم نخعی اور امام ابو حنیفہ کا تعلق، اما ابو حنیفہ کا اپنے حلقۂ درس میں منہج، سیاسی حالات، اندرونی خطرات، یحییٰ طالبی کی امان، خلفاء اور فقہاء کے درمیان کشیدگی، بیرونی خطرات، معاشرتی حالات، دوسری صدی ہجری میں معاشرتی عناصر اوران کا باہمی تعلق، خوشحالی کے اسباب اور معاشرتی زندگی پر اس کے اثرات، دوسری صدی ہجری میں غلامی کا ارادہ، فکری حالات، دوسری صدی ہجری میں فکری زندگی کی اٹھان، علوم اسلامیہ کی ترقی، فرقے اوران کے فکری اثرات، فقہ تقدیری (فرضی): اولین عباسی دور میں، مذاہب فقہ کب ظہور پذیر ہوئے؟، المراجع والمصادر باب اول

باب دوم
امام ابو یوسف کے حالات زندگی

یہ باب مندرجہ ذیل ابحاث پر مشتمل ہے:

مختصر سوانحی خاکہ، بچپن، دست نبوت کے برکات، جمال ابو یوسف، طلب علم، والدہ کی پریشانی اور امام ابو حنیفہ کی پیش گوئی، امام ابو حنیفہؒ کی نظر شفقت نے مالا مال کر دیا، امام ابو یوسف کی طالب علمی، شوق علم کی انتہاء، علمی انہاک، مقتضائے حدیث پر عمل کا جذبہ، ذوق حدیث، قوت حافظہ اور

استحضار، بے مثال حافظہ، امام مالک اور محمد بن اسحاق سے ملاقات، استاد سے تعلق، صحبت و خدمت، علم دین سے شغف، اساتذہ سے عقیدت، امام ابو یوسف اور تدوین مسائل، انگور سے پہلے منقیٰ بن گئے، علمی ریاست اور عملی سیادت امام ابو یوسف کا حصہ ہے، حلقہ درس و افادہ، امام ابو یوسف کے درس کی خصوصیات اور امتیاز، طلبہ پر شفقت، حالت نزاع میں تعلیم مسائل، سفر میں سلسلہ درس، وسعت افادہ، مسلک اعتدال، علمی مسائل میں خصومت سے گریز، تدوین اصول فقہ، امالی ابو یوسف اور کتاب الخراج، مؤلفات امام ابو یوسف، جو کچھ آپ کما کر لاتے ہیں وہی حاضر ہے، خوشدامن کا طعنہ، قاضی القضاۃ کا منصب کیوں قبول کیا، اظہار حق، خلیفہ ہارون رشید کے نام امام ابو یوسفؒ کی ہدایات، شجاعت وحق پرستی اور انصاف کے تقاضے، عدل و انصاف کی عدالت میں شاہ وگدا سب برابر ہیں، ہارون رشید کے دربار میں زندیق کے قتل کا فیصلہ، امام کسائی رحمہ اللہ کا نحوی اعتراض اور امام ابو یوسفؒ کا فقہی جواب، تنقید کسائیؒ: ، جواب اور اس کا حل، باجماعت نماز نہ پڑھنے کی وجہ سے خلیفہ کا چہیتا وزیر مردود الشہادت قرار پایا، روایتیں مختلف ہیں، امام ابو یوسفؒ کا ایک جواب نصف سلطنت کے برابر ہے، ہارون رشید کا اشتیاق اور امام ابو یوسفؒ کی استغناء، امام ابو یوسفؒ کی تدبیر اصلاح اور حق گوئی و بے باکی، قیاسات حضرت عمرؓ سے مخالف کا اعتراض اور امام ابو یوسفؒ کا جواب، امام ابو یوسفؒ کی دانائی کام آئی، امام ابو یوسفؒ کی وسعت قلبی کا ایک دلچسپ قصہ، ہمعصر علماء کی توقیر اور اہل علم کی قدر و منزلت، قاضی ابو یوسفؒ اور ربیعۃ الرائےؒ کے درمیان ایک دلچسپ مباحثہ، علوم اور معارف میں ام، ام ابو یوسفؒ کی یکتائی، جب تک فریقین حاضر نہ ہوں میں فیصلہ نہیں کیا کرتا، عیسائی باپ اور مسلمان بیٹا، اعتراف سرقہ کے باوجود چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، کشتی خرید لو طلاق نہیں واقع ہوگی، فقہی حیلہ کی شرعی حیثیت، حیلہ جائز اور لطیف تدبیر کا نام ہے، امام ابو یوسفؒ کا محتاط طرز عمل، خاموش رہنا ہی اچھا تھا، قرآن مجید کا ادب اور احترام، سخاوت و ایثار، صرف مٹی کا ایک برتن جس سے والدہ اور بیٹا وضو کیا کرتے تھے، نرم خوئی و فیاضی اور

احساس ذمہ داری، اہل بدعت اور دروغ گوئی کا جواب، بعض اہل زیغ فلسفی، ملحدین اور امام ابو یوسفؒ کا حکم، امام ابو یوسفؒ کے علم فقہ سے تعلق کی ایک مثال، علم وفضل اور زبان و بیان کا بادشاہ، امام ابو یوسفؒ کا نام لو تو پہلے زبان دھولو، مخالفوں کا اعتراف، جنت کا پروانہ منامی، محدث اعمشؒ اور فقیہ ابو یوسفؒ، قاضی ابو یوسفؒ امام اعظم ابوحنیفہؒ کی نگاہ میں، امام ابو یوسفؒ کی علمی عظمت اور اعاظم رجال علماء کا اعتراف، سید العلماء، ابوحنیفہؒ کا ممتاز شاگرد، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ ائمہ ثلاثہ سے کسی طرح کم نہ تھے، لاؤ! اگر ابو یوسفؒ کا سا کوئی آدمی پیش کر سکتے ہو، امام ابو یوسفؒ نے عہدہ قضا کو بلندی بخشی تھی، امام ابو یوسفؒ کی موجودگی میں محدث ابومعاویہؒ کے پاس کیوں آتے ہو، ائمہ احناف کی فقہی ڈگریاں، امام ابو حنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے درجات، اپنے کام سے کام، امام ابو یوسفؒ کا قصر جمیل، امام ابو یوسفؒ نے ہارون رشید کے خلاف فیصلہ دیا، کاش ایسا نہ ہوتا، تقویٰ و دیانت اور اولاد کی تربیت، زہد وورع اور ذوق عبادت، تقویٰ اور خوف آخرت، عالم نزع میں توجہ وانابت الی اللہ، گرانقدر نصائح، المراجع والمصادر باب دوم

باب سوم

امام ابو یوسف کا فقہی مقام

یہ باب مندرجہ ذیل ابحاث پر مشتمل ہے:

فقہ کی لغوی تعریف، فقہ کی اصطلاحی تعریف، ضرورت فقہ، فقہ اسلامی کے مصادر، منصوص مصادر، کتاب اللہ، سنت رسول، آثارِ صحابہ، شرائع ماقبل، غیر منصوص مصادر، اجماع، قیاس، دوسرے دلائل، فقہ اسلامی کا امتیاز، جامعیت وہمہ گیری، عقل وحکمت سے مطابقت، ابدیت ودوام، فطرت انسانی سے ہم آہنگی، توازن واعتدال، عدل وانصاف، حقیقی نافعیت، تنفیذ کی قوت، فقہ پر اعتماد نہ کرنے کا نقصان، فقہ اسلامی کا پہلا دور اور اس کی خصوصیات، فقہ اسلامی کا دوسرا دور اور اس کی خصوصیات، فقہاء صحابہ، فقہ اسلامی کا تیسرا دور، فقہ حنفی، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے تلامذہ [illegible] رحمۃ اللہ علیہ کا

منہج استنباط، فقہ مالکی، امام مالک رحمہ اللہ کا طریقہ اجتہاد، فقہ شافعی، امام شافعی رحمہ اللہ کا منہج استنباط، فقہ حنبلی، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا طریقہ اجتہاد، دیگر فقہی مکاتب، فقہ اسلامی کا چوتھا دور، فقہ اسلامی کا پانچواں دور، عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، دوسرا مرحلہ خلافتِ راشدہ، تیسرا مرحلہ اصاغر صحابہ اور اکابر تابعین، چوتھا مرحلہ اوائل دوسری صدی تا نصف چوتھی صدی، امام اوزاعیؒ: سفیان ثوری، لیث بن سعد، داود ظاہری، ابن جریر طبری، پانچواں مرحلہ سقوطِ بغداد تک (۶۵۶ھ)، حنفیہ، شوافع، چھٹا مرحلہ سقوطِ بغداد تا اختتام تیرہوی صدی، حنفیہ، مالکیہ، شوافع، حنابلہ، فقہ اسلامی عہدِ جدید میں، نصوص سے غایت اعتناء، مصادرِ شرعیہ کے مدارج کی رعایت، نقد حدیث میں اصول درایت سے استفادہ، حقوق اللہ میں احتیاط، یسر وسہولت کا لحاظ، عقل واصول سے مطابقت، مذہبی رواداری، مسلمانوں کی طرف گناہ کی نسبت سے احتراز، قانون تجارت میں دقیقہ سنجی، حیلہ شرعی، فقہ تقدیری، اجتہاد کی ضرورت، اجتہاد کے شرائط، قرآن کا علم، احادیث کا علم، اجماعی مسائل کا علم، قیاس کے اصول وشرائط کا علم، عربی زبان کا علم، مقاصد شریعت سے آگہی، زمانہ آگہی، مجتہد کے لیے زمانہ آگہی کی ضرورت کیوں؟، ایمان وعدل، مجتہد کو نتیجہ تک پہونچنے کے لیے درکار وسائل، تنقیح مناط، تخریج مناط، تنقیح وتخریج میں فرق، تحقیق مناط، مجتہد کا دائرہ کار، شرائط اجتہاد کا خلاصہ، المراجع والمصادر باب سوم

باب چہارم

امام قاضی ابو یوسف کا تفقہ اور انکی علمی خدمات

یہ باب مندرجہ ذیل ابحاث پر مشتمل ہے:

عہدہ قضاء، قاضیوں کا انتخاب، قاضی القضا کے عہدہ کی ابتداء، عہدہ قضا کی مدت، علم وفضل، قرآن، حدیث وآثار، فقہ، فرائض، اجتہاد واستنباط، علم کلام، خلقِ قرآن، ایمان، جرح وتعدیل، حیل، زریں اقوال، تصانیف، مرجوع مسائل، امام صاحب کی وصیت، امام اعظمؒ کی نصیحتیں امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نام، حاکم کے ساتھ محتاط طرزِ عمل، عوام کے ساتھ محتاط طرزِ عمل، ازدواجی آداب، امورِ زندگی کی ترتیب، سیرت و کردار کی تعمیر، معاشرتی آداب، آداب زندگی، آداب وعظ ونصیحت، اخلاق حسنہ، آداب مجلس، امام

صاحب کے درس کی خصوصیات امام ابو یوسف کے درس میں، امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی تضعیف و جرح کا مفصل جواب، امام ابو یوسف اور حدیث وسنت سے استدلال، کتاب الخراج 'حدیث' کی کتاب نہیں، کتاب الخراج میں روایات کی تعداد، کتاب الخراج میں امام ابو یوسف کے فقہی مصادر، حدیث اور اَثر کے ہم معنی اور وسیع تر مفہوم میں استعمال کی مثالیں، 'اَثر' اور 'حدیث' کا اطلاق مقطوع روایات کے لیے، ۔امام ابو یوسف کے ہاں 'سنت' کی اصطلاح، 'سنت' کا استعمال حدیث کے معنی میں، 'سنت' کا استعمال مشہور ومعروف طرزِ عمل کے لیے، 3۔صحابہ کے جاری کردہ طریقوں کے لیے، 4۔اخبار (خبر) کی اصطلاح، 2۔امام ابو یوسف اور حجیتِ حدیث، امام ابو حنیفہ 'حدیث' کو حجت مانتے تھے، امام ابو یوسف 'حدیث' کو حجت مانتے ہیں، امام ابو یوسف نے حدیث کی بنیاد پر ابو حنیفہ اور دیگر ائمہ سے اختلاف بھی کیا ہے، 3۔امام ابو یوسف اور حجیتِ آثارِ صحابہ، متفرقات، علالت اور وفات، المراجع والمصادر باب چہارم

آخر میں خاتمہ بیان کیا گیا ہے اور کتابیات درج کی گئی ہیں ۔اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس تحقیقی کام کو شرفِ قبول عطا فرمائے ۔اور نئے آنے والے محققین کے لئے اسے مشعلِ راہ بنائے ۔

آمین

باب اول

امام قاضی ابو یوسف سے قبل فقہ کی تاریخ اور کوفے کی سرگرمیوں پر ایک نظر

﴿بسم اللہ الرحمان الرحیم﴾

باب اول

امام قاضی ابو یوسف سے قبل فقہ کی تاریخ اور کوفے کی سرگرمیوں پر ایک نظر

اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انسانیت کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لائیں اور صراط مستقیم کی طرف اس کی رہنمائی فرمائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے کچھ عرصہ پہلے انسانیت ہدایت الٰہی سے بھٹک چکی تھی، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل مبعوث ہونے والے انبیاء کی شریعتیں تحریف کا شکار ہو چکی تھیں اور لوگ ان کی تعلیمات کو چھوڑ کر فساد و منکر کی زندگی کے خوگر ہو گئے تھے، ان حالات میں وہ اس بات کے سخت ضرورت مند تھے کہ کوئی ایسی شخصیت آئے، جو دنیا و آخرت کی فلاح و نجات کی راہیں ان کے سامنے روشن کر دے، چنانچہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تا کہ آپ انسانیت کو گمراہی، انارکی اور سرکشی کی ان خوفناک گھاٹیوں سے نکالیں جن میں لوگ بھٹک رہے تھے۔(۱)

آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے مبعوث ہونے والے انبیاء کے برعکس رسالت محمدی صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کے لیے خاص نہ تھی، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت عالمی تھی، اور رنگوں، زبانوں، علاقوں کے اخلاف سے ماوراء یہ نوع انسانی کے لیے دعوت کی حامل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ہر دور اور ہر علاقے کے لیے قابل عمل ہیں تا کہ اس پر موجودات کا اللہ اسے وارث بنا دے۔ اسی سے یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ نبوت محمدی تمام نبوتوں کا خاتمہ و تتمہ ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سب سے آخری رسالت ہے۔

عرب قبل از اسلام

اللہ تعالیٰ نے جن عربوں میں سے اپنے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو منتخب کیا، اور جس زبان میں

قرآن نازل کیا اور جو اسلام کے علمبردار، اس کے داعی اور روئے زمین پر اسے پھیلانے والے بن گئے، وہ ایک ان پڑھ اجڈ قسم کے افراد تھے، جنہیں پڑھنا لکھنا تک نہ آتا تھا، نہ ان کو علوم حاصل تھے جو ان کی ہمسایہ قوموں، رومیوں اور ایرانیوں کو حاصل تھے۔ انہیں صرف زبان، لغت، شاعری، سفر اور تاریخ کا علم تھا یا ان علوم کا جو ان کی زندگی کے لیے ضرورت بن چکے تھے، مثلاً علم نجوم، علم قیافہ، فال گیری اور علم انساب، تاہم ان علوم سے ان کی معرفت تجربے کی بناء پر تھی، نہ کہ حقائق کا علم حاصل کرنے پر، اور نہ ہی تعلیم و تعلم کی بناء پر۔ (۲)

اسی طرح عربوں کے ہاں قبل از اسلام کچھ قوانین و قواعد بھی تھے جو ان کی زندگی اور معاملات کو کنٹرول کرتے تھے، مگر یہ قواعد و قوانین کسی با قاعدہ شریعت پر مبنی نہ تھے، بلکہ ان عادات و افعال کے تابع تھے جو اختلاف قبائل کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے رہتے تھے، (۳) یہ گروہی اور علاقائی تعصّبات پر مبنی غیر منظّم، غیر مدون، غیر مستقل اور منتشر قوانین تھے، مزین براں عمومی لحاظ سے وہ ایک صحت مند معاشرے کے قیام اور باوقار زندگی گزارنے والی امت صالحہ کو وجود میں لانے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ انہی وجوہ کی بناء پر اسلام آیا، تاکہ عقیدے کو شرک و اوہام سے آزاد کرائے، اور انسانی معاشرے کے لیے ایسے قواعد و اصول مقرر کرے جو انسانی زندگی کے لیے فضیلت، سعادت، جدیدیت (۴) اور استقلال کے ضامن ہوں۔

قرآن کی مکی اور مدنی سورتیں

محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکے میں اپنے رَبّ کے حکم کو علی الاعلان بیان کیا۔ قرآن کریم کا نصف سے زائد حصہ ہجرتِ مدینہ سے قبل مکی دور ہی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا، اور جتنا قرآنی حصہ مکے میں نازل ہوا، وہ فقہی قانون سازی پر زیادہ مبنی نہ تھا، کیونکہ نزول قرآن کا اولین مقصود دعوت الی اللہ، توحیدِ الٰہی اور ان مختلف معبودانِ باطلہ کا ابطال تھا جن کی لوگ اسلام سے قبل عبادت کیا کرتے تھے، قیام آخرت پر دلائل پیش کرنا، اور دعوت الی اللہ کی راہ میں پیش آنے والے مصائب و مشکلات برداشت کرنے کے لیے سابق انبیاء و مرسلین کے مختلف واقعات کے ذریعے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے۔ جہاں تک تفصیلی فقہی

قانون سازی کا معاملہ ہے تو اس کا بہت بڑا حصہ مدنی سورتوں میں نازل ہوا، جو مجموعی طور پر قرآن کے تہائی حصے سے کچھ زائد ہیں۔(۵) فقہی احکام کی ایک کثیر تعداد اپنی قانون سازی میں ان واقعات سے متعلق تھی جو وقوع پذیر ہو چکے تھے، یا ان سوالات سے متعلق تھی جو صحابہ کرام آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھتے تھے۔(۶)

اجتہادِ رسول ﷺ

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصدِ بعثت وحی الٰہی کی تبلیغ ہی نہ تھا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ آپ کی ذمہ داری یہ بھی تھی کہ قرآن کریم کے مبہم مقامات کی توضیح اور مجمل مقامات کی تفصیل بیان کریں اور جو احکام توضیح طلب ہوں ان کی تفسیر و وضاحت کریں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابِ عزیز میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصل مقصد بعثت کو بیان کرتے ہوئے واضح فرمایا ہے کہ آپ مبلغ قرآن، مبیّن قرآن، اور قرآن کے مقاصد و آیات کی توضیح کرنے والے ہیں، چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

”وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ“(۷)

اور اب ہم نے یہ ذکر تم پر اتارا ہے تا کہ تم لوگوں کے سامنے اس تعلیم کی تشریح و توضیح کرتے جاؤ جو ان کے لیے اتاری گئی ہے اور لوگ خود بھی غور وفکر کریں۔

مسلمان آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ان امور کے بارے میں سوال کیا کرتے تھے جو ان پر مخفی ہوتے تھے۔ ہر نئے پیش آنے والے معاملے میں آپ کے دامنِ رحمت میں پناہ لیتے تھے جس کے بارے میں حق یا صحیح ہونے کا انہیں علم نہ ہوتا تھا۔ کبھی تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اپنی رائے سے جواب دیا کرتے تھے اور کبھی وحی الٰہی کا انتظار فرماتے تھے۔ وحی الٰہی بعض معاملات میں آپ کی رائے اور فیصلے کے برعکس بھی نازل ہوتی تھی، جیسا کہ اسیرانِ بدر کے معاملے میں ہوا کہ آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مشورے کو قبول کرتے ہوئے مشرکین سے فدیہ قبول کر لیا اور ان کے قتل کرنے کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ

کی رائے کو قبول نہ کیا، تو اس کے بعد یہ ارشادِ الٰہی نازل ہوا:

"مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَن يَكُونَ لَهُ أَسْرَى حَتَّى يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ○ لَّوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ" (۸)

کسی نبی کے لیے یہ زیبا نہیں کہ اس کے پاس قیدی ہوں، جب تک کہ وہ زمین میں ان دشمنوں کو اچھی طرح کچل نہ دے۔ تم لوگ دنیا کے فائدے چاہتے ہو، حالانکہ اللہ کے پیش نظر آخرت ہے، اور اللہ غالب اور حکیم ہے۔ اگر اللہ کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا تو جو کچھ تم لوگوں نے لیا ہے، اس کی پاداش میں تم کو بڑی سزا دی جاتی۔

علماءِ اصول اور فقہاء کے درمیان اجتہادِ رسول کے بارے میں اختلاف ہے کہ: کیا آپ کو اجتہاد کا حق حاصل ہے، اور کیا آپ ﷺ نے اجتہاد کیا؟

اس موضوع پر فقہاء و علماء اصول کی طویل مباحث ہیں، (۹) اور اس سلسلے میں شدید اختلاف ہے، بعض کا مسلک یہ ہے کہ رسول اکرم کو سرے سے اجتہاد کا حق حاصل ہی نہیں ہے، کیونکہ آپ اتباعِ وحی کے پابند ہیں، نیز یہ کہ آپ پیش آمدہ سوال کا جواب دینے کے لیے وحی الٰہی کا انتظار کیا کرتے تھے۔ مزید براں وحی کے مقابلے میں اجتہاد پر اعتماد کمزور تر ہے، کیونکہ اجتہاد میں تو بہر حال خطاء کا امکان موجود ہے اور وحی میں بالکل نہیں، جیسا کہ آیاتِ قرآنی:

"وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَى ○ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَى" (۱۰)

اور وہ اپنی خواہش سے کوئی بات نہیں کہتے ہیں، وہ تو صرف وحی ہے جو اتاری جاتی ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر ہونے والی ہر چیز کو وحی الٰہی پر منحصر قرار دیتی ہیں۔ اگر آپ کو اجتہاد کرنے کا اختیار رہتا تو پھر آپ کا ہمہ قسم کلام وحی کی بناء پر صادر ہونا قرار نہ پاتا۔ (۱۱)

بعض فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ بلا شبہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے وحی الٰہی کا انتظار

کرنے کے پابند تھے، لیکن اگر پیش آمدہ مسئلے کے فوت ہونے کا اندیشہ ہوتا اور اس بارے میں آپ ﷺ پر وحی نازل نہ ہوتی تو پھر آپ کو اجتہاد کا اختیار تھا۔

ایک رائے یہ بھی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جنگی احکام اور دنیوی امور کے بارے میں تو اجتہاد پر مامور تھے لیکن ان کے علاوہ احکام کے لیے نہیں۔(۱۲)

جمہور فقہاء اور علماء اصول کا مذہب یہ ہے کہ اجتہاد کرنا رسول ﷺ کے لیے جائز ہے(۱۳) اور آپ ﷺ نے اجتہاد کیا بھی ہے، نیز آپ کا اجتہاد کسی متعین موضوع کے ساتھ خاص نہیں تھا، اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کریم میں خود آپ کو مشورہ کرنے کا حکم دیا ہے وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۱۴) اور دین کے کام میں ان مسلمانوں کو بھی شریک مشورہ رکھو۔ یہ مشورے کا حکم صرف ان معاملات کے بارے میں تھا جن کا فیصلہ آپ بذریعہ اجتہاد کرتے تھے، نہ کہ ان معاملات کے بارے میں جن کا فیصلہ آپ اجتھاد کے ذریعہ کرتے تھے۔(۱۵) اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے بہت سے احکام کی علت (Cause) بیان فرمائی۔ تعلیل اتباعِ علت کی موجب ہوتی ہے، جہاں کہیں بھی ہو اور یہی اصل قیاس ہے۔ (۱۶) مثلاً آپ ﷺ نے کسی عورت کو اس کی پھوپھی اور خالہ پر بیاہ کرلانے کی علت بیان کرتے ہوئے یوں ممانعت فرمائی: انکم اذا فعلتم ذلك قطعتم ارحامكم. یعنی جب ایسا کروگے تو اپنی رشتہ داریوں کے خاتمے کا ارتکاب کروگے۔ اسی طرح مروی ہے کہ آپ ﷺ احکام کو ان کے نظائر، اسباب اور مختلف مثالیں بیان کرکے سمجھاتے تھے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ نظیر (Similar) کا حکم وہی ہوتا ہے جو اس کی مثل (Exactequivalent) کا ہوتا ہے، اور یہ کہ علتیں اور اسباب نفی اور اثبات کے لحاظ سے احکام میں مؤثر ہوتے ہیں۔ دیکھئے! یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہ کہنے کی غرض سے جارہے ہیں کہ: اے اللہ کے رسول ﷺ! آج مجھ سے بہت بڑا گناہ سرزد ہوگیا کہ میں نے روزے کی حالت میں بیوی کا بوسہ لے لیا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے جواب میں ان سے

فرماتے ہیں: کیا خیال ہے تمہارا، کہ اگر تم روزے کی حالت میں پانی سے کلی کرلو؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جواب میں کہتے ہیں کہ اس سے تو روزے میں کوئی فرق نہیں آتا۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: فصمہ (۱۷) پھر روزہ مکمل کرو۔ بوسہ لینے سے بھی روزے میں کوئی فرق نہیں آتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو اس سے بڑھ کر عقلِ سلیم اور فکرِ قویم رکھنے والے انسان تھے جو دوسروں سے کہیں زیادہ مقاصدِ تشریع اور حکمِ تشریع کو جانتے تھے، آپ ﷺ کے علاوہ کسی ایسے شخص کی طرف سے اجتہاد ہو جس میں یہ شرائط پوری پائی جاتی ہوں تو اس پر اجتہاد کرنا لازم ہوگا، بشرطیکہ اس کے علاوہ کوئی دوسری شخصیت ایسی نہ ہو جو اس کی قائم مقام بن سکے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی حیات مبارکہ میں دینی معاملات میں لوگوں کے لیے واحد مرجع و مرکز تھے جن سے لوگ مسائل دریافت کرتے تھے اور آپ ﷺ انہیں فتویٰ دیتے تھے اور آپ ﷺ ان سب سے بہتر انسان تھے، جن میں وہ شرائط بتمام و کمال موجود تھیں جن کی بناء پر آدمی غور و فکر اور اجتہاد کا اہل بنتا ہے، لہٰذا آپ ﷺ دوسروں کے مقابلے میں اجتہاد کرنے کے بدرجہ اولیٰ مستحق تھے۔ (۱۸) بلا شبہ آپ ﷺ فقہاء و مجتہدین کے امام اور علماء و محققین کے لیے اسوہ و نمونہ تھے۔

رسول اللہ ﷺ کے بعض اجتہادی معاملات

اس بناء پر ہر اس معاملے میں رسول کی اطاعت لازم ہے، جسے وہ اپنے رب کی طرف سے پہنچاتے ہیں اور جس کا حکم دیتے ہیں چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: يَـا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ أَطِيْعُواْ اللّٰهَ وَأَطِيْعُواْ الرَّسُولَ وَأُوْلِـيْ الْأَمْرِ مِنكُمْ ۔(۱۹) یعنی اے لوگو جو ایمان لائے، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اجتہاد رسول کو ایک تقدس حاصل ہوتا ہے، جو آپ کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں۔ لہٰذا آپ کا اجتہاد واجب الاتباع ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اور تقریرات قانون سازی کا حصہ ہیں، یہاں اجتہادِ رسول کی دونوعیتوں کے درمیان فرق کرنا ضروری

ہے:

(الف)　　وہ اجتہاد جو حلال وحرام کی وضاحت سے متعلق ہو، یا بالفاظ دیگر اصول واحکام شرعیہ مقرر کرنے سے متعلق ہو۔ اس اجتہاد کے سلسلے میں رسول کریم ﷺ واجب الاتباع ہیں۔ اللہ تعالیٰ کسی خطا پر آپ کو برقرار نہیں رکھتا۔ اگر آپ ﷺ نے کوئی حکم برقرار رکھا اور اللہ نے اس میں تنبیہ نہ کی تو وہ حکم شرعی بن جاتا ہے جس پر عمل کرنا اور اس سے باہر نہ جانا لازم ہو جاتا ہے۔

(ب)　　ایسا اجتہادِ رسول ﷺ جو ان دنیوی امور سے متعلق ہو، جن کا تعلق حلت وحرمت سے نہیں ہوتا، مثلاً کھجور کے درختوں کی پیوند کاری کے بارے میں بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ سے مشورہ لیا، تو آپ ﷺ نے پیوند کاری نہ کرنے کا مشورہ دیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پیوند کاری نہ کی، تو اس سال کھجوروں کا پھل نہ رہا۔ انہوں نے دوبارہ اس سلسلے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کیا۔ تب آپ نے فرمایا: انتم ادری بشؤون دنیاکم، یعنی تم اپنے دنیا کے معاملات کو بہتر جانتے ہو۔

اس قسم کے اجتہاد میں رسول ﷺ واجب الاتباع نہیں ہیں، کیونکہ آنحضرت ﷺ نے خود اس بات کی وضاحت کی ہے کہ کبھی کبھی دنیاوی معاملات میں فیصلہ کرنے میں ان سے تسامح ہو جاتا ہے۔(۲۰) لیکن یہ ایک ایسی چیز ہے جو ہمارے بس سے باہر ہے ہم نہیں جان سکتے کہ ایسا کہاں ہوا تاہم یہ صورت خارج از امکان تو نہیں ہے۔(۲۱)

وہ مسائل وحوادث جن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجتہاد کیا ہے، ان میں سے بعض کی طرف قرآن کریم نے اشارہ کیا ہے، جبکہ بعض دیگر کا تذکرہ حدیث، سیرت، فقہ اور اصول کی کتابوں میں ملتا ہے، یہ بات پیش نظر رہے کہ جن اجتہادی معاملات کی طرف قرآن کریم نے اشارہ کیا ہے، وہ ایسے معاملات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے اجتہادِ رسول سے موافقت نہیں کی، مثلاً اسیرانِ بدر کا معاملہ، جنگ تبوک سے پیچھے رہنے والوں کا آپ کو اجازت دینا وغیرہ۔ یہ بات گزر چکی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے اسیرانِ

بدر کے معاملے میں صحابہ سے مشورہ طلب کیا، اور آپ ﷺ نے ان کو قتل کرنے کی بجائے فدیہ قبول کرنے کے بارے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے کو ترجیح دی۔ اس کے بعد قرآنی آیت کا نزول ہوا، جس میں وضاحت کر دی گئی کہ صحیح اور حق رائے آپ کی رائے کے خلاف ہے، اسی طرح غزوۂ تبوک کے موقع پر جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کا آخری غزوہ ہے، آپ ﷺ نے ان بعض منافقین کو پیچھے رہنے کی اجازت دے دی جنھوں نے جھوٹے عذر پیش کئے تھے، آپ نے ان کے کمزور عذروں کو قبول کیا۔ اس کے نتیجے میں بعض سچے اہل ایمان بھی پیچھے رہ گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو جنگ سے پیچھے رہنے کی اجازت دیدی۔

لیکن اللہ تعالیٰ تو دلوں میں پوشیدہ نیتوں کی حقیقت کو خوب جانتا تھا وہ اپنے رسول کی اس اجازت پر راضی نہ ہوا، اور آپ کو فہمائش کی کہ اجازت طلب کرنے والوں کو اجازت دینے میں تاخیر کرنا اور جلد بازی نہ کرنا آپ کے لیے زیادہ مناسب تھا، تاکہ یہ بات واضح ہو جاتی کہ عذر پیش کرنے میں کون سچا ہے اور کون منافق؟ کیونکہ اگر آپ اجازت نہ بھی دیتے تو منافقین پھر بھی لازماً پیچھے رہ جاتے۔ اسی بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

”لَوْ كَانَ عَرَضاً قَرِيْباً وَسَفَراً قَاصِداً لَّاتَّبَعُوكَ وَلَـٰكِن بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ وَسَيَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ يُهْلِكُونَ أَنفُسَهُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ O عَفَا اللّٰهُ عَنكَ لِمَ أَذِنتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُواْ وَتَعْلَمَ الْكَاذِبِيْنَ“(۲۲)

اے نبی! اگر فائدہ سہل الحصول ہوتا اور سفر ہلکا ہوتا تو وہ ضرور تمہارے پیچھے چلنے پر آمادہ ہو جاتے، مگر ان پر تو یہ راستہ کٹھن ہو گیا ہے، اب وہ اللہ کی قسم کھا کھا کر کہیں گے کہ اگر ہم چل سکتے تو یقیناً تمہارے ساتھ چلتے۔ وہ تو اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں۔ اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔ اے نبی! اللہ تمہیں معاف کرے تم نے کیوں انہیں رخصت دیدی؟ (تمہیں چاہئے تھا کہ خود رخصت نہ دیتے) تاکہ تم پر کھل جاتا

کہ کون لوگ سچے ہیں اور جھوٹوں کو بھی تم جان لیتے۔

چنانچہ یہ ارشاد الٰہی اس بات کو واضح کر دیتا ہے کہ رسول کریم ﷺ کے اس اجتہاد میں اللہ کی موافقت آپ کے ساتھ نہ تھی۔ چونکہ اجازت طلب کرنے والوں میں جنہیں آپ نے اجازت دیدی، منافق بھی تھے اور سچے مومن بھی، اس لیے اللہ نے آپ کو اس اجتہاد پر برقرار نہ رکھا۔(۲۳)

فقہاء اور اصولیین کے درمیان جس طرح اجتہادِ رسول کے بارے میں اختلاف ہے، اسی طرح دور رسالت میں اجتہادِ صحابہ کے بارے میں بھی اختلاف ہے،(۲۴) بعض کا مسلک یہ ہے کہ رسول اللہ کی موجودگی میں صحابہ کے لیے اجتہاد کرنا جائز نہیں تھا، جبکہ آپ انہیں وحی الٰہی پہنچا رہے تھے اور انہیں دریافت کردہ مسائل کے بارے میں فتویٰ دے رہے تھے، آنحضرت ﷺ کے ساتھ ان کا تعلق دراصل آپ کے احکام بغور سن کر اختیار کرنے کا تھا، یا بالفاظ دیگر ہر معاملے میں فہم و توجیہہ کے لحاظ سے آپ پر اعتماد کرنے کا تھا۔(۲۵) بعض فقہاء نے زمانۂ رسول میں اجتہاد صحابہ کے جواز کے لیے یہ قید لگائی ہے کہ آپ کے اور ان کے درمیان دور دراز کا فاصلہ ہو، یا پیش آمدہ مسئلے کے موقع کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو۔(۲۶)

لیکن راجح رائے یہ ہے کہ صحابہ کرام نے اجتہاد کیا ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں کیا ہے اور آپ کی غیر موجودگی میں بھی، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود انہیں اجتہاد کی ترغیب دی ہے، تاکہ آپ انہیں تحقیق و استنباط کے طریقے سکھائیں اور ان کے اندر غور و فکر اور استدلال کی قوت کو پروان چڑھائیں، اسی لیے وہ اپنے اجتہادات رسول اکرم کے سامنے پیش کرتے تھے یا آپ تک پہنچاتے تھے، پھر آپ صحیح اجتہاد کرنے والے کی تصویب فرماتے اور غلط اجتہاد کرنے والے کی غلطی سے آگاہ کرتے۔(۲۷)

اجتہادِ صحابہ رضی اللہ عنہم دور رسالت میں

اجتہاد نے دور رسالت میں کوئی اہم کردار ادا نہیں کیا۔(۲۸) کیونکہ آسمان سے وحیِ الٰہی نازل ہو رہی تھی، اور اجتہاد کے لیے کوئی قابل ذکر میدان نہیں تھا، یہی وجہ ہے کہ اس دور میں اجتہاد کو مستقل مصادر تشریع

میں شمار نہیں کیا جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اجتہادِ رسول بھی بالآخر وحی کی طرف لوٹتا ہے اور اجتہاد صحابہ کا مرجع بھی بالآخر سنت رسول ہی قرار پاتا ہے، (۲۹) لیکن اس سے اس بات کی نفی نہیں ہوتی کہ دورِ رسالت میں اجتہاد ایک امر واقعہ تھا۔ رسول نے اجتہاد کیا اور صحابہ کرام نے بھی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی اور غیر موجودگی میں اجتہاد کیا البتہ یہ اجتہاد گنے چنے مسائل و معاملات تک محدود تھا۔ (۳۰)

یہ بات قابل ذکر ہے کہ زمانۂ نبوت میں لفظ فقہ کا اطلاق کتاب و سنت کی نصوص سے سمجھی جانے والی ہر بات پر ہوتا تھا خواہ اس کا تعلق عقائد سے ہو یا عملی قانون سازی سے، یا آداب سے ہو، اور یہ کہ دورِ رسالت مآب میں احکام کا ماخذ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کریم کی صورت میں نازل ہونے والی وحی اور آپ کی بیان کردہ وضاحت تھی جو آپ کے اقوال، افعال اور تقاریر کی صورت میں ہوتی تھی۔ نیز اس سلسلے میں اصول و قواعد کے استعمال کی کوئی حاجت نہ ہوتی تھی۔ (۳۱) اجتہادِ رسول اور اجتہاد صحابہ نہ تو احکام میں اختلاف کا باعث تھا اور نہ آراء میں تعارض ہی کا۔ یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ رسول کریم ﷺ ایسے اجتہاد میں خطا پر برقرار نہ رہتے تھے جس کا تعلق اصول و احکام شرعیہ کے مقرر کرنے سے ہوتا تھا، اسی طرح صحابہ کرام اپنے درمیان اختلافات کے وقت آپ کی خدمت میں پیش ہوتے، اور آپ ان کے درمیان فیصلہ فرما دیتے۔ اور تمام صحابہ آپ کے حکم اور رہنمائی کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے تھے، اس لحاظ سے فقہ واقعی اور عملی رہا، نہ کہ فرضی اور نظری۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی تو اپنے پیچھے مسلمانوں کے لیے کتاب اللہ اور وہ احادیث چھوڑیں جنہیں آپ نے بیان کیا تھا اور وہ افعال چھوڑے جنہیں آپ نے انجام دیا تھا۔ ان کے لیے کوئی باقاعدہ مدون فقہ نہیں چھوڑی، البتہ ہمہ قسم کے اصول، قواعد اور جزوی احکام قرآن و سنت میں بکھرے پڑے ہیں۔ (۳۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صحابہ کرام کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ اسلام کے مقاصد کو

قائم رکھنے اور دعوت اسلام کو پوری نوعِ انسانی تک پہنچانے کے لیے اپنی مساعی کو جاری رکھیں، اسی مقدس پیغام کی خاطر وہ اپنی جانیں ہتھیلیوں پر رکھ کر روئے زمین پر پھیل گئے۔ اللہ کے سوا انہیں کسی کا ڈر نہ تھا۔ ان کی مساعی کے پیچھے قوموں کے مال و دولت چھیننے اور ان کو غلام بنانے کا جذبہ ہرگز کارفرمانہ تھا، بلکہ ان کا مقصد نصرِ حق اور اللہ تعالیٰ کے کلمے کی سربلندی تھی کہ دنیا پر کوئی فتنہ و فساد باقی نہ رہے اور دین سارے کا سارا اللہ کے لیے ہو جائے۔

کسی کو یہ گمان ہرگز نہ ہوا کہ اسلام میں جنگ کا مقصد لوگوں کو زبردستی ایمان قبول کرنے پر مجبور کرنا ہے۔ قرآن کریم نے تو کھلے لفظوں میں اس بات کی وضاحت کردی ہے کہ دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے، بلکہ صحیح عقیدے کی اساس تو دلیل اور ضمیر کی آواز پر قائم ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے آیات کی ایک بہت بڑی تعداد میں (۳۳) ہر اس چیز میں جسے اللہ نے پیدا کیا ہے، غور و فکر اور تدبر و تفکر کی دعوت دی ہے، اور ان لوگوں کا مرثیہ کہا ہے جنہوں نے اپنی عقلوں سے کام نہیں لیا، جو آنکھیں بند کر کے بغیر کسی غور و فکر کے اپنے اسلاف کی راہ پر چل پڑے اور انہوں نے اپنے موروثی معتقدات میں اپنے آباء و اجداد کی اندھی تقلید کی، ایسے لوگوں کو جانور، بلکہ جانوروں سے بھی بدتر اور راہ راست سے ہٹے ہوئے قرار دیا گیا ہے۔

اسلام میں جنگ کا ایک بلند پایہ پیغام اور مقام ہے اور وہ ہے ہر فرد کے لیے دینی حریت و آزادی کا قائم کرنا، پھر اس کے بعد جو چاہے، ایمان قبول کرلے اور جو چاہے کفر کا رویہ اختیار کرے۔

اسلام سے قبل بادشاہ، حکمران، سردار، اور سوسائٹی کے معزز لوگ عقائد سازی میں من مانا تصرف کیا کرتے تھے اور لوگوں پر اپنی مرضی کے مطابق عبادت کے طریقے اور مذہبی رسم و رواج ٹھونس دیتے تھے، اسلام کا ظہور اپنی عام اور دائمی دعوت کے ساتھ اس لیے ہوا کہ وہ انسانیت کو شرک، ظلم اور سرکشی سے آزاد کرائے۔ مسلمانوں پر جہاد اس لیے فرض کیا گیا کہ معاشرے سے ظلم کا خاتمہ ہو، عدل و انصاف کا بول بالا ہو،

حق کا چلن ہو، روئے زمین پر کہیں بھی اللہ کی حکمرانی کے علاوہ کسی کی حکمرانی قائم نہ ہو، اور ہمیشہ کے لیے کلمۃ اللہ سر بلند اور کلمۂ کفر سرنگوں ہو جائے۔

رسول ﷺ کے بعد اشاعت اسلام

سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کو خلیفۃ الرسول منتخب کرنے کے بعد سب سے پہلے مسلمانوں کو مرتدوں کے خلاف لڑنا پڑا۔ اس کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے روم وایران کے ممالک فتح کرنے کے لیے لشکر روانہ کئے مگر قبل اس کے کہ یہ لشکر اپنے مقدس مقاصد حاصل کرتے، حضرت ابو بکر کا انتقال ہو گیا۔ امیر المؤمنین سیدنا حضرت عمر بن خطاب خلیفہ منتخب ہوئے تو آپ کے عہد خلافت میں شام، عراق، مصر اور ایران کی فتوحات کی تکمیل ہوئی، اسی طرح آپ نے اپنے دورِ خلافت میں بڑے بڑے اسلامی شہروں، مثلاً فسطاط، کوفہ اور بصرہ کی بنیاد رکھی اور وہاں مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد کو آباد کیا، جن میں صحابہ کرام کی ایک کثیر تعداد موجود تھی، (۳۴) سیدنا حضرت عمر کے بعد فتوحات کا یہ سلسلہ جاری رہا، پہلی صدی ہجری ختم ہونے کے قریب تھی کہ اسلامی لشکر نے شمالی افریقہ فتح کرنے کے بعد اندلس کو فتح کرنے کے لیے بحرِ متوسط کو عبور کر لیا تھا، اسی طرح وہ مشرقی جانب سمرقند تک پہنچ چکے تھے۔

ان عظیم فتوحات کی بدولت اسلام مختلف تہذیب وتمدن رکھنے والی اقوام میں پھیل گیا اور قدیم تہذیبوں کی حامل کئی اقوام اسلامی حکومت کی زیرِ نگیں آ گئیں۔ (۳۵) اسلامی ممالک کا میل جول ان غیر اقوام سے بڑھا اور مختلف قومیتوں اور ذاتوں کے حامل عناصر ان میں داخل ہو گئے، تو لازمی طور پر بہت سے نئے مسائل بھی سامنے آئے، جن سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کو دور رسالت مآب میں واسطہ نہ پڑا تھا، صحابہ کرام کی ذمہ داری تھی کہ وہ ہر پیش آنے والے نئے مسئلے اور واقعے کا مناسب حل پیش کریں۔ کسی نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ قرآن کریم اور سنت رسول پیش آمدہ اور آئندہ پیش آنے والے تمام جزئی مسائل کا قطعی حل ہیں۔ (۳۶) اس کی وجہ یہ ہے کہ علامہ شہرستانی کے بقول ''نصوص محدود ہیں، جبکہ مسائل وحوادث غیر محدود

ہیں"(۳۷) اور محدود، غیر محدود کو منضبط نہیں کرسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام نے پیش آنے والے نئے مسائل کا حل معلوم کرنے کے لیے اجتہاد سے کام لیا۔ چونکہ وہ عہد رسالت سے قریب تھے، قرآن کریم کا فہم اور اسباب نزول آیات کی کامل معرفت رکھتے تھے، رسول اللہ کے فیصلوں اور احادیث سے کاملاً آگاہ تھے، اور اس بات پر ایمان رکھتے تھے کہ احکام ایسی علتوں کے لیے مقرر کئے گئے ہیں جو اس کی متقاضی ہیں اور ایسے مقاصد کے لیے ہیں جن کا حصول ان کے ذریعے ممکن ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اپنے اجتہاد میں وسعت کے لحاظ سے زیادہ کشادہ نظر اور فہم کے اعتبار سے زیادہ گہرائی کے حامل تھے، ان میں سے ہر ایک دوسرے کی رائے کا احترام کرتے ہوئے اپنی رائے سے اس وقت دستبردار ہو جاتا جب اسے معلوم ہو جاتا کہ دوسرے کی رائے اس کی رائے کے مقابلے میں حق کے زیادہ قریب ہے، اسی طرح وہ فتویٰ دینے میں بھی جلد بازی کو ناپسند کرتے تھے اور ہر ایک کی خواہش ہوتی تھی کہ دوسرا ہی فتویٰ دے دے۔ عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں کہ: سفیان نے عطاء سے اور عطاء نے عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کے حوالے سے بیان کیا کہ میں ایک سو بیس اصحابِ رسول سے ملا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ انہوں نے کہا مسجد میں ملا ہوں ان میں سے جو بھی محدث تھا، اس کی یہی خواہش ہوتی تھی کہ اس کا دوسرا محدث بھائی ہی حدیث بیان کرے، اور جو ان میں سے مفتی تھے ان میں سے ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ ان کو دوسرا مفتی بھائی ہی فتویٰ دیدے۔ (۳۸)

اس حزم و احتیاط کے باوجود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب سے پہلے کتاب اللہ کی طرف رجوع کرتے تھے، اگر اس میں کوئی حکم مل جاتا تو اسی کو تھام لیتے اور اس مسئلے کے مقتضی کے مطابق اس پر حکم جاری کر دیتے، اگر قرآن میں نہ پاتے تو سنت رسول کی طرف رجوع کرتے، اگر اس مسئلے کے بارے میں انہیں کوئی حدیث مل جاتی تو اس پر عمل کرتے، لیکن اگر قرآن وسنت میں کوئی حکم نہ پاتے (۳۹) تو اجتہاد سے اپنی آراء قائم کرتے اور غور و فکر کے ذریعے ایسا حکم لگاتے جو مقاصدِ شریعت اور اس کے قواعدِ عامہ کے زیادہ قریب ہوتا۔

اس صورت میں صحابہ کرام نے اجتہاد کیا اور اپنے اجتہاد میں رائے کو ذہانت کے ساتھ استعمال کیا،

انہیں جہاں ضرورت محسوس ہوتی وہاں پوری سرگرمی کے ساتھ قیام سے کام لیتے اور ان مصالح کو پیش نظر رکھتے جن کو شریعتِ اسلامیہ نے ملحوظ رکھا ہے۔

امام مزنی کہتے ہیں کہ عہدِ رسالت کے فقہاء سے لے کر ہمارے دور کے فقہاء تک اور اس کے بعد بھی سب نے دینی امور میں احکام کے استنباط کے لیے آراء کا استعمال کیا ہے۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ فقہاء کا اس بات پر اجماع ہے کہ حق کی نظیر حق ہوتی ہے، اور باطل کی نظیر باطل ہوتی ہے۔(۴۰) امام ابن قیم فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام نے مسائل وحوادث کو ان کے نظائر کے ذریعے پیش کیا اور انہیں ان جیسے مسائل کے مشابہ قرار دیا، اور ان کے احکام بیان کرنے میں بعض کو بعض کی طرف لوٹایا۔ اس طرح علماء کے لیے اجتہاد کا دروازہ کھولا، اس کا طریق کار مقرر کیا اور اجتہاد کے منہج کی وضاحت کی۔(۴۱)

ابن خلدون کہتے ہیں کہ بہت سے احکام ومسائل قرآن وسنت میں مذکور نہیں ہیں۔ لہٰذا صحابہ کرام نے غیر مذکور مسائل کو قرآن وسنت میں مذکور مسائل پر قیاس کیا، ان پر منصوص علیہ والا حکم لگایا، اس حکم کے لگانے میں ایسی شرائط کو ملحوظ رکھا، جو شرائط مشابہ چیزوں، یا دو ایک جیسے مسائل کے درمیان مساوات کی صحت کو برقرار رکھیں، تاکہ گمانِ غالب یہ ہو کہ ان کے بارے میں حکم الٰہی ایک ہی ہے، اس پر ان کے اجماع کی وجہ سے یہ ایک دلیل شرعی بن گئی اور اسی کا نام قیاس ہے۔(۴۲)

ارشاد نبوی ہے: **لا ضمان علی مؤتمن** (۴۳) یعنی جس کے پاس امانت رکھی اور اس سے وہ امانت ضائع ہوگئی تو اس پر کوئی جرمانہ نہیں ہے، یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جو شخص کسی وجود رکھنے والی چیز کا امین ہو مثلاً کوئی چیز امانت کے طور پر یا عاریتاً اس کے ہاں رکھی جائے، اور وہ تباہ ہو جائے یا ضائع ہو جائے تو اس پر کسی قسم کا کوئی تاوان نہیں ہے الا یہ کہ اس نے اس کی حفاظت کرنے میں کوتاہی کی ہو، یا خود اس امانت میں خیانت کا مرتکب ہوا ہو، لیکن دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں کچھ لوگوں کے دل راہ راست سے ہٹ گئے، بعض لوگوں کی جانب سے امانتوں میں خیانت کے واقعات رونما ہونے لگے۔ لہٰذا اس نئی پیش آمدہ صورت

حال کا سد باب ضروری تھا، اسی سلسلے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے فیصلہ دیا کہ مزدور، نوکر اور کاریگر نقصان کے ذمہ دار ہوں گے۔ اور مزید فرمایا کہ: ''اس کے بغیر لوگوں کی اصلاح نہیں ہوگی۔'' (۴۴) اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ صحابہ کرام نے اپنے اجتہاد میں مصلحت (Publicinterest) کا لحاظ رکھا ہے اور اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ زمان و مکان کے لحاظ سے احکام بدلتے رہتے ہیں جو اپنے علل واسباب کے تغیر کے تابع ہوتے ہیں اس طرح قانون سازی سے مقصود مقاصدِ شریعت کو پورا کرنا ہوتا ہے۔

وفات رسول کے بعد اجتہاد صحابہ کے مصادر

صحابہ کرام رضی اللہ عنہ نے جس طرح اپنے اجتہاد میں قیاس سے کام لیا ہے، اسی طرح مصالح (public interest) کو پیش نظر رکھا ہے اور اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ احکام متقاضی علل کی بناء پر مقرر کئے گئے ہیں، اور اس لیے مقرر کئے گئے ہیں کہ اصل مقاصد تک پہنچنے کا ذریعہ ہیں۔ بالکل اسی طرح انہوں نے اجماع کی بھی معرفت حاصل کی اور اس پر اعتماد کیا۔ خاص طور پر ان مشکل مسائل میں جن کے بارے میں مختلف آراء ہوتی تھیں، چنانچہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ جب کسی معاملے کا حکم کتاب اللہ میں نہ پاتے اور نہ لوگوں کے پاس اس کے بارے میں کوئی سنت رسول ہی ہوتی تو آپ صحابہ رضی اللہ عنہم کو جمع فرماتے اور ان سے مشورہ کرتے۔ جب کسی مسئلے پر ان کی رائے متفق ہو جاتی تو اسی پر فیصلہ کر دیتے۔ (۴۵) یہی طرز عمل سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا تھا، آپ رضی اللہ عنہ بھی علم و معرفتِ احکام کے سلسلے میں مسلمہ حیثیت کے صحابہ کی طرف رجوع فرماتے ان سے مشورہ لیتے اور تبادلہ آراء کرتے، اور جب وہ کسی متعین حکم پر متفق ہو جاتے تو اسے نافذ کر دیتے۔ اگر اختلاف ہوتا تو باہمی بحث ومباحثہ کرتے۔ یہاں تک کہ وہ کسی ایک رائے تک پہنچ کر اس پر اجماع کر لیتے جیسا کہ عراق کے باشندوں کے ساتھ معاملہ ہوا تھا۔ (۴۶)

اعلام الموقعین میں تحریر ہے کہ جب سیدنا ابو بکر صدیق کے سامنے کوئی معاملہ پیش ہوتا تو سب

سے پہلے وہ اسے کتاب اللہ میں دیکھتے۔ اگر وہاں اس کا حکم مل جاتا تو اسی کے مطابق فیصلہ کر دیتے۔ اگر کتاب اللہ میں نہ ملتا تو سنتِ رسول اللہ میں دیکھتے۔ اگر وہاں اس کا حکم مل جاتا تو اسی کے مطابق فیصلہ کرتے۔ اگر سنتِ رسول میں بھی اس کا کوئی حکم نہ ملتا تو پھر لوگوں سے دریافت کرتے کہ کیا تمہیں اس مسئلے میں رسول اللہ کے کسی فیصلے کا علم ہے، بسا اوقات لوگ آپ کے پاس آ کر بتاتے کہ رسول اللہ نے اس معاملے میں کیا فیصلہ کیا تھا، لیکن اس معاملے میں رسول اکرم ﷺ کا طرزِ عمل نہ ملتا تو پھر سر برآوردہ لوگوں کا اجتماع بلاتے اور ان سے مشورہ طلب کرتے، چنانچہ جب وہ کسی ایک رائے پر متفق ہو جاتے تو اسی کے مطابق فیصلہ کر دیتے۔ یہی طرزِ عمل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا رہا۔ انہیں جب کتاب اللہ اور سنت رسول میں ناکامی ہوتی تو لوگوں سے دریافت کرتے کہ کیا ابوبکر نے اس معاملے میں کوئی فیصلہ کیا تھا، اگر اس بارے میں حضرت ابوبکر کا کوئی فیصلہ موجود ہوتا تو اسی کے مطابق فیصلہ کر دیتے، ورنہ علماء حضرات کو جمع کر کے ان سے مشورہ لیتے، جب وہ کسی ایک رائے پر اتفاق کر لیتے تو اسی کے مطابق فیصلہ کر دیتے۔ (۴۷)

سیدنا عمر بن خطاب نے قاضی شریح کو جو خط لکھا تھا اس میں فرمایا: ''پس اگر تمہارے پاس کوئی ایسا مقدمہ آئے جس کا حکم نہ کتاب اللہ میں ہو اور نہ سنت رسول ہی میں، تو اس رائے کے مطابق فیصلہ کیجئے جس پر لوگوں کا اجماع ہو۔'' (۴۸)

یہ بات واضح رہنا چاہئے کہ اجماعِ صحابہ کی شکل دورِ جدید کی قانون ساز اسمبلی جیسی نہ تھی، البتہ اس مفہوم اور طریق کار کی حامل ضرور تھی، جیسا کہ بیان ہو چکا ہے، یہی تمام اہم مسائل میں بلند ترین مرجع ومحور تھا۔ اجماعِ صحابہ کا مطلب یہ نہیں تھا کہ سب کسی ایک رائے پر متفق ہوتے تھے اور کوئی مخالفت نہ کرتا تھا، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ پیش آمدہ مسئلے کے حکم پر اکثریت کا اتفاق ہوتا تھا، یہ اجماع کی اس تعریف پر پورا نہیں اترتا جو متأخرین نے کی ہے، اس تعریف کے مطابق اجماع سے مراد ''محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کسی زمانے میں کسی معاملے میں امت محمد کے مجتہدین کا متفق ہونا ہے'' (۴۹) تاریخ اسلام کے خواہ کسی

دور میں ہو۔

جمہور علماء کا مذہب (۵۰) یہ ہے کہ گزشتہ تعریف کے ساتھ اجماع سے مراد عہدِ صحابہ کا اجماع ہے، یعنی اکثریت کا اجماع، جو صرف حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے عہد خلافت میں ہی وقوع پذیر ہوا ہے، ان کے دور خلافت کے بعد مجتہدین دور دراز اسلامی ممالک میں منتشر ہو گئے، لہٰذا اجماع منعقد نہ ہو سکا، بلکہ کسی حکم پر اکثریت کے اتفاق کا موقع ہی نہ رہا۔

مرحوم شیخ محمد حضری اجماع اور اس کے وقوع کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ ''علماء سلف کے دو باہم مختلف و متفرق ادوار ہیں: پہلا دور شیخین ابوبکر و عمر کا ہے جب مدینہ دارالخلافہ تھا اور تمام صحابہ یکجا رہتے تھے اور متحد تھے، ان کے فقہاء مشہور تھے اور ان کا امام و حکمران شوریٰ کے فیصلوں کا پابند تھا جو انہیں نظر انداز کر کے فتویٰ دینے میں آمریت کا مظاہرہ نہیں کرتا تھا۔ اس کے لیے ان سب کی آراء سے آگاہی حاصل کرنا ممکن تھا، اس بناء پر ہم آسانی سے ان کے اجماع کا تصور کر سکتے ہیں، لیکن یہ سوال اپنی جگہ باقی رہے گا کہ کیا انہیں پیش آنے والے اجتہادی مسائل میں سے کسی مسئلے کے بارے میں فتویٰ دینے پر فی الواقع ان کا اجماع بھی ہوا؟ تو زیادہ سے زیادہ یہی حکم لگایا جا سکتا ہے کہ دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں بہت سے ایسے مسائل تھے جن کے بارے میں صحابہ کرام کے درمیان باہمی اختلاف معلوم نہیں ہے، رہا اس بات کے معلوم ہونے کا دعویٰ کہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے متفقہ آراء کے ساتھ فتویٰ دیا اور کوئی ایک بھی مخالف نہ تھا تو یہ ایسا دعویٰ ہے جو تائیدی دلیل و برہان کا محتاج ہے، اس دورِ اول کے بعد، دوسرا وہ دور ہے جس میں اسلامی سلطنت میں وسعت ہوئی، فقہاء دیگر مسلمان علاقوں میں منتقل ہو کر بے شمار تابعین فقہاء کے علمی سرچشموں سے وابستہ ہو گئے۔ سیاسی اور ذاتی معاملات میں مختلف امور پر لڑائی جھگڑوں نے سر اٹھایا، ہم نہیں سمجھتے کہ ان حالات میں وقوع اجماع کا دعویٰ ایسا ہے جسے آسانی سے قبول کیا جا سکتا ہو۔''

اجماعِ صحابہ کے متعلق علماء کی آراء کے متضاد و مختلف ہونے اور بعض کے اس سے انکار کرنے کے

باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ ابو بکر اور عمر کے دور خلافت میں اجماع بالفعل منعقد ہوا۔ اگر چہ صحابہ مجتہدین کی تعداد قلیل تھی، مگر وہ مختلف ممالک اور شہروں میں منتشر نہیں ہوئے تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ سیدنا عمر نے ان کے مدینہ سے چلے جانے پر پابندی لگادی تھی، لہٰذا ان سب کو یا ان میں سے بعض کو مشورہ کے لیے بلانا ممکن اور آسان تھا۔

بہر حال اجماع صحابہ کو ایک مقام وامتیاز حاصل ہے، کیونکہ صحابہ وہ پاکباز ہستیاں ہیں، جنہوں نے نزولِ قرآن کا بچشم خود مشاہدہ کیا اور پیغام الٰہی کو لوگوں تک پہنچایا، یہ وہ مقدس وامین لوگ ہیں جنہوں نے وفات رسول کے بعد علم رسول کو بعد میں آنے والوں تک پہنچا کر حق نیابت رسول ادا کیا، لہٰذا ان کے اجماع کو اور خاص طور پر اس اجماع کو (جو کلیات شریعت اور بعض فرائض، مثلاً نماز اور حج کی عملی شکل سے متعلق تھا) وہ بنیادی مقام حاصل ہے کہ جس پر عمل کرنا اور اس سے باہر نہ نکلنا لازم ہے، علامہ شہرستانی اپنی شہرۂ آفاق کتاب **الملل والنحل** میں رقمطراز ہیں کہ "صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد آنے والوں پر ان کے اجماع واتفاق کی پیروی کرنا لازم ہے، ان کے اجتہادی اسالیب کو اپنانا ضروری ہے، کبھی تو ان کا اجماع کسی مسئلے پر اجتہادی اجماع ہوتا تھا اور کبھی مطلق اجماع ہوتا تھا، جس میں اجتہاد کی تصریح نہیں کی گئی"۔

مذکورہ دونوں صورتوں میں صحابہ کا اجماع ایک شرعی حجت ہے، کیونکہ تمسک بالاجماع پر ان کا اجماع تھا ہمیں معلوم ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم ہی وہ ہدایت یافتہ لوگ ہیں جو کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتے، اس بارے میں فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی موجود ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "**لا تجمع امتی علی الضلالة**" یعنی میری امت کبھی گمراہی پر جمع نہ ہوگی۔ اس بارے میں اسی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ صحابہ کے اجتہادی مصادر وماخذ یہ تھے: کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، اجماع اور رائے اپنے دونوں شعبوں مصلحت وقیاس سمیت۔

اختلافِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے اسباب

صحابہ کرام سب کے سب فقہاء نہیں تھے، اسی طرح احوال واقوال رسول کو جاننے کے لحاظ سے بھی سب کا علمی معیار یکساں نہ تھا، ان میں شہری بھی تھے دیہاتی بھی، تاجر بھی تھے، کاریگر بھی، ایسے بھی تھے جو صرف عبادت کرتے تھے، الگ تھلگ رہتے تھے اور کوئی کام نہ کرتے تھے، مدینہ منورہ میں مستقل رہنے والے بھی، اور اکثر اس سے غائب رہنے والے بھی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعۃ المبارک اور عیدین کے علاوہ شاذ و نادر ہی کوئی ایسی مجلس برپا کرتے تھے، جس میں سارے صحابہ جمع ہوتے ہوں، بلکہ ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا تھا۔ (۵۱)

اس کے باوجود کہ صحابہ کرام سارے فقہاء نہیں تھے، تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مستقل رہنے والے صحابہ کی اکثریت مجتہدین فقہاء کی تھی۔ ان میں سے جو صحابہ کرام فتاویٰ واحکام میں مشہور ہوئے اور انہوں نے حلال وحرام کے بارے میں گفتگو کی، وہ ایک مخصوص جماعت تھی، (۵۲) امام ابن قیم (۵۳) بیان کرتے ہیں کہ اصحاب رسول میں سے جن حضرات کے فتاویٰ محفوظ ہیں، ان کی تعداد ایک سو تیس سے کچھ زائد ہے۔ ان میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں، ان میں سے بعض کثرت سے فتویٰ دینے والے تھے، بعض کم اور بعض متوسط، ان کے نام محفوظ کر لیے گئے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے فتاویٰ کی تعداد بھی محفوظ ہے۔

چونکہ صحابہ کرام سارے کے سارے نہ تو فقہاء تھے اور نہ ہی احوال واقوال رسول کے بارے میں ان کا علمی معیار ایک جیسا تھا اس لیے ان میں جن حضرات نے اجتہاد کیا اور ان کی آراء ہم تک پہنچی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ رائے کو استعمال کرنے کی مقدار کے لحاظ سے ان کے اجتہادی طریقہ ہائے کار ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ بہر حال کتاب اللہ اور سنت مشہورہ (۵۴) پر اعتماد کے سلسلے میں ان سب کا اتفاق تھا، البتہ اگر وہ کسی مسئلے میں کتاب وسنت سے کوئی نص نہ پاتے تو پھر ان میں سے بعض کا طرز عمل توقف اختیار کرنے اور

فتویٰ نہ دینے کا تھا اور بعض رائے استعمال کرنے کی گنجائش سے فائدہ اٹھانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے جو رائے کے کم از کم استعمال کرنے میں مشہور ہوئے اور جن پر روایت کے ظاہری الفاظ پر سختی سے عمل کرنے کا غلبہ تھا، ان میں عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عمرو بن العاص نمایاں ہیں۔ رائے میں وسعت اختیار کرنے اور رائے سے بکثرت کام لینے والوں میں حضرت عمر کا شمار سرِ فہرست ہوتا ہے۔ آپ کے اجتہادی طریق کار کو عراقی اہل رائے کے لیے دائمی حجت کا درجہ دیا جاتا ہے، عراقی اہل رائے سیدنا عبداللہ بن مسعود کی فقہ سے بھی متأثر ہوئے، کیونکہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلوب کے پیروی کرتے تھے، اور آپ رضی اللہ عنہ کے طریق اجتہاد پر عمل پیرا تھے۔ (۵۵)

صحابہ کرام کے باہمی اختلاف کا ایک سبب ان کا رائے استعمال کرنے میں باہمی فرق ہے، اسی طرح رائے پر اعتماد کرنا بھی اس اختلاف کا ایک سبب ہے، کیونکہ رائے ایک وسیع اور کشادہ باب ہے، ہر مجتہد کا اپنا نظریہ اور انداز فکر ہے، جس چیز کو ایک درست سمجھتا ہے وہی چیز دوسرے کی رائے میں غلط ہوتی ہے۔ (۵۶)

یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بہت سے احکام میں باہم تنازعہ کیا (۵۷) اور بعض معاملات میں ان کے درمیان بحث مباحثے اور باہمی جھگڑے رونما ہوئے تھے، (۵۸) لیکن ان کے اختلاف کے عمومی اسباب کا دار و مدار ان کے علم وفہم، نصوصِ شریعت اور ان کے مقاصد کا احاطہ کرنے میں ان کی صلاحیتوں کے مختلف ہونے، نیز ادراک قوتِ مشاہدہ کے مختلف ہونے پر ہے۔ (۵۹)

تاریخی فقہی کتب (۶۰) نے صحابہ کرام کے باہمی اختلاف اور اس کے اسباب پر گفتگو کی ہے، ان میں سے بعض فقہاء نے اس اختلاف کو سات اسباب تک محدود قرار دیا ہے، (۶۱) مگر ان سارے کے سارے اسباب کا مرکزی نقطہ یہی ہے کہ نصوص شریعت کے فہم وصلاحیتِ اخذ، خاص طور پر سنت نبویہ کے فہم واکتساب میں ان کی صلاحیتیں باہم مختلف اور کم وبیش تھیں، اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس دور میں کوئی مجموعۂ کتب نہیں تھا، جس کی طرف وہ رجوع کرتے، نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا علمی معیار یکساں تھا، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے

روایت کردہ سنت رسول ﷺ کو قبول کرنے میں انتہائی احتیاط اور دیدہ ریزی سے کام لیا۔ بعض صحابہ تو راوی سے روایت کی صحت پر حلف لیتے تھے، یا اس کے ساتھ ایک دوسرے راوی کو پیش کرنے کا مطالبہ کرتے تھے۔(٦٢)

دور صحابہ رضی اللہ عنہم میں فقہ کا مزاج

اس کے باوجود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اختلاف کچھ زیادہ معاملات کے بارے میں نہ تھا،(٦٣) جیسا کہ دور صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد فقہاء کے درمیان رونما ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فقہ دور رسالت کی طرح دور صحابہ رضی اللہ عنہم میں بھی واقعی اور عملی رہا، جس میں مسائل کے واقع ہونے کے بعد ان کا حل تلاش کیا جاتا تھا۔(٦٤) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرضی مسائل اور ان کے بارے میں جواب دینے کو ناپسند کرتے تھے اور اسے دین میں بلاوجہ دخل دینے کے مترادف سمجھتے تھے۔(٦٥) حضرت زید رضی اللہ عنہ بن ثابت کے بارے میں منقول ہے کہ ان سے کسی مسئلے کہ متعلق فتویٰ دریافت کیا جاتا، تو وہ اگر مسئلہ عملاً پیش آچکا ہوتا، تو فتویٰ دے دیتے، ورنہ فرماتے: ''اسے چھوڑ و یہاں تک کہ یہ واقع ہو جائے''۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر کھڑے ہو کر ایسے شخص پر لعنت کرتے تھے جو ایسے مسئلے کے بارے میں سوال کرتا جو ابھی پیش نہ آیا ہوتا۔(٦٦) یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجتہاد صرف پیش آمدہ معاملات تک محدود ہے۔ بلاشبہ یہ نئے پیش آمدہ معاملات فتوحات اور بہت سی اقوام کے اسلام میں داخل ہونے کے سبب دور رسالت سے کہیں زیادہ ہیں۔

جس طرح دور رسالت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں فقہ عملی اور واقعی رہا، اسی طرح دور صحابہ رضی اللہ عنہم میں واقعی اور عملی رہا۔ اس دور میں یہ سینوں میں محفوظ رہا جسے اس وقت تک مدون نہیں کیا گیا تھا،(٦٧) نیز یہ انسانی مسائل کے لیے زندہ شکل میں موجود رہا، کیونکہ فقہاء معاشرے اور اس کے مختلف معاملات سے الگ تھلگ اور کٹے ہوئے لوگ نہ تھے، اس پر مستزاد یہ ہے کہ خلفاء سیاست فقہاء کی آراء کی آئینہ دار تھی۔

لیکن دور صحابہ رضی اللہ عنہم کی فقہ کو ایک منفرد اور نمایاں مقام حاصل ہے، جیسا کہ ابھی گزشتہ بحث سے واضح ہوا ہے، اور اس کی وجہ اجماع کا واقع ہونا، شوریٰ کے ادارے کا موجود ہونا اور گروہی و مذہبی فرقہ بندی کا نہ ہونا ہے۔(۶۸) چونکہ فقہاء صحابہ رضی اللہ عنہم مختلف شہروں اور ممالک میں منتشر نہیں ہوئے تھے، خاص طور پر ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں، لہٰذا ان کو باہمی مشورہ کی غرض سے بلانا ممکن اور آسان تھا، نیز دور صحابہ رضی اللہ عنہم کی فقہ اس بناء پر بھی ممتاز ہے کہ وہ ان اجتہادی آراء سے مالا مال تھی، جنہیں پیش کرنے والے طبعاً تعمیر و ترقی اور دعوت اسلام کی اشاعت کی طرف رجحان رکھتے تھے ان آراء یا اقوال کو تاریخ فقہ میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ مجتہدین کے اختلافات میں ان کا عمل دخل ہے۔ بعض فقہاء نے تو ان کو ایسی حجت قرار دیا ہے جس کا اتباع لازم ہے اور اجتہاد انہی آراء کے دائرے میں ہوگا۔ اس کے باوجود کہ فقہاء کا ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا قول لے کر دوسرے کا قول چھوڑ دینے میں اختلاف ہے، بعض نے سختی سے یہ کہا ہے کہ اقوال صحابہ رضی اللہ عنہ حجت نہیں ہیں، اور نہ ہی ان پر عمل واجب ہے اور نہ ہی ان کی عدم مخالفت لازم ہے۔(۶۹)

خلافت عثمان رضی اللہ عنہ میں ممالک اسلامیہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم کا پھیل جانا

جب سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں فتوحات کا دائرہ زیادہ وسیع ہوگیا، تو انہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اطراف عالم میں رہائش پذیر ہونے اور پھیل جانے کی کھلی اجازت دے دی۔(۷۰) بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جن کا فقہ و اجتہاد میں مقام مسلم تھا، وہ زمانہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اسی طرح زمانہ خلافت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ میں لوگوں کی تعلیم کی غرض سے مدینہ سے جزیرہ عرب کے مختلف شہروں کی جانب کوچ کر گئے، ان کے علاوہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان شہروں کی طرف بھی مراجعت کی، جنہیں مسلمانوں نے آباد یا فتح کیا تھا، لیکن ان کی تعداد کم تھی، اور ان کا وہاں سے نکلنا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے تھا۔ یہ لوگ مبلغین تھے جو لوگوں کو دین سمجھاتے یا گورنر

تھے جو ان کے درمیان فیصلے کرتے تھے۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ بن جبل کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو ان سے فرمایا: ''اگر تمہارے سامنے کوئی مقدمہ پیش ہو تو کیسے فیصلہ کرو گے؟ انہوں نے عرض کیا۔ کتاب اللہ کے مطابق کروں گا،۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر کتاب اللہ میں اس کا حکم موجود نہ ہو تو؟ عرض کیا پھر سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ آپ نے فرمایا اگر سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی اس کا حل موجود نہ ہو تو؟ عرض کیا، میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں کوئی کوتاہی نہیں کروں گا،، (۷۱)

حضرت عمر نے جب حضرت عبداللہ بن مسعود کو کوفہ روانہ کیا، تو اہل کوفہ کو لکھا کہ میں نے عبداللہ رضی اللہ عنہ بن مسعود کو معلم اور وزیر کی حیثیت سے تمہاری طرف روانہ کر دیا اور میں نے اپنی ذات پر تمہیں ترجیح دی ہے۔ لہٰذا ان سے فیض حاصل کرو۔ (۷۲)

اس میں کوئی شک نہیں کہ جن صحابہ رضی اللہ عنہ کو تعلیم دینے کی غرض سے مختلف علاقوں میں بھیجا گیا، (۷۳) انہوں نے ہر اس مقام پر ایک علمی تحریک برپا کر دی جہاں ان کو بھیجا گیا تھا، مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں صحابہ کے بکھر جانے کا مقصد مفتوحہ علاقوں میں ان کا رہائش پذیر ہونا نیز سرحدوں کی حفاظت کرنا تھا۔ تعلیم وتہذیب اس علمی تحریک کے نتیجہ میں پروان چڑھی، (۷۴) کیونکہ یہ نئے علاقے دین اسلام کی تعلیمات کے سخت پیاسے تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی اولین حاملین اسلام تھے جو اس پر ایمان لائے تھے اور اس کی راہ میں جہاد کیا تھا۔ وہی دوسرے کے مقابلے میں اس کے احکام وتعلیمات کو بہتر جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر علاقے کے باشندے اپنے ہاں تشریف لانے والے صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف متوجہ ہوئے، وہ ان سے فتاویٰ پوچھتے، ان سے روایت کرتے اور ان سے علم حاصل کرتے تھے، ان صحابہ کرام کی سرپرستی میں علوم سے بہرہ مند ہو کر ان کے شاگرد نکلتے (۷۵) اور تابعین کے نام سے سرفراز کئے جاتے تھے، کیونکہ قرآن نے انہیں یہی نام دیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے کہ وہ مہاجر وانصار جنہوں نے سب سے پہلے دعوت ایمان پر لبیک کہنے میں سبقت کی، نیز وہ جو بعد میں راست بازی کے ساتھ ان کے پیچھے آئے، یہ ایک

نا قابل انکار حقیقت ہے کہ تمام صحابہ کا علمی پایہ ایک جیسا نہ تھا، نہ ایسا ہی تھا کہ جو کچھ ایک کو یاد تھا تو وہ دوسرے کو بھی یاد ہوتا، رائے کو استعمال کرنے کے لحاظ سے بھی وہ یکساں حیثیت کے حامل نہ تھے، یہ چیز اہلِ عراق اور اہلِ حجاز وغیرہ کے ہاں تعدد روایات اور اختلاف کے اہم اسباب کی وضاحت کر دیتی ہے کہ ہر علاقے کے باشندوں نے اپنے اپنے علاقے کے علماء کے فتاویٰ پر سختی سے عمل کیا۔ جس پر ان کے علماء کا عمل تھا، اسی کو دلیل بنایا اور اسی کے مطابق ان کے قضاۃ نے فیصلے کئے۔ (۷۶)

حجوی رقمطراز ہیں کہ جب صحابہ و تابعین کے اقوال میں اختلاف ہو تو ہر عالم کے ہاں اس کے شہر والوں اور اس کے اساتذہ کا مذہب ہی قابل ترجیح ہوتا ہے، کیونکہ وہ ان کے صحیح اور کمزور اقوال سے خوب واقف ہوتا ہے، اس کا دل ان کے فضل و کمال علمی کی طرف زیادہ مائل ہوتا ہے اور ان کے اصول اسے زیادہ یاد ہوتے ہیں۔ (۷۷)

ابن مسیّب اور ان کے اصحاب کے بارے میں مروی ہے کہ حرمین شریفین (مکہ و مدینہ) کے باشندے حدیث و فقہ میں تمام لوگوں سے زیادہ پختہ اور راسخ ہیں، جبکہ ابراہیم نخعی اور ان کے اصحاب کا خیال تھا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود فقہ میں سے زیادہ پختہ اور ماہر ہیں، کیونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:
تمسکوا بعهد ابن ام عبد　تم لوگ ابن ام عبد یعنی عبداللہ بن مسعود کے زمانے کو مضبوطی سے تھام لو۔ (۷۸)

عامۃ الناس کا اپنے درمیان رہائش پذیر صحابہ رضی اللہ عنہم پر اعتماد

ہر علاقے کے باشندے ہمیشہ انہی صحابہ کے اقوال پر اعتماد کر کے عمل کرتے رہے جو ان کے ہاں پہنچے تھے، حضرت عبداللہ بن مسعود جب کوفہ (۷۹) روانہ ہوئے اور وہاں قیام کیا تو اہل کوفہ نے آپ کی اور آپ کے اصحاب کی رائے پر اعتماد کرتے ہوئے اسے اختیار کر لیا۔ حضرت ابن مسعود ان کے نزدیک فقہ میں سے زیادہ پختہ اور ماہر تھے، جیسا کہ علقمہ نے مسروق سے فرمایا تھا: ''کیا ان میں سے کوئی عبداللہ بن مسعود سے

زیادہ پختہ اور قابل اعتماد فقیہ ہے''۔

حقیقت یہ ہے کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود عراق کے شیخ الشیوخ تھے۔کوفے کے مدرسۂ رائے کے بانی تھے۔آپ رضی اللہ عنہ قریش کے ایک نادار چھوٹے خاندان سے نسبت رکھتے تھے،آپ رضی اللہ عنہ کے والد کا نام مسعود بن غافل ہذلی تھا جو عبداللہ بن حارث بن زہرۃ کے حلیف تھے۔آپ رضی اللہ عنہ کی والدہ ماجدہ ام عبد بنت عبدود بن سواد بھی قبیلہ ہزیل سے تعلق رکھتی تھیں۔بعض اوقات حضرت عبداللہ کو ان کی ماں کی طرف منسوب کرتے ہوئے، ابن ام عبد کہہ دیا جاتا تھا۔آپ رضی اللہ عنہ اسلام قبول کرنے والے ابتدائی لوگوں میں سے تھے۔(۸۰) آپ کے بارے میں یہ روایت بھی ملتی ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ اسلام قبول کرنے والے چھٹے آدمی تھے۔آپ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: میں نے اپنے آپ کو اسلام قبول کرنے والوں میں چھٹا آدمی پایا، جب ہمارے علاوہ روئے زمین پر کوئی مسلمان نہ تھا''۔آپ رضی اللہ عنہ پہلے مسلمان ہیں جنہوں نے بلند آواز سے قرآن کریم پڑھ کر قریش مکہ کو سنایا۔آپ نے دو بار ہجرت کی اور تمام مناظر کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کیا۔(۸۱) آپ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم کی حیثیت سے مستقلاً آپ کے ساتھ رہے، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنے گھر میں آنے کی خصوصی اجازت دے رکھی تھی، جو کسی اور کو حاصل نہ تھی۔آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ زیادہ رہنے کی وجہ سے ابن مسعود کو آنجناب کے گھر کا فرد تصور کیا جاتا تھا،(۸۲) اسی خاص قربتِ رسول کی بناء پر وہ دوسروں سے علم میں سبقت لے گئے اور ان علوم و احکام سے آگاہی حاصل کی جو دوسروں کو حاصل نہ تھے، حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ بن عمرو کا آپ کے بارے میں یہ تبصرہ ہے کہ میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ قرآن کا عبداللہ بن مسعود سے بڑا کوئی عالم نہیں دیکھا، حضرت ابوموسیٰ فرماتے ہیں کہ کہ کیا ان کا یہی اعزاز کچھ کم ہے کہ جب ہم آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ نہ سن سکتے تھے تو ابن مسعود سنتے تھے اور جب آنحضور ﷺ کے پاس ہمیں جانے کی اجازت نہ ہوتی تھی تو ان کو اجازت ہوتی تھی۔(۸۳)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ جب انہوں نے اہل کوفہ سے عبداللہ بن مسعود کے بارے میں دریافت کیا اور اہل کوفہ نے ان کی تعریف کی اور ان پر پسندیدگی کا اظہار کیا، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں بھی ان کے بارے میں وہی کہتا ہوں جو کچھ اہل کوفہ نے کہا ہے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر کہتا ہوں۔ یہ وہ شخصیت ہیں جنہوں نے قرآن پڑھا، اس کے حلال کو حلال اور اس کے حرام کو حرام قرار دیا۔ آپ رضی اللہ عنہ دین کے فقیہ اور سنت کے عالم ہیں۔(۸۴)

حضرت علی کا ابن مسعود کے بارے میں یہ بیان ان کی زندگی کے ایک اہم پہلو کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ آپ کاتبین وحی میں سے تھے۔ صحابہ میں سب سے زیادہ آپ رضی اللہ عنہ نزول آیات کے اسباب کو جانتے تھے، کیونکہ آپ معیت رسول میں بہت زیادہ رہتے تھے، مسروق نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: "اللہ کی قسم! جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے، کتاب اللہ میں کوئی ایسی سورت نہیں جس کے نزول کی جگہ کو میں سب سے زیادہ نہ جانتا ہوں، اور کوئی آیت نہیں، مگر میں جانتا ہوں کہ وہ کس بارے میں نازل ہوئی، اگر مجھے معلوم ہو کہ کوئی مجھ سے بھی زیادہ کتاب اللہ کا عالم ہے اور سواری کے ذریعے اس کے پاس پہنچا جا سکتا ہے تو میں ضرور سوار ہو کر اس کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔(۸۵) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے قرآن بیان کرنے پر اعتماد کا اظہار کیا اور لوگوں کو ان سے علم حاصل کرنے اور قرآن سیکھنے کی ترغیب دلائی۔ مسروق ہی سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ہم عبداللہ بن عمرو کے پاس حاضر تھے تو ہم نے حضرت عبداللہ بن مسعود کے حوالے سے ایک حدیث بیان کی۔ انہوں نے فرمایا کہ عبداللہ بن مسعود وہ شخصیت ہیں جنہیں میں اس وقت سے ہر ایک سے زیادہ محبوب رکھتا ہوں، جب سے ان کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے میں نے ایک بات سنی ہے۔ میں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے بارے میں فرماتے ہوئے سنا ہے۔ آپ فرما رہے تھے: اقرأوا القرآن من أربعة نفر: من ابن أم عبد فبدأ به، ومن أبي بن كعب، ومن سالم مولى أبي حذيفة، ومن معاذ بن جبل (۸۶) تم چار افراد سے قرآن پڑھو۔

عبداللہ بن مسعود سے، سب سے پہلے آپ ﷺ نے انہی کا نام لیا، اُبی بن کعب سے، سالم بن ابی حذیفہ سے اور معاذ بن جبل سے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے قرآن سننا پسند فرماتے تھے۔ آپ ﷺ ان کے بارے میں فرماتے کہ یہ قرآن کو ایسے ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے ہیں جیسے یہ نازل ہوا ہے، (۸۷) ابن مسعود کو ہمیشہ رسول اللہ ﷺ کے ہاں ایک با اثر و باوقار مقام حاصل رہا، آپ رضی اللہ عنہ سب سے زیادہ آں حضرت ﷺ کے دل کے قریب تھے، یہاں تک کہ آپ اپنے رب کے جوار رحمت میں چلے گئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں فرمایا تھا: **لو کنت مؤمرا احدا دون شوری المسلمین لامرت ابن ام عبد** ۔(۸۸) اگر میں مسلمانوں کی شوریٰ کے مشورے کے بغیر کسی کو امیر بناتا تو عبداللہ بن مسعود ہی کو امیر بناتا۔ بلاشبہ حضرت عبداللہ بن مسعود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں چوٹی کے علماء میں سے تھے۔ بلند مرتبے پر فائز تھے، علم قرآن وسنت آپ پر بس تھا اور علم کے لحاظ سے آپ آخری سند تھے۔

کوفے میں ابن مسعود کا قیام اور ان کا کارنامہ

حضرت عبداللہ بن مسعود کی شخصیت کا یہ ایک پہلو ہے جس کی بناء پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے سلسلے میں اہل کوفہ کو اپنی ذات پر ترجیح دی تھی، ۔ان کو اہل کوفہ کا معلم اور مرشد بنا کر بھیجا تھا، وہاں آپ کا قیام خیر وبرکت کا باعث بنا۔ کوفہ شہر میں آپ کے علمی حلقے اس کی تاریخ میں فتح مبین کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہ اس فقہی مدرسے (school of thought) کا عمدہ پاکیزہ آغاز تھا، جو آپ کی طرف منسوب ہے، اس عظیم فقہی درس گاہ کا ہماری تاریخ دستور وقانون میں ایک نمایاں اور اہم کردار ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود کا طریقِ کار یا آپ کا فقہی اسلوب تقریباً، بالکل وہی تھا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن خطاب کا اسلوب وانداز تھا، ابن مسعود رضی اللہ عنہ حدیث کم بیان کرتے تھے، جس کا سبب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آپ کو وصیت تھی، نیز یہ اندیشہ تھا کہ کہیں رسول اللہ کی طرف کوئی ایسی بات منسوب نہ کر دیں

جو آپ نے نہ فرمائی ہو۔ مسروق سے روایت ہے، انہوں نے کہا کہ ایک دن حضرت عبداللہ مسعود نے ایک حدیث بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے'' یہ کہتے ہی آپ پر کپکپی طاری ہوگئی، آپ کا پورا جسم کانپنے لگا، پھر فرمایا: ''اور ایسی بات یا اس جیسی بات آنحضرت رضی اللہ عنہ سے میں نے سنی'' (۸۹) ابن مسعود مصلحت عامہ کی رعایت رکھتے تھے اور اسی چیز کا لحاظ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے اجتہاد میں رکھتے تھے، تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مقلد تھے، اس کے باوجود کہ منہج اور طریق کار میں وہ حضرت عمر کے مشابہ تھے، مگر بہت سے مسائل میں انہوں نے حضرت عمر سے اختلاف کیا ہے ابن قیم فرماتے ہیں کہ ابن مسعود کا حضرت عمر سے اختلاف ان سے موافقت کے مقابلے میں زیادہ مشہور ہے۔ دراصل وہ ان کی موافقت اسی طرح کرتے تھے جس طرح ایک عالم دوسرے عالم کی کرتا ہے، (۹۰) پھر ابن قیم نے اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ ابن مسعود نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے صرف چار مسائل میں موافقت کی ہے، جبکہ کم وبیش ایک سو مسائل میں ان سے اختلاف کیا ہے، (۹۱) خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابن مسعود کے علم کی شہادت دی ہے، (۹۲) وہ کبھی کبھی عبداللہ بن مسعود سے فتویٰ بھی حاصل کرتے تھے، (۹۳) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کے بارے میں اہل کوفہ کو تحریر لکھی تھی وہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ حضرت عمر نے آپ کا جو تقرر کیا تھا وہ اس بات کی تاکید تھی کہ ان دونوں حضرات کے اسلوب واندازِ فکر میں باہمی مشابہت کو اتباع یا تقلید خیال نہ کیا جائے اور یہ کہ ان دونوں میں سے ہر ایک اپنی جگہ ایک فقیہ اور مجتہد تھا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود کوفے کے سنِ تاسیس سے لے کر خلافت عثمان کے اواخر تک وہاں قیام پذیر رہے، اہل کوفہ کو تعلیم قرآن سے آراستہ کرتے تھے، ان کو دینی سمجھ بوجھ اور فقہ کی تعلیم دیتے رہے اور ان کے سوالات پر فتاویٰ دیتے رہے، اس سلسلے میں انہوں نے اتنا اہتمام کیا اور انتہائی توجہ دی کہ اس سے زیادہ کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، چنانچہ آپ کی مساعی جمیل سے کوفہ قراء اور فقہاء سے بھر گیا، یہاں تک کہ جب حضرت

علی کوفہ منتقل ہوئے تو وہاں فقہاء کی کثرت سے بہت خوش ہوئے اور فرمایا ''اللہ ابن ام عبد (ابن مسعود) پر رحم فرمائے، انہوں نے تو اس شہر میں یعنی کوفے کو علم سے بھر دیا ہے''۔(۹۴)

سیدنا علی نے کوفے میں رہائش اختیار کی اور اپنی مدت خلافت میں اسے دار الخلافہ اور صدر مقام بنائے رکھا، جہاں نص موجود نہ ہوتی، وہاں اپنی رائے سے اجتہاد کرتے رہے،(۹۵) لیکن اپنی سیاسی مصروفیات اور اپنے زمانۂ خلافت کی مختلف مشکلات کے سبب فقہی لحاظ سے کوفے میں آپ کو وہ مؤثر فقہی مقام حاصل نہ ہوا، جو ابن مسعود کو حاصل ہوا تھا، اسی طرح جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہ نے کوفے کو اپنا وطن بنایا تھا ان کی تعداد تقریباً ڈیڑھ ہزار تھی، ان میں ستر کے قریب بدری صحابہ تھے،(۹۶) ان صحابہ کا بھی اس شہر کی علمی تحریک کی ترقی میں کردار تھا، مگر عبداللہ بن مسعود نے عمومی طور پر اپنے فقہی اندازِ فکر کی گہری چھاپ لگا دی تھی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود کے یا آپ کی درس گاہ کے چھ شاگردوں نے شہرت پائی، جو قرآن کی تعلیم دیتے تھے، لوگوں کو فتوے دیتے تھے اور کوفے میں عبداللہ بن مسعود کی فقہ کو عام کرتے تھے، روایات میں ان میں سے تین تلامذہ پر متفق ہیں، بلکہ بعض اوقات حدِ اجماع کو پہنچ جاتی ہیں۔ ان تلامذہ کے اسماء گرامی یہ ہیں، علقمہ بن قیس نخعی، مسروق بن اجدع ہمدانی، قاضی شریح، باقی جن تین کے بارے میں روایات قابل ترجیح ہیں، ان کے نام یہ ہیں: اسود بن یزید بن قیس نخعی جو علقمہ کے بھتیجے تھے، شعبی یعنی ابو عمرو کوفی، تیسرے کا نام بعض عبیدہ بن عمرو سلمانی یا حارث اعور یا عمرو بن شرحبیل ہمدانی بتاتے تھے۔

جہاں تک ابراہیم نخعی کا تعلق ہے تو یہ عبداللہ بن مسعود کے وہ نامور شاگرد ہیں جنہیں کوفہ کا امام اور فقیہ سمجھا جاتا تھا، مذکورہ بالا چھ میں انہیں شمار نہیں کیا جاتا، کیونکہ انہیں مدرسۂ کوفہ میں ایک خاص مقام اور بہت اثر ورسوخ حاصل تھا، تھوڑا سا آگے چل کر ان کے بارے میں قدرے تفصیل سے گفتگو کی جائے گی۔

بعض مؤرخین کی روایت کے مطابق حضرت عبداللہ بن مسعود کے شاگردوں کی تعداد پانچ ہے، جیسا

کہ حماد سے منقول ہے، جب حماد سے عبداللہ بن مسعود کے شاگردوں کے بارے میں سوال کیا گیا تھا تو انہوں نے پانچ شاگردوں کا تذکرہ کیا، ابن سیرین سے ان کی تعداد چار منقول ہے۔ ان مشہور اصحاب کی تعداد اور ان کے ناموں کے بارے میں مؤرخین کے درمیان خواہ کتنا ہی اختلاف ہو، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ کوفے میں ابن مسعود کے ایسے جانشین تھے، جو ان کی آراء کا دفاع کرتے تھے، اور ان کے طریقِ فقہ پر چلتے تھے، فتاویٰ دینے سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ اگر انہیں کسی مسئلے میں قرآن وسنت کی نص نہ ملتی تو اپنی عقل سے کام لیتے تھے، درس کے متعدد حلقے قائم تھے، مساجد طلباء سے بھری رہتی تھیں، علمی سرگرمیوں میں اس بات نے مزید اضافہ کیا کہ جن صحابہ نے کوفے کو وطن بنالیا تھا، انہوں نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے علاوہ علی بن ابی طالب، عبداللہ بن عباس، معاذ بن جبل اور دیگر اصحاب علم وفضل سے کسبِ فیض کیا، چنانچہ اس شہر میں علمی تحریک کی ترقی اور نشوونما پانے کا یہ ایک اہم عامل تھا، اس کے ساتھ ساتھ نئے سیاسی واقعات اور ان کے نتیجے میں مسلمانوں کے درمیان رونما ہونے والے اختلاف اور گروہ بندی جیسے اسباب نے عراق کے تاریخی واجتماعی حالات سے قطع نظر، کوفے کی اس درس گاہ کو ترقی دی اور اس پر رائے کا غلبہ کردیا، اسی طرح ان حالات نے اس علمی تحریک کو نشوونما اور اسے کمال تک پہنچایا اور علمائے کوفہ کی بہت بڑی تعداد کو فقہی اور دیگر تحقیقات کے میدان میں شہرت کے مقام تک پہنچایا۔

عراق کی ثقافتی میراث

عراق ایک ایسا ملک ہے جس کی تاریخ عمدہ اور شاندار تہذیب وثقافت کی حامل ہے، اس خطے میں تین ہزار سال قبل مسیح سے متعدد متمدن قومیں یکے بعد دیگرے رہتی چلی آئی ہیں، چنانچہ بابلی، اشوری، کلدانی، ایرانی، یونانی تہذیبوں نے یہاں نشوونما پائی، ان کے رنگ مختلف تھے، مگر ان کی تہذیب مینارۂ نور تھی جو اپنے اردگرد کے خطوں میں اپنی کرنیں بکھیرتی رہی۔ (۹۷)

فتوحاتِ اسلامی سے قبل عراق، ایرانی سلطنت کی حدود میں شامل تھا، ایرانیوں کے مختلف مذاہب تھے

اور بت پرستی ان سب کا مرکز ومحور تھی۔ان کے اہم مذاہب زردشتیت ، مانویت اور مزدکیت تھے۔(۹۸) اہل عرب اسلام سے قبل عراق سے متعارف تھے، کیونکہ زمانۂ جاہلیت میں یہاں بنو بکر اور ربیعہ کے قبائل آ چکے تھے۔پھر انہوں نے یہاں ایک حکومت قائم کی۔یہ حیرہ میں مناذرہ کی حکومت تھی جو اہل ایران کے بادشاہ شاہ پور اول کے عہد میں ۲۴۰ء میں قائم ہوئی۔اس حکومت میں جو ایرانیوں کے ماتحت تھی،نصرانیت کو فروغ حاصل ہوا۔اسی طرح یونانی فلسفے کو بھی فروغ ملا۔ ہرمز اول کے عہد میں ایرانی حکومت نے یہاں نو آبادیات قائم کیں،جنہیں رومی جنگوں کے قیدیوں نے آباد کیا۔ان لوگوں میں ایسے افراد بھی تھے جو یونانی ثقافت کے دلدادہ تھے۔ان میں ایسے بھی تھے جو اہل ایران پر انجینئرنگ اور طب میں فوقیت رکھتے تھے، چنانچہ ان لوگوں سے ایرانیوں نے اپنے اہم کاموں میں خدمات لیں۔ان میں سے کچھ لوگ حیرہ میں قیام پذیر ہوئے۔بعض کا خیال تھا کہ یہی نصرانیت کا سرچشمہ تھے۔بہر حال حیرہ میں نصرانیت کے علمبردار اور اس کے داعی موجود تھے۔(۹۹)

عراق میں اسلام کے تعارف کے بعد بھی ان دینی مذاہب اور ان مختلف تہذیبوں نے عراق کی ثقافتی اور فکری تاریخ میں بہت بڑا کردار ادا کیا ہے۔عراق میں جن لوگوں نے اسلام قبول کیا، ان کی اکثریت نسل در نسل اپنے موروثی عقائد سے دستبردار نہ ہوئی، البتہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنی آراء کو اسلامی رنگ میں رنگ دیا۔قطع نظر اس سے کہ اپنی قدیم تہذیب اور علمی میراث کو واپس لانے کی خواہش ان میں موجود تھی یا نہیں، یہ وہ چیز ہے جو بعض مسلمانوں کو ان لوگوں کی گرفت کرنے اور ان کی آراء کو رد کرنے پر مجبور کرتی ہے۔(۱۰۰) اس کا نتیجہ فکری انتشار اور تہذیبی زوال کی صورت میں نکلا۔اسی کی علامات میں سے وہ علمی بحث ومباحثہ ہے جو منطق و برہان کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ اسلام کی آمد کے بعد اہل عراق بھرپور طریقے سے تحصیل علم میں مشغول ہو گئے، یہاں تک کہ وہ اسلامی ثقافت کے محافظ بن گئے۔ایک دولت مند خطے کے لحاظ سے وہاں بھرپور زندگی تھی،

لوگ تحصیل علم کے لیے وقت نکال لیتے تھے، ایک اور لحاظ سے وہ اس بات کا ادراک رکھتے تھے کہ اہل عرب سیادت اور حکمرانی کے حامل ہیں، لہٰذا انہوں نے دینی اور دنیاوی دونوں علوم کے حصول میں سخت محنت کی، یہاں تک کہ وہ اہل عرب کی برابری کرنے لگے اور ان میں بلند فکر دانشور اور علماء اسلام پیدا ہوئے۔(۱۰۱)

سیدنا عثمان کی شہادت کے بعد جب امت مسلمہ انتشار کا شکار ہوگئی، اور اس کے فرزند آپس میں لڑنے لگے تو اس وقت عراق ممالک اسلامیہ کی جنگوں اور فتنوں کا سب سے بڑا میدان تھا۔(۱۰۲) اسی طرح یہ ان خون ریز واقعات کے متعلق فکری جنگ وجدل کا اکھاڑا بھی تھا۔ اسی جنگ وجدل کے نتیجے میں مختلف فرقوں نے جنم لیا اور اسی چیز نے دینی وفکری معاملات کو ابھارا۔

جب مسلمان گروہوں اور فرقوں میں بٹ گئے تو یہیں سے دشمنان اسلام کو در آنے کا موقع ملا۔ مسلمانوں کے افتراق سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے اپنا زہر اگلا اور اپنے باطل عقائد ونظریات کا پرچار کیا۔ وہ گروہ بندی کو ہوا دینا چاہتے تھے اور ارکانِ دین کو متزلزل کرنا چاہتے تھے، جنہوں نے ان کی حکمرانی کا خاتمہ کر کے عربوں کو ان پر حاکم بنا دیا تھا۔

وہ رسول ﷺ کی طرف ایسی باتیں منسوب کرتے تھے جو آپ ﷺ نے نہیں فرمائی تھیں۔ بعض گروہوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے انہوں نے خوب جھوٹ بولا اور حدیثیں گھڑیں تا کہ اپنے ناپاک عزائم اور دیرینہ آرزوئیں پوری کر سکیں۔(۱۰۳) اسی بناء پر فقہاء عراق نے حدیث قبول کرنے میں احتیاط سے کام لیا۔ روایت کے سلسلے میں سختی سے کام لیا، اس سے قبل وہ صرف انہی احادیث پر اکتفاء کرتے تھے جو انہیں عراق میں آنے والے صحابہ رضی اللہ عنہم سے ملتی تھیں۔ یہ لوگ قلت روایت کے سلسلے میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے متاثر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل عراق کو پہلی صدی میں حدیث کا وہ حصہ نصیب نہ ہوا جو اہل حجاز کو حاصل ہوا۔ اس کے علاوہ عراقی معاشرہ ان مسائل وحوادث کی آماجگاہ تھا جو آئے روز پیش آتے تھے، لہٰذا فقہاء کی ذمہ داری تھی کہ وہ نئے پیش آمدہ مسائل کے احکام بیان کرنے کے لیے اجتہاد کریں۔

نصوص ہمیشہ وقوع پذیر ہونے والے سب ہی مسائل کا احاطہ نہیں کرتیں، اہل عراق کی سنت کی پونجی ہمیشہ قلت کا شکار ہی رہی۔ اس کا سبب وہ حالات تھے جن کی طرف ابھی اشارہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح عراقی فقہاء قانون سازی کے مرکز مدینہ سے بھی دور تھے، لہٰذا ان کے اجتہاد میں رائے کا رنگ غالب آ گیا اور وہ بحث ومباحثہ، منطق، قیاس اور تخریج کے جوہر میں ممتاز اور نمایاں ہو گئے، کیونکہ عراق قدیم ثقافتوں اور پرانی تہذیبوں کا مرکز تھا۔ اس میں فتوحات کے بعد مختلف عقلی صلاحیتوں کے حامل لوگوں کا امتزاج ہوا۔ ان خون ریز واقعات کے بارے میں علمی حلقے برپا ہوئے اور عراق ان کا مرکز بنا۔ ان سب چیزوں نے اس بات میں مدد دی کہ عراق بلادِ اسلامیہ میں علمی و ادبی سرمائے کے لحاظ سے سب سے آگے ہو، اور اس کے علماء وفقہاء دوسروں کے مقابلے میں سب سے زیادہ آزادی رائے کے حامل ہوں، علمی بحث ومباحثہ میں مشغول ہوں اور قیاس ومنطق میں نمایاں ہوں، لیکن یہ بات کبھی نہیں بھولنا چاہئے کہ فقہی تحقیقات کے میدان میں اہل رائے کی سرگرمی میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی شخصیت کا بڑا کردار ہے، وہ اہلِ عراق کے معلم اول ہیں جو رائے کو وہاں استعمال میں لاتے تھے جہاں نص موجود نہ ہوتی تھی، ان تمام عوامل نے اس بیج سے غذا حاصل کی، جسے ابن مسعود نے عمدہ اور زرخیز زمین میں بویا تھا، لہٰذا وہ پروان چڑھا اور پھیل گیا، مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اس کی نمو اور بلند قامتی میں اضافہ ہوتا چلا گیا، حتیٰ کہ دوسری صدی ہجری میں وہ ایسا پھیلا ہوا وسیع درخت بن گیا، جس کی شاخیں ایک دوسرے میں پیوست تھیں۔

فقہائے کوفہ کی رائے میں توسع کے اسباب

عراق یا کوفے نے رائے کے استعمال میں توسع کی خاص وجہ سے ایک ممتاز اور نمایاں مقام حاصل کر لیا تھا، جس کے مقابلے میں حجاز یا مدینہ کی ایک تیز لہر تھی، جو نصوص پر سختی سے عمل پیرا ہونے کی طرف متوجہ تھی، اگرچہ بعض اوقات وہ بھی رائے کا استعمال کرتے تھے، مگر حقیقت یہ ہے کہ مدینہ رسم ورواج، موروثی ثقافت اور وہاں رہنے والی قومیتوں کے لحاظ سے کوفے سے مختلف حیثیت رکھتا تھا، اسی طرح وہ بیرونی اثرات

سے بھی دور تھا، اسی لیے وہ ان پیش آنے والے نئے مسائل وواقعات سے باخبر نہ تھا جتنا کہ عراق باخبر تھا۔ اس سے قطع نظر یہ ایک حقیقت ہے کہ مدینہ کوفے کے مقابلے میں احادیثِ نبویہ اور اقوالِ صحابہ رضی اللہ عنہم کا سرمایہ کہیں زیادہ رکھتا تھا، اور یہ ایک فطری امر تھا، کیونکہ وہ اسلام کا پہلا بڑا مرکز تھا، اسی سرزمین پر پہلی اسلامی ریاست وجود میں آئی تھی۔ یہ ان اصحابِ رسول سے آباد تھا جنہوں نے براہِ راست رسول خدا کو دیکھا تھا اور آپ کی زبان سے سنا تھا اور آپ سے احادیث بیان کی تھیں، جب بعض صحابہ رضی اللہ عنہم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں مدینہ سے ترکِ وطن کر کے دیگر علاقوں میں چلے گئے تو پھر بھی صحابہ کی ایک بہت بڑی تعداد نے، (خاص طور پر ان صحابہ کی ایک بڑی تعداد جن پر ظاہری روایت اور اس پر عمل کرنے کا غلبہ تھا جیسے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ) مدینہ نہیں چھوڑا تھا۔

جب مسلمانوں کا اتحاد پارہ پارہ ہوگیا اور بنو امیہ کی حکومت قائم ہوگئی تو تابعین کی بہت بڑی تعداد نے فتنوں کے مراکز سے دور رہنے کو ترجیح دی، لہٰذا انہوں نے مدینہ منورہ کا رخ کیا اور وہاں اقامت اختیار کی، جن مسائل میں کوئی قرآنی نص نہ ہوتی وہ وہاں احادیثِ رسول کی روایت اور فتاویٰ صحابہ کو اختیار کرتے، (۱۰۴) اور ان کے مطابق فتویٰ جاری کرتے تھے۔

ان حالات سے متاثر ہوکر مدینے میں ایک فقہی درسگاہ کی بنیاد پڑی، اس کے بانی تابعین تھے، ان کے اجتہاد کی امتیازی بات یہ تھی کہ وہ سنت پر مبنی تھا۔ اگرچہ اس درسگاہ کے بعض فقہاء نے نص کے نہ ملنے پر اجتہاد بھی کیا ہے، اسی طرح کسی قولِ صحابی کے نہ ملنے پر بھی اجتہاد کیا ہے۔ (۱۰۵)

مدینے کی اس فقہی درسگاہ کے جن فقہاء نے شہرت پائی، وہ فقہائے سبعہ (سات فقہاء) کے نام سے معروف ہیں، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: سعید بن مسیّب، عروہ بن زبیر، ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارث، قاسم بن محمد بن ابی بکر، عبید اللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود، سلیمان بن یسار، خارجہ بن زید بن ثابت۔ ان حضرات کی فقہ امام مالک اور ابن شہاب زہری نے نافع مولیٰ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے واسطے سے حاصل

کی۔

یہ سب کے سب صرف فقہائے اثر ہی نہ تھے، بلکہ ان میں کچھ فقہاء صاحب رائے تھے جو قرآن وسنت میں نص نہ ملنے پر رائے استعمال کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ امام مالک کی فقہ اثر اور رائے دونوں کا مجموعہ ہے۔

کوفے اور مدینے کے مکاتبِ فکر میں فرق

دراصل عراقی فقہ ساری کی ساری رائے پر مبنی فقہ نہ تھی، جیسے حجازی فقہ ساری کی ساری اثر پر مبنی نہیں تھی، اثر (حدیث) کا عراق میں بھی چرچا تھا اور رائے حجاز میں بھی استعمال کی جاتی تھی، البتہ اہل عراق کے ہاں رائے کا استعمال اس سے کہیں زیادہ تھا جتنا اہل مدینہ کے ہاں تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ اہل مدینہ کے ہاں احادیث کی کثرت تھی، جبکہ اہل عراق کے ہاں اس کی قلت تھی۔

نیز یہ کہ اہل عراق کے ہاں نئے پیش آمدہ مسائل وحوادث کی بھر مار تھی، جبکہ اہل مدینہ کے ہاں خال خال ایسا ہوتا تھا، اس لیے کوفی مدرسہ فقہ اور مدنی مدرسہ فقہ کے درمیان مصادرِ تشریع یا اسلوبِ تشریع میں اتنا اختلاف نہ تھا، جتنا کہ ان کے حصول میں اختلاف تھا، یہ اختلاف اساتذہ میں تنوع کے لحاظ سے تھا اور معاشرہ ورواج میں فرق کی بناء پر تھا۔

عراقی اور حجازی سب فقہاء رائے اور قیاس کے قائل ہیں، البتہ قائل ہونے کے درجہ ومقدار میں اختلاف ہے، پہلی صدی ہجری کے نصف ثانی میں فقہ (اگرچہ مذکورہ دونوں مکتب فکر عراق اور حجاز میں مشہور تھے) کا تاسیسی دور فتنوں اور اندرونی خلفشار کے باوجود اسی درمیانی مدت میں شروع ہوا، متقی وخدا ترس بڑے بڑے فقہاء زندگی کے عام ہنگاموں سے کنارہ کش ہوگئے، کیونکہ وہ اموی حکام سے اتفاق نہیں رکھتے تھے، امویوں نے خلافت کو ایک ظالمانہ بادشاہت کی شکل دیدی تھی اور اپنے پیش رو خلفاء کے طریقے سے ہٹ گئے تھے۔ بسا اوقات حق پرست فقہاء نے ان حکام پر تنقید کی اور مصائب اور آزمائشوں کے باوجود (جو

انہیں اس کی وجہ سے جھیلنا پڑیں) حکمرانوں کی سخت گرفت کی۔ اسی بات کا اثر تھا کہ فقہاءعلم کے پڑھنے پڑھانے اور اس کے پھیلانے کی جانب متوجہ ہوئے، لہٰذا فقہ پروان چڑھنے لگی اور اس کی شاخوں میں اضافہ ہونے لگا تاہم یہ ترقی وعروج ایک مثالی اندازفکر کے مطابق تھی، جو کسی کمزور سبب کے بغیر عملی زندگی سے رشتہ نہیں جوڑتی تھی، اسی بناء پر اس مدت کو ان فرضی مسائل کی طرف فقہ کے متوجہ ہونے کی تمہید قرار دیا جاتا ہے، جنہوں نے اسے ایک نظری رنگ دے کر عملی زندگی سے استفادہ کرنے سے اس کو محروم کر دیا۔(۱۰۶)

ابراہیم نخعی اور ان کا کارنامہ

یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ ابراہیم نخعی کو، اس کے باوجود کہ وہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے ان تلامذہ کے ہم عصر تھے، جنہوں نے کوفے میں آپ رضی اللہ عنہ کی آراء کی ترویج کی، ان کے چھ مشہور شاگردوں میں شمار نہیں کیا جاتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ان میں بہت بڑے مرتبہ پر فائز تھے، وہ کوفے کے امام اور اپنے وقت کے فقیہ تھے، جیسا کہ سعید بن مسیّب مدینے کے فقیہ اور امام تھے۔

ابراہیم نخعی اہلِ کوفہ میں عبداللہ بن مسعود کے اصحاب اور ان کے مذہب کو سب سے زیادہ جانتے تھے، آپ نے ابن مسعود کی فقہ کو حاصل کیا اور اس پر آپ کو ناز تھا، اسی طرح آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ، شریح، ابوموسیٰ اشعری اور دیگر فقہائے کوفہ کی فقہ گہرے فہم وادراک کے ساتھ حاصل کی، ایسے عقلی ادراک سے جو علل واسباب سے ماوراء بحث کرتا اور اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ شروع احکام عقل کی رسائی سے باہر نہیں ہیں،(۱۰۷) مزید برآں یہ احکام وجود وعدم وجود کے لحاظ سے اپنی علتوں کے گرد گھومتے ہیں، شیخ خضری کہتے ہیں: ’’ابراہیم نخعی اور ان کے طریق کے پیروکار عراقی فقہاء اور بعض فقہائے مدینہ، اپنے فتاویٰ میں کتاب وسنت ہی کو آخری سنت مانتے تھے، مگر وہ یہ بات سمجھتے تھے کہ شریعت کے ایسے قابل حصول مصالح مقصودہ کا ہونا ضروری ہے جن کی غرض سے شریعت دی گئی ہے، اور ان مصالح کا اعتبار کرنا ان کے نزدیک درست ہے، اس لیے انہوں نے ایسے مسائل میں استنباط کے لیے ان مصالح کو اساس قرار دیا، جن کے

بارے میں کتاب وسنت کا کوئی حکم موجود نہ ہو' (۱۰۸) یہی وجہ ہے کہ ابراہیم نخعی نے قیاس اور استنباط میں وسعتِ نظر سے کام لیا اور فتویٰ کو خوفناک شکل دے کر نا قابل حل نہیں بنایا۔ قیاس کو اختیار کرنے میں توسع اور نصوص کی تعلیل کی بنیاد قرار دینے کے باوجود فرضی اور من گھڑت مسائل سے دور رہے، وہ بالعموم خاموشی کو ترجیح دیتے تھے اور جب تک ان سے سوال نہیں کیا جاتا تھا علمی گفتگو نہیں کرتے تھے۔ (۱۰۹)

ابراہیم نخعی اپنے فقہی مقام کے ساتھ ساتھ کبار حفاظ حدیث میں شمار کیے جاتے ہیں، انہوں نے صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے شرف ملاقات حاصل کیا، جن میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ اور سیدہ عائشہ کے نام قابل ذکر ہیں، البتہ زیادہ روایت تابعین سے کی ہے، آپ اپنی روایت کردہ حدیث کی سند دیکھنے کے مقابلے میں اس کے معانی ومفہوم کو زیادہ ملحوظ رکھتے تھے، آپ حدیث کو غور سے سنتے اور پنے نقد وتحقیق کی بناء پر اس کے بعض حصے کو قبول کر لیتے اور بعض کو رد کر دیتے تھے، ان کا یہ قول نقل کیا گیا ہے: ''میں حدیث کو سنتا ہوں، پھر میں اس کے قابلِ اخذ حصے پر غور کر کے اسے لے لیتا ہوں اور باقی کو چھوڑ دیتا ہوں''۔ ان کے بارے میں اعمش کا قول ہے: ''ابراہیم نخعی حدیث کے سنار ہیں''۔ اس کے باوجود وہ رسول اللہ ﷺ سے براہ راست روایت کرنے سے احتراز کرتے تھے، وہ براہ راست **قال رسول اللہ** کہنے کے بجائے **قال الصحابی** کہنے کو ترجیح دیتے تھے۔ (۱۱۰)

ابراہیم نخعی زرخیز فقہی ملکہ رکھنے والی شخصیت تھے، جنہوں نے احادیث، صحابہ رضی اللہ عنہ کے فتاویٰ، تابعین کے فتاویٰ اور خاص طور پر فقہائے کوفہ کے فتاویٰ کا ایسا تحقیقی مطالعہ کیا تھا جس کی بنیاد تفہیم نصوص اور علل واسباب وتتبع پر قائم تھی۔ وہ رائے اور احادیث کے حامل فقیہ تھے، اگرچہ رائے کا استعمال ان کے ہاں زیادہ تھا اور اسی میں وہ زیادہ مشہور بھی تھے، چنانچہ ان کے بارے میں روایت ہے کہ وہ نہ تو رائے بلا روایت کو درست سمجھتے تھے، اور نہ ہی روایت بلا رائے کو صحیح سمجھتے تھے۔ عراق میں پہلی فقہی شخصیت ہونے کے ناتے انہوں نے رائے پر مبنی فقہ کو ایک وجود رکھنے والی مقبول عام چیز بنا دیا۔ بعض مورخین کا تو یہاں تک خیال ہے کہ فقہ ابوحنیفہ،

فقہ ابراہیم سے مختلف نہیں ہے، اور یہ کہ متاخر (ابو حنیفہ) کی شخصیت متقدم (ابراہیم نخعی) کی شخصیت میں فنا نظر آتی ہے۔(۱۱۱)

شاہ ولی اللہ دہلوی فرماتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ، ابراہیم نخعی اور ان کے ہم سروں کے مذہب کا سب سے زیادہ التزام کرتے تھے، الا ماشاء اللہ اس سے تجاوز نہیں کرتے تھے، وہ ان کے مذہب کے مطابق تخریج میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے، وجوہ تخریجات پر گہری نظر رکھتے تھے اور فروع پر مکمل توجہ دیتے تھے۔ اگر آپ ہماری بیان کردہ حقیقت کو معلوم کرنا چاہیں تو جامع عبد الرزاق اور مصنف ابن ابی شیبة سے ابراہیم نخعی اور ان کے ہمسروں کے اقوال کو چھانٹ لیں۔ پھر ان کا موازنہ ان کے مذہب سے کریں تو آپ محسوس کریں گے کہ امام ابو حنیفہ اس راہ سے الگ نہیں ہوئے، سوائے چند مسائل کے۔ ان چند مسائل میں بھی وہ فقہائے کوفہ کے مذہب سے باہر نہیں گئے۔(۱۱۲)

ابراہیم نخعی اور امام ابو حنیفہ کا تعلق

اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ امام ابو حنیفہ نے ابراہیم نخعی کا منہج اور ان کا فقہی طریقہ اختیار کیا ہے، مگر متعدد پہلوؤں سے ان سے اختلاف بھی کیا ہے، جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان کے درمیان منہج کا اتفاق یہ معنیٰ نہیں رکھتا کہ امام ابو حنیفہ محض ابراہیم نخعی کی فقہ کے ناقل تھے۔

یقیناً ابو حنیفہ نے ابراہیم نخعی کی فقہ ان کے شاگرد رشید اور ان کی فقہ کے راوی حماد بن ابی سلیمان کے واسطے سے حاصل کی، لیکن انہوں نے شعبی سے بھی فقہ حاصل کی تھی، اگرچہ انہوں نے عراق میں زندگی گزاری، اس کے باوجود وہ فقہائے اثر (حدیث) کے زیادہ قریب تھے، بہ نسبت اس کے جتنا وہ فقہائے اہل الرائے کے قریب تھے، اسی طرح انہوں نے مکی فقہ عطا بن ابی رباح سے حاصل کی اور مدنی فقہ نافع مولیٰ ابن عمر سے حاصل کی۔(۱۱۳)

وہ قیاسی طریقہ جس میں ابراہیم نخعی مشہور ہوئے، امام ابو حنیفہ کی سرپرستی میں بہت زیادہ پروان

چڑھا، حتیٰ کہ ان کو قیاس کی وجوہ اور اس کے لیے مقررہ علل کا علم رکھنے کے لحاظ سے مسلمانوں کا سب سے بڑا فقیہ قرار دیا گیا۔

قیاس میں امام ابو حنیفہ کی مہارت، احکام کی علتوں کے متعلق ان کی تحقیق اور کبھی استحسان کی بناء پر ان کا قول، اکثر ان کو تفریع و تقدیرِ احکام پر آمادہ کرتا رہتا تھا۔ وہ صرف اسی سوال پر اکتفاء نہیں کرتے تھے، جو ان سے پوچھا جاتا تھا، جیسا کہ ابراہیم نخعی کا عمل تھا، یہی وجہ ہے کہ عراقی درسگاہ نے امام ابو حنیفہؒ کی نگرانی میں قیاس، فقہ تقدیری اور مختلف فقہی تفریعات کو پروان چڑھایا۔ (۱۱۴)

اما ابو حنیفہ کا اپنے حلقۂ درس میں منہج

امام ابو حنیفہ تیس برس تک مدرسۂ کوفہ کے سربراہ رہے۔ یہ کوئی معقول بات نہیں ہے کہ ان تیس برسوں میں وہ ابراہیم نخعی کی آراء کو دہراتے رہے ہوں، ان کی فقہ کو محض نقل کرتے رہے ہوں اور اجتہاد و آراء میں ان کی اپنی کوئی مستقل حیثیت نہ ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ عراقی، مکی اور مدنی تینوں طرز کے فقہ کا مجموعہ تھے، آپ نے اپنے زمانے کے مشہور ترین علماء سے ملاقات کر کے ان سے بحث و مباحثہ کیا، آپ نے ان سے استفادہ کیا اور انہوں نے آپ سے استفادہ کیا، حتیٰ کہ آپ متفقہ طور پر فقہائے عراق کے امام بن گئے، آپ کا حلقۂ درس و تدریس ایک علمی اکیڈمی بن گیا، جس میں فقہاء و علماء کی ایک ایسی نسل نے تیار ہو کر سند فراغت لی، جس نے فقہ کی تدوین و اشاعت کا کام انجام دیا۔

امام ابو حنیفہ نے اجتہاد یا اپنے مذہب کے اصول کے سلسلے میں جو منہج اختیار کیا، اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ ابراہیم نخعی اور ان جیسے فقہاء کو اس طرح دیکھتے تھے کہ وہ انسان تھے جنہوں نے اجتہاد کیا، لہٰذا ان پر بھی لازم ہے کہ ان کی طرح اجتہاد کریں۔ چنانچہ ان سے مروی ہے کہ "میں سب سے پہلے کتاب اللہ کو لیتا ہوں، کتاب اللہ میں حکم نہ ملے تو سنت رسول اللہ کو لیتا ہوں، کتاب اللہ اور سنت رسول دونوں میں نہ ملے تو

اصحاب رسول میں سے جس کا قول چاہتا ہوں، لے لیتا ہوں، اور جس کا چاہتا ہوں چھوڑ دیتا ہوں، مگر اقوالِ صحابہ کو چھوڑ کر کسی اور کا قول نہیں لیتا، تاہم جب معاملہ ابراہیمؒ شعبی، ابن سیرین، حسن، عطاء اور ابن مسیّب تک پہنچ جائے تو وہ بھی انسان تھے جنہوں نے اجتہاد کیا، لہٰذا میں بھی اسی طرح اجتہاد کرتا ہوں، جس طرح انہوں نے اجتہاد کیا۔(۱۱۵)

امام ابوحنیفہ کے اجتہادی اصول بالعموم دیگر ائمہ، خاص طور پر ائمہ ثلاثہ کے اجتہادی اصولوں سے متفق تھے، اس کے باوجود امام ابوحنیفہ کے بارے میں ان کے زمانے میں ایک بہت بڑی ہنگامہ آرائی ہوئی جو آپ کی وفات کے بعد بھی جاری رہی۔ دراصل آپ کی طرف ایسی آراء منسوب کر دی گئیں، جو حقیقت میں آپ کے عقائد ہی نہ تھے، جن چیزوں کے سبب آپ کو متہم اور مطعون کیا جاتا تھا، وہ یہ تھیں کہ آپ ذخیرۂ احادیث کم رکھتے ہیں اور حدیث صحیح پر قیاس اور رائے کو مقدم رکھتے ہیں، انصاف پسند علماء و محققین خواہ زمانۂ قدیم کے ہوں یا دور جدید کے انہوں نے یہ جھوٹے الزامات رد کر دیئے ہیں اور ان اسباب کا پردہ چاک کیا ہے جو ان کے پیچھے کارفرما تھے۔(۱۱۶)

امام ابوحنیفہ کا اپنے حلقے میں شاگردوں کے ساتھ طریقۂ بحث و تدریس اس استاد کے طریقے سے مختلف تھا، جو اپنے طلبہ کے سامنے لیکچر دیتا ہے اور وہ اسے سنتے رہتے ہیں اور لکھتے رہتے ہیں، بغیر اس کے کہ کسی کو بحث و مباحثہ کا حق ہو۔ امام ابوحنیفہ کا طریقہ اس استاد کی طرح تھا جو اپنی رائے زبردستی نہیں ٹھونستا اور نہ اپنے شاگرد سے ایسی بات ہی سننے میں کوئی شرمندگی محسوس کرتا ہے جو اس کے قول کی بہ نسبت حق و صواب کے زیادہ قریب ہو، بلکہ وہ اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، اس پر خوشی کا اظہار کرتا ہے اور اس قسم کے اسلوب کی دعوت دیتا ہے، آپ نے اپنے تلامذہ کو اجتہاد کرنے کی نصیحت فرمائی اس کی انہیں ترغیب دی اور ان کے سامنے اجتہاد کے دروازے کھول دیئے۔ آپ اپنے شاگردوں کے بہترین رہنما تھے، آپ کے شاگردوں میں سے ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی نکلی جو فقہ و حدیث کے امام بنے۔ عراقہ فقہ کی تدوین و اشاعت کا سہرا انہی

کے سر ہے۔

اسی وجہ سے مذہب حنفی کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ اس کے مسائل طویل مباحث اور مناظروں کی چھلنی میں چھننے کے بعد مدون ہوئے، ان تمام مسائل کی نسبت کسی ایک متعین شخصیت کی طرف کرنا ممکن نہیں ہے، کیونکہ یہ علماء کی ایک ایسی جماعت سے صادر ہوئے جو اپنے استاذ کے زیر سایہ باہم مشورے اور مباحثے کرتے تھے اور استاذ اس بات کا انتہائی حریص تھا کہ مسئلہ اس وقت تک ضبط تحریر میں نہ لایا جائے، جب تک تمام حضرات اپنی رائے کا اظہار نہ کرلیں اور کسی نتیجے پر پہنچ جائیں۔

جامع المسانید کے مقدمے میں مذکور ہے: ''امام ابوحنیفہ کو جب کوئی مسئلہ پیش آتا، آپ اپنے شاگردوں سے باہمی مشورہ کرتے، ان سے بحث ومباحثہ کرتے اور ان سے سوال کرتے۔ اس طرح ان کے پاس موجود اخبار واحادیث کی ان سے سماعت کرتے، جو کچھ آپ کے علم میں ہوتا، اسے بھی بیان کردیتے، ایک ایک ماہ یا اس سے بھی زیادہ عرصہ ان سے مناظرہ اور بحث ومباحثہ کرتے رہتے، یہاں تک کہ ایک رائے پر اتفاق ہوتا، تب شاگرد اسے ضبط تحریر میں لے آتے، اسی منہج پر آپ نے اصول قائم کردیئے، (۱۱۷) اسحاق بن ابراہیم سے مروی ہے کہ اصحاب ابوحنیفہ آپ کے ساتھ مسائل کے بارے میں غور وخوض اور بحث ومباحثہ کرتے رہتے لیکن اگر ان کی مجلس کے ایک رکن عافیہ بن زید موجود نہ ہوتے تو امام ابوحنیفہ فرماتے کہ عافیہ کے آنے تک اس مسئلے پر بحث جاری رکھو، چنانچہ جب عافیہ بن زید آجاتے اور اپنے ساتھیوں سے اس مسئلے پر اتفاق کرتے، تب ابوحنیفہ فرماتے کہ اب اسے لکھ لو، اگر وہ ان سے اتفاق نہ کرتے تو امام حنیفہ فرماتے کہ اس کو نہ لکھو۔ (۱۱۸)

اس علمی حلقے میں جس کے اندر کبار فقہاء ومحدثین جمع ہوتے تھے، امام قاضی ابو یوسف بھی بیٹھ کر علم حاصل کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بلند مقام حاصل کیا۔

سیاسی حالات

۱۳۲ھ میں عباسیوں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے نسبت رکھتے تھے، امویوں کو گرانے اوران کی حکومت ختم کرنے کے بعد خود حکومت پر قابض ہو گئے۔عباسیوں نے امویوں کے خلاف ایک خفیہ تحریک چلائی تھی، جو بظاہر اہل بیت کے ایک فرد امام رضا کی طرف خلافت لوٹانے کے پروگرام پر کام کررہی تھی۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی طویل خفیہ تحریک کے دوران اس بات کا تذکرہ تک نہ کیا کہ وہ خود خلافت کے خواہش مند ہیں، بلکہ وہ یہی بات پھیلاتے رہے کہ وہ تو صرف امام رضا کی خلافت قائم کرنے کے لیے اٹھے ہیں،تاکہ حضرت فاطمہ کی اولاد کے شہداء کے خون کا بدلہ لے سکیں۔(۱۱۹)

عباسی جب اپنے عزائم اور منصوبوں میں کامیاب ہو گئے اور ابو العباس سفاح کی خلافت کے لیے بیعت لے لی گئی تو وہ ہر اس شخص کو اچانک موت کے گھاٹ اتارنے لگے جو ان کی راہ میں روڑے اٹکاتا، یا جس کے اخلاص اور دوستی میں انہیں ذرا بھی شک ہو جاتا تھا،خواہ ان کا قابل اعتماد وزیر ہی کیوں نہ ہو۔(۱۲۰) اسی طرح عباسیوں نے امویوں سے ایسا خوفناک اور دردناک انتقام لیا کہ نہ ان کے زندوں کو چھوڑا اور نہ مردوں کو،(۱۲۱) بڑوں کو معاف کیا گیا نہ چھوٹوں کو،ان کے ظالمانہ انتقام سے نہ مرد بچ سکے اور نہ ہی عورتیں، (۱۲۲) یہ سب کچھ عبدالرحمٰن بن معاویہ بن ہشام بن عبدالملک المعروف بہ عبدالرحمٰن الداخل کو راستے سے ہٹانے کے لیے تھا،حتی کہ وہ اندلس کی طرف فرار ہو گیا،تاکہ وہاں وہ ایک نئی اموی سلطنت قائم کرے،جس پر خلافت عباسیہ کا تسلط نہ ہو،اور یہ سلطنت قریب تین سو سال تک قائم رہی۔

اندرونی خطرات

عباسیوں کی اس مار دھاڑ اور دہشت گردی کی پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے خلاف مختلف شورشیں کھڑی ہو گئیں،ان شورشوں کا برپا ہونا ایک ایسا خطرہ تھا، جو اس نوزائیدہ خلافت کے لیے چیلنج بنتا جارہا تھا،مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ عباسیوں نے اپنے خلاف شورش برپا کرنے والے اہل عرب،علویوں،موالی،شعوبیوں

اور زنادقہ کا احتیاط، پختہ عزم اور مکر وفریب کے ساتھ مقابلہ کیا۔ اپنے تمام مخالفوں یا باغیوں کو دھوکے اور فریب کی سیاست کے ذریعے ختم کر دیا، تب وہ اس قابل ہو سکے کہ تقریبا پندرہ سال کے بعد اپنی حکومت کو قائم کر سکیں، جس کے دوران انہیں بہت سے معرکے لڑنے پڑے۔ ان معرکوں میں انہوں نے تلوار، چالاکی اور سیاست سب سے کام لیا، تاکہ اپنی حکومت کی بنیادیں مضبوط کر کے تمام بیرونی دشمنوں اور اندرونی خلفشار برپا کرنے والوں کو ایک ساتھ شکست سے دو چار کر دیں۔

ان کے علاوہ عباسیوں کو ایک اور خطرے سے دو چار ہونا پڑا اور یہ خطرہ خود عباسیوں کا آپس میں خلافت کی رسہ کشی کا تھا، تاہم اس خطرے کو اکثر تدبیر اور سیاسی چال نے دبا دیا۔

خلافت عباسیہ کو پیش آنے والے ہر خطرے اور مشکل کو ختم کرنے میں ابو جعفر منصور کا نمایاں کردار رہا، یہی وجہ ہے کہ مؤرخین اسے خلافت عباسیہ کا حقیقی بانی قرار دیتے ہیں، وہ خلافت عباسیہ کے روزِ اول ہی سے اس کے بیرونی باغیوں سے نبرد آزما رہا، احتیاط، ہوشیاری، دھوکے اور فریب دہی میں وہ اسی طرح مشہور تھا، جیسے کنجوسی اور اعمال کا سخت محاسبہ کرنے میں۔ خلافت کو مضبوط کرنے اور اس کے دشمنوں کے ساتھ جنگ کرنے میں اس کی کامیابی کے یہی عوامل تھے۔ اس بناء پر اس کے ہاں غیر معمولی سرمایہ جمع ہو گیا تھا، اس نے جو املاک ضبط کیں، وہ اس کے علاوہ تھیں، یہ مال و دولت اس نے معاشرے کی ترقی، آبادکاری اور بعض شورش پسندوں سے چھٹکارا پانے کے لیے صرف کیا۔

منصور کے بعد اس کا بیٹا مہدی تخت خلافت پر بیٹھا تو اس نے ملکی خزانے کو اموال سے بھرا ہوا پایا۔ چنانچہ اس نے لوگوں کو مال و دولت دینے میں فراخ دستی کا مظاہرہ کیا۔ ظلم سے چھینی ہوئی املاک ان کے اصل مالکوں کو واپس کیں، علویوں کو اپنے قریب کیا، ان پر ظلم و ستم کا سلسلہ بند کر دیا اور بہت اندرونی اصلاحات کیں، مسعودی کے قول کے مطابق وہ محبوب عوام و خواص بن گیا۔ (۱۲۳)

مہدی رفتہ رفتہ عیش و عشرت کا دلدادہ بن کر ملکی معاملات میں براہ راست نگرانی کرنے سے غافل

ہوگیا، لیکن اس کے باوجود سفاح اور منصور کے اساسی اور بنیادی دور کے گزر جانے کے بعد اس کی حکومت مستحکم تھی، اس نے ملکی معاملات کلی طور پر وزراء کے سپرد کردیئے، جو بہت سے معاملات میں خلیفہ کی طرف رجوع کیے بغیر خود جس طرح چاہتے، تصرف کرتے، اس سے خلیفہ کا اثر نفوذ کمزور ہوگیا، اور وزراء ہی مرکزی حیثیت کے مالک بن گئے، اس وجہ سے وزارت باہمی چپقلش اور سازشوں کا میدان بن گیا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وزیر کا کنٹرول اور عمل دخل اتنا بڑھ گیا کہ ہارون الرشید کے عہد خلافت میں اس نے خلیفہ کے سارے اختیارات پر قبضہ کرلیا، برامکہ کی نکبت وزوال، وزارت کے اسی بے پناہ حد تک طاقتور ہوجانے کا ردعمل تھا، جس نے اپنے مقابلے میں خلافت کی قوت کو پارہ پارہ کردیا تھا۔ (۱۲۴)

گزشتہ بحث سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ عباسی دور خلافت درحقیقت ایک خاندان سے دوسرے خاندان کی طرف آمریت کے انتقال کے سوا کچھ نہ تھا، سیاسی زندگی میں کوئی جوہری تبدیلی نہ ہوئی، عباسی داعی مظلوموں کی مدداور اجتماعی عدل وانصاف کے قیام کے لیے جو دعوتِ جہاد دیتے تھے، وہ محض ایک پردہ تھا، جس کے پیچھے ان کی خواہشات اور ذاتی اغراض پوشیدہ تھیں۔ اس پر علویوں کے ساتھ روا رکھے گئے ان کے بدترین طرز عمل سے زیادہ بڑی دلیل اور کیا ہوسکتی ہے۔ عباسی علویوں کے خلاف سنگ دلی کے اس مقام تک جا پہنچے جہاں اموی نہ پہنچ پائے تھے، یہاں تک کہ علوی عہد بنی امیہ کا ذکر تعریف کے انداز میں کرنے لگے، وہ دیکھ رہے تھے کہ اموی پھر بھی کسی اخلاقی ضابطے کے پابند ہیں، ابو جعفر میں تو اخلاق نام کی کوئی چیز تھی ہی نہیں۔

عباسی اپنے لیے ایسی آمرانہ اور طاقت ور حکومت قائم کرنا چاہتے تھے، جس میں کوئی بھی ان کی مزاحمت نہ کرسکے، لہٰذا جب وہ اپنے منصوبے میں کامیاب ہوئے تو انہوں نے اپنے خلاف سرکشی کرنے والوں اور شورش برپا کرنے والوں پر کچھ بھی رحم نہ کیا، جن لوگوں نے بھی ان کی حکومت اور سیاست سے سرتابی کی، انہیں ٹھکانے لگا دیا گیا، جب تک ان کی مصلحت کا تقاضا رہا، انہوں نے فقہاء، علماء کی مخالفت کے باوجود

نہ کسی عہد کا پاس کیا اور نہ امان دے کر اسے پورا کیا۔

یحییٰ طالبی کی امان

ابو جعفر پر مؤرخین کا الزام ہے کہ اس نے ابن ہبیرہ کو امان دے کر اس کے ساتھ دھوکا کیا، ابن ہبیرہ کی جانب سے ایسا کوئی فعل سرزد نہ ہوا تھا جو اچانک اسے قتل کرنے کا متقاضی ہوتا، ابو جعفر منصور نے اپنے چچا عبداللہ بن علی کو امان دینے کے بعد دھوکے سے قتل کرا دیا۔ اسی طرح ابو مسلم کو اطمینان دلانے کے بعد دھوکے سے قتل کرا دیا، جہاں تک ہارون الرشید کا معاملہ ہے تو اس نے یحییٰ بن عبداللہ بن حسن کو خود اپنے ہاتھ سے امان نامہ لکھ کر دیا، جبکہ اس نے بلاد دیلم کی طرف فرار ہو کر اپنے لیے بیعت لینا شروع کر دی تھی، اور خطرے میں اضافہ کر دیا تھا، وہ فضل بن یحییٰ برمکی کے ساتھ واپس آیا، جسے ہارون الرشید نے پچاس ہزار فوج دے کر یحییٰ سے جنگ کرنے کے لیے روانہ کیا تھا، اس کے باوجود ہارون الرشید اس سے بڑی نرمی اور احترام سے پیش آیا تاہم جلد ہی ہارون الرشید نے اسے اس کے گھر میں قید کر کے فقہاء سے اسے دی ہوئی امان کو توڑنے کے بارے میں فتویٰ پوچھا،، اس واقعۂ امان اور اس کے بارے میں فقہاء کے موقف کے حوالے سے صیمری (۱۲۵) کا بیان ہے کہ جب ہارون الرشید ''رقہ'' آیا تو اس نے محمد بن حسن کو طلب کیا، اسی طرح حسن بن زیاد اور ابو البختری وہب بن وہب کو بھی طلب کیا، آخر الذکر امام ابو یوسف کی وفات کے بعد قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کے منصب پر فائز تھے، ہارون الرشید نے یحییٰ کو دی جانے والی امان نکال کر ان کے سامنے رکھی تو امام محمد بن حسن نے اس کے بارے میں فرمایا: ''یہ ایک انتہائی مضبوط امان ہے، اسے توڑنے کی کوئی تدبیر کرنا جائز نہیں'' حسن نے کمزور آواز میں کہا: یہ امان ہی ہے، لیکن بختری نے کہا: ''یہ بُرا آدمی ہے، اس کی امان کا کوئی اعتبار نہیں ہے'' پھر اس نے چھری سے تحریرِ امان کے دو ٹکڑے کر دیے اور ہارون الرشید سے کہنے لگا ''اسے قتل کر دیجئے، اس کا خون میری گردن پر ہے''۔

ایک دوسری روایت میں یوں ہے کہ جب امام محمد نے ہارون الرشید کی خواہش کے برعکس فتویٰ دیا تو

اس نے آپ کو اس زور سے دوات ماری کہ آپ زخمی ہو گئے، جب امام محمد وہاں سے باہر آئے تو زار زار رونے لگے، ان سے پوچھا گیا کہ وہ اس زخم کی وجہ سے رو رہے ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا: ''نہیں، اللہ کی قسم! میں اس وجہ سے نہیں رو رہا، بلکہ میں اپنی اس کوتاہی پر رو رہا ہوں کہ مجھے بختری سے کہنا چاہئے تھا کہ تو امان توڑنے کا فتویٰ کس دلیل کی بنیاد پر دے رہا ہے، تا کہ اس کے فتویٰ کے غلط ہونے کی وجہ سے اس کے خلاف حجت قائم ہو جاتی''۔

بہر حال ہارون الرشید نے امان توڑ کر یحییٰ کو قتل کرا دیا اور امام قاضی ابو یوسف اور ان جیسے فقہاء کی رائے پر عمل نہ کیا، ایک روایت یہ بھی ہے کہ ہارون الرشید نے یحییٰ کو قتل نہیں کرایا تھا، بلکہ وہ قید میں پڑے پڑے ایک مدت کے بعد وفات پا گیا تھا۔(۱۲۶)

علامہ ابو عبداللہ محمد بن ابراہیم وزیر یمانی (۱۲۷) اس امان کی صحت اور اس کے بارے میں فقہاء کے مؤقف کے متعلق مغالطے میں ڈالتے ہیں، لیکن اس مغالطے کی کوئی حیثیت نہیں ہے، کیونکہ قدیم ترین مؤرخین نے یہ واقعہ بیان کیا ہے۔

خلفاء اور فقہاء کے درمیان کشیدگی

بنو عباس کی یہ ظالمانہ پالیسی اسی طرح ایک مسلح مخالفت سے دو چار ہوئی جس طرح اس کی زبانی مخالفت کی گئی تھی۔ بعض فقہاء نے بنو عباس اور ان کے گورنروں کو نقضِ عہد، خونریزی، اور لوگوں کے مال ناحق غصب کرنے سے متہم کیا۔ سفاح کے چچا عبداللہ بن علی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے امام اوزاعی نے الزام لگایا، (۱۲۸) اسی طرح امام شافعی، ابن ابی ذئب کے بارے میں روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے ابو جعفر سے کہا: ''میں گواہی دیتا ہوں کہ تو نے لوگوں کا مال ناحق غصب کیا اور اسے ناجائز کاموں پر صرف کیا'' (۱۲۹)

ابن جریر امام مالک کے بارے میں کہتے ہیں کہ محمد بن عبداللہ نے ۱۴۵ھ میں، جب مدینے میں ابو جعفر کے خلاف خروج کیا تو انہوں نے محمد بن عبداللہ کی بیعت کرنے کا فتویٰ دیا، اس پر لوگوں نے امام مالک

سے کہا کہ ہماری گردن میں تو منصور کی بیعت کا قلادہ ہے۔ انہوں نے فرمایا: تمہیں منصور کی بیعت پر مجبور کیا گیا تھا اور کسی مجبوری و بے بس کی بیعت منعقد نہیں ہوتی''۔(۱۳۰)

عباسیوں کے خلاف اس فتوے کی بناء پر امام مالک کو اذیت دی گئی۔ یہ فتویٰ اپنے اندر انقلاب کا رجحان لیے ہوئے تھا جو لوگوں کو اپنی بیعت پر مجبور کرنے اور ان پر راضی ہونے سے تنفر کرتا تھا، امام مالک نے اس وجہ سے یہ خیال کیا تھا کہ عباسی حکومت ایک ظالمانہ حکومت ہے اور اور اس کے خلاف خروج کرنا درست اور لازم ہے۔

امام ابوحنیفہ نے تو کھلم کھلا دولتِ عباسیہ کے خلاف خروج کرنے والے علویوں کی مدد کا اعلان کیا، اور اپنے خطبات میں ابوجعفر کی سیاست پر کڑی تنقید کی، کوفے کی مسجد میں بھی اس پر برملا تنقید کی، جس کی پاداش میں انہیں اس قدر سخت اذیتیں دی گئیں کہ بعض مؤرخین اس جلیل القدر امام کی وفات کو ان پر ڈھائے جانے والے ظلم اور سزا کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔

دولت عباسیہ کے بارے میں مذکورہ ائمہ اور ان جیسے دیگر ائمہ کے تبصرے اس رائے کے قائلین کی نفی کرتے ہیں کہ عباسیوں نے فقہاء سے حسن سلوک کیا اور ان کی حوصلہ افزائی کی، جس کی بناء پر ان کے دور میں فقہ نے خوب ترقی کی۔ یہ رائے بحث و تحقیق اور تقابل کی محتاج ہے، تاریخی حقیقت یہ ہے کہ حیاتِ فکری بالعموم، اور حیاتِ فقہی بالخصوص پہلے دور عباسی میں پروان چڑھی اور اس نے عمدہ نتائج پیدا کئے یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض عباسی خلفاء نے امت کے امور میں دلچسپی لی، دین حنیف کے احکام کی پیروی کی اور بعض فقہاء سے درخواست کی کہ وہ ان کے لیے ایسی کتابیں تیار کریں جو ان کی خواہش کے مطابق احکام کی تنفیذ میں ان کے لیے مدد و معاون ہوں، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ فقہ کی ترقی اور علم اور اہل علم کی تکریم کا احسان اور سہرا دولت عباسیہ کے سر ہے۔ دراصل عباسی خلافت دین کے نام پر وجود میں آئی تھی اور یہی اس کی کامیابی، لوگوں اور بالخصوص غلاموں اور موالی کے اس کی طرف متوجہ ہونے کے عوامل میں سے ایک اہم عامل تھا، عباسی تحریک

کی کامیابی کے بعد ان کی ذمہ داری تھی کہ وہ اپنی حکومت پر دین کی چھاپ کو گہرا کرتے تاکہ اپنی سیاست میں اس بنیادی دعوت میں تضاد کا شکار نہ ہوتے جس کی طرف انہوں نے لوگوں کو دعوت دی تھی اور جس کے قیام کے لیے وہ اٹھے تھے، تاکہ لوگ نہ تو ان سے متنفر ہوتے اور نہ ان کے خلاف شورش برپا کرتے۔(۱۳۱)

اسی غرض کے پیش نظر خلفاء فقہاء کا قرب حاصل کرتے تھے، اس قرب کے پس منظر ان فقہاء سے علمی استفادے کا کوئی جذبۂ صادق نہ تھا، حکومت میں فقہاء کو مقام و مرتبہ بھی اس لحاظ سے ملتا تھا کہ وہ خلفاء کے فیصلوں اور ان کے افعال و کردار کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں اور کیا فتویٰ دیتے ہیں۔ اہل علم سے اچھے تعلقات رکھنا حکمرانوں کی مجبوری بھی تھی، کیونکہ یہ فقہاء حکومت کے لیے ایک بھاری پتھر تھے، وہ عام لوگوں کے اعتماد کا مرکز تھے، جو انہیں دین کے محافظ، شریعت کے ترجمان اور فتویٰ دینے کے مقام پر فائز سمجھتے تھے، چنانچہ خلفاء بھی ان فقہاء کا تقرب حاصل کرنے کی دوڑ دھوپ کرتے اور اس بات کا اظہار کرتے تھے کہ فقہاء ان خلفاء کو محبوب رکھتے ہیں، ان کی حکومت کی اطاعت کرتے ہیں۔

اس پس منظر میں ان کے خلاف اٹھنے والی ہر شورش اور بغاوت دب جاتی تھی، یہ بات کہ فقہاء کے ساتھ خلفاء کا تعلق اور میل جول محض ایک سیاسی چال کے طور پر تھا، نہ کہ خلوص پر مبنی دینی عمل، اس کی تائید اس اذیت اور جبر سے ہوتی ہے جو خلفاء کی خواہش کے برعکس فتویٰ دینے پر ان فقہاء سے روا رکھا جاتا تھا، خواہ وہ فتویٰ صریح حق پر ہی مبنی کیوں نہ ہوتا۔

یہی وجہ ہے کہ بعض فقہاء نے خلفاء کی مجالس سے کنارہ کشی اختیار کی، تاکہ ان مجالس میں شریک ہو کر خلفاء کے ان غیر شرعی اعمال میں شریک نہ ہوں جن کا وہ ارتکاب کرتے تھے، پس عباسی خلافت کے دور اول میں فقہ کی ترقی کا منبع و مصدر عباسی خلفاء کی طرف سے فقہ اور فقہاء کی سرپرستی نہ تھی، بلکہ اس سرپرستی کا اصل ہدف خدمت علم و اہل علم کے علاوہ کچھ اور تھا، تاہم یہ سرپرستی غیر ارادی طور پر فقہ کی اٹھان میں مددگار و معاون رہی، مگر اس سلسلے میں یہ کوئی بنیادی عنصر نہ تھا۔

بیرونی خطرات

عباسی خلافت جب متعدد اندرونی مشکلات کا شکار ہوئی اور مختلف ذرائع سے ان پر قابو پالیا گیا تو اسے اپنی پڑوسی حکومتوں سے بعض تکلیف دہ مصائب کا سامنا کرنا پڑا، خاص طور پر بازنطینی سلطنت کی طرف سے۔ یہ لوگ نقضِ عہد اور اسلامی سرحدوں پر حملے کی راہ پر چل نکلے تھے، اہل عرب اور رومیوں کے درمیان بعض معرکوں میں جنگی نتائج کبھی ایک کے حق میں اور کبھی دوسرے کے حق میں رہے، لیکن آخرالامر اہل عرب کو ان پر غلبہ اور فتح حاصل ہوئی اور انہوں نے اپنے دشمنوں کو اپنی من مانی شرائط تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا۔

یاد رہے کہ اہل عرب اور رومیوں کے درمیان جنگوں کا سلسلہ دوسری صدی ہجری کے طویل عرصے پر محیط رہا، مگر اس سے حدود اسلامی میں کوئی قابل ذکر تبدیلی نہیں آئی تھی، (۱۳۲) کیونکہ اسلامی لشکر فتح اور جہاد کی غرض سے جنگ نہیں کرتے تھے، بلکہ وہ ان بغاوتوں کا قلع قمع کرتے تھے، جو ان کی اپنی زمین پر جنم لیتی تھیں، یہ سب کچھ وہ موسم سرما اور موسم گرما میں اپنی قتل و غارت گری اور حملوں کی صورت میں کرتے تھے، اس سے ان کا مقصد حکومت کو مستحکم کرنا اور اپنے دشمنوں پر مزید خوف و دہشت بٹھانا ہوتا تھا۔

عبدالرحمٰن الداخل کا اندلس فرار ہونا اور اس کا اموی حکومت قائم کر لینا اس طرز عمل کا نتیجہ تھا، جو عباسی حکومت نے دشمنوں سے روا رکھا تھا، اور یہی وہ عامل ہے جس نے اس حکومت اور اس کے پڑوسیوں کے درمیان جنگوں کا سلسلہ برپا کر دیا، جن کا مقصد انتقام کی آگ بجھانے اور قوت میں اضافہ کرنے سے زیادہ کچھ نہ تھا، اس کے ساتھ ساتھ سرحدوں کے تحفظ اور مضبوط قلعوں کی تعمیر کا مقصد اس سے زیادہ کچھ نہ تھا کہ دولت اسلامیہ کو اپنی ہمسایہ حکومت کے ساتھ کسی خارجی عمل سے دوچار نہ ہونا پڑے جس کے نتیجے میں حکومت جاتی رہے، یا حکومت کمزور ہو جائے اور عبدالرحمٰن الداخل کو شمالی افریقہ پر حملہ کرنے کا موقع مل جائے، ایک طرف تو یہ معاملہ تھا جبکہ دوسری طرف صورت حالت یہ تھی کہ عباسی خلافت نے بعض بیرونی حکومتوں کے ساتھ دوستی اور محبت کی سیاست اور پالیسی کا ڈور ڈالا تا کہ اپنے آپ کو ان حکومتوں کے ساتھ باہمی دوستی کی بناء پر خطرات

سے محفوظ کر لے۔(۱۳۳)

اس کے علاوہ دوسری صدی ہجری میں عباسیوں کی سیاست کا امتیازی وصف اپنی حکومت کے مقاصد کی تکمیل اور اس کے خلاف خروج کرنے والوں کے خاتمے کی پالیسی ہے، بلاشبہ عباسی ایک مضبوط سلطنت کے قیام میں کامیاب ہوئے جس کا اقتدار ماسوا اندلس پورے عالم اسلام میں پھیلا ہوا تھا، اس سلطنت کی وجہ سے تہذیب اور خوشحالی کے وہ اسباب پیدا ہوئے جنہوں نے اسے خاص طور پر ہارون الرشید کے دور میں خوشحالی، عیش وعشرت، لہوولعب اور گانے بجانے کی زندگی کی علامت اور نشان بنا دیا، مگر اس حکومت کی خوشحالی اور بے انتہا دولت سے صرف حکام اور ان کے حواری ودرباری ہی بہرہ ور ہوئے، عوام تنگی ترشی اور محرومی ہی میں مبتلا رہے، حکمران طبقے کی زندگی اور عام لوگوں کی زندگی کے درمیان گہری خلیج ان اہم عوامل میں سے ایک تھی، جس سے دولت عباسیہ ضعف، انتشار اور زوال کا شکار ہوئی۔

معاشرتی حالات

دوسری صدی ہجری میں معاشرتی عناصر اور ان کا باہمی تعلق

دوسری صدی ہجری میں اسلامی معاشرہ قومیت اور عقیدے کے لحاظ سے متضاد اور مختلف عناصر سے مرکب تھا، اس معاشرے میں غیر مسلموں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اسلام پہلی صدی ہجری میں ہی ان دور دراز علاقوں میں پھیل چکا تھا، جو ایسی اقوام پر مشتمل تھے جن کے اصول، عادات اور رسم ورواج ایک دوسرے سے یکسر مختلف تھے، یہ اقوام جن تک اہل عرب نے اسلام کا پیغام پہنچایا، ان کے سارے لوگ دعوتِ حق اور پیغامِ خیر کے مطیع نہ بنے، بلکہ ان میں سے کچھ لوگ اپنے موروثی عقائد پر قائم رہے، بغیر اس کے کہ وہ اسلام قبول کرنے کو ناپسند کرتے، کیونکہ دین میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ یہ لوگ دولت اسلامیہ کے زیر سایہ مختلف ادوار اور مختلف خطوں میں ہر قسم کی دینی رواداری اور فراخ دلی سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

جتنی زیادہ فتوحات اور شاندار کامیابیاں پہلی صدی ہجری میں ہوئیں، وہ دوسری صدی ہجری میں نہ ہوسکیں، حالانکہ دوسری صدی تقریباً انہی عناصر کا مجموعہ تھی جن سے پہلی صدی مرکب تھی، یہ صدی اصل میں عرب فاتحین، موالی اور ان مفتوحہ علاقوں کے لوگوں سے مرکب تھی، جنہیں اسلام نے اپنے سائے میں جگہ دی اور وہ اس کے پرچم تلے رہے، جبکہ موالی مختلف ملے جلے عناصر کا مجموعہ تھے، ان میں ایرانی، رومی، ترکی اور مصری ہر قسم کے لوگ تھے، اسی طرح وہ متعدد قومیتیں تھیں جو اسلام میں داخل ہو کر اس کے اقتدار کے تابع ہوگئیں۔

اس کے باوجود کہ اسلام نے قومی عصبیت کے خلاف جنگ کی اور تمام لوگوں کے درمیان مساوات کے اس اصول کو راسخ کر دیا کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر تقویٰ کے سوا کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے، اس کے علی الرغم اہل عرب یا موالی میں سے جو لوگ اس دین پر ایمان لائے، وہ پوری طرح اپنی عقلی اور سماجی میراث سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکے، وہ لوگ اپنے اصولوں اور آباء واجداد کی طرف نسبت، اپنے حسب ونسب اور اپنی قومیت پر تفاخر سے باہر نہ نکل سکے، چنانچہ اس معاشرے سے قومی، یا گروہی عصبیت کا خاتمہ نہ ہوسکا، بلکہ بعض حکمرانوں کی سیاست نے اس عصبیت کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا، تاکہ امت کی وحدت ویک جہتی کو پارہ پارہ کر کے اور لوگوں کو آپس میں لڑا کر وہ اپنے مقاصد حاصل کرتے رہیں۔

معاشرتی زندگی اور اس کی تاریخ میں اہل عرب اور اہل فارس کے درمیان عصبیت اس عصبیت کے مقابلے میں سختی اور نمایاں اثرات کے لحاظ سے کہیں زیادہ تھی جو عرب اور غیر اہل فارس جیسے ترکوں اور مغربی لوگوں کے درمیان تھی۔ اس کا بنیادی سبب غالباً امویوں کا وہ امتیازی سلوک تھا جو انہوں نے اہل فارس سے روا رکھا تھا کہ بڑے بڑے مناصب دینے میں عربوں کو ان پر ترجیح دی گئی، چنانچہ جب دولت عباسیہ قائم ہوگئی، جس میں اہل فارس کا بہت بڑا کردار تھا تو وہ عربوں سے برسرِ پیکار ہونے لگے اور ان سے ظلم وستم کے ذریعے امویوں کے طرزِ عمل کا انتقام لینے لگے، مقابلے میں عربوں نے اپنے حسب ونسب اور عزت وشرف کا دفاع

کیا، اور ہر فریق اپنی عصبیت اور قومیت کے دفاع میں اپنی حدود سے تجاوز کر گیا، حتیٰ کہ ان میں سے بعض نے اپنے قومی اور عصبیتی دعووں کو مضبوط کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹا الزام لگانے سے بھی دریغ نہ کیا۔

عربوں اور موالی (اہل فارس) کے درمیان یہ عصبیت اس گروہی عصبیت کا خاتمہ نہ کر سکی جو خود عربوں کے درمیان موجود تھی، لوگوں میں اپنے اپنے قبیلے کی طرف انتساب کا احساس بڑھتا رہا، اپنے قبیلے کی مدد کرنا اور اسے دوسرے طاقتور قبیلے سے بچانا ان کے پیش نظر تھا جس کی قوت اور سختی میں حکمرانوں کی سیاست نے مزید اضافہ کر دیا تھا، جیسا کہ بغداد میں منصور کے خفیہ ایجنٹوں کے ہاتھوں شمال کے رہنے والے مصری عربوں اور جنوب کے رہنے والے یمنی عربوں کے درمیان حادثہ پیش آیا تھا۔ (۱۳۴)

جس طرح دوسری صدی ہجری کی شہرت قومی اور گروہی عصبیت کے لحاظ سے ہے، اسی طرح یہ صدی علاقائی اور شہری عصبیت میں بھی مشہور ہے، عراقی حجازیوں سے تعصب رکھتے تھے، اور حجازی عراقیوں سے، شامی اپنے علاقے کے علاوہ دوسروں سے تعصب میں مبتلا تھے اور کوفی اہل بصرہ کے تعصب کا شکار تھے، اس پر مستزاد بغدادی بصرے، کوفے اور دیگر علاقوں کے خلاف تعصب کی آگ میں جل رہے تھے۔

اس علاقائی، یا شہری تعصب کا اثر علم کی طرف بھی منتقل ہوا، عراقی فقہ، حجازی فقہ کے مقابلے میں کھڑی تھی اور ہر ایک کے لیے تعصب رکھنے والے موجود تھے اور ہر ایک کا اپنا رنگ تھا۔ بصرے کا مدرسہ علم نحو کے سلسلے میں کوفے کے مدرسے کے بالمقابل کھڑا تھا اور ہر ایک کو کچھ متعصب حامی حاصل تھے۔ پھر نحو کے بارے میں مدرسہ بغداد یہ وجود میں آیا، جس کی خاص چھاپ تھی۔ اس کا اپنا ایک رنگ تھا اور اس کے لئے بھی تعصب رکھنے والوں کی کمی نہ تھی اہل بصرہ اور اہل بغداد کے درمیان جھگڑے شروع ہوئے ہر ایک کا بنیادی اور فروعی مسائل میں ایک مذہب تھا اور ہر ایک کو حمایتی اور مددگار میسر تھے۔

اس عصبیت نے لوگوں کو مختلف علاقوں کی خوبیوں اور خامیوں کے بارے میں احادیث گھڑنے پر

اکسایا۔متضاد اقوال جڑ پکڑ گئے جن میں سے کچھ اقوال کسی خطے کی مذمت کرتے ہیں تو بعض اس کی مدح کرتے ہیں۔ وضع احادیث کا یہ سلسلہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان اختلاف کے بعد شروع ہوا، جب شامی حضرات معاویہ کے طرفدار اور عراقی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے طرفدار بن گئے۔ پھر انہوں نے ایک دوسرے کے خلاف احادیث کے ذریعے ایک طرح کی تیراندازی کی۔ اس کے بعد شامیوں اور عراقیوں وغیرہ کے درمیان یہ علمی نزاع ان احادیث واقوال کی وجہ سے زیادہ ہو گیا جو ہر علاقے اور شہر کی خصوصیات اور ہر قوم کی اپنے علاقے سے عصبیت رکھنے اور اس سے برائی کو دور کرنے کو نمایاں کرتے تھے۔

خوشحالی کے اسباب اور معاشرتی زندگی پر اس کے اثرات

یہ معاشرہ قومیت کے اعتبار سے متضاد معاشرہ تھا۔ جو معاشرہ لڑائی جھگڑے اور عصبیت کی مختلف اقسام سے پہچانا جاتا ہو، وہ بالعموم دو طبقوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ایک مراعات یافتہ طبقہ جو عیش وعشرت کی انتہائی آرام دہ زندگی کے مزے لوٹتا ہے اور دوسرا طبقہ جو اپنی زندگی میں المناک محرومی سے دوچار ہوتا ہے۔

پہلا طبقہ خلفاء، وزراء، قائدین، ان کے تعلق داروں اور ان ہنرمند لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے جو اس طبقے کے لیے ان کی ضرورت کے وسائلِ عیش وعشرت اور کھیل کود کے آلات تیار کرتے ہیں، دوسرا طبقہ ان محنت کش عوام پر مشتمل ہوتا ہے جو اپنے حقوق سے محروم ہوتے ہیں اور ظلم وستم پر مبنی سیاست انہیں بدبختی اور محرومی کے شکنجے میں جکڑ لیتی ہے۔

اس عیش وعشرت اور آرام دہ زندگی کے تمام اسباب کا دارومدار اس بے بہا دولت پر تھا جس پر حکمران طبقہ قابض ہو گیا تھا اور اس نے اس پر بے دریغ تصرف کیا تھا۔ چنانچہ عباسی اقتدار مشرق میں چین اور وسط ہند کی حدود سے نکل کر مغرب میں بحر اوقیانوس تک پھیل گیا اور جنوب میں ہندوستان اور سوڈان سے نکل کر شمال کے علاقوں ترکستان، خزر، روم اور صقلیہ تک پھیل گیا۔ ان تمام علاقوں کا خراج (ٹیکس) حکومت بغداد کے

خزانے میں جمع ہوتا تھا۔صرف یہ خراج ہی اس دولت وثروت کا ذریعہ نہ تھا، بلکہ زکوۃ، جزیے اور ٹیکس کی دیگر اقسام، مثلاً محصول چنگی اور عشر بھی تھیں اور یہ ان اموال کے علاوہ تھے، جنہیں حکومت ضبط کر لیتی تھی۔(۱۳۵)

یہ متعدد ذرائع آمدنی ہی اس طاقت ور معیشت اور دولت مندی کا سرچشمہ تھے، جسے عوام کی فلاح وبہبود کے لے کم ہی خرچ کیا جاتا تھا، حکمران طبقے کے افراد میں بے تحاشا دولت وثروت عام ہوگئی جو اس میں جس طرح چاہتے تصرف کرتے اور اسے حکومتی عزائم کی تکمیل کا ذریعہ بنا لیتے تھے نیز انہوں نے اسے عوام کو فحاشی وبے حیائی، کھیل کود اور شان وشوکت میں غرق کرنے کے لیے استعمال کیا۔اسی طرح حکمران طبقے اور اس کے حواریوں میں جاگیریں عام ہوگئیں۔خلفاء افراد کو چاہتے، انہیں بڑی بڑی جاگیروں سے نواز دیتے، بغیر اس کے کہ حدود کا تعین ہو، اس طبقے کا مقابلہ دولت مندی، لہو ولعب کی فن کاری، مصاحبین، شعراء اور گویوں کو بھاری بھاری انعامات اور عطیات تک محدود تھا۔برامکہ اسی طرز کی جود وسخاوت کی وجہ سے مشہور ہوئے۔شاید اس سے ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ وہ دوسروں سے نمایاں نظر آئیں اور لوگ صرف انہی کی تعریف میں رطب اللسان ہوں۔اس کا سبب اس قومی جذبے کو اجاگر کرنا تھا، جس کے پیچھے اثر ورسوخ اور اقتدار کی خواہش اور آرزو کارفرما تھی۔

شان وشوکت، کبر وغرور اور عیش وعشرت کی یہ لہر جس نے حکمران طبقے اور ان کے تعلق داروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، اگر لوگوں کے ایک مختصر طبقے تک، جس کی اکثریت ایرانی الاصل تھی، محدود نہ ہوتی،(۱۳۶) اور عوامی طبقات اپنے بے داغ عربی فضائل کا تحفظ نہ کرتے (۱۳۷) تو پوری امت کی اجتماعی زندگی کا خاتمہ ہوجاتا۔یہی آخر الذکر عنصر تھا جس نے معاشرے کو بزرگی وشرافت، صلاح وتقویٰ کے ساتھ سختی سے وابستہ رکھنے میں کردار ادا کیا، وہ یہ تھا کہ مساجد اپنے نمازیوں سے آباد تھیں، علماء اور واعظین ہدایت وتقویٰ اختیار کرنے کی طرف لوگوں کی رہنمائی کر رہے تھے، درویش منش اور زاہد وعابد لوگ ہر جگہ لوگوں کے سامنے دنیا سے بے رغبتی اور سادگی کی بہترین اور سچائی پر مبنی مثالیں پیش کر رہے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ دوسری صدی ہجری، خاص طور پر اس کا نصفِ ثانی، فساد اور صلاح، ہدایت اور گمراہی کا مجموعہ تھا، ایک جانب کھلی بے حیائی و بے شرمی تھی تو دوسری جانب بے مثال زہد وتقویٰ تھا۔ ایک طرف الحاد و بے دینی تھی تو دوسری طرف ایمان اور دنیا سے بے رغبتی تھی۔(۱۳۸) لیکن اس زمانے میں خیر کا عنصر (کھیل کود اور اس عیش وعشرت کے باوجود جو بعد میں قصہ پارینہ بن گئی جس کے بعض واقعات ہی بیان کئے جاتے تھے) طاقتور اور ان عامل کی بناء پر غالب تر تھا جن کی طرف ابھی اشارہ کیا گیا ہے۔

دوسری صدی ہجری میں غلامی کا ارادہ

اولین عباسی دور میں اسلامی معاشرے میں لونڈی غلاموں کی ایک بہت بڑی تعداد موجود تھی۔ یہ اس معاشرے کا ایک بہت بڑا طبقہ تھے۔ حکمران طبقے کے محلات ان سے بھرے پڑے تھے۔ باقی لوگوں کے گھر بھی اکثر اوقات میں ان سے خالی نہیں رہتے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ پہلی صدی ہجری میں فتوحات کی وجہ سے لونڈیوں اور غلاموں کی ایک خوفناک تعداد وجود میں آئی۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان کی تجارت نے فروغ پایا اور مختلف دارالحکومتوں میں اس مقصد کے لیے منڈیوں کا قیام عمل میں آیا۔ بعض لوگوں نے اس تجارت کو اپنی معاش کا بنیادی ذریعہ بنالیا تھا یہی وجہ تھی کہ وہ لونڈیوں اور غلاموں کو دور دراز علاقوں سے خرید کر یا چرا کر لاتے تھے۔

اسلام جو آزادی، اخوت اور مساوات کا دین ہے وہ شرعی جہاد کے بغیر غلامی کو جائز قرار نہیں دیتا، اسی طرح اسلام دیگر تمام ذرائع کو بھی جائز قرار نہیں دیتا، جو انسانی تکریم کے لیے رسوائی کا باعث ہیں۔ یہاں غلاموں اور اسلام میں ان کے حقوق پر گفتگو کرنے کی گنجائش تو نہیں ہے مگر اس بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ عباسی دور کے آغاز میں غلام لونڈی اس معاشرے کا ایک بہت ہی نمایاں حصہ تھے۔ اس سے بڑھ کر اس کی دلیل اور کیا ہوسکتی ہے کہ غلامی کے بارے میں کتب فقہ میں اس پر باقاعدہ گفتگو کی گئی ہے، یہ فقہی کتابیں ایسے ابواب پر مشتمل ہیں جو خاص طور پر غلامی سے متعلق ہے، جیسا کہ فقہ کی تقریباً تمام کتب میں غلامی

کے جملہ احوال سے متعلق خصوصی احکام بیان کیئے گئے ہیں۔

فکری حالات

دوسری صدی ہجری میں فکری زندگی کی اٹھان

مؤرخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اولین دور میں فکری حالات ترقی یافتہ اور طاقتور تھے اور فکر و دانش منتشر جزئی مسائل کے مرحلے سے گزرنے کے بعد تنظیم، تبویب اور تدوین کے حالات مراحل سے گزر رہی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ فکری اٹھان مختلف ادوار میں اسلامی ثقافت کی مضبوط اساس بنی رہی۔ اس دور میں تقریباً تمام علوم کی اساس و بنیاد رکھ دی گئی تھی۔ کم ہی ایسا ہوا کہ کسی ایسے اسلامی علم نے بعد میں ترقی کی ہو جس کی داغ بیل عباسی دور میں نہ ڈالی گئی ہو۔ اس بناء پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ مسلمان اپنی طویل علمی زندگی میں خصوصاً علوم نقلیہ کے نام سے موسوم علوم کے میدان میں، اس علمی سرمائے سے فیض یاب ہوتے رہے، جن کی بنیاد عباسی دور میں رکھی گئی تھی۔ ان کا کام اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ کبھی کسی علمی موضوع کی تلخیص کر دیں اور کسی کی تشریح کر دیں، متفرق علمی مواد کو جمع کر دیں اور جمع شدہ مواد کو پھیلا دیں، جہاں تک نئے اور تخلیقی کام کا تعلق ہے تو وہ مفقود تھا۔

یہی وہ بنیادی عوامل تھے جنہوں نے اولین عباسی دور میں فکر و دانش کو اس طرح ترقی اور عروج سے ہمکنار کیا کہ یہ دور ثقافتِ اسلامیہ کی گزشتہ تاریخ میں نمایاں طور پر ابھر آیا۔

قبل اس کے کہ اس شاندار فکری اٹھان کے بلاواسطہ اور بالواسطہ اسباب کا تذکرہ کیا جائے، اس بات کی طرف اشارہ کرنا مناسب ہوگا کہ اسلام علم و معرفت اور تفکر و تدبر کا دین ہے، قرآن کریم کی سب سے پہلے نازل ہونے والی آیت کریمہ کو جو اسلام کے دستور کی حیثیت رکھتی ہے، علم کی کنجی قرار دیا جاتا ہے، علم کی خواہ کوئی بھی نوعیت اور قسم ہو، اس کتاب عزیز کی بہت سی آیات متعدد مواقع پر غور فکر کی دعوت دیتی ہیں، یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ علم ایمان کا خادم ہے اور آدمی کے علم میں جوں جوں اضافہ ہوگا، وہ اسی قدر زیادہ خشیت

الٰہی اختیار کرے گا۔ یرفع الله الذین آمنوا منکم والذین اوتوا العلم درجات (۱۳۹) تم میں سے جولوگ ایمان رکھنے والے ہیں اور جن کو علم بخشا گیا ہے، اللہ ان کو بلند درجے عطا کرے گے۔ انما یخشی الله من عباده العلماء۔ (۱۴۰) دراصل اللہ سے اس کے اہل علم بندے ہی ڈرتے ہیں۔

اسلام نے علم اور اہل علم کو جو مقام دیا ہے، یہ ایک وسیع بحث کا متقاضی ہے۔ یہاں صرف اس حقیقت کا اظہار کرنا کافی ہے کہ اسلام نے بحث وتحقیق اور علم کے میدان عقل انسانی کے سامنے وا کر دیئے۔ اس دین قویم کا کوئی بھی حکم ایسا نہیں، جو عقلی سرگرمی کی ترقی ونشونما پر قدغن لگاتا ہو، بلکہ حکمت ودانائی تو مومن کی گم شدہ میراث ہے، اسے تاکید کی گئی کہ وہ جہاں بھی علم وحکمت پائے، لے لے اور جن کے پاس بھی دیکھے ان سے حاصل کرے۔ اسی وجہ سے اسلام جس طرح انسانیت کو شرک وجاہلیت کی گمراہیوں سے نجات دلانے کے لیے آیا اسی طرح اس کا مقصد انسانیت کو جہالت اور بے علمی کی خرافات سے نجات دلانا بھی تھا۔

اسلام ہمیشہ علم وفکر کا دین رہا ہے، جولوگ دور رسالت میں اس نظامِ حیات پر ایمان لائے، وہ ہر اس علم کے حصول پر متوجہ رہے جو ان کے دینی ودنیوی معاملات میں نفع کا باعث تھا۔ عام حالت میں وہ سب سے پہلے قرآن وسنت کا علم حاصل کرنے کا اہتمام کرتے، تاکہ دینی احکام کے بارے میں انہیں دلائل پر مبنی علم حاصل ہو، لیکن جب فتوحات کا سلسلہ تھم گیا تو اسلامی علوم کی کئی اقسام وجود میں آئیں اور علم کے میدان میں ایسے ماہرین پیدا ہوئے جنہوں نے تہذیب اور انسانیت کے لیے عظیم خدمات انجام دیں، ان کی عبقریت ان کے چھوڑے ہوئے علمی آثار وخدمات سے ظاہر ہوتی تھی۔ مسلمانوں نے جدید تہذیب کی تعمیر نو کے لیے بنیادیں فراہم کیں۔

فکرودانش اسلامی معاشرے میں کئی مراحل طے کر کے تدریجاً پروان چڑھی تھی، اولین عباسی دور تک پہنچتے پہنچتے وہ از حد طاقتور، گہری اور عمومیت کی حامل ہو چکی تھی، اس لیے عباسی دور میں وہ کہیں باہر سے آ کر یکا یک اسلامی ثقافت میں داخل نہیں ہوگئی تھی۔ اموی دور خلافت میں دوسری زبانوں سے کتابوں کے عربی

میں ترجمے کی ابتدائی کوششیں خالد بن یزید بن معاویہ (۱۴۱) کی زیر نگرانی ہوئیں، اس دور میں مختلف فرقے وجود میں آئے اور ان کے درمیان لڑائی جھگڑے عباسی دور تک رہے۔ یہ بات تمہید میں گزر چکی ہے کہ پہلی صدی ہجری میں مختلف اور متضاد تہذیبوں، ثقافتوں اور رسم و رواج کے حامل علاقوں میں اسلام کی اشاعت نے اسے فکری عروج تک پہنچا دیا۔ یہ فکری عروج فقہی اجتہاد کو اسی طرح شامل تھا جس طرح وہ اسلام اور مفتوحہ علاقوں کے عقائد کے درمیان مخاصمت کو شامل تھا۔ عباسی دور میں اس فقہی اجتہاد نے نشو و نما پائی اور عقائد کے جھگڑوں نے شدت اختیار کی۔ اس کے باوجود اس بات پر اتفاق ہے کہ عباسی دور میں فکر و دانش نے جو اگرچہ اموی دور کے فکر و دانش کا تسلسل تھا، قابل لحاظ تدریجی ترقی کی اور تصنیف و تالیف کے میدان میں ایک بہت بڑا قدم اٹھایا گیا۔

رہے وہ اسباب جو اس ترقی و عروج نے فکر و دانش کو فراہم کئے، تو وہ بہت زیادہ اور متنوع قسم کے تھے، ان میں سے بعض کا انحصار زمانے، اس کے تسلسل، معاشرے کی وسعت اور تہذیبی اسباب کی فراہمی پر اس سے کہیں زیادہ تھا جتنا کہ اس سے قبل تھا۔ بعض دوسرے اسباب کا دارومدار فکر اسلامی میں اجنبی ثقافتوں کے اثر پر تھا۔

زمانے کا عنصر مخلوط قومیتوں، ان کے کردار اور غلاموں کی نسل کی صورت میں ظاہر ہوا، جو اصل عربوں کی طرح خوب اچھی طرح عربی زبان بولتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے آباء و اجداد کی زبان میں اپنی ثقافت بھی رکھتے تھے۔ ان کو فکر و دانش اور اس کی اٹھان میں ایک مؤثر کردار حاصل تھا۔ انہوں نے اپنی میراث کو عربی زبان میں منتقل کیا اور جو علمی سرمایہ ان کے آباء و اجداد نے اپنی زبانوں میں لکھ کر جمع کیا تھا، اس میں بزبان عربی اضافہ کیا۔ لہٰذا یہ جدید علمی امتزاج زرخیزی اور گہرائی کے لحاظ سے فکر و دانش کے حصول کا زیادہ بڑا ذریعہ بنا۔ غلاموں کی اس نسل کو علمی اثرات کی وجہ سے عرب فاتحین کے سامنے اپنے کمزور ہونے کا کچھ زیادہ احساس ہوا اور اپنی قدیم شان و شوکت کو دوبارہ حاصل کرنے کا شوق چرایا، چنانچہ انہوں نے طلب علم

میں محنت شروع کر دی اور انتہائی ذوق وشوق کے ساتھ اس کے لیے یکسو ہو گئے، یہاں تک کہ مسلمان معاشرے میں اکثر حاملین علم موالی (۱۴۲) میں سے تھے، اس صورت حال نے بعض خلفاء کو پہلی صدی ہجری میں پریشان کر دیا، اس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ دوسری صدی میں اور خاص طور پر عباسی دور میں ان موالی علماء نے اتنے فوائد ومنافع حاصل کئے، جو اس سے قبل انہیں حاصل نہ ہوئے تھے۔ وہ اسلامی ثقافت کے مختلف شعبوں میں امام بن گئے۔ انہوں نے اپنی تالیفات وتصنیفات کے ذریعے علمی وفکری سرگرمیوں پر گہرا اثر ڈالا، یہاں تک کہ عربی زبان وادب پر بھی۔

زمانے کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی اثر انداز ہوئی کہ امت مسلمہ منتشر جزئی مسائل کے مرحلے سے گزر چکی تھی، لہٰذا اب ضروری ہو گیا تھا کہ وہ دوسرے مرحلے، یعنی علوم کی تنظیم وتدوین اور انہیں الگ الگ مدون کرنے کے مرحلے کی طرف منتقل ہو، مگر یہ مرحلہ صرف علوم نقلیہ، یعنی علوم دینیہ، لغویہ اور ادبیہ پر ہی مشتمل تھا، رہے علومِ عقلیہ، یعنی طب، منطق اور ریاضی وغیرہ تو یہ امت مسلمہ میں منظّم طور پر شروع ہوئے کیونکہ یہ علوم اپنی اصل لغات سے عربی زبان میں تنظیم وتدوین کے مرحلے کے لیے منتقل ہوئے تھے اور ان کے لیے اس بات کی حاجت نہ تھی کہ وہ دوبارہ از سر نو طبعی مراحل سے گزریں۔

جوں جوں معاشرہ ترقی کرتا ہے، علم میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور علم دولت مندی اور تہذیب کے زیر سایہ ترقی کرتا ہے، (۱۴۳) کیونکہ اس کی شان یہ ہے کہ لوگوں کی زندگی میں اس کی وجہ سے زیادہ ٹھہراؤ آ جاتا ہے اور خوشحالی آسان ہو جاتی ہے اور انہیں زمانے سے بھرپور سرمایہ حاصل ہوتا ہے جسے وہ علوم کے حصول، ان کی تدوین اور انہیں تحریری شکل میں لانے پر خرچ کرتے ہیں، اس پس منظر میں عباسی دور میں آبادی وسعت اختیار کر چکی تھی اور اسلامی تہذیب قدیم تہذیبوں کی علامات سمیت ترقی وعروج حاصل کر چکی تھی، خوشحالی وخوشگوار زندگی کے وسائل اس بے حد وحساب دولت کی وجہ سے، جس کے ذرائع کی طرف گزشتہ صفحات میں اشارہ کیا جا چکا ہے، لوگوں کی اکثریت کو حاصل تھے۔ ان تمام وجوہ کی بناء پر عباسی دور بارآور علمی زندگی کے

لیے پوری طرح سازگار بن گیا تھا۔

کاغذ کی صنعت کو جو تہذیبی مظہر ہے، اولین عباسی دور نے متعارف کرایا، یہ فکر و دانش کی ترویج و ترقی کے اہم اسباب میں سے ایک تھا، کیونکہ اس صنعت کی بدولت کتابوں کو لکھنا، انہیں دور دور پھیلانا اور ان سے نفع حاصل کرنا آسان ہو گیا تھا، جبکہ اس سے پہلے لوگ چمڑے یا ورق البردی پر لکھا کرتے تھے جو مصر میں تیار کیا جاتا تھا اور جس کا حصول کوئی آسان کام نہ تھا۔

اجنبی ثقافتوں کا تعارف بھی اس زمانے مین فکر و دانش کی ترقی کے اہم اسباب میں سے تھا۔ اگر چہ ان ثقافتوں سے اتصال کے لیے اموی عہد میں کوششیں ہوئیں، مگر وہ محدود تھیں، جنہوں نے فکر و دانش میں کوئی قابلِ ذکر کردار ادا نہ کیا، جب دولت عباسیہ کا قیام عمل میں آیا تو عباسی خلفاء نے دوسری ثقافتوں کے علمی سرمائے کو عربی زبان میں ترجمہ کرانے کا اہتمام کیا، چنانچہ ترجمے کا یہ سلسلہ منصور کے عہد میں شروع ہوا۔ مامون الرشید کے دور میں اس میں ترقی ہوئی، ترجمے کے اہتمام اور اس کے لیے اموال خرچ کرنے میں خلیفہ، برامکہ اور ریاست کے دیگر لوگ شریک تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مامون الرشید نے ''دارالحکمت'' قائم کیا، روم اور دوسرے علاقوں سے اس کے لیے اجنبی کتب حاصل کیں، اور مترجمین کی ایک بہت بڑی تعداد کو مقرر کیا کہ وہ بھر پور طریقے سے ترجمے کا کام کریں، ان کتب پر نظر ثانی بھی کریں جو اس سے قبل ترجمہ ہو چکی تھیں تا کہ یہ کام زیادہ باریک بینی اور پختگی کے ساتھ ہو، یہ بارآور علمی تحریک مامون الرشید کے عہد میں جس عروج پر پہنچی، دراصل وہ مرہون منت تھی خلیفۂ وقت کی کہ اس نے کھلے دل سے کثیر رقم اس پر خرچ کی۔ مامون الرشید کا عہد بجا طور پر دولت عباسیہ کی تاریخ میں تراجم کے کام کے حوالے سے سنہری دور شمار کیا جاتا ہے، اگر چہ اسلامی فکر و دانش کی تاریخ میں ہمیشہ ایسا نہیں ہوا، سوائے عصر حاضر کے۔

غیر عربی کتب کا ترجمہ ایک دروازہ تھا جس سے اجنبی علوم اسلامی معاشرے کے فکر و دانش میں داخل ہوئے۔ یہ علوم متنوع قسم کے تھے، ان میں ریاضی، طب، فلکیات، کیمیا، فلسفہ، منطق، موسیقی، ادب اور

سیاست شامل تھے، جس طرح علوم قسم قسم کے تھے وہ زبانیں بھی متنوع قسم کی تھیں جن سے یہ علوم نقل کئے گئے، مثلاً رومی، یونانی، فارسی اور ہندی وغیرہ۔

تاہم یہ بات تاریخی طور پر صحیح نہیں ہے کہ اسلامی معاشرے میں سرایت کرنے والے علوم یا قدیم اقوام کے جو علوم مسلمانوں میں منتقل ہوئے ان کا واحد ذریعہ صرف تراجم کا کام تھا، مفتوحہ علاقوں کے باشندوں کے ساتھ براہ براست امتزاج اور تصنیف و تالیف نے بھی اجنبی علوم کو عربی زبان میں منتقل کر دیا تھا یہ بات ابھی گزر چکی ہے کہ ان مفتوحہ علاقوں کے باشندوں میں ایسے لوگ بھی تھے جو اہل زبان کی طرح عربی زبان کو خوب اچھی طرح جانتے، سمجھے اور بولتے تھے، اور انہوں نے اپنی قومی زبانوں میں لکھے ہوئے اپنے آباء واجداد کے علمی سرمائے کو عربی زبان میں منتقل کر دیا تھا، جہاں تک مفتوحہ علاقوں کی علمی میراث سے مسلمانوں کے آگاہ ہونے میں براہ راست زبانی گفتگو کے کردار کا تعلق ہے تو وہ دینی و مذہبی معرکہ آرائی اہم ہے جو مسلمانوں اور ان علاقوں کے باشندوں کے درمیان ہوئی جو اپنے مناصب اور اپنے موروثی عقائد پر سختی سے قائم رہے، اس مذہبی معرکہ آرائی کی وجہ سے غیر اسلامی عقائد وافکار کو اسلامی معاشرے میں داخل ہونے کا موقع ملا۔ اس کا اظہار بعض ایسے نظریات وآراء کے پھیلنے کی صورت میں ہوا جنہوں نے بعض مسلمانوں کے افکار میں جوش پیدا کر دیا تھا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اہل ہوی اور ملحدین سرگرم ہو گئے، اسی طرح اس کا نتیجہ یہ بھی نکلا کہ مسلمانوں نے اپنے جھگڑوں اور مناظروں میں جدلی طریقوں اور نئے قیاسی انداز کو استعمال کیا، حتی کہ وہ اپنے حریف کے دلائل کے بالمقابل اپنا دفاع کرنے کے قابل ہو گئے، ان حریفوں نے اپنے آراء کی تائید میں ان مناظرہ بازوں کا طریقہ اختیار کیا تھا جو دلائل کی ترتیب و تنظیم میں انتہا پسندی کا مظاہرہ کرتے تھے یہ ایک سبب تھا یونانی منطق کو ترجمے کے ذریعے عربی میں منتقل کرنے کا، جو بعد ازاں اسلامی علم کلام کی ترقی کا سبب بنا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلامی معاشرے میں بلاد مفتوحہ کے علوم کے نفوذ نے فکر و دانش کی اٹھان

اور عروج میں نمایاں کردار ادا کیا ہے، اس سے علماء کے ذہن کے دریچے وا ہوئے، ان کے علمی مطالعے اور تنقیدی مہارت میں قوت اور مضبوطی پیدا ہوئی، اور یہ امتزاج منہج عقلی کا قائد بن گیا، خاص طور پر عراق میں اسے خصوصی اہمیت حاصل ہوئی۔

اس کے باوجود ان ثقافتوں اور علوم پر مسلمانوں کا انحصار صرف واجبی سا نہ تھا، بلکہ وہ پورے ذوق وشوق اور عقلی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کی طرف متوجہ ہوئے تھے انہوں نے ان علوم کی تشریح وتوضیح کی، ان میں اضافے کیے، ان میں تصنیفات کیں، اور مختلف علوم وفنون میں اپنی سبقت اور بے مثال مہارت کا سکہ بٹھا دیا۔

اس کے بعد مسلمانوں نے ان علوم کا ترجمہ کر کے پوری انسانیت پر بہت بڑا احسان کیا، کیونکہ انہوں نے علمی میراث کو ضائع ہونے سے بچالیا تھا اور اسے اپنی مفید شروح وتعلیقات اور نئے اضافوں کے ساتھ پیش کیا تھا، پس یہ وہ چراغ تھا جس نے ازمنہ وسطیٰ کے گھٹا ٹوپ اندھیروں کو کافور کر دیا، اور یورپ کے لیے نئے تہذیب وتمدن کی راہ روشن کر دی۔

علوم اسلامیہ کی ترقی

مذکورا سباب اور ان کے علاوہ دیگر اسباب کا نتیجہ یہ نکلا کہ اولین عباسی دور میں فکرودانش پروان چڑھی اور پختہ ہوگئی، یہ تحریک تمام اسلامی علوم فقہ حدیث، تفسیر، ادب اور تاریخ وغیرہ پر مشتمل تھی، عراق نے تمام ممالک سے زیادہ اس فکری تحریک سے فائدہ اٹھایا اور اس کی صورت گری میں اہم کردار ادا کیا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عراق کو تہذیب وثقافت میں گہری جڑیں رکھنے والی تاریخ کے حامل خطے کا اعزاز حاصل ہوگیا، اموی عہد میں یہ اپنے علوم کی بناء پر اہل شام پر اظہار برتری کرتا تھا، جب خلافت عباسیہ نے شام کو چھوڑ کر عراق کو اپنا پایہ تخت بنایا اور اپنی سلطنت کا دار الخلافہ قائم کرنے کے لیے بغداد شہر کی تعمیر کی اور ایرانیوں کو اس حکومت میں اثر ونفوذ حاصل ہوا جو اس سے پہلے انہیں حاصل نہ تھا، تو یہ علمی تحریک عراق میں سرگرم عمل ہوگئی، اس تحریک کی

سرگرمی میں اس بات نے مزید اضافہ کر دیا کہ خلفاء اور امراء نے بیرونی علوم کے تراجم کرائے اور علماء و شعراء کی عزت و تکریم میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، جس کی وجہ سے بغداد اپنی تاسیس کی مختصر مدت کے بعد ایسا علمی مرکز بن گیا جو دمشق اور مدینہ منورہ کا مقابلہ کرتا تھا۔

خلافت عباسیہ کا پایۂ تخت عراق منتقل ہونے کے بعد عراق دیگر اسلامی خطوں کے مقابلے میں معاشرت اور دولت و ثروت کے لحاظ سے بہت آگے نکل گیا، اسی کا نتیجہ تھا کہ لوگوں کو حصول علم اور علمی مراکز اور مباحثوں کے لیے فراغت کے اوقات میسر تھے، اسی طرح اس کی مخلوط اور پیچیدہ اجتماعی زندگی نے متعدد نئے مسائل و مشکلات کو جنم دیا۔ اس صورتِ حال نے فقہاء پر لازم کر دیا کہ ان مسائل پر غور و فکر کریں اور ان کا کوئی حل نکالنے کی راہیں تلاش کریں، بعض مؤرخین کا بیان ہے کہ بلاشبہ عراق کے نظام زراعت کو ''کتاب الخراج لابی یوسف'' کے تالیف کرانے میں بہت بڑا دخلِ حاصل ہے۔

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ سیاسی مسائل و واقعات جو سیدنا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد رونما ہوئے اور جن کا میدان جنگ عراق تھا، وہ بہت سے مختلف فرقوں کے وجود میں آنے کا سبب بنے۔ ان فرقوں کے درمیان فکری معرکہ آرائی شدت کے لحاظ سے جنگی معرکہ آرائی سے کسی طرح کم نہ تھی۔ اس محاذ آرائی نے عراق کی قدیم فکری میراث کو ملیامیٹ کر دیا، اسلام کے خلاف بعض کینہ و حسد رکھنے والوں نے ان فرقوں کی صفوں میں گھس کر ایسی آراء اور ایسے نظریات پھیلا دیئے جو فرقہ بندی کی آگ کو بھڑکا دینے اور امت کو پارہ پارہ کرنے والے تھے، لیکن بالآخر یہ معرکہ آرائی عراق میں فکر و دانش کی ترقی کے لیے انتہائی اہم عامل ثابت ہوئی، یہاں تک کہ اولین عباسی دور میں فکری بلندی کا نشان بن گئی۔

فرقے اور ان کے فکری اثرات

چونکہ اس دور میں علمی ترقی کے تمام اسباب وافر مقدار میں میسر تھے، اس لیے فقہاء علماء اور شعراء کی ایک بہت بڑی تعداد سامنے آئی۔ اسلامی دارالحکومتوں میں مختلف علمی مناظرے اور مباحثے ہوتے تھے، ان

میں سے بعض میں خلفاء اور امراء بھی شریک ہوتے تھے، اسی طرح یہاں طلب علم اور حصول معرفت کے لیے کوشاں فوج درفوج آنے والوں اور یہاں سے جانے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا، علمائے لغت دیہات کا رخ کرتے تاکہ وہاں کے باشندوں سے اصل اور بے داغ زبان سیکھیں۔ ادب وتاریخ کے علماء قبائل اور بستیوں میں منتقل ہوتے رہتے تاکہ اشعار اور واقعات کو جمع کریں۔

اس دور کے فقہاء حج وغیرہ کے مواقع پر جمع ہوتے اور باہم علمی مذاکرے اور تبادلۂ آراء کرتے تھے، ان میں سے بعض تو دوسرے علماء سے احادیث اور فقہ کی معرفت حاصل کرنے کے لیے انتہائی حرص کا مظاہرہ کرتے تھے اگر سفر کی سہولت میسر ہوتی تو اس کے ذریعہ استفادہ کرتے ورنہ باہمی خط وکتابت کے ذریعہ یہ کام کرتے تھے۔

علمائے حدیث کے پاس احادیث کا وافر ذخیرہ جمع ہوگیا تھا اگرچہ یہ جمع شدہ ذخیرہ اقوال صحابہ وتابعین پر مشتمل تھا۔

فقہاء کی ان باہمی ملاقاتوں اور علمی سفروں کے نتیجے میں فقہی مدارس کا آغاز ہوا، یہ مدارس دوسری صدی کے نصف ثانی میں وجود میں آئے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کے مختلف شہروں میں منتشر ہوجانے اور متعدد اجتماعی تاریخی حالات کا نتیجہ تھے جن علماء کی باہم ملاقاتیں رہیں، ان کی وجہ سے مذاہب میں باہمی قرابت پیدا ہوئی، اختلاف کا دائرہ تنگ ہوا، اہل رائے اہل حدیث کے درمیان اختلافات میں کمی واقع ہوئی۔

فقہ اولین عباسی دور میں قانون سازی کے انتہائی زرخیز ترین مرحلے سے گزر رہی تھی، جس کی مثال اس کی طویل تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس دور میں اجتہاد نے قابل لحاظ ترقی کی۔ مجتہدین کی حیران کن حد تک ایک بڑی تعداد وجود میں آئی۔ فقہ کا دائرہ انتہائی وسعت اختیار کر گیا۔ اس نے عبادات اور معاملات کے ہر پہلو اپنی گرفت میں لے لئے، یہ نئے مآخذ ومصادر پر قائم ہوا جو ان مصادر پر اضافہ تھے جن سے صحابہ رضی اللہ عنہ

وتابعین متعارف ہوئے تھے، اور فقہی آراء اہم علمی بحث و تحقیق کی روح کے ساتھ فروغ پذیر ہوئیں، اسی طرح انہوں نے معاشرے اور رسم و رواج پر واضح اور گہرا اثر ڈالا۔

فقہ تقدیری (فرضی): اولین عباسی دور میں

پہلی صدی کے اواخر میں فقہاء اگر مسائل کی تفریع و تقدیر کی طرف متوجہ ہوئے تو عباسی دور میں انہوں نے مسائل کی تفریع اور ان کو فرض کرنے اور ان کے احکام مستنبط کرنے میں وسعت اختیار کی، اس سلسلے میں سب سے بڑی کاوش اہل عراق کی تھی، انہوں نے کثرت سے قوتِ تخیل پر اعتماد کیا، جس نے انہیں اس قابل بنا دیا کہ وہ لوگوں کے لیے ایسے ہزاروں مسائل نکالیں جن کا وجود ناممکن ہو، ان میں سے ایسے مسائل کو بھی فرض کر کے نکالا کہ نسلیں بیت جاتی ہیں، اور انسان ان کے وجود کا احساس تک نہیں کر پاتا۔

فقہ کے پھیل جانے، بہت سی آراء میں عملی ضرورت سے دور ہو جانے، نیز بعض فقہاء کے ہاں حیلوں کے مسائل وضع ہونے میں نظری فقہ کا عمل دخل ہے، یہ حیلے اس لیے تھے کہ لوگ ان حیلوں کے ذریعہ جان سکیں کہ وہ کس طرح احکام شریعت پر عمل نہ کریں اور سزا سے بھی بچ جائیں۔

ان تمام وجوہ کی بناء پر دوسری صدی میں متعدد فقہی مذاہب وجود میں آئے، جن میں سے بعض صفحہ ہستی سے مٹ گئے اس کے کچھ اسباب تھے جن کی وضاحت کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔

مذاہب فقہ کب ظہور پذیر ہوئے؟

اگرچہ یہ دور مذاہب فقہ کے نشو و نما پانے کا دور تھا اور یہی دور ان کی تدوین کا دور تھا، تاہم مسلمانوں کے کئی فقہی مذاہب کی واضح تقسیم تیسری صدی ہجری کے نصف ثانی میں نمایاں ہوئی، جب اس دور میں لوگ اپنے مذاہب کی تقلید اور ان کی تائید کے لیے تعصب کا اظہار کرنے لگے تھے اس سے قبل ایسا نہ تھا۔

ابو طالب مکی کہتے ہیں کہ کتب اور مجموعوں کا رواج نیا ہے، اسی طرح لوگوں کا اقوال کو اختیار کرنا، ان کا کسی ایک فقیہ کے مذہب کے مطابق فتویٰ دینا، اس کا قول اختیار کرنا اور ہر چیز کے مقابلے میں اسی کو بیان کرنا

اور اسی کے مذہب کے مطابق فقہ حاصل کرنا بھی ایک نئی چیز ہے، پہلی دو صدیوں میں لوگ ایسا نہ کرتے تھے۔

پہلی اور دوسری صدی میں مجتہدین کثیر تعداد میں موجود تھے، جس آدمی کو بھی کوئی معاملہ پیش آتا اور اسے فتوے کی ضرورت ہوتی تو اسے جو مجتہد میسر آتا، اس کے سامنے مسئلہ پیش کر دیتا۔ خواہ وہ کوئی بھی ہوتا اور اس کے فتوی پر عمل کرتا تھا، پس جب عباسی دور میں زمانے نے ترقی کی، یا مختصر الفاظ میں تیسری صدی ہجری کا نصف گزر گیا تو مذاہب نے ایک معین شکل اختیار کر لی اور ائمہ کے مناہج بھی متعین اور واضح شکل اختیار کر گئے، ان کے متبعین اور پیروکار بھی پیدا ہو گئے جو ان کا دفاع کرتے اور ان کے حق میں تعصب سے کام لیتے تھے۔ یوں امت احناف، شافعیہ اور مالکیہ کے مسائل فقہی پر عمل کرنے لگی۔

☆☆☆☆☆

المراجع والمصادر باب اول

١. سورة الطلاق آیت نمبر ١٠، ١١

٢. محمد بن حسن الحجوی، "الفکر السامی فی تاریخ الفقه الاسلامی" دارالکتب العلمیة بیروت لبنان، ١٩٩٥م، صفحه /جلد١/٦٣

٣. "مجلة القانون والاقتصاد" جامعه القاهره مصر سال١ عدد٣/٣٢٨

٤. ایضاً عدد٣/٣٤٠

٥. مناع بن خلیل القطان، "تاریخ التشریع الاسلامی" مکتبة وهبة، ٢٠٠١م، صفحه /جلد١/٤٠١

٦. ابو اسحاق ابراهیم بن موسی الغرناطی الشهیر بالشاطبی، "الموافقات للشاطبی" دار ابن عفان، ١٩٩٧م، صفحه /جلد ٤/١٨٤

٧. النحل:٤٤

٨. الانفال:٦٧، ٦٨

٩. ابو الحسین سید الدین علی بن ابی علی بن محمد بن سالم الآمدی "الاحکام فی اصول الاحکام للآمدی" المکتب الاسلامی بیروت، دمشق، لبنان، صفحه /جلد٤/٢٢٢

١٠. النجم: ٣، ٤

١١. ابو الحسین سید الدین علی بن ابی علی بن محمد بن سالم الآمدی "الأحکام فی أصول الأحکام للآمدی" المکتب الاسلامی بیروت، دمشق، لبنان، صفحه /جلد٤/٢٢٧

١٢. محمد امین بن محمود البخاری المعروف بأمیر بادشاه الحنفی "تیسیر التحریر" دارالفکر بیروت صفحه /جلد٤/١٨٤

١٣. علی حسب الله "اصول التشریع الاسلامی" دار الفکر العربی ١٩٩٧م صفحه /جلد٧٠

١٤. آل عمران:١٥٩

١٥. ابو الحسين سيد الدين على بن ابى على بن محمد بن سالم الآمدى "الاحكام فى اصول الاحكام للآمدى" المكتب الاسلامى بيروت، دمشق، لبنان صفحه /جلد٤/٢٢٣

١٦. محمد ابن ابى بكر بن أيوب سعد شمس الدين ابن قيم الجوزية "إعلام الموقعين عن رب العالمين" دارالكتب العلمية بيروت ١٩٩١م صفحه /جلد١/١٧٢

١٧. ايضاً

١٨. محمد امين بن محمود البخارى المعروف بأمير بادشاه الحنفى "تيسير التحرير" دارالفكر بيروت صفحه /جلد٤/١٨٧

١٩. النساء:٥٩

٢٠. سيد ابو الاعلىٰ مودودى "تفهيم القرآن" مكتبه تعمير انسانيت لاهور صفحه /جلد١/١٤٩

٢١. محمد ابو زهره "محاضرات فى تاريخ المذاهب الفقهّيه" مكتبة الشيخ كراچى صفحه /جلد٨

٢٢. التوبه:٤٢،٤٣

٢٣. محمد بن حسن الحجوى "الفكر السامى فى تاريخ الفقه الاسلامى" دارالكتب العلمية بيروت لبنان ١٩٩٥م صفحه /جلد١/٥٤

٢٤. محمد امين بن محمود البخارى المعروف بأمير بادشاه الحنفى "تيسير التحرير" دارالفكر بيروت صفحه /جلد٤/١٩٣

٢٥. مصطفىٰ الزرقاء "الفقه الاسلامى فى ثوبه الجديد" دار القلم دمشق ١٩٩٨م صفحه /جلد١/١٥٦

٢٦. مناع بن خليل القطان "تاريخ التشريع الاسلامى" مكتبة وهبة ٢٠٠١م صفحه /جلد٣١

٢٧. ابو محمد على بن أحمد بن سعيد بن حزم الأندلسى القرطبى الظاهرى "الإحكام فى أصول الأحكام لابن

حزم" دارالآفاق الجديدة، بيروت صفحه /جلد٨٤/٦

٢٨. أبو عبد الله محمد بن محمد بن محمد العبدری الفاسی المالکی الشهير بابن الحاج "المدخل لاصول الفقه" دارالتراث صفحه /جلد٦٢

٢٩. مناع بن خليل القطان "تاريخ التشريع الاسلامی" مكتبة وهبة ٢٠٠١م صفحه /جلد٧٧

٣٠. أبو عبد الله محمد بن محمد بن محمد العبدری الفاسی المالکی الشهير بابن الحاج "المدخل لاصول الفقه" دارالتراث صفحه /جلد٦٢

٣١. زكی الدين شعبان "اصول الفقه الاسلامی" مطبع دار التأليف ١٩٦١م صفحه /جلد١٤

٣٢. مصطفیٰ الزرقاء "الفقه الاسلامی فی ثوبه الجديد" دار القلم دمشق ١٩٩٨م صفحه /جلد١٤٩/١

٣٣. عباس محمود العقاد "التفكير فريضة اسلاميه" المكتبة العصرية مصر ٢٠٠٨ صفحه /جلد ٣

٣٤. مناع بن خليل القطان "تاريخ تشريع الاسلامی" مكتبة وهبة ٢٠٠١م صفحه /جلد١٠٣

٣٥. محمد ابو زهره "محاضرات فی تاريخ المذاهب الفقهيه" مكتبة الشيخ كراچی صفحه /جلد١٣

٣٦. احمد امين، "فجر الاسلام"، دارالكتب العلمية بيروت ١٩٢٩ء صفحه /جلد٢٣٥

٣٧. ابو محمد علی بن أحمد بن سعيد بن حزم الاندلسی القرطبی الظاهری "الفصل فی الملل و الأهواء و النحل" مكتبة الخانجی القاهرة صفحه /جلد٣٨/٢

٣٨. محمد ابن ابی بكر بن أيوب ب سعد شمس الدين ابن قيم الجوزية "إعلام الموقعين عن رب العالمين" دارالكتب العلمية بيروت ١٩٩١م صفحه /جلد٢٧/١

٣٩. ابومحمد علی بن احمد بن سعيد بن حزم الاندلسی القرطبی الظاهری "الفصل فی الملل و الأهواء و النحل" مكتبة الخانجی القاهرة صفحه /جلد٣٦/٢

٤٠. ابوالعباس شمس الدين احمد بن محمد بن ابراهيم بن ابی بكر ابن خلكان "وفيات الاعيان و أنباء ابناء

الزمان" دار صادر ، بیروت صفحه /جلد١/١٩٦

٤١. محمد ابن ابی بکر بن أیوب ب سعد شمس الدین ابن قیم الجوزیة "إعلام الموقعین عن رب العالمین" دارالکتب العلمیة بیروت ١٩٩١م صفحه /جلد١/١٨٨

٤٢. عبدالرحمن بن محمد بن محمد ابن خلدون ابوزید ولی الدین الحضرمی "مقدمه ابن خلدون" (دیوان المبتدأ و الخبر فی تاریخ العرب و البربر ومن عاصرهم من ذوی الشأن الأکبر) دارالفکر، بیروت ١٩٨٨م صفحه /جلد٦ ٤٩٦

٤٣. محمد بن علی بن محمد عبد الله الشوکانی الیمنی "نیل الاوطار" دارالحدیث، مصر ١٩٩٣م صفحه /جلد٥/٢٩٦

٤٤. أحمد بن الحسین بن علی بن موسی الخُسْرَوْجِردی الخراسانی، أبو بکر البیهقی المتوفی 458 :هـ " السنن الکبری" :دار الکتب العلمیة، بیروت -لبنان، 1424هـ 2003 -م،' صفحه /جلد٦/١٢٢

٤٥. مناع بن خلیل القطان "تاریخ التشریع الاسلامی" مکتبة وهبة ٢٠٠١م صفحه /جلد١١٥

٤٦. الشیخ محمد ابو زهره "ابو حنیفة : حیاته و عصرہٖ و آراؤه الفقهیة" دار الفکر العربی القاهره الطبعة الثانیة صفحه /جلد٣١٠

٤٧. محمد ابن ابی بکر بن أیوب ب سعد شمس الدین ابن قیم الجوزیة" إعلام الموقعین عن رب العالمین" دارالکتب العلمیة بیروت ١٩٩١م صفحه /جلد١/٥١

٤٨. ایضاً

٤٩. محمد بن علی بن محمد بن عبد الله الشوکانی الیمنی "ارشاد الفحول الی تحقیق الحق من علم الأصول" دارالکتاب العربی ١٩٩٩م صفحه /جلد٧١

٥٠. رشدی علیان "الاجماع فی الشریعة الاسلامیه" الجامعة الاسلامیة ١٩٧٧م

٥١. مصطفیٰ السباعی "السنة ومكانتها فی التشريع الاسلامی" دار الوراق المكتب الاسلامی ٢٠٠٠ء صفحه /جلد٦٢

٥٢. ابو اسحاق ابراهيم بن علی الشيرازی "طبقات الفقهاء" دار الرائد العربی، بيروت، لبنان ١٩٧٠م صفحه /جلد٣

٥٣. محمد ابن ابی بكر بن أيوب ب سعد شمس الدين ابن قيم الجوزية "إعلام الموقعين عن رب العالمين" دارالكتب العلمية بيروت ١٩٩١م صفحه /جلد١/٩،١١

٥٤. الشيخ محمد ابو زهره "ابو حنيفة : حياته و عصره و آراؤه الفقهية" دار الفكر العربی القاهره الطبعة الثانية صفحه /جلد٩٢

٥٥. مصطفیٰ الزرقاء "الفقه الاسلامی فی ثوبه الجديد" دار القلم دمشق ١٩٩٨م صفحه /جلد١/١٦٤

٥٦.محمد ابو زهره "محاضرات فی تاريخ المذاهب الفقهيه" مكتبة الشيخ كراچی صفحه /جلد٢٥

٥٧. محمد ابن ابی بكر بن أيوب ب سعد شمس اليدين ابن قيم الجوزية "إعلام الموقعين عن رب العالمين" دارالكتب العلمية بيروت ١٩٩١م صفحه /جلد١/٤٠

٥٨.المؤلف :أبو عمر يوسف بن عبد الله بن محمد بن عبد البر بن عاصم النمری القرطبی المتوفی 463 :هـ تحقيق :أبی الأشبال الزهيری "مختصر جامع بيان العلم وفضله" الناشر :دار ابن الجوزی، المملكة العربية السعودية الطبعة :الأولی، 1414هـ 1994 -م صفحه /جلد١٤٧

٥٩. عبد العظيم شرف الدين "فقه ابی يوسف بين معاصريه من الفقهاء" غير مطبوع صفحه /جلد٦١

٦٠. مناع بن خليل القطان، "تاريخ التشريع الاسلامی" مكتبة وهبة، ٢٠٠١م، صفحه /جلد٢٧

٦١. احمد بن عبدالرحيم بن الشهيد وجيه الدين بن معظم بن منصور المعروف ب الشاه ولی الله الدهلوی "حجة الله البالغة" دار الجيل، بيروت، لبنان ٢٠٠٥م صفحه /جلد١/٣٠٠

٦٢. مناع بن خليل القطان تاريخ التشريع الاسلامی مكتبة وهبة ٢٠٠١م صفحه /جلد١٢٨

٦٣. ايضاً

٦٤. مصطفیٰ الزرقاء "الفقه الاسلامی فی ثوبه الجديد" دار القلم دمشق ١٩٩٨م صفحه /جلد١/١٥٨

٦٥. محمد بن حسن الحجوی، "الفكر السامی فی تاريخ الفقه الاسلامی" دارالكتب العلمية بيروت لبنان، ١٩٩٥م، صفحه /جلد٢/٣٩

٦٦. محمد ابن ابی بكر بن أيوب ب سعد شمس الدين ابن قيم الجوزية "إعلام الموقعين عن رب العالمين" دارالكتب العلمية بيروت ١٩٩١م صفحه /جلد١/٥٧

٦٧. محمد بن حسن الحجوی، "الفكر السامی فی تاريخ الفقه الاسلامی" دارالكتب العلمية بيروت لبنان، ١٩٩٥م، صفحه /جلد٢/١٠٠

٦٨. مصطفیٰ الزرقاء "الفقه الاسلامی فی ثوبه الجديد" دار القلم دمشق ١٩٩٨م صفحه /جلد١/١٥٨

٦٩. محمد ابو زهره "محاضرات فی تاريخ المذاهب الفقهيه" مكتبة الشيخ كراچی صفحه /جلد٨٣

٧٠. مناع بن خليل القطان، "تاريخ التشريع الاسلامی" مكتبة وهبة، ٢٠٠١م، صفحه /جلد١٥٤

٧١. محمد ابن ابی بكر بن أيوب ب سعد شمس الدين ابن قيم الجوزية "إعلام الموقعين عن رب العالمين" دارالكتب العلمية بيروت ١٩٩١م صفحه /جلد١/١٧٥

٧٢. ابو عبد الله محمد بن سعد بن منيع الهاشمی بالولاء، البصری، البغدادی المعروف بابن سعد "الطبقات الكبریٰ" دارالكتب العلمية بيروت ١٩٩٠م صفحه /جلد٢/١١٧

٧٣. احمد امين، "فجر الاسلام"، دارالكتب العلمية بيروت ١٩٢٩ء صفحه /جلد١٥١

٧٤. محمد بن حسن الحجوی، "الفكر السامی فی تاريخ الفقه الاسلامی" دارالكتب العلمية بيروت لبنان، ١٩٩٥م، صفحه /جلد٢/٣٩

٧٥. محمد ابو زهره "محاضرات فی تاریخ المذاهب الفقهیه" مکتبة الشیخ کراچی صفحه /جلد٢٨

٧٦. مناع بن خلیل القطان "تاریخ التشریع الاسلامی" مکتبة وهبة ٢٠٠١م صفحه /جلد١٥٣

٧٧. محمد بن حسن الحجوی، "الفکر السامی فی تاریخ الفقه الاسلامی" دارالکتب العلمیة بیروت لبنان، ١٩٩٥م، صفحه /جلد٢/٩٦

٧٨. ایضاً

٧٩. شهاب الدین ابو عبدالله یاقوت بن عبد الله الرومی الحموی "معجم البلدان" دار صادر، بیروت ١٩٩٥م صفحه /جلد٧/٢٩٥

٨٠. المؤلف :أبو عبد الله محمد بن سعد بن منیع الهاشمی بالولاء ، البصری، البغدادی المعروف بابن سعد المتوفی230 :هـ "الطبقات الکبری"دار الکتب العلمیة -بیروت الطبعة :الأولی، 1410هـ 1990 -م صفحه /جلد٣/١/١٠٧

٨١. ایضاً

٨٢. مسلم بن الحجاج أبو الحسن القشیری النیسابوری المتوفی 261 :هـ "الصحیح لمسلم"دار إحیاء التراث العربی -بیروت حدیث نمبر ٢٤٦٠ ،صفحه /جلد ١٩١١

٨٣. محمد ابن ابی بکر بن أیوب ب سعد شمس الدین ابن قیم الجوزیة "إعلام الموقعین عن رب العالمین" دارالکتب العلمیة بیروت ١٩٩١م صفحه /جلد١/١٣

٨٤.المؤلف :أبو عبد الله محمد بن سعد بن منیع الهاشمی بالولاء ، البصری، البغدادی المعروف بابن سعد المتوفی230 :هـ "الطبقات الکبری"دار الکتب العلمیة -بیروت الطبعة :الأولی، 1410هـ 1990 -م صفحه /جلد٣/١/١١٠

٨٥. مسلم بن الحجاج أبو الحسن القشیری النیسابوری المتوفی261 :هـ "الصحیح لمسلم"دار إحیاء التراث

العربی -بیروت حدیث نمبر٢٤٦٣ صفحه /جلد١٩١٣

٨٦. مسلم بن الحجاج أبو الحسن القشیری النیسابوری المتوفی 261 :هـ "الصحیح لمسلم"دار إحیاء التراث العربی -بیروت حدیث نمبر٢٤٦٤ ،صفحه /جلد١٩١٣

٨٧. ابو عبد الله محمد بن احمد بن ابی بکر بن فرح الأنصاری الخزرجی شمس الدین القرطبی "الجامع لأحکام القرآن" المعروف ب "تفسیر قرطبی" دارالکتب المصریة القاهرة ١٩٦٤م، صفحه /جلد٥٧/١

٨٨. المؤلف :أبو عبد الله محمد بن سعد بن منیع الهاشمی بالولاء ، البصری، البغدادی المعروف بابن سعد المتوفی 230 :هـ "الطبقات الکبری"دار الکتب العلمیة -بیروت الطبعة :الأولی، 1410هـ 1990 -مٰ صفحه /جلد١٠٩/١/٣

٨٩. ایضاً

٩٠. محمد ابن ابی بکر بن أیوب ب سعد شمس الدین ابن قیم الجوزیة "إعلام الموقعین عن رب العالمین" دارالکتب العلمیة بیروت ١٩٩١م صفحه /جلد١٧٠/٢

٩١. ایضاً

٩٢. ایضاً

٩٣. ایضاً

٩٤. احمد امین، "فجر الاسلام"، دارالکتب العلمیة بیروت ١٩٢٩ء صفحه /جلد١٨٤

٩٥. امام محمد بن حسن الشیبانی "مقدمه کتاب السیر الکبیر" مطبع جامعه القاهره ١٩٥٨ء صفحه /جلد٢٥

٩٦. محمد زاهد الکوثری، "مقدمه نصب الرایة" الکمتبة المکیة مؤسسة الریان صفحه /جلد٣٠

٩٧. احمد امین، "فجر الاسلام"، دارالکتب العلمیة بیروت ١٩٢٩ء صفحه /جلد١٧٩

٩٨. ابو محمد علی بن أحمد بن سعید بن حزم الاندلسی القرطبی الظاهری "الفصل فی الملل و الأهواء و النحل"

مکتبة الخانجی القاهرة صفحه /جلد۲/ ٦٣

۹۹. احمد امین، "فجر الاسلام"، دارالکتب العلمیة بیروت ۱۹۲۹ء صفحه /جلد۱۱۲

۱۰۰. ایضاً

۱۰۱. عبدالرحمن بن محمد بن محمد ابن خلدون ابوزید ولی الدین الحضرمی "مقدمه ابن خلدون"، دار الفکر، بیروت، 1408هـ 1988 -م،صفحه /جلد٦٢٢

۱۰۲. احمد امین، "فجر الاسلام"، دارالکتب العلمیة بیروت ۱۹۲۹ء صفحه /جلد۱۸۲

۱۰۳. محمد عجاج الخطیب "السنة قبل التدوین" دارالفکر ۱٤۰۰هجری صفحه /جلد۱۸۷

۱۰٤. امام محمد بن حسن الشیبانی "مقدمه کتاب السیر الکبیر" مطبع جامعه القاهره ۱۹۵۸ء صفحه /جلد۲۳

۱۰۵. ایضاً

۱۰٦. مصطفیٰ الزرقاء "الفقه الاسلامی فی ثوبه الجدید" دار القلم دمشق ۱۹۹۸م صفحه /جلد۱/ ۱٦٦، ۱۷۰

۱۰۷. محمد بن حسن الحجوی، " الفکر السامی فی تاریخ الفقه الاسلامی" دارالکتب العلمیة بیروت لبنان، ۱۹۹۵م، صفحه /جلد۲/ ۹۷

۱۰۸. مناع بن خلیل القطان، "تاریخ التشریع الاسلامی" مکتبة وهبة، ۲۰۰۱م، صفحه /جلد۱٤٦

۱۰۹. شمس الدین أبو عبد الله محمد بن أحمد بن عثمان بن قَایْماز الذهبی (المتوفی 748 :هـ،"تذکرة الحفاظ"،دار الکتب العلمیة بیروت-لبنان،1419هـ1998 -م،صفحه /جلد۱/ ۷۰

۱۱۰. الشیخ محمد ابو زهره "ابو حنیفة : حیاته و عصره و آراؤه الفقهیة" دار الفکر العربی القاهره الطبعة الثانیة صفحه /جلد۲۲۷

۱۱۱. ایضاً

۱۱۲. المؤلف :أحمد بن عبد الرحیم بن الشهید وجیه الدین بن معظم بن منصور المعروف بـ الشاه ولی الله

الدهلوى (المتوفى 1176 :هـ،"حجة الله البالغة"، :دار الجيل، بيروت -لبنان، 1426 :هـ 2005 -م،صفحه /جلد١/١٤٥

١١٣. الشيخ محمد ابو زهره "ابو حنيفة : حياته و عصرهٔ و آراؤه الفقهية" دار الفكر العربى القاهره الطبعة الثانية صفحه /جلد٢٢٤

١١٤. امام محمد بن حسن الشيبانى "مقدمه كتاب السير الكبير" مطبع جامعه القاهره ١٩٥٨ء صفحه /جلد٢٥

١١٥. مصطفیٰ السباعى "السنة ومكانتها فى التشريع الاسلامى" دار الوراق المكتب الاسلامى ٢٠٠٠ء صفحه /جلد٣٦٥

١١٦. ايضاً صفحه /جلد٣٦٦

١١٧. محمد بن محمود خوارزمی،"جامع مسانيد الامام الاعظم"، مطبع مجلس دائرة المعارف جامعه كيليفورنيا ، اگست ٢٠٠٩ء، صفحه /جلد١/٣٣

١١٨.مصطفیٰ السباعى "السنة ومكانتها فى التشريع الاسلامى" دار الوراق المكتب الاسلامى ٢٠٠٠ء صفحه /جلد٣٨٩

١١٩. ڈاکٹر شوقی ضيف "تاريخ الادب العربى العصر العباسى الاول" دار المعارف مصر صفحه /جلد ١٣

١٢٠. محمد بن جرير بن يزيد بن كثير بن غالب الآملي، أبو جعفر الطبرى المتوفى310 :هـ،" تاريخ الطبرى = تاريخ الرسل والملوك، وصلة تاريخ الطبرى"، دار التراث -بيروت، 1387 -هـ،صفحه /جلد٧/٤٨

١٢١. ابن اثيرالجزرى ، "الكامل فى التاريخ" دارالكتب العلمية بيروت، ١٤٠٧هجرى صفحه /جلد٥/١٦١

١٢٢. مسعودى، ابوالحسن على بن حسين؛" مروج الذهب و معادن الجوهر"؛ تحقيق محمد محى الدين عبدالحميد؛ بيروت :دارالمعرفه، صفحه /جلد٢/٢٠٧

١٢٣. مسعودى، ابوالحسن على بن حسين؛" مروج الذهب و معادن الجوهر"؛ تحقيق محمد محى الدين

عبدالحمید؛ بیروت :دارالمعرفہ، صفحہ /جلد۳/۲۵۲

۱۲۴. عبدالرحمن بن محمد بن محمد ابن خلدون ابوزید ولی الدین الحضرمی "مقدمہ ابن خلدون"، دار الفکر، بیروت، 1408ھ 1988 -م صفحہ /جلد۱۵

۱۲۵.الصمیری، "اخبار ابی حنیفۃ واصحابہ"، مخطوطہ دار الکتب المصریۃ، تاریخ /تیمور، نمبر۳۱۰

۱۲۶.شیخ زاھد الکوثری، "بلوغ الامانی"، ایچ ایم سعید کمپنی کراچی،صفحہ /جلد۴۰،۴۱

۱۲۷.محمد بن ابراھیم ابن الوزیر "الروض الباسم فی الذب عن سنۃ ابی القاسم"دار عالم الفوائدللنشر والتوزیع، صفحہ /جلد۲/۴۹

۱۲۸. ابو الفداء اسماعیل بن عمر بن کثیر القرشی البصری ثم الدمشقی، "البدایۃ والنھایۃ" دارالفکر، ۱۹۸۶م، صفحہ /جلد۱۰/۱۱۸

۱۲۹.أبو الفضل أحمد بن علی بن محمد بن أحمد بن حجر العسقلانی المتوفی 852 :ھ، "تھذیب التھذیب"،مطبعۃ دائرۃ المعارف النظامیۃ، الھند،1326ھ، صفحہ /جلد۹/۳۰۳

۱۳۰. ابو الفداء اسماعیل بن عمر بن کثیر القرشی البصری ثم الدمشقی، "البدایۃ والنھایۃ" دارالفکر، ۱۹۸۶م،صفحہ /جلد۱۰/۸۴

۱۳۱. ابو بکر محمد بن یحی بن عبد اللہ الصولی، "تاریخ الدولۃ العباسیۃ"، مطبعۃ الصاوی مصر، ۱۹۳۵م، صفحہ /جلد۶۸

۱۳۲. ایضاً صفحہ /جلد۷۸

۱۳۳. امین الخولی، "الامام مالک"، دارالکتب الحدیثۃ مصر، ۱۹۵۱ء صفحہ /جلد۱/۱۹۸

۱۳۴.حسن ابراھیم حسن :"تاریخ الإسلام السیاسی و الدینی و الثقافی والإجتماعی"، ، دار الجیل ، بیروت 1996،صفحہ /جلد۲/۲۸۹

۱۳۵.استاد ابراهیم مصری،الحیاة الاقتصادیة و الاجتماعیة فی عهد هارون الرشید،مجلة الهلال دسمبر ۱۹۶۷ء، صفحه /جلد۲۲۶

۱۳۶. ڈاکٹر شوقی ضیف "تاریخ الادب العربی العصر العباسی الاول" دار المعارف مصر صفحه /جلد۸۳

۱۳۷.استاد ابراهیم مصری،"الحیاة الاقتصادیة و الاجتماعیة فی عهد هارون الرشید"مجلة الهلال دسمبر ۱۹۶۷ء صفحه /جلد۲۲۷

۱۳۸.احمد مکی انصاری. "ابو زکریا الفراء ومذهبه فی النحو واللغة" القاهرة :المجلس الأعلی لرعایة الفنون والآداب، 1964، صفحه /جلد۱۸

۱۳۹. المجادلة : ۱۱

۱۴۰. الفاطر:۳۸

۱۴۱.ابو العباس شمس الدین احمد بن محمد بن ابراهیم بن ابی بکر ابن خلکان،"وفیات الاعیان و أنباء أبناء الزمان" دار صادر بیروت،۱۹۹۴م،صفحه /جلد۴/۲

۱۴۲.عبدالرحمن بن محمد بن محمد ابن خلدون ابوزید ولی الدین الحضرمی "مقدمه ابن خلدون" ، دار الفکر، بیروت، 1408هـ 1988 -م،صفحه /جلد۲۶۲

۱۴۳.عبدالرحمن بن محمد بن محمد ابن خلدون ابوزید ولی الدین الحضرمی "مقدمه ابن خلدون" (دیوان المبتدأ و الخبر فی تاریخ العرب و البربر ومن عاصرهم من ذوی الشأن الأکبر) دارالفکر، بیروت ۱۹۸۸م، صفحه /جلد۴۴۰

☆

باب دوم

☆☆☆

سوانح حضرت امام قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ

☆

﴿بسم اللہ الرحمان الرحیم﴾

باب دوم

سوانح حضرت امام قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ

مختصر سوانحی خاکہ

حضرت امام ابو یوسفؒ کا نام یعقوب اور کنیت ابو یوسف تھی۔ سلسلہ نسب یہ ہے۔ ابو یوسف بن ابراہیم بن حبیب بن سعد بن بجیر بن معاویہ بن قحافہ بن نفیل الانصاری البجلیؒ۔

آپؒ کوفہ میں پیدا ہوئے، وہیں تعلیم پائی وہیں سکونت پذیر رہے۔ آپ عربی النسل تھے، موالی (غلام) میں سے نہ تھے۔ سلسلۂ نسب انصار سے جاملتا ہے ان کے جدِ اعلیٰ حضرت سعد بن حتبہؓ صحابی تھے جو غزوۂ احد میں اجازت چاہنے کے باوجود بوجہ کمسنی شریک نہ ہوسکے، بعد میں جب غزوۂ خندق پیش آیا تو انھیں شرکت کی سعادت حاصل رہی۔ امام ابو یوسف ۹۴، ۹۳ یا ۱۱۳ ہجری میں پیدا ہوئے۔ آپ کی ولادت کے متعلق تذکرہ نگار سن پیدائش ۱۱۳ ہجری کہتے ہیں۔ علامہ سمعانیؒ اور صاحب ملک الابصار نے ان کی عمر ۸۹ برس بتائی ہے، جب کہ وفات کے بارے میں متفق ہیں ۱۸۲ ہجری ہے، عمر اور سن وفات کو ملحوظ رکھا جائے تو آپ کی پیدائش کا سن ۹۳ ہجری ہے۔ علامہ زاہدی الکوثریؒ نے بھی امام ذہبیؒ کے رسائل کے حواشی میں اور امام ابو یوسف کے تذکرے میں اسی کو ترجیح دی ہے، لکھتے ہیں کہ اصل نسخہ میں ۹۳ کے ۹ کا سر مٹ گیا اور ۱۳ رہ گیا۔ ارباب رجال نے قیاساً اسے ۱۳ سمجھ لیا اور ایک بڑھا دیا۔ علامہ زاہد الکوثری کی رائے اس لیے بھی راجح قرار دی جاسکتی ہے کہ فقہ کی عام کتابوں میں تذکرہ نویسوں نے جہاں امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کا تذکرہ یکجا کیا ہے تو انھیں شیخین لکھا ہے، اس تعلق میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے تھا۔ اگر امام ابو یوسف کی پیدائش کا سن ۱۱۳ ہجری قرار دیا جائے تو دونوں کی عمر میں ۳۳ برس کا فرق ہوتا ہے۔ اتنے بڑے فرق کے ساتھ دونوں کو شیخین کہنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

بچپن

حضرت امام ابو یوسفؒ کا بچپن اور لڑکپن غربت و افلاس میں گزرا، ابتداء میں قاضی ابن ابی لیلیٰؒ کی درسگاہ میں باقاعدگی سے حاضر ہوتے رہے اور جب امام اعظم کی تدریس اور مجلس علم میں شرکت کی تو ان سے زیادہ متاثر ہوئے زندگی بھر ان کے ساتھ لگے رہے یہاں تک کہ امام ابو یوسفؒ کی معاشی کفالت کی ذمہ داری بھی خود امام ابو حنیفہؒ نے لے لی تھی اور یہ مدد اس وقت تک جاری رہی جب تک کہ خود امام ابو یوسفؒ بے نیاز نہیں ہو گئے۔

دست نبوت کے برکات

امام ابو یوسفؒ کے پر دادا حضرت سعد بن حتبہ آلانصاری (۱) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی تھے۔

غزوہ احد میں شرکت کے عزم کے باوجود بوجہ کمسنی اجازت نہ ملی البتہ غزوہ خندق اور بعض دیگر غزوات میں حضرات صحابہؓ کے ساتھ شریک جہاد رہے۔

ابن عبداللہؒ نے استیعاب میں لکھا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ خندق کے موقع پر قاضی ابو یوسف کے پر دادا حضرت سعد الانصاری کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو ملاحظہ فرمایا کہ نوعمر ہونے کے باوجود بے جگری اور دلیری کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کر رہے ہیں تو آپؐ نے حضرت سعدؓ سے پوچھا اے لڑکے تو کون ہے؟ حضرت سعدؓ نے عرض کیا جی میرا نام سعد بن حتبہ ہے یہ سن کر آپ نے فرمایا آفرین ہے میرے قریب آ جاؤ۔ حضرت سعدؓ نبی اکرم ﷺ کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے تو نبی اکرمؐ نے اپنا ہاتھ شفقت سے سر اور پیشانی پر رکھا اور دعائیں دیں کہ خدا تمہیں کامیاب (اسعد) کرے"۔

قاضی امام ابو یوسف اس واقعہ پر بہت فخر کرتے تھے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک کے چھونے کی برکات آج بھی [illegible] محسوس [illegible] (۲)

جمال ابو یوسف

چنانچہ خود امام ابو یوسفؒ کا یہ حال تھا کہ جب کبھی کوئی شخص آپ کے چہرہ کی طرف دیکھتا تو آپ کی پیشانی کا نور چمکتا نظر آتا تھا۔ یہ برکت دادا سے ورثہ میں حاصل ہوئی۔

طلب علم، والدہ کی پریشانی اور امام ابو حنیفہ کی پیش گوئی

حضرت امام ابو یوسف کے امام ابو حنیفہؒ سے تعلق قائم ہونے کے اور علم حاصل کرنے کے مختلف واقعات ملتے ہیں۔ مثلاً علی بن جعدؒ سے روایت ہے کہ امام ابو یوسفؒ کہا کرتے تھے کہ جب میرے والد کا انتقال ہو گیا تو میں چونکہ عمر میں چھوٹا تھا میری والدہ مجھ کو دھوبی کے پاس کام سیکھنے کے لیے لے گئیں۔ راستہ میں امام ابو حنیفہؒ کا حلقہ درس تھا میں دھوبی کی مجلس چھوڑ کر امام صاحب کے حلقہ درس میں بیٹھ گیا جب بار ہا ایسا ہوا تو والدہ مجھ کو کھینچ کر دھوبی کے پاس لے جانا چاہتی تھیں مگر میں ابو حنیفہؒ کے حلقہ درس کے علاوہ کسی اور جگہ جانے کے لئے قطعاً راضی نہ ہوا، جب بار بار ایسا ہوا تو والدہ امام ابو حنیفہؒ کے پاس شکایت کرنے پہنچ گئیں اور عرض کیا میں بیوہ عورت ہوں، اخراجات پورے کرنے کے لیے سوت کات کر گزر بسر کرتی ہوں، میں چاہتی ہوں میرا بیٹا کام سیکھ جائے مگر یہ آپ کے درس میں شامل ہو جاتا ہے۔ امام صاحب نے جواب دیا اسے ہمارے ہاں رہنے دو علم حاصل کرے گا اور عنقریب صحنِ فیروزج میں روغن پستہ کے ساتھ فالودہ کھائے گا۔ بعض مؤرخین نے یہ الفاظ نقل کیے ہیں "یہ لڑکا پستے کے روغن میں تیار کیا ہوا فالودہ کھانا سیکھ رہا ہے۔ ابو حنیفہؒ کے یہ الفاظ سن کر والدہ نے کہا آپ کی عقل ماری گئی ہے آپ بوڑھے ہو گئے ہیں۔

حضرت امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ مجھے منصب قضا کی ذمہ داری عباسی دور کے خلیفہ ہارون رشید کے دور میں ملی میں صحن فیروزج میں خلیفہ رشید کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ خلیفہ کے نوکر فالودہ لائے روغن پستہ بھی اس کے ساتھ تھا مجھے خلیفہ نے کہا فالودہ تناول فرمائیے یہ فالودہ ایک خاص قسم کا ہے جو ہر وقت تیار نہیں کیا جاتا۔ خلیفہ کی بات سن کر میرے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی، خلیفہ نے مسکرانے کی وجہ پوچھی میں نے تمام پس

منظر اور سارا قصہ بیان کر دیا اور کہا کہ یہ میرے استاذ محترم امام ابو حنیفہؒ کی کرامت ہے۔ خلیفہ نے کہا بے شک علم فائدہ دیتا ہے اور دنیا و آخرت میں مرتبہ بڑھاتا ہے۔

پھر ہارون الرشید کے الفاظ یہ تھے:

رحمہ اللہ ابا حنیفہ لقد کان ینظر بعین عقلہ مالا ینظر بعین راسہ (۳)

خدا امام ابو حنیفہ پر رحم کرے وہ عقل کی آنکھوں سے وہ چیز دیکھتے تھے جو سر کی آنکھوں سے بھی نہیں دیکھی جا سکتی۔

امام ابو حنیفہؒ کی نظر شفقت نے مالا مال کر دیا

خطیب بغدادیؒ نے امام ابو یوسف کے بارے میں اس طرح حکایت بیان کی ہے کہ میں علم حدیث اور علم فقہ کی تعلیم حاصل کر رہا تھا لیکن میری مالی حالت بے حد خستہ اور خراب تھی ایک روز میں امام ابو حنیفہ کی مجلس میں بیٹھا تھا کہ میرے والد آئے انھیں دیکھ کر میں اٹھ کھڑا ہوا ان کے ساتھ باہر نکل آیا میرے والد نے اس وقت مجھ سے کہا بیٹے دیکھو تم ابو حنیفہؒ کے قدم بہ قدم نہیں چل سکتے خدا کے فضل سے ان کے پاس سب کچھ ہے جو چاہیں کھائیں جو چاہے پئیں۔ اس کے برعکس تمہاری معاشی حالت کمزور ہے والد کے پرزور اصرار پر میں نے معاشی جدوجہد شروع کر دی۔ میری غیر حاضری کو امام صاحب نے محسوس کر لیا اور انھیں فکر ہوئی جب میں دیر سے مجلس میں پہنچا تو امام صاحب نے وجہ دریافت کی میں نے جواب دیا کہ حصول معاش میں مصروف ہوں اور والد کا بھی یہی حکم ہے۔ یہ بیان کرنے کے بعد درس میں بیٹھ گیا جب درس ختم ہوا تو امام ابو حنیفہؒ نے ایک تھیلی ہاتھ میں تھما دی اور کہا کہ جب ختم ہو جائے تو بتا دینا اور پوری توجہ علم حاصل کرنے میں لگا دو۔ امام ابو حنیفہؒ خود سے جانچ لیا کرتے تھے تھیلی ختم ہو گئی ہے اور میری مدد کر دیا کرتے۔ (۴)

امام صاحب کی وجہ سے آہستہ آہستہ میری معاشی حالت درست ہوتی چلی گئی اور میں پوری توجہ کے

ساتھ امام صاحب کی مجلس میں حدیث و فقہ کا علم حاصل کرنے لگا۔ یہ رحمت و شفقت اور اللہ تعالیٰ نے امام ابو حنیفہؒ کے دل میں میرے لیے ڈال دیا تھا علم کے دروازے مال کی برکت مجھے حاصل ہوتی چلی گئی۔ احمد بن مکیؒ کے بیان کے مطابق امام ابو یوسف کو درس سے اٹھا کر لے جانے کا واقعہ ایک ہی بار پیش نہیں آیا بلکہ بسا اوقات ایک ہی دن کئی کئی بار پیش آتا تھا۔ ایک روز امام ابو یوسف کے بار بار اپنے والد کی نظر بچا کر درس میں آنے سے ان کے والد کو بہت غصہ آیا، درس میں آئے اور ابو یوسف کو سخت سست کہا اور اہل مجلس سے مخاطب ہو کر کہا کہ میرا لڑکا میری نافرمانی کرتا ہے اور تم اس کی مدد کرتے ہو اس پر امام ابو حنیفہؒ نے نرمی اور شفقت سے ان کے والد کو سمجھایا اور راضی کر کے رخصت کر دیا یہ تو اس طرح کے حالات رہے جب بھی امام ابو یوسف نے اپنی تعلیم اور امام ابو حنیفہؒ کی مجلس کو نہ چھوڑا۔

امام ابو یوسف کی طالب علمی

ابراہیم بن جراحؒ فرماتے ہیں کہ میں نے قاضی ابو یوسف سے خود سنا فرمایا کہ ''ہم نے بھی طلب علم کیا اور ہمارے ساتھ اتنے لوگوں نے طلب علم کیا کہ ہم ان کو شمار نہیں کر سکتے مگر علم سے نفع صرف اسی شخص نے حاصل کیا جس کے قلب کو دودھ نے رنگ دیا تھا۔ مراد ان کی یہ تھی کہ طالب علمی کے وقت امام ابو یوسف کے گھر والے ان کے لیے روٹی دودھ میں ڈال کر رکھ دیتے تھے، وہی روٹی صبح کے وقت کھا کر حلقہ درس میں پہنچ جاتے تھے اور پھر واپس آکر وہی روٹی کھا لیتے تھے۔ کسی عمدہ غذا اور بہترین کھانے کا انتظام کرنے میں وقت ضائع نہیں کرتے تھے جب کہ دوسرے لوگ عمدہ غذائیں اور بہترین کھانے تیار کرنے میں مشغول ہو کر سبق کے ایک حصہ سے محروم رہ جاتے تھے۔ (۵)

شوق علم کی انتہاء

امام ابو یوسف کو اپنے استاذ محترم ابو حنیفہؒ سے ایک گہرا تعلق اور انسیت و محبت ہو گئی تھی۔ ان کی مجلس میں حاضر ہونے کے لیے وہ دنیا کا ہر کام چھوڑ دیتے تھے یہاں تک کہ درس میں حاضری اولیت رکھتی تھی امام ابو

یوسف فرماتے ہیں۔

میرے لڑکے کا انتقال ہوگیا لیکن میں نے اس کی تدفین و تکفین میں حصہ نہ لیا یہ سارا کام میرے پڑوسیوں اور عزیزوں نے انجام دیا۔ مجھے یہ خوف تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں مجلس درس سے بچھڑ جاؤں اور کوئی سبق قضا ہو جائے اور یہ حسرت رہ جائے کہ فلاں سبق میں حاضر نہ تھا۔(۶)

بعض سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ والد کے انتقال کے وقت بھی درس میں شرکت کو فوقیت دی۔(۷)

امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ ''میرے درس میں امام ابو یوسف کی طرح کسی نے بھی اتنی پابندی سے حاضری نہیں دی اگر داؤد طائی نے بھی ان کے نقش قدم کی رہروی کی ہوتی تو لوگ اس سے بھی امام ابو یوسف کی طرح نفع اندوز ہوتے۔ایک مرتبہ فرمایا کہ ابو یوسف اپنے طبقے فقہاء میں اس دنیا کے سب سے بڑے عالم ہیں''۔

علمی انہاک

امام ابو یوسف کی استاذ امام ابوحنیفہ اور علم سے محبت کے معاملہ میں مشغول رہنے کا یہ عالم تھا کہ اپنے اہل و عیال کو بھی بھلا دیتے تھے، کچھ واقعات مندرجہ ذیل ہیں:

ایک مرتبہ امام ابو یوسف کے ماموں جن کا نام ابو طالب تھا حضرت امام ابوحنیفہؒ کے حلقہ درس میں آیا کیا دیکھتا ہے کہ امام ابو یوسف علمی مذاکرہ میں اونچی آواز سے بول رہے ہیں اور ہمہ تن بحث میں مشغول ہیں۔ ماموں ایک طرف خاموش کھڑے رہے اچانک امام ابوحنیفہؒ کی نظر پڑی تو فرماتے ہیں آیئے تشریف لے آیئے کھڑے کیوں ہیں ماموں طالب نے کہا:

''میں مذاکرہ اور علمی مباحثہ میں اپنے بھانجے ابو یوسف کی بلند آواز اور ہمہ توجہی پر تعجب کر رہا ہوں کہ آج تیسرا روز ہے کہ انھوں نے اور ان کے عیال اور اطفال نے کچھ نہیں کھایا۔''(۸)

امام ابو یوسف کے دیگر گھر کے افراد کے علاوہ ان کی اہلیہ نے بھی امام ابوحنیفہؒ سے شکایت کی چنانچہ ابو یوسفؒ کی اہلیہ کے الفاظ ہیں کہ امام ابو یوسف دن بھر تو امام ابوحنیفہؒ کی خدمت میں رہتے تھے اور رات کو گھر آتے تھے اور کبھی کبھی رات کو بھی وہیں رہ جاتے تھے اور کئی کئی دن گھر نہیں آتے تھے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ وہ خود حاضر ہوئیں ابو یوسف کی شکایت لے کر امام ابوحنیفہؒ کے پاس کہ یہ آپ کے شاگرد ہمارے نان ونفقہ کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے صرف پڑھنے پڑھانے ہی میں لگے رہتے ہیں۔ امام صاحب نے ان کو سمجھایا اور صبر کی تلقین کی اور فرمایا کہ تنگدستی کے دن انشاء اللہ جلد ختم ہو جائیں گے اور تم لوگ ان سے جو توقع رکھتے ہو اس سے زیادہ تم کو ملے گا۔

امام ابو یوسف پر کچھ عرصہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم کے دروازے کھول دیئے، معاشی تنگی دور ہوگئی وہ فرماتے ہیں معاشی کفالت اتنی بڑھ گئی کہ تقریباً سات سو خچر اور تین گھوڑے اپنے ذاتی اصطبل میں موجود تھے۔(۹) یہ وہ عنایت ہے جو کہ حضرت امام ابوحنیفہ کے درس میں آنے اور ان سے علم حاصل کرنے اور صحبت سے مستفید ہونے کے صلہ میں حاصل ہوا۔

مقتضائے حدیث پر عمل کا جذبہ

امام ابو یوسف کا علم حدیث سے لگاؤ کا یہ عالم تھا کہ جس دور میں امام ابو یوسفؒ قاضی ابن ابی لیلیٰؒ کے حلقہ درس میں جایا کرتے تھے تو وہ آپ کا بہت لحاظ کرتے تھے۔ قاضی ابن ابی لیلیٰؒ کا معمول تھا کہ جب کوئی پیچیدہ اور نازک مسئلہ درپیش ہوتا تو وہ امام ابوحنیفہؒ سے رجوع کر کے مسئلہ حل کرلیا کرتے تھے۔ امام ابو یوسفؒ یہ دیکھ کر امام ابوحنیفہؒ کی خدمت میں حاضری کے لیے بے تاب رہتے مگر عملاً اس کی نوبت نہ آسکی چنانچہ اتفاق سے ان کے قاضی ابن ابی لیلیٰؒ سے تعلقات کشیدہ ہوگئے اس کی وجہ یہ تھی کہ امام ابو یوسفؒ نے حدیث کے مقتضاء پر عمل کیا تو قاضی ابن ابی لیلیٰؒ نے ٹوکا مگر امام ابو یوسف نے مقتضائے حدیث کی روشنی میں ان کے ٹوکنے کو بے جا قرار دیا۔

یہ واقعہ اس طرح ہے قاضی ابن ابی لیلیٰ کی صاحبزادی کی شادی تھی نکاح کی تقریب میں اہل مجلس پر چھوارے بکھیرے گئے حاضرین نے چھین جھپٹ شروع کی تو امام ابو یوسف نے بھی لوٹے۔ قاضی ابن ابی لیلیٰ نے ابو یوسف کو اس عمل سے روکا اور فرمایا کہ "اس طرح کی چھین جھپٹ مکروہ اور لوٹنا مکروہ ہے۔ امام ابو یوسفؒ نے جواب دیا کہ "بے شک لوٹنا مکروہ وممنوع ہے لشکروں میں نہ کہ شادی بیاہ اور نکاح کے موقعوں پر" امام ابو یوسف کا یہ جواب سن کر ابن ابی لیلیٰ کے چہرہ کا رنگ بدل گیا اور یہ بات مزید کشیدہ ہوگئی۔ جس کی وجہ سے ابو یوسفؒ امام ابو حنیفہؒ کے حلقۂ درس میں شریک ہونے لگے۔(۱۰)

کہا جاتا ہے کہ امام ابو یوسف تقریباً ۹ سال تک ابن ابی لیلیٰ کی درسگاہ سے جڑے رہے۔ ابن ابی لیلیٰ کی خدمت میں رہ کہ علمی فیض حاصل کرتے رہے ان کی مجلس درس کو چھوڑ کر امام اعظم ابو حنیفہؒ کی صحبت اختیار کی۔

امام ابو یوسف کے پہلے استاد محمد بن ابی لیلیٰ جید فاضل ممتاز تبع تابعین میں سے تھے۔ اموی اور عباسی دونوں ادوار میں قاضی رہ چکے تھے۔ ان کا علم اور تجربہ وسیع تھا۔ امام ابو یوسفؒ نے ان سے علمی اور عملی دونوں طرح فیض اٹھایا تھا مگر اس زمانے میں کوئی بھی طالب علم اور وہ بھی فقہ کا امام اعظم ابو حنیفہؒ کی مجلس درس سے بے نیاز نہیں رہ سکتا تھا۔ خود ابن ابی لیلیٰ "بہت سی خوبیوں، ذاتی کمالات اور علم وفضل اور علمی منزلت کے باوجود جب کوئی مسئلہ درپیش آتا تو سب سے پہلے امام اعظم ابو حنیفہؒ کی رائے معلوم کرنے کی کوشش کرتے اس سے خود امام ابو یوسفؒ کو بھی یہ خیال پیدا ہوا کہ امام صاحب کے درس میں بھی ضرور شریک ہونا چاہیے لہٰذا ابتداء میں وہ اس کی جرأت نہ کر سکے بعد میں بعض وجوہات کی وجہ سے امام ابن ابی لیلیٰ کی مجلس چھوڑ دی۔

بعض حضرات نے نفسِ اختلاف کو ابن لیلیٰ کی مجلس چھوڑ دینے کا سبب قرار دیا مگر یہ بات اس لیے درست نہیں کہ خود امام ابو یوسفؒ نے امام اعظمؒ نے متعدد امور اور مسائل میں اختلاف کیا یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جس کی وجہ سے وہ ان کی مجلس چھوڑ دیتے۔

جب قاضی ابو یوسفؒ امام ابوحنیفہؒ کی درسگاہ سے فارغ ہو کر مسندِ علم پر بیٹھے تو اپنے تلامذہ کے سامنے امام اعظم ابوحنیفہؒ اور ابن ابی لیلیٰ کے اختلافی مسائل مساویانہ طور پر بیان کرتے۔ اگر اختلاف کسی کبیدہ خاطری کی وجہ سے آیا تھا تو اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ امام ابو یوسف ہر مسئلہ پر ابن ابی لیلیٰ پر نکیر کرتے اور اگر ایسا موقع نہ تھا تو نام تک نہ لیتے۔

امام محمدؒ نے استاد اور شاگرد کے درمیان تمام مختلف فیہ مسائل کو ایک کتاب ''اختلاف ابی حنیفہ و ابن ابی لیلیٰ'' میں جمع کر دیا۔ یہ احساس عقیدہ کا اور احترام کا اظہار ہے جس کو آخری وقت تک باقی رکھا۔

امام سرخسیؒ نے مبسوط کے آخر میں امام ابو یوسفؒ اور ابن ابی لیلیٰ کے درمیان اسباب اختلاف کا ذکر کیا ہے اور اس کا ذکر کرتے ہوئے قیل کے لفظ سے اس کے ضعف کا اشارہ کر دیا ہے۔(۱۱)

امام ابو یوسف امام زفرؒ سے بحث و مناظرہ کیا کرتے تھے ان مناظرات سے انھوں نے محسوس کیا کہ امام ابوحنیفہؒ اور ابن ابی لیلیٰ کی فقہ میں وجہٴ امتیاز کیا ہے تو امام ابوحنیفہؒ کی مجلس درس میں شامل ہو گئے۔

یہ دور علوم دینیہ کی جمع و تدوین کا ابتدائی زمانہ تھا ہزاروں اہل علم کے سینوں میں علم محفوظ تھا اس وقت کا دستور تھا طلبہ زیادہ سے زیادہ اہل علم اور اصحاب درس کے پاس جا کر ان سے فائدہ حاصل کرتے تھے۔ چنانچہ اس دور کا کوئی بھی ممتاز اہل علم ایسا نہ ملے گا جس کے سینکڑوں کی تعداد میں شیوخ نہ ہوں۔

علامہ زاہد الکوثریؒ نے خود امام ابو یوسفؒ کے ممتاز مشائخ اساتذہ کی تعداد ۴۰ ابتائی ہے پھر یہ حالت تھی تو امام ابو یوسفؒ جیسے طباع اور ذہین طالب علم کب ایک استاد پر قناعت کر سکتے تھے۔ انھوں نے بھی دستور زمانہ کے مطابق اکابر اہل علم کے پاس جا جا کر زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ علم سے محبت اور عقیدت اور اس راستے پر گامزن رہے۔ قول رسولؐ ''علم کا حاصل کرنا جنت میں جانے کا راستہ ہے'' اس پر عمل کرتے ہوئے امام ابو حنیفہؒ کی درسگاہ میں شامل ہو گئے۔

ذوق حدیث، قوت حافظہ اور استحضار

ذوق حدیث اور قوت حافظہ اس قدر تیز تھی، محمد بن جریر طبری کہتے ہیں قاضی امام ابو یوسف بہت بڑے عالم بہت بڑے حافظ حدیث تھے۔ حاضر دماغ اور جید الحافظہ محدثین سے تھے ساٹھ ستر حدیثیں سنتے ہی یاد کرلیا کرتے تھے۔ پھر کھڑے ہو کر املا کرا دیتے تھے۔ چنانچہ حسن بن زیاد فرماتے ہیں کہ ہم امام ابو یوسفؒ کے ساتھ بارادۂ حج روانہ ہوئے، راستہ میں ان کی طبیعت ناساز ہوگئی چنانچہ ہم نے بیئر میمون پر ڈیرا ڈال دیا جہاں ابو محمد سفیان بن عینیہؒ ان کی عیادت کے لیے تشریف لائے تو ابو یوسفؒ نے ہم سے کہا ابو محمد سفیانؒ سے حدیث سننا چاہیے"۔ چنانچہ ابو سفیانؒ نے چالیس احادیث اسی وقت بیان کر دیں۔ امام ابو یوسف کے شوق کا عالم یہ رہا کہ ابو سفیان جیسے ہی احادیث سنا کر فارغ ہوئے امام ابو یوسفؒ بیماری کی حالت میں شوق سے سن رہے تھے جب ابو سفیان وہاں سے چلے گئے تو قاضی ابو یوسفؒ نے کہا اب وہ احادیث تمام اسناد کے ساتھ مجھ سے سن لو۔ جو سفیان نے روایت کی تھیں چنانچہ انھوں نے چالیس کی چالیس احادیث اسی وقت سنا دیں گو کہ بیماری سے نڈھال ہو رہے تھے عمر بھی کافی ہو چکی تھی بوڑھے ہو چکے تھے مگر حافظہ بے انتہا تیز تھا۔ (۱۲)

امام محمدؒ ان کے حافظہ شوق حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں امام ابو یوسف کو کہیں ذرہ بھی علم کی خوشبو یا بھنک مل جائے تو اس پر اکتفاء کر لیتے ہیں۔ یہ جملہ انھوں نے اس وقت کہا تھا جب اسد بن فرات کی پہلی ملاقات عراق میں ہوئی اور اسد بن فرات نے اس ملاقات میں امام مالک سے موطا کا درس حاصل کیا تھا اور براہ راست سننے کی سعادت حاصل کی تھی اور موطا کا وہ نسخہ اپنی مرویات کی بناء پر مرتب کیا تھا چنانچہ امام ابو یوسف نے بڑے شوق سے موطا کا مطالعہ کیا جو اسد بن فرات کی روایات پر مبنی تھا۔ امام محمد نے بتفراً کہا

"ابو یوسفؒ یکتفی بشم العلم یرید انه لم یر حل مثله لسماع المؤطا بل اکتفی بالتناول من یدین یطلب العلم عنده" (۱۳)

ترجمہ: امام ابو یوسفؒ کو کہیں ذرہ بھی علم کی خوشبو یا بھنک مل جائے تو اس پر اکتفاء کر لیتے

ہیں۔

مقصد یہ تھا کہ انھوں نے موطا کے سماع کے لیے سفر نہیں کیا تھا اور جب ایسا شخص سامنے آیا جو خود مدینہ میں امام مالک سے سماع کر چکا ہے اور اس کے پاس وہیں کا اور اس کا لکھا ہوا نسخہ بھی ہے تو اس کے ہاتھ سے لے کر اپنا یہ شوق حدیث اور جذبہ بھی پورا کر لیا"۔ اس واقعہ کے پس منظر میں یہ بتانا ضروری تھا کہ امام ابو یوسف حدیث کے سنانے کے بے پناہ شوقین اور ان سے بھی دلی لگاؤ رکھتے تھے جو حدیث کے حاصل کرنے میں سفر کرتے تھے اسد بن فرات امام مالک کی خدمت میں رہ کر علم حدیث حاصل کرتے رہے۔

دراصل امام ابو یوسفؒ کو مدت سے فن حدیث سے شغف چلا آ رہا تھا اور روایت آثار کے سلسلے میں مخزن و خازن کی حیثیت رکھتے ہیں اور چونکہ موطا میں بھی اخبار کی بہ نسبت آثار زیادہ ہیں تو ان کے لیے یہ بات کافی تھی کہ جب موطا کا ایک نسخہ صحیحہ کی انھیں اطلاع ملی تو وہ اسے نظر انداز نہ کر سکے اور محض اس کے مطالعاتی استفادہ پر اکتفاء کر لیا۔ جب کہ اس کے برعکس امام محمد "بذاتِ خود امام مالک سے موطا کی سماعت کر چکے تھے اور یہ ان کی نوعمری اور طالب علمی کا زمانہ تھا۔

بے مثال حافظہ

امام ذہبیؒ نے امام ابو یوسف کو حفاظِ حدیث میں شمار کیا ہے جیسا کہ ابن جوزیؒ لکھتے ہیں " امام ابو یوسفؒ امت کے ان سوقوی الحفظ لوگوں میں شمار ہوتے ہیں جن کا حافظہ ضرب المثل تھا۔"

امام ابو یوسف اپنے اساتذہ سے جب حدیث سنتے تھے تو ایک ایک مجلس میں انھیں پچاس، ساٹھ حدیثیں مع سند زبانی یاد ہو جاتی تھیں۔ ابو معاویہؒ کی روایت ہے کہ میں اور امام ابو یوسفؒ دونوں اکٹھے سماع حدیث کے لیے جایا کرتے تھے میں تو شیخ سے سنی ہوئی تمام حدیثیں لکھ لیا کرتا تھا اور ابو یوسف کو لکھے بغیر زبانی یاد ہو جایا کرتی تھیں۔ اور یہی ان کے علم و فضل کی گواہی ہارون الرشید نے بھی اس وقت دی جب خلیفہ بنے۔

ہارون الرشید انھوں [illegible] قوی تھا کہ

ان کو سب حدیثیں زبانی یاد ہو جاتی تھیں اور درس کے بعد لکھنے والے ان کے حفظ سے اپنی مکتوبہ احادیث کی تصحیح کرتے تھے۔(۱۴)

امام مالک اور محمد بن اسحاق سے ملاقات

وہ امام مالک کے ہم عصر تھے دونوں درجۂ اجتہاد پر فائز تھے دونوں میں بعض اجتہادی مسائل میں اختلاف بھی تھا۔ امام ابو یوسفؒ نے باوجود معاصرت کے بعض مسائل میں امام مالکؒ کی رائے کو ترجیح بھی دی۔ امام ابو یوسف نے موطا کا سماع براہ راست امام مالک سے نہیں کیا تھا۔(۱۵)

امام ابو یوسف کے زمانۂ طالب علمی میں ایک مرتبہ محمد بن اسحاق صاحب المغازی کوفہ تشریف لائے تو ان کی علمی شہرت اور کشش امام ابو یوسفؒ کو بھی ان کے حلقۂ درست میں کھینچ لائی اور کئی مہینہ تک ان سے کتاب المغازی کے درس کا سماع کیا۔ جب کتاب پوری ختم ہوگئی تب امام اعظم ابو حنیفہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ امام صاحب نے غیر حاضری کی وجہ دریافت کی تو کہا میں ابن اسحاق سے ان کی کتاب المغازی کا سماع کر رہا تھا۔ یہ علم کا شوق انھیں لے گیا۔ امام صاحب نے اس موقع پر عدم اطمینان کا اظہار کیا مگر ادب کے ساتھ امام ابو یوسف نے اپنے مشفق استاد کے سامنے صاحب مغازی کے علم و فضل کا اعتراف کیا۔

استاد سے تعلق، صحبت و خدمت

امام ابو یوسف کو اپنے استاد امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد ہونے پر ہمیشہ فخر رہا اور وہ ہمیشہ اپنے استاد کا ذکر کرتے بلکہ ان کے علوم کی نشر و تشریح ان کا مقصد زندگی رہا۔ ان کے علم و کمال کی طرف لوگوں کو دعوت دیا کرتے بلکہ ایک روایت ہے ہر نماز کے بعد امام ابو حنیفہؒ کے لیے دعائے مغفرت کرتے اس کے بعد اپنے والدین کے لیے علامہ صمیریؒ نے نقل کیا ہے کہ میرے سامنے ایک مرتبہ امام ابو یوسفؒ نے فرمایا کہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں نے نماز پڑھی ہو اور اپنے استاد امام ابو حنیفہؒ کے لیے دعا نہ کی ہو، شاید اسی سعادت مندی کا نتیجہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے علم و تفقہ میں اس قدر برکت عطا فرمائی تھی۔

مزید ایک روایت ہے امام ابو یوسفؒ نے کہا میں ۱۷ سال ان کی خدمت میں رہا اور ہمیشہ فجر کی نماز ان کے ساتھ پڑھی، نہ صبح کے وقت ان کا دامن چھوڑتا نہ دوپہر کو سوائے اس صورت کے کہ جب بیماری مجھ پر غالب آجائے۔"(۱۶)

امام ابو یوسفؒ اپنی ذہانت، بصیرت اور قوت حافظ میں اپنی مثال آپ تھے۔ طویل مدت گزارنے کے بعد اپنے ذہن و دماغ میں ابوحنیفہ کا علم فقہ جذب کرلیا کہ مرتبہ اجتہاد پر فائز ہوئے۔

علم دین سے شغف

امام ابو یوسفؒ نہایت غریب والد کی اولاد تھے مگر علم دین سے اتنا لگاؤ رہا کہ معاشی تنگی بھی رکاوٹ نہ بن سکی۔ یوسف بن سعیدؒ کا بیان ہے کہ امام ابو یوسفؒ نے ایک مدت تک امام اعظم ابوحنیفہؒ کی خدمت میں آمد و رفت کا سلسلہ جاری رکھا۔ مگر ایک طویل مدت میں ایک دن بھی نہیں گزرا جس میں وہ فجر کی نماز میں ان کے ساتھ شریک نہ رہے ہوں۔

امام ابو یوسف کہتے ہیں میں سوائے بیماری کے، عیدالفطر اور عیدالضحیٰ کے دن بھی ان سے جدا نہیں ہوا"۔(۱۷)

اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ علم دین کے حصول کے لیے ابو یوسفؒ کا شوق اور اپنے استاد امام ابوحنیفہ سے محبت کا لگاؤ رہا مجلس علم کی شرکت اور امام اعظم کی رفاقت کو عیدین کی خوشیوں پر ترجیح دی۔

اساتذہ سے عقیدت

امام ابو یوسف نے اپنے اساتذہ ابن ابی لیلیٰ کے تلمذ اور امام اعظم جیسے فقیہ و مجتہد کی خدمت، نسبت تلمذ، استفادہ اور ان کی خدمت و رفاقت میں رہنے کے بعد کسی دوسرے صاحب کمال کے سامنے ان کو زانوئے تلمذتہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی مگر اس کے باوجود ۱۰۴ مشائخ تو ایسے ہیں جن سے اس زمانہ کے

دستور کے مطابق امام ابو یوسفؒ نے استفادہ کیا ہے مگر اس سب کچھ کے باوجود ان کے دلی کیفیات اور قلبی بندھنیں امام اعظم ابوحنیفہ سے بندھی رہیں کہا کرتے کہ

ماکان فی الدنیا مجلس احب الی من مجلس ابی حنیفه فانی مارایت فقیها افقه من ابی حنیفه ولا قاضیا خیرا من ابن ابی لیلی(۱۸)

ترجمہ: مجھے دنیا میں کوئی مجلس درس امام ابوحنیفہ اور ابن ابی لیلیٰ کی مجلس درس سے زیادہ محبوب نہیں ہے اس لیے کہ نہ تو میں نے امام اعظم ابوحنیفہ جیسا بہتر فقیہ دیکھا اور نہ ابن ابی لیلیٰ جیسا قاضی''

امام ابو یوسفؒ امام ابوحنیفہؒ کے انتقال کے بعد بعض اوقات حسرت سے فرمایا کرتے تھے کہ'' کاش! امام اعظم ابوحنیفہؒ کی ایک علمی صحبت مجھے پھر مل جاتی اور میں ان سے اپنا علمی اشکال حل کر لیتا خواہ مجھے اس ایک علمی مجلس پر آدھی دولت قربان کرنی پڑتی'' کہا جاتا ہے کہ امام ابو یوسف مالی اعتبار سے مستحکم ہو چکے تھے اس وقت تقریباً ۲۰ لاکھ کے مالک تھے گویا دس لاکھ روپے صرف کر کے ایک مجلس کی تمنا کرتے تھے۔

''من لم یذق لم یدر''(۱۹)

ترجمہ جس نے اس کی لذت نہ چکھی ہو وہ اس حقیقت کو کیا جانے''

درحقیقت علم دین کا ذوق وشوق اور صحیح علم کی قدر و قیمت یہی ہے امام ابوحنیفہ کو اپنے ہر شاگرد سے گہرا دلی لگاؤ رہا خاص طور پر امام محمدؒ، امام زفرؒ اور امام ابو یوسفؒ کو وہ بہت ہی عزیز رکھتے تھے ان تینوں میں سب سے زیادہ عزیز امام ابو یوسفؒ تھے۔ امام اعظمؒ نے انکی علمی اور عملی صلاحیتوں کو بھانپ لیا تھا۔ کہا جاتا ہے امام اعظمؒ نے وصیت نامہ امام ابو یوسف کے نام لکھا تھا اس دنیا سے رخت سفر باندھنے سے پہلے جب وہ مسند درس پر فائز ہوئے ان کی بے پناہ علمی اور عملی صلاحیتیں انھیں ایک روز منصب پر فائز کریں گی اور اس میں کوئی شبہ بھی

نہیں یہ خیال امام ابوحنیفہ کا درست ثابت ہوا اور وقت نے ثابت کر دیا کہ امام ابو یوسف قاضی القضاء بنے۔ امام ابوحنیفہؒ نے جو چاہا اس خیال کو سچ ثابت کر دیا اپنے علم و ہنر سے علم وفضل اور اخلاق و کردار سے اپنی محبت امام اعظم کے دل میں پیدا کر لی تھی یہی وجہ ہے ایک وصیت نامہ امام اعظم نے تحریر کیا۔

امام ابوحنیفہؒ کا طریقہ کار رہا جس وقت آپ اپنے شاگردوں کے درس دیتے تھے آپ اپنی مجلس فقہی کو ایک طرح کی مجلس شوریٰ بنالیا تھا۔

امام ابو یوسف اور تدوین مسائل

امام موفق مکیؒ لکھتے ہیں امام اعظم نے اپنی مجلس فقہی کو ایک طرح کی مجلس شوریٰ بنایا تھا جہاں ہر شخص آزادی سے اپنی رائے کا اظہار کرتا تھا اور وہ اپنی رائے کو تھوپنے اور منوانے کی ذرا بھی کوشش نہیں کرتے تھے۔ ان کا معمول یہ تھا کہ وہ ایک ایک مسئلہ لے کر اس پر بحث و گفتگو کرتے اپنے اصحاب کو بحث و گفتگو کا موقع دیتے کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ صرف ایک مسئلہ پر پورا مہینہ بلکہ کبھی کبھی اس سے زیادہ بحث و مناظرہ میں گزر جاتا یہاں تک کہ کامل بحث و مناظرہ، مباحثہ تنقیح و تمحیص کے بعد کوئی ایک قول قبول کر لیا جاتا تھا پھر امام ابو یوسفؒ اسے مرتب و مدون کر لیتے اور وہ داخل اصول ہو جاتا۔ درحقیقت یہی اولی و اصوب طریق کار تھا حق سے قریب اور تسکین قلوب کا سبب اور آپس میں بحث و مباحثہ کے بعد کسی شخص کو بھی اپنی رائے کے واپس لے لینے میں اور متفقہ قول کو قبول کر لینے میں تامل یا تردد نہ ہوتا۔ امام ابوحنیفہؒ کا امام ابو یوسف اور دیگر تلامذہ کی تربیت کرنے کا انداز دوسرے اساتذہ سے مختلف تھا جب کوئی مسئلہ زیر غور آتا تو اس کے تمام احتجاجی پہلوؤں پر غور بھی کیا جاتا اور تائید میں جو کچھ کہا جا سکتا وہ کہتے اس کے بعد اپنے اصحاب سے دریافت کرتے کیا آپ میں کوئی اس کے برخلاف کچھ کہنا چاہتا ہے؟ اس سوال کے بعد ہر شخص مجلس فقہی میں اپنی اپنی رائے کا اظہار کرتا اور امام اعظم اس نئی رائے سے مختلف پہلوؤں پر نکتہ چینی کرتے اور ایک دوسری رائے قائم کر کے پوچھتے اب آپ کی کیا رائے ہے؟ تلامذہ و اصحاب آپس میں بحث و اختلاف کرتے اور جب کسی ایک رائے پر قریب

قریب متفق ہو جاتے تو امام صاحبؒ پھر ان دلائل کا توڑ کرتے اور ایک تیسری رائے پیش کرتے اور سوال کرتے اب کیا رائے ہے آپ کی؟ لوگ پھر اس پر نقد و تبصرہ کا سلسلہ شروع کر دیتے پھر امام صاحبؒ معائنہ کر کے کسی ایک رائے کو ترجیح دے دیتے اس طرح بار بار رد و کد کے مسئلہ فقہی اعتبار سے حل ہو جاتا اور اس پر متفق ہو جاتے تو امام ابو یوسف مرتب و مدون کر کے اصل میں لکھ لیتے تھے۔ امام ابو حنیفہؒ کا یہ طرز تفقہ دوسرے تمام آئمہ و مجتہدین کے طرز و اسلوب کے مقابلہ میں ایک امتیاز خاص کا حامل ہے۔ (۲۰)

امام ابو یوسف نے بعد میں اپنے درس تدریس میں یہی طریقہ اختیار کیا چونکہ امام ابو یوسف حافظ قرآن رہے قرآن کو حفظ کیے بغیر فقہی مسائل کا حل نکالنا مشکل ضرور ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے جو وصیت نامہ امام ابو یوسف کے نام لکھا وہ اہل علم اور طالب علم دونوں کے لیے بہت قیمتی اور زرین اقوال ہیں۔

امام ابو یوسف کی علمی اور عملی زندگی اس وصیت نامے کو پڑھنے کے بعد محسوس ہوتی ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کی وصیت دراصل امام ابو یوسفؒ کا ''صحیفۂ زندگی'' ہے۔

انگور سے پہلے منقیٰ بن گئے

انھوں نے اپنی علیحدہ درس گاہ بنالی اور اس کے بنانے میں اپنی استاد محسن و مربی سے مشورہ بھی نہ کیا اور نہ ہی کوئی اطلاع دی۔ امام ابو حنیفہؒ نے چند سوالات مسائل کی شکل میں کسی شاگرد کے ذریعہ دریافت کرائے مگر انھیں جواب سے اطمینان نہ ہوا اور فوراً تردید کر دی۔ اس صورت واقعہ کے پیش نظر خود امام ابو یوسفؒ کو احساس ہوا کہ انھوں نے قبل از وقت حلقۂ درس قائم کر دی۔ چنانچہ وہ خود امام اعظم ابو حنیفہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی کمزوری کا اقرار کر لیا۔ امام اعظم نے انھیں نصیحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ''تزبیت قبل ان تحصرم'' ترجمہ تم انگور سے پہلے منقیٰ بن گئے۔ (۲۱)

یہاں پر ان سوالات کا ذکر لکھا جا رہا ہے جو کہ تحریر میں شامل ہیں۔

سوال نمبر ۱: دھوبی نے کپڑے پھاڑ ڈالے اور جو پارچہ جات لایا وہ پھٹے ہوئے تھے آیا اسے اجرت دی جائے گی یا نہیں؟

ابو یوسفؒ نے جواب دیا نہیں دی جائے گی۔ ابو حنیفہؒ کے بھیجے ہوئے شخص نے کہا تم نے غلط کہا،۔ ابو یوسفؒ نے جواب دیا اچھا اسے اجرت دی جائے گی وہ آدمی جسے ابو حنیفہ نے بھیجا تھا اس نے کہا یہ بھی غلط۔ پھر اس نے بتایا اگر کپڑے پھٹنے سے پہلے با قاعدہ اس پیشہ کو وہ کرتا تھا تو اجرت دی جائے گی ورنہ نہیں۔

سوال نمبر ۲: میں اس نے کہا آیا نماز میں دخول فرض ہے یا سنت؟ ابو یوسف نے کہا فرض ہے وہ کہنے لگا یہ غلط ہے؟ ابو یوسف نے کہا تو پھر سنت ہے وہ بولا یہ بھی غلط ہے ابو یوسف حیرت سے اسے دیکھنے لگے اس نے کہا دونوں چیزیں فرض و سنت بیک وقت ہیں کیونکہ تکبیر فرض ہے اور رفع یدین سنت ہے۔

سوال نمبر ۳: ابو حنیفہؒ کے بھیجے ہوئے آدمی نے سوال کیا ہانڈی، چولہے پر چڑھی ہوئی ہے ایک چڑیا اڑتی ہوئی گزری اور کھولتی ہوئی ہانڈی میں گر گئی اب اس ہانڈی کا گوشت اور شوربہ قابل استعمال ہے یا نہیں؟ ابو یوسفؒ نے کہا کیوں نہیں؟ استعمال کیا جائے گا وہ شخص بولا تم غلط کہتے ہو۔ ابو یوسف نے کہا اچھا نہیں استعمال کیا جائے گا وہ شخص بولا یہ جواب بھی درست نہیں۔ پھر اس شخص نے بتایا اگر گرا ہوا پرندہ سے پہلے ہانڈی کا گوشت پک چکا تھا تو اسے تین مرتبہ دھو ڈالا جائے گا اور کھالیا جائے گا اور شوربہ پھینک دیا جائے گا۔

سوال نمبر ۴: چوتھا سوال اس شخص نے ابو یوسف سے یہ کیا کہ ایک مسلمان کی بیوی ذمی ہے وہ اس حالت میں مر گئی کہ وہ حاملہ تھی اب اسے کس کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا؟ ابو یوسف نے کہا مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کی جائے گی وہ عورت۔ اس شخص نے کہا غلط کہتے ہو۔ ابو یوسفؒ نے کہا اچھا اہل ذمہ کے قبرستان میں اسے دفن کیا جائے گا وہ بولا یہ جواب بھی غلط ہے۔ ابو یوسفؒ نے کہا اچھا اہل ذمہ کے قبرستان میں اسے دفن کیا جائے گا وہ بولا یہ جواب بھی غلط ہے۔ ابو یوسفؒ حیرت سے اسے دیکھنے لگے پھر اس شخص نے کہا وہ عورت مقابر اہل [illegible] گا یہاں تک

کہ پیٹ میں جو بچہ ہے اس کا رخ قبلہ کی طرف ہو جائے گا کیونکہ پیٹ میں جو بچہ ہوتا ہے اس کا منہ ماں کی پیٹھ کی طرف ہوتا ہے۔

ان سوال و جواب کے بعد ابو یوسفؒ کو احساس ہوا کہ ابھی رہنمائی کی انھیں ضرورت ہے اس واقعہ کے بعد وہ دوبارہ امام ابوحنیفہؒ کی مجلس میں پہنچ گئے۔

اس زمانہ میں استاد و شاگرد کے درمیان روابط کس طرح کے ہوا کرتے تھے۔ شاگرد ادھر ادھر بھٹکنے کے بعد دوبارہ استاد کے آستانے پر آموجود ہوا کرتا تھا۔ غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہی چیز تھی جس نے علم کی نشر واشاعت میں غیر معمولی مدد دی تھی۔ اگر یہ جذبہ کارفرما نہ ہوتا تو شاید اس وسیع پیمانہ پر علم نہ پھیل سکتا۔ شاید اس کثرت کے ساتھ ایک ایک استاد کے حلقہ سے ایسے شاگرد فارغ التحصیل ہو کر نہ نکلتے جو آگے چل کر بلکہ خود استاد کی زندگی میں مرتبہ اجتہاد وامامت پر فائز ہو جاتے۔

حقیقت یہ ہے کہ امام ابو یوسف اپنی شخصیت کے عجیب وغریب خصائص کے حامل تھے ان کی ساری زندگی علم نافع کا نہایت مکمل نمونہ ہے۔ درس وافادہ کا سلسلہ امام ابوحنیفہؒ کی مجلس میں چلتا رہا۔ ایک مرتبہ امام ابو یوسفؒ بیمار ہو گئے۔ امام اعظمؒ اپنے لائق ہونہار شاگرد کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے عیادت کے بعد ارشاد فرمایا ''مجھ کو تم سے بڑی توقعات ہیں اور تم مسلمانوں کے لیے بڑے مفید ثابت ہو سکتے ہو اور اپنے بعد میں تم ہی کو چھوڑ کر جاؤں گا''۔ (۲۲)

امام اعظمؒ کے حالات وسوانح کا اگر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ عہد شباب میں وہ بھی اس دور سے گزرے ہیں کہ ان کے استاد حماد بن ابی سلیمان کے درمیان ایسی صورت پیدا ہوگئی کہ گویا بالکل انقطاع ہو گیا لیکن یہ کیفیت ہمیشہ نہیں رہی ایک دن ایسا آیا کہ امام ابوحنیفہؒ اپنے شیخ اور استاد کی بارگاہ میں پھر پہنچے اور اس وقت تک ان کے دامن علم سے وابستہ رہے جب تک ان کی وفات نہیں ہوئی اور پھر عمر اور علم کی پختگی کے ساتھ ساتھ فہم وخرد [illegible] گی یا تلفی کا

سبب بن سکتی۔

جب امام ابو یوسف کو بیماری سے افاقہ ہوا تو انھیں اپنا علیحدہ حلقہ درس قائم کرنے کا خیال ہوا پھر امام ابوحنیفہؒ نے کوئی مشکل مسئلہ دریافت کرلیا جب امام ابو یوسف تسلی بخش جواب نہ دے سکے تو امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا''سبحان اللہ ایک شخص جو اپنا الگ حلقہ قائم کرتا ہے خدا کے دین پر گفتگو کرتا ہے تلازمدہ کی ایک بڑی تعداد کو خطاب کرتا ہے اور درس دیتا ہے اور وہ اجارہ کا ایک مسئلہ اچھی طرح نہیں جانتا پھر امام اعظمؒ نے بطور نصیحت ارشاد فرمایا

''من ظن انه يستغنىٰ عن التعليم ليبك على نفسه.(٢٣)

ترجمہ: جو شخص یہ گمان کر لیتا ہے کہ وہ حصول تعلیم سے مستغنی ہو گیا ہے تو اس کو اپنے اوپر جی بھر کر رونا چاہیے۔

اس نصیحت سے معلوم ہوتا ہے چونکہ امام ابوحنیفہؒ امام ابو یوسف سے خاص تعلق رکھتے تھے اور وہ ان کی تربیت میں کوئی کمی نہیں رہنے دینا چاہتے تھے وہ ان کو آنے والے وقت میں مسائل کی پیچیدہ صورتوں اور دقتِ فقہ ان کے سامنے آجانے پر انھیں اپنے کم علم اور نارسائی ذہن کا احساس نہ ہو اور اس طرح مستقبل میں ان کی برابر ہمت افزائی ہو اور خود میں اعتماد اور ثقاہت پیدا کرنے کی کوشش میں لگے رہیں۔

علمی ریاست اور عملی سیادت امام ابو یوسف کا حصہ ہے

حضرت حماد بن ابی حنیفہؒ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ امام زفرؒ اور امام ابو یوسف کے درمیان کسی مسئلہ میں مباحثہ ہوا اس مجلس میں خود امام ابوحنیفہؒ موجود تھے جب کئی گھنٹے گزر گئے اور بحث جاری رہی اور کسی قطعی نتیجہ پر نہ پہنچا جا سکا تو امام اعظم نے امام زفرؒ سے فرمایا۔''علمی ریاست اور عملی سیادت ابو یوسفؒ کا حصہ ہے تم اس کو لینے کی کوشش نہ کرو''۔(۲۴)

یہ قول منقول ہے تذکرہ امام ابو یوسف صفحہ نمبر ۳۷۶ سے۔

حلقہ درس وافادہ

امام ابو یوسفؒ کے باقاعدہ حلقۂ درس وافادہ کا ذکر تذکرہ نویسوں نے نہیں کیا تاہم امام ابو یوسفؒ کے تلامذہ اور مستفیدین کی کثرت تعداد سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے علم سے فیض یاب ہونے والوں کی تعداد زیادہ ہی رہی ہے ان کی تدریس کا سلسلہ تقریباً ۱۶ سال ۱۵۰ ہجری سے ۱۶۶ ہجری تک جاری رہا۔ ۱۶۶ ہجری میں انھیں عہدۂ قضا پر فائز کر دیا گیا اور ۱۷ سال تک انھوں نے یہ خدمت انجام دی مگر قاضی بننے کے باوجود اپنے طلبہ کی تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ وہ دن کے اوقات قاضی کے فرائض انجام دیتے اور رات کو تدریس کا سلسلہ جاری رکھتے۔ امام ابو یوسفؒ درس دیتے وقت طلبہ کے ساتھ خیر خواہی اور حسن سلوک کے ساتھ پیش آتے ان کی تعلیم میں نہ بخل سے کام لیتے اور نہ اوقات ضائع کرتے بلکہ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ ان کے تلامذہ اپنے فن میں مہارت حاصل کرلیں۔

امام ابو یوسف کے درس کی خصوصیات اور امتیاز

امام ابو یوسف کے زمانہ میں طریقہ تدریس یہ تھا کہ شیوخ حدیث اپنے تلامذہ کو حدیث کی املا کرا دیتے تھے اور آئمہ فقہ صرف فقہ کا درس دیتے تھے لیکن امام ابو یوسفؒ کے درس کی خصوصیت یہ تھی کہ حدیث سناتے تھے اسی کے ساتھ اس سے نتائج و مجتہدات بھی طلبہ کے سامنے رکھے جاتے تھے اور فقہی آراء بھی اس کے ساتھ سمجھائے جاتے تھے۔

علی مدائنی فرماتے ہیں کہ جب امام ابو یوسفؒ بصرہ تشریف لائے تو ہم لوگ ان کی خدمت میں استفادہ کے لیے پہنچے ان کا طریقۂ درس یہ تھا کہ دس احادیث بیان کرتے۔ فقہی آراء بھی ان کے ساتھ بیان کرتے۔ (۲۵)

ان کے قول [illegible] اعلیٰ درجہ یہ

ہے کہ حدیث سے مسائل اخذ کیے جائیں اس سے اجتہاد اور استنباط کیا جائے تا کہ احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے زندگی کے ہمہ گیر نظام کے لیے زیادہ سے زیادہ روشنی حاصل کی جا سکے۔

روایت حدیث کے علاوہ امام ابو یوسف کا اصلی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مسائل کا استخراج کیا ہے۔

طلبہ پر شفقت

امام ابو یوسف بہت زیادہ وسیع القلب اور متحمل مزاج تھے ان کی پیشانی پر کبھی بھی بل نہ آتا تھا حسن بن زیاد نے امام ابو یوسف اور امام زفرؒ دونوں بزرگوں سے علم حاصل کیا تھا وہی راوی ہیں کہ **کان ابو یوسف اوسع صدراً باالتعلیم من زفرؒ**،(۲۶) ترجمہ: امام ابو یوسف تعلیم کے بارے میں امام زفر کے زیادہ کشادہ دل اور وسیع ظرف تھے۔

جب بھی امام زفرؒ سے سوال کرتا یا اپنی کوئی علمی شکل ان کی خدمت میں پیش کرتا وہ سمجھانے میں نہ سمجھ پاتا تو پھر سوال کرتا امام زفر پھر جواب دیتے پھر بھی میری سمجھ میں نہ آتا میں پھر کہتا تو وہ ناراض ہو جاتے اور ناراضگی سے کہتے نالائق ہو، عقل سے عاری یہ الفاظ سن کر میں دل برداشتہ ہو کر غمگین امام ابو یوسف کے حلقہ درس میں پہنچتا۔ یہاں بھی میں سوال کرتا وہ جواب دیتے میرے بار بار سوال کرنے پر ابو یوسف نرمی اور شفقت کے ساتھ مجھے سمجھاتے اور اپنا علم میرے دل میں اتار دینے کی کوشش کرتے اور ارشاد فرماتے کوئی بات نہیں صبر کرو، غور کرو، بات کی تہہ تک پہنچ جاؤ گے تو مقصد حاصل کرلو گے مراد کو پہنچ جاؤ گے۔ پھر ارشاد فرماتے:

لو استطعت ان اشاطر کم مافی قلبی لفعلت(۲۷)

ترجمہ: اگر میری استطاعت میں یہ بات ہوتی تو جو کچھ علم وفضل میرے پاس ہے وہ سب

میں تمہارے دلوں میں انڈیل دیتا۔

یہ حوالہ حاصل کیا ہے رسائل ابن جوزی تذکرہ امام ابو یوسفؒ صفحہ نمبر ۴۳ سے۔

حالت نزاع میں تعلیم مسائل

امام ابو یوسفؒ کا شفقت کا اندازہ اپنے طالب علموں کے ساتھ رہا علم سے محبت اور اس کو پہنچانے کا طریقہ کار طالب علم کے دل میں اترنے کی خواہش اور بے چینی انھیں پریشان کیے، ریشمی تعلیم اور علمی مسائل سے امام یوسف صاحب کو بے انتہا دلچسپی رہی۔

ابراہیم بن الجراح کی روایت ہے امام ابو یوسف بیمار ہوئے مرض بڑھ گیا میں نے ان کی عیادت کی، بے ہوشی سی طاری تھی جب افاقہ ہوا آنکھ کھول کر دیکھا مجھ سے کہنے لگے اے ابراہیم رمی جمار میں افضل صورت کہاں ہے، آیا رمی جمار پیدل کرنا چاہیے یا سوار ہو کر؟ میں نے جواب دیا پیدل، امام ابو یوسف نے فرمایا ''غلط'' میں نے عرض کیا ''سوار ہو کر'' ارشاد ہوا یہ بھی غلط ہے'' اس کے بعد از خود ارشاد فرمایا ''جو شخص دعا کے بعد وہاں رکنا چاہتا ہو اس کے لیے افضل یہ ہے کہ سواری پر بیٹھے بیٹھے رمی جمار کر لے اور آگے بڑھ جائے''۔(۲۸)

سفر میں سلسلہ درس

یہ ہے ایک انداز طالب علم کو علم دینے کا حضرت امام ابو یوسفؒ اپنے طلبہ کو علم دینے کا اہتمام سفر کی حالت میں بھی جاری رکھتے جب امام ابو یوسف عہدۂ قضاء پر مامور ہوئے تو اس کی وجہ سے تدریس میں تسلسل قائم نہیں رہتا تھا اس طرح طلبہ کا نقصان ہو رہا تھا لیکن پھر بھی وہ اپنی ذات سے طلبہ کو فائدہ پہنچانا زیادہ پسند کرتے تھے جیسا کہ ایک واقعہ ہے کہ بصرہ تشریف لے گئے تو طلبہ کا بڑا اژدہام ہوا۔ اصحاب حدیث چاہتے تھے کہ وہ پہلے استفادہ کریں اور اصحاب فقہ چاہتے تھے کہ پہلے ان کو خطاب کیا جائے امام ابو یوسف نے فرمایا میں دونوں گروہ [illegible] تعلق رکھتا [illegible] کو دوسرے پر ترجیح نہیں دے سکتا [illegible] امام صاحب نے

ایک سوال کیا تو جن لوگوں نے جواب دیا ان کو اندر لے گئے اور پھر دیر تک مجلس درس وافادہ قائم رہی۔(۲۹)

مندرجہ بالا واقعہ کا حوالہ اور پس منظر کچھ اس طرح بیان کیا ہے امام ابو یوسفؒ نے اعلان کیا فریقین سے ایک مسئلہ پوچھنا چاہتا ہوں جو فریق صحیح جواب دے گا اس کو سب سے پہلے میرے گھر میں داخلے کا موقع ملے گا یہ کہہ کر امام ابو یوسفؒ نے اپنی انگلی سے انگوٹھی نکالی اور ارشاد فرمایا کہ''ایک آدمی نے میری یہ انگوٹھی منہ میں چبا ڈالی اور اسے ریزہ ریزہ کر دیا اب یہ بتایئے میں کیا کروں؟ اہل حدیث میں سے کچھ نے جواب دیا لیکن امام ابو یوسفؒ نے جواب کو درست تسلیم نہیں کیا۔ پھر اہل رائے میں سے ایک آدمی کھڑا ہوا اس نے کہا اس آدمی سے سونے کی قیمت لے لی جائے گی اور وہ انگوٹھی صاحب خاتم کو دے دی جائے گی تا کہ نقصان کی تلافی ہو سکے اور ٹوٹی پھوٹی انگوٹھی اس کے حوالے کر دی جائے بشرطیکہ صاحب خاتم اسے اپنے پاس نہ رکھنا چاہتا ہو البتہ ٹوٹ پھوٹ کی کوئی قیمت نہیں دلائی جائے گی یہ سن کر اہل رائے کے گروہ کو گھر میں اندر بلا لیا چنانچہ اہل رائے درس دینے کو حاصل کرنے پر فوقیت دی یہ درس وافادہ کا سلسلہ تقریباً ۳۲ برس تک جاری رہا۔

امام ابو یوسفؒ کے تلامذہ کے نام کچھ حاصل ہوئے ہیں وہ یہ ہیں قاضی ابراہیم بن جراح مازنی، ابراہیم بن سلمۃ الطیالسی، ابراہیم بن یوسف، میمون البلخی، امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ میں نے تین الماریوں کے بقدر کتابوں کا علم ان سے حاصل کیا ہے۔

اسد بن فرات، امام مالک کے مشہور شاگرد اسمٰعیل بن حماد امام اعظم کے پوتے اشرف بن سعد نیشا پوری بشار بن موسیٰ بصری، جعفر بن یحییٰ برمکی ہارون الرشید کا وزیر، ابو الخطاب، ابو یوسفؒ کے کاتب یعنی پرائیویٹ سیکریٹری خلف بن ایوب بلخی، علی بن صالح جرجانی، علی بن المدینی (مہور حافظ الحدیث) فیض بن عیاض، امام احمد بن حسن الشیبانی، وسیع بن الجراح بلال بن یحییٰ بصری (صاحب احکام الوقف) یحییٰ بن آدم صاحب کتاب الخراج یحییٰ بن معین (امام جرح تعدیل یوسف امام ابولومنو کے صاحبزادے جو کتاب الآثار کے راوی ہیں ان ناموں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ امام ابو یوسف کے فیض کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔

وسعت افادہ

امام ابو یوسف کی ذات اوصاف و کمالات کے مجموعہ تھی وہ بہت بڑے مفسر، حافظ حدیث، فقیہ اور مجتہد وقت تھے۔ آپ سے علم لینے والوں کی بڑی تعداد تلامذہ کی ان ممالک میں رہی، خراسان، جوز جان، بلخ، مرو، ہرات، رے، بغداد، کوفہ، بصرہ، مدینہ منورہ اور مغرب اقصیٰ تک شائقین علم امام ابو یوسفؒ ہیں۔

امام ابو یوسف نے تدریس کی خدمت میں تقریباً ۳۲ برس گزارے۔ خراساں، جوز جان، بلخ، مرو، ہرات، رے، بغداد، کوفہ، بصرہ، مدینہ منورہ اور مغرب اقصیٰ تک کے شائقین علم امام ابو یوسفؒ سے فیض یاب ہوتے رہے۔ امام صاحب کی ذات میں بے شمار خوبیاں موجود تھیں، وہ بہت بڑے مفسر قرآن، حافظ حدیث، فقیہ اور مجتہد وقت تھے، ایام عرب، انساب اور ادب وشعر پر ان کی نظر گہری اور وسیع تھی، غرض وہ بیک وقت جامع علوم وفنون تھے۔ وہ دنیا کی سب سے بڑے اسلامی حکومت کے رکن وزیر قانون قاضی القضاء تھے اشراف درباران کے سامنے سر جھکاتے تھے۔ خلیفہ ہارون ان کے سامنے سراپا ادب بن کر بیٹھا تھا۔ مگر اس قدر عظمت ورفعت کے باوجود آپ کی طبیعت میں غرور تکبر اور احساس برتری نہ تھا آپ سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتے کسی کا دل نہ دکھاتے کسی کے کام اگر آسکتے تو تامل نہ کرتے۔

مسلک اعتدال

امام ابو یوسفؒ کے زمانہ میں مسئلہ خلق قرآن اور اعتزال کا بڑا چرچا تھا۔ اس موضوع پر بحث ومباحثہ ایک عام معمول تھا اس بحث سے نہ تو خلفاء اور امراء کے دربار خالی تھی نہ فقہاء اور محدثین کی مجالس درس اور نہ عوام اور بازاری لوگوں کے حلقے خصوصیت سے ایمان کی کمی وزیادتی قرآن کے مخلوق وغیر مخلوق ہونے گناہ کبیرہ کے مرتکب کے کافر ہونے اور خدا تعالیٰ کی تجسیم وعدم تجسیم وغیرہ کے مباحث کا ذکر تقریباً ہر مجلس اور ہر گھر میں تھا ان حالات میں فقہائے احناف محتاط رویہ اختیار کرتے تھے۔ آئمہ احناف بالخصوص امام ابو حنیفہؒ امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ کی آراء کیا تھیں ذیل میں امام ابو یوسفؒ کے وہ نصائح کا ذکر کرنا ضروری ہے جو اپنے

تلامذہ اور عامۃ المسلمین کو اعتدال پر دینے کی تلقین کرتے۔

آپ کے بارے میں کسی نے مشہور کر دیا کہ امام ابو یوسفؒ خلق قرآن کے قائل ہیں ان کے تلامذہ نے سنا تو ان کو بڑی تشویش ہوئی وہ ان کے پاس بڑے ادب و احترام سے آتے اور پوچھا تو امام ابو یوسفؒ نے بڑے غصہ میں فرمایا:

''ارے کم عقلو! یہ لوگ جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھ سکتے ہیں ان کو میرے اوپر کوئی بہتان تراش لینے میں کیا باک ہوسکتا ہے''۔

پھر فرمایا:

اهل بدع يحكون كلا مهم و يكذبون على الناس (۳۰)

ترجمہ: اہل بدعت اپنی طرف سے بات کہتے ہیں اور لوگوں پر جھوٹ باندھتے ہیں۔

اس طرح کے مسائل میں پڑنے کے بجائے اور اپنی صلاحیتیں ضائع کرنے اور مسلک اعتدال اور ضرورت دین کو ترجیح دینے کے سلسلے میں امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں:

دین کے بارے میں شک لڑائی، کج بحثی اور جدال چھوڑ دو اس لیے کہ دین بالکل واضح ہے۔ خدا نے اس کے فرائض بھی مقرر کر دیئے ہیں اور اس کی سنتیں بھی اور اس کی تمام حدود مقرر کر دی ہیں اور حلال کو حلال اور حرام کو حرام کر دیا ہے جیسا کہ اس نے خود فرمایا تو میں نے تمہارے لیے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمت کو تمہارے اوپر تمام کر دیا اور تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کر لیا، تو اس کے حلال کو حلال اور اس کے حرام کو حرام قرآن کی محکم آیات واضح آیات پر عمل کرو اور جو متشابہ آیات ہیں ان پر ایمان و یقین رکھو اور اس کے اندر جو امثال ہیں یعنی مثالیں ان سے عبرت حاصل کرو۔

اگر دین کے مسائل میں کج بحثی کوئی تقویٰ کی بات ہوتی تو اس کی طرف سب سے پہلے رسول اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے بعد آپ کے صحابہ کرامؓ سبقت کرتے تو کیا انھوں نے کبھی عقائد کے مسائل میں کج بحثی کی، انھوں نے اگر اختلاف اور بحث ومباحثہ کیا تو فقہی مسائل میں جن کا تعلق عمل سے ہے۔

انھوں نے اگر گفتگو کی تو فرائض، نماز، حج، طلاق جیسے مسائل میں اور حلال اور حرام میں انھوں نے ایمانیات میں کبھی قیل وقال نہیں کیا۔ انھوں نے خدا کے تقویٰ اور اس کی اطاعت پر بس کیا اور انھوں نے سنت متواترہ کو مضبوط پکڑ لیا تھا اور جوان مبتدعین نے نئے نئے مسائل پیدا کر دیئے ہیں ان کو انھوں نے کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کہا ہے کہ جب دیکھو کہ ہماری آیات میں کرید کر رہے ہیں تو ان سے الگ ہو جاؤ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو اپنی کتاب میں جدال اور قیل وقال کا طریقہ بھی نازل فرما سکتا تھا۔ مگر اس سے اس نے گریز کیا اور یہ حکم دیا کہ ان کے ساتھ نہ بیٹھو اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اگر وہ تم سے محبت کریں تو کہہ دو کہ میں نے اور جن لوگوں نے میری اتباع کی ہے اپنی پوری توجہ خدا کی طرف مبذول کر لی ہے آپ سے یہ نہیں کہا کہ آپ بھی ان سے بحث ومباحثہ اور قیل وقال کیجیے۔

یہ نصیحت امام ابو یوسفؒ نے اپنے تلامذہ کی

ذروا الخصومة فی الدین و المراء فیه والجدال — دین کے بارے میں کج بحثی اور جدال چھوڑ دو

فان الدین واضح بین قد فرض اللّٰه عزجل فرائضه و شرع سنته وحدوده وحد دعا واحل حلاله و حرام حرامه — اس لئے کہ دین بالکل واضح ہے خدا نے اس کے فرائض مقرر کر دیئے ہیں فرض اور سنت بھی اور اس کی حدود بھی مقرر کر دی ہیں اور حلال کو حلال اور حرام کو حرام کر دیا

فقال اکملت لکم دینکم و اتممت　جیسا کہ اس نے　خود فرمایا میں نے تمہارے لیے

علیکم نعمتی	دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمت کو تمہارے اوپر تمام کر دیا
و رضیت لکم الاسلام دینا	اور تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کر لیا
فاحلوا حلال القرآن و حرموا حرمه	تو اس کے حلال کو حلال سمجھو اور اس کے حرام کو حرام
واعملوا بمحکم و امنوابا لمتشابه	قرآن کی محکم یعنی واضح آیات پر عمل کرو اور جو متشابہہ آیات ہیں ان پر ایمان رکھو
واعتبروا بالامثال فیه	اور اس کے اندر جو امثال یعنی مثالیں ان سے عبرت حاصل کرو
فلو کانت الخصومة فی الدین تقویٰ	اگر دین کے مسائل میں کج بحثی کوئی تقوی کی بات ہوتی

عندالله لسبق الیها رسول الله صلی الله　اس کی طرف سے سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ

علیه وسلم	علیہ وسلم
و اصحابه بعدهٗ	اور اس کے بعد آپؐ کے بعد آپؐ کے اصحاب سبقت کرتے
فهل اختصموا فی الدین	تو کیا انھوں نے کبھی عقائد کے مسائل میں کج بحثی کی

تنازعوا فیه و قداختصموا فی الفقه و　انھوں نے اگر اختلاف اور بحث و مباحثہ کیا فقہی

تکلمو فی الفرائض	مسائل جن کا تعلق عمل سے ہے۔

والصلوۃ والحج و الطلاق و الحلال و الحرام	اگر گفتگو کی فرائض، نماز، حج، طلاق جیسے مسائل میں حلال اور حرام میں
ولم یختصموا فی الدین ولم یتنازعو فیه	انھوں نے ایمانیات میں کبھی قیل وقال نہیں کیا
فاقتصرو اعلیٰ تقویٰ اللّٰہ و طاعته	انھوں نے خدا کے تقویٰ اور اس کی اطاعت پر بس کیا۔
والزموا ماجرت السنة	انھوں نے سنت مواترہ کو مضبوط پکڑ لیا تھا
ودعوا ماحدث المحدثون من التنازع فی الدین	اور جو ان مبتدعین نے نئے نئے مسائل پیدا کر دیئے ہیں ان کو انھوں نے کبھی ہاتھ نہیں لگایا
وقد انزل اللّٰہ عزوجل فی کتابة "اذا رأیت الذین یخوضون فی اٰیتنا فاعرض عنهم "	اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کہا ہے جب دیکھو کہ ہماری آیات میں کرید کر رہے ہیں ان سے الگ ہو جاؤ
ولوشاء انزل فی ذٰلك جدالا وحجاجا ولکنه ابی ذلك	اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو اپنی کتاب میں جدال اور قیل و قال کا طریقہ بھی نازل فرما سکتا تھا مگر اس نے (انکار) گریز کیا۔
وقال "ولا تقعدوا معهم" وقال "فان حاجوك	اور یہ حکم دیا کہ ان کے ساتھ نہ بیٹھو اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا اگر وہ تم سے حجت کریں
فقل اسلمت وجهی اللّٰہ ومن تبعن "	تو کہہ دو کہ میں نے اور جن لوگوں نے میری اتباع کی اپنی توجہ اللہ کی طرف مبذول کر لی ہے۔

ولم یقل و حاجھم (۳۱)　　آپ سے یہ نہیں کہا کہ آپ بحث و مباحثہ ان سے قیل قال کیجیے

علمی مسائل میں خصومت سے گریز

حضرت امام ابو یوسف کے شاگرد اسد بن فرات درحقیقت مغرب اقصیٰ کے رہنے والے تھے شوق علم انھیں مدینہ منورہ لے گیا وہاں سے انھوں نے امام مالک سے علم حاصل کیا بعض مسائل میں ان کی تشفی نہ ہوسکی جستجو ہوئی کہ فقہا کوفہ کو بھی ٹٹولا جائے چنانچہ اس شوق کو پورا کرنے کے لیے کوفہ چلے آئے۔

کوفہ میں امام ابو یوسف اور امام محمد کا بازار علم گرم تھا ان سے استفادہ کیا۔ اسد بن فرات نے سفر کی سختیاں برداشت کر کے مدینہ سے کوفہ پہنچے کیونکہ کوفہ اس وقت علم کا مرکز تھا۔ حضرت امام ابو یوسف اور امام محمد کی وجہ سے لوگ جوق در جوق امام صاحب کی سیرت کردار علم وسعت نظر قوت اجتہاد رسوخ فی العلم اور دوسرے نکات سے بہت زیادہ متاثر ہوئے یہاں آ کر انھوں نے یکھا قانون فقہ میں لچک آسانی اور سہولت اسلام کی اصل روح ہے اسد بن فرات امام ابو یوسف کی شاگردی پر فخر محسوس کرتے تھے ان کی تعلیمات نے اسد بن فرات کے قلب و نظر کو تبدیل کر دیا تھا۔

اسد بن فرات امام ابو یوسف سے روایت کرتے ہیں کہ امام ابو یوسف نے ارشاد فرمایا: ''دین کے معاملات خصومت، جنگ و جدل کا سلسلہ ترک کیونکہ دین واضح ہے اللہ تعالیٰ نے فرائض مقرر کر دیے سنن مشروع کر دیے، حدود کی حد بندی کر دی جو حلال تھا اسے حلال کر دیا اور حرام کو حرام قرار دے دیا خود اللہ کا ارشاد ہے:

'' اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْناً''(۳۲)

’’آج میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو پسندیدہ دین قرار دیا۔‘‘

پس جو کچھ قرآن نے حلال کر دیا اسے حلال رکھو جو کچھ قرآن نے حرام کر دیا اسے حرام سمجھو جو اس نے حکم دیا اس کی تعمیل کرو، متشابہات پر ایمان رکھو اور مثال کا اعتبار ملحوظ رکھو اگر معاملات دین میں خصومت اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبنی پر تقویٰ ہوتی تو بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا ہی کرتے اور آپؐ کے بعد آپ کے اصحاب کا بھی یہی نظریہ ہوتا، لیکن کیا انھوں نے ایسا کیا؟ کیا انھوں نے معاملات دین میں خصومت روا رکھی؟ کیا دینی معاملات میں انھوں نے تنازع کیا، بے شک انھوں نے فقہی معاملات و مسائل میں اختلاف کیا اور اس باب میں بحث وجدل کی انھوں نے فرائض نماز، حج، زکوۃ، طلاق، حلال وحرام کے مسائل میں بھی اختلاف فکر و نظر کا اظہار کیا، لیکن جہاں تک نفس دین کا تعلق ہے وہ بالکل متفق رہے انھوں نے ذرا بھی خصومت یا بیکار آویزش کا اظہار نہیں کیا۔ پس تم بھی اللہ سے ڈرو اس کی اطاعت کرو اور اسے اپنے اوپر لازم کر لو جس کی تائید سنت سے ہوتی ہے۔ بس اتنی شفقت ہمارے لئے کافی ہے یاد رکھو سنت کا لزوم اللہ کے حکم سے دشمن سے انسان کو محفوظ رکھ سکتا ہے شرط صرف یہ ہے کہ آدمی اسے اپنے اوپر لازم کرے پھر وہ ہر خطا اور لغزش سے محفوظ ہو جائے گا۔ (۳۳)

اسد بن فرات امام ابو یوسف کے شاگرد خاص رہے اسد بن فرات تعلیم کے مراحل سے فارغ ہو کر اپنے وطن پہنچے تو وہاں کی حکومت، اعیان و امداد اور عوام نے ان کی قدر دانی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی، انھیں منصب قضا سونپا اور قاضی القضاء کے عہدے پر فائز ہوئے۔

لیکن قدرت کو ان سے ابھی ایک بہت بڑا کام لینا تھا اسی زمانہ میں مغرب کی اسلامی حکومت نے صقلیہ (سنسلی) کے قزاقوں اور غارت گران امن و امان کی تاخت و تاراج سے متاثر ہو کر فیصلہ کر لیا کہ اسے مملکت اسلامی میں شریک کر لیا جائے، چنانچہ صقلیہ فتح کرنے کے لیے جو فوج بھیجی گئی اس کے امیر اور سالار

بھی اسد بن فرات تھے۔

اسلام کی تاریخ میں ایسے لوگ ملتے ہیں جو بیک وقت صاحب سیف وقلم تھے مثلاً امام ابن ثمینہ جنھوں نے قرامطہ سے تاتاریوں سے اور دوسرے عناصر سے جنگ میں باقاعدہ حصہ لیا۔لیکن یہ سعادت قاضی اسد بن فرات ہی کی قسمت میں اللہ نے لکھ دی تھی کہ وہ ایک بڑی فوج کے امیر اور سالار بنیں۔ایک غیر ملک کو فتح کریں،تاریخ میں فاتح صقلیہ کے نام سے مشہور ہوں اور ان کارناموں کے انجام دینے کے بعد جام شہادت پئیں اور حیات ودام حاصل کریں۔''اسد بن فرات بہت بڑے عالم مجاہد اور سب سے بڑھ کر یہ کہ راہ حق کے شہید تھے''۔

تدوین اصول فقہ

حضرت امام ابو یوسفؒ علم اصول فقہ کے مدون اول ہیں۔امام ابو یوسفؒ اور ان کے علم وفضل کا سب سے وسیع میدان فقہ کی تدوین واشاعت اور اس کی خدمت وترویج ہے جس میں انھوں نے باقی تمام علوم سے زیادہ اپنی جودتِ طبع اور جولانی فکر کا ثبوت دیا ہے چنانچہ دنیا ان کو فقیہہ ہی کی حیثیت سے جانتی ہے۔علم فقہ کے بعد ان کا دوسرا بڑا کارنامہ اصول فقہ کی تدوین ہے جب کہ اس سے پہلے باقاعدہ اصول فقہ کی تدوین نہیں ہوئی تھی اگرچہ قرآن وسنت کے کلیات کو سامنے رکھ کر حضرات صحابہ وتابعین نے بہت سے مسائل مستنبط کیے تھے انھی اصول وکلیات اور حضرات صحابہؓ کے مستنبط ومسائل کی روشنی میں امام ابو یوسف نے علم اصول فقہ مرتب کیا۔اگرچہ اس موضوع پر ایک کتاب خود امام اعظم ابو حنیفہؒ نے بھی لکھی تھی جو''کتاب الرائے'' کے نام سے مشہور ہے تاہم امام ابو یوسفؒ پہلے شخص ہیں جنھوں نے علم اصول فقہ کو باقاعدہ ایک فن کی حیثیت سے مدون کیا چنانچہ کتاب مفتاح السعادۃ ومناقب کردری ومناقب موفق تذکرہ ابو یوسفؒ میں محمد بن جعفرؒ کہتے ہیں:

واول من وضع الکتاب فی اصول الفقه علی مذهب ابی حنیفه(۳۴)

امام ابو یوسف [illegible] پہلا شخص [illegible] امام ابو حنیفہؒ کے [illegible]

تدوین کی۔

بعض حضرات سے منقول ہے کہ امام شافعیؒ اصول فقہ کے سب سے پہلے مولف ہیں مگر واقعاتی اور تجزیاتی طور پر یہ بات سب کے نزدیک مسلم ہے کہ علم اصول فقہ کی تدوین میں سبقت وتقدم کا شرف امام اعظم ابوحنیفہ اور امام ابو یوسفؒ اور آئمہ احناف ہی کو حاصل ہے۔

امالی ابو یوسف اور کتاب الخراج

علامہ زاہد الکوثری حسن التقاضی میں لکھتے ہیں کہ کتاب ''الخراج'' امام ابو یوسف کا انداز بالکل امام ابو حنیفہؒ کی طرح ہے۔امام ابوحنیفہؒ نے امام ابو یوسفؒ کی تربیت جس طرح کی ہے جیسا کہ ایک وصیت نامہ امام ابو یوسفؒ کے نام تحریر کیا اسی طرح امام ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج ہارون لرشید کے لیے تحریر کی گوکہ امام ابوحنیفہ نے امام ابو یوسف کی سیاسی فکر قرآن سے معاشرتی تربیت حاصل کی ہارون الرشید کی درخواست پر احکام و اموال سے متعلق احکامات حاصل کیے جسے قلمبند کیا۔امام ابو یوسفؒ کی اس کتاب کے مقدمہ سے ثابت ہوتا ہے کہ امام صاحب کے سینہ میں کس قدر جری بہادر اور نڈر دل تھا۔حق کے معاملہ میں کسی سے خائف ہونا جانتے ہی نہیں ان کے طبقہ میں سے کسی شخص نے کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی جو اس کے ہم پلہ اور ہم رتبہ ہو اس کتاب کا آج تک جواب نہ ہوسکا۔مقدمہ جس دلیری اور جرأت کے ساتھ خلیفہ وقت کو نصیحت اور موعظت کی ہے اسے خدا سے ڈرایا ہے، ظلم سے روکا ہے، خلق خدا کے ساتھ نرمی اور ملاطفت کا برتاؤ کرنے کی تلقین کی ہے عدل پر زور دیا ہے، احسان کی تاکید کی ہے، حسن سلوک کی ترغیب دی ہے، یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ وہ صرف خدا ہی سے ڈرتے تھے اس لیے دوسروں کو بھی خواہ وہ خلیفہ وقت ہی کیوں نہ ہو خدا سے ڈراتے رہتے تھے جس بھی شخص نے اس موضوع پر دوسری کتابوں کا مطالعہ کیا مجبور کر دیا یہ اعتراف کرنے پر کہ یہ کتاب اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے لاثانی اور بے مثال ہے یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کی متعدد شرحیں بھی لکھی گئیں جس کے ذریعہ اس کتاب کے نکات مکنون کو اجاگر کیا گیا ہے، علم ومعرفت کے جوخزینے اس کتاب میں موجود

ہیں ان کی نشاندہی کی گئی ہے جو حقائق اس میں زیر نقاب ہیں انھیں نمایاں کیا گیا ہے۔

کتاب الخراج امام ابو یوسفؒ کا لازوال علمی کارنامہ ہے یہ کتاب اپنی جامعیت، افادیت اور اہمیت کے اعتبار سے یگانہ اور منفرد ہے اتنی صدیاں گزر چکی ہیں لیکن آج بھی کتاب الخراج کی عظمت قائم ہے اور شاید مدتوں تک بلکہ ہمیشہ قائم رہے گی۔ اس کتاب میں روح اسلام بھی ہے۔ روح عصر بھی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ زندہ رہے گی۔

علامہ زاہد الکوثریؒ نے اپنے رسالہ میں امام ابو یوسفؒ کی گرانقدر مصنفات و مولفات کی تفصیل دی جو علوم و معارف کے بحر بیکراں تھے۔ تاریخ میں آپ کی مبسوط تصانیف کا ذکر ملتا ہے۔ علامہ کوثری نے لکھا ہے کہ شیخ یحییٰ الغزیٰ جو مسجد حرام میں منصب وعظ پر فائز تھے اور حجر اسود کے مواجہہ میں کعبہ شریف میزاب کے سامنے وعظ کیا کرتے تھے۔ ۹۰۸ ہجری کا واقعہ ہے کہ وہ شہر زربید میں تشریف لائے تھے انھوں نے ارشاد فرمایا کہ:

''میں نے بچشم خود تین سو مجلدات میں ''امالی ابو یوسف شہر غزہ جو ارض شام میں واقع ہے کے ایک کتب خانے میں دیکھے ہیں اور جس کتب خانے میں یہ بے نظیر علمی سرمایہ دیکھنے میں آیا وہ صرف امام ابو یوسفؒ کی کتابوں کے لیے مخصوص تھا۔''

وہاں کتب خانہ کی وضاحت سے مراد شاید راوی نے الماریاں لی ہیں کیونکہ اس زمانے میں یہ دستور تھا کہ خاص خاص اصحاب کی کتب و مولفات کے لیے الماریاں مخصوص کر دیتے تھے انہی میں ان کی کتابیں رکھی جاتی تھیں۔ امام ابو یوسفؒ کی تین سو مجلدات پر مشتمل یہ ضخیم کتاب اور اس نوع کی دوسری دسیوں علمی مولفات کے بارے میں اب کچھ معلوم نہیں غالباً یہ کتابیں بھی ۱۰۰۰ ہجری کی اس طوائف الملو کی اور خانہ جنگی میں ضائع ہو گئیں جو مصر میں چرکس حکومت کے زمانہ میں ہوئی جس سے بہت سی گراں بہا اور نادر و نایاب کتابیں ضائع ہو گئیں۔

مؤلفات امام ابو یوسف

مولفات ابو یوسف کے اجمالی تعارف کے بارے میں یہ حقیقت سامنے آئی کہ آپ کی مولفات کشیدہ کا ذکر اہل علم کی کتابوں میں موجود ہے لیکن ان میں سے اکثر ناپید ہو چکی ہیں اوراب ان کے اجمالی تعارف سے بڑھ کر ان تک حقیقی رسائل ناممکن ہے۔ امالی، کتاب الآثار، کتاب الخراج، اوراختلاف ابن ابی لیلیٰ وابی حنیفہؒ کا کسی حد تک اجمالی تذکرہ ہم نے کیا مگر ان کے علاوہ الردعلی سیر الاوزاعی، المخارج والحیل، کتب فی الاصول والامالی، محض امالی، کتاب اختلاف علماء الامصار کتاب الردعلی مالک بن انس، الخراج، کتاب الجوامع، جو آپ نے یحییٰ بن خالد کے لیے تصنیف کی یہ چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس میں انھوں نے لوگوں کے اختلافات اور قابل عمل رائے کا اظہار کیا ہے۔ اصول فقہ مسائل امالی امام ابو یوسفؒ، ادب القاضی یہ وہ کتابیں تھیں جو اپنے موضوع، مغز، مواد، معلومات نکات اور حقائق و معارف کے اعتبار سے اپنی نظیر آپ تھیں۔ عالم اسلام میں ان کا کوئی جواب نہ تھا۔ مدرسہ و خانقاہ میں ان کی یکساں عظمت تھی۔ علم کی ہر محفل اور ذکر کی ہر مجلس میں ان کتابوں کا چرچا تھا۔(۳۵)

مگر باہمی خانہ جنگیوں، بدامنیوں اور طوائف الملوکی نے جہاں اور بہت سے نقصانات ملت اسلامیہ کو پہنچائے وہاں ایک عظیم اور ناقابل تلافی نقصان یہ پہنچایا تاتاریوں نے قبول اسلام سے پہلے اسلامی ممالک پر تخت و تاراج کا جو نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کیا تھا اس میں سر کٹے، دھڑ گرے عمارتیں مسمار ہوئیں، شہر ویران ہوئے، کھیت جھلس گئے، دولت و ثروت پر ڈاکہ پڑا بلکہ اس سے بڑھ کر نقصان یہ ہوا کہ مسلمانوں کے علمی خزانے اوران کے لازوال تصنیفی خزانے برباد ہو گئے اور ہر نقصان ایسا ہے جس کی تلافی ناممکن ہے۔

جو کچھ آپ کما کر لاتے ہیں وہی حاضر ہے

امام ابو یوسفؒ جب تحصیل علم سے فارغ ہوئے تو نکاح کر لیا اور بعض روایات کے مطابق زمانہ طالب علمی میں آپ کا نکاح ہو چکا تھا مگر غربت و افلاط، عسرت و ناداری ہنوز جاری تھی آپ کے افلاس کا یہ عالم

تھا کہ کاغذ خریدنے کی استطاعت نہ رکھتے تھے۔ مذبح خانے سے جانوروں کی ہڈیاں اور پسلیاں اٹھالاتے اور ان پر مسائل قلمبند فرماتے ایک روز تھکے ماندے گھر آئے بیوی سے کھانا مانگا اللہ کی بندی نے وہی ہڈیاں لاکر سامنے رکھ دیں اور کہا ''جو کچھ آپ کما کر لاتے ہیں وہی حاضر ہے بیوی کا یہ طعنہ سن کر آپ کو کب معاش کی فکر ہوئی۔(۳۶)

خوشدامن کا طعنہ

غربت و افلاس کی وجہ سے اپنے گھر جو کہ شادی کے بعد سسرال سے ملا تھا اس مکان کا ایک شہتیر نکلوا کر بازار میں بیچنے کے لیے بھیج دیا یہ بات خوشدامن صاحبہ کو معلوم ہوئی تو اسے بے حد ناگوار گزری اور دیکھا کہ اس کے چہرے پر کافی گرانی کے آثار ہیں بلکہ بڑی بی نے اس سلسلہ میں امام ابو یوسفؒ سے کچھ تلخ ترش باتیں بھی کیں اور شاید یہی کہا ہوگا کہ ''اچھی میری لڑکی کی قسمت پھوٹی ایسے آدمی سے بیاہی گئی جو خود تو کیا کھائے گا اور دوسروں کو کیا کھلائے پلائے گا۔ اب میرے گھر کے شہتیر تک بیچ بیچ کر کھانے لگا ہے کہتے ہیں کہ ساس کے اس طرز عمل سے دل پر سخت چوٹ پڑی اور اب بات برداشت سے باہر ہوگئی ایسے حالات پیش آئے ادھر خلیفہ وقت مہدی کا اصرار بڑھنے لگا ساتھ ہی ساتھ دینی سیاست اور حنفیت کی ترقی و عروج اور ترویج نفاذ کے امکانات بھی ظاہر ہونے لگے تو امام ابو یوسفؒ نے مہدی کی حکومت میں قضا کا عہدہ قبول کرلیا گو ابتدا میں آپ اس عہدہ کے قبول کرنے سے کتراتے رہے اور جس طرح ہوسکا زندگی گزارتے رہے لیکن جب بات یہاں تک پہنچی تب مجبوراً ملازمت اختیار کرلی۔(۳۷)

قاضی القضاۃ کا منصب کیوں قبول کیا

جیسا کہ اکثر حالات میں امام ابو حنیفہؒ نے اپنی زندگی میں قاضی کے عہدہ کو کبھی قبول نہیں کیا امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد قاضی حفص بن غیاث کے حالات سے بات ظاہر ہوتی ہے جب مردار کا کھانا مجھ پر حلال ہوگیا تب میں نے قضا کا عہدہ قبول کرلیا اس طرح قاضی شریک کو بھی مجبوراً عہدہ قضا قبول کرنا پڑا تو انھوں نے اس

کو دین کے فروخت کرنے سے تعبیر کیا ان کے الفاظ یہ ہیں ''بعت دینی'' یعنی میں نے اپنے دین کو بیچ دیا۔ وہ لوگ مردار دین فروشی سے اس لیے اس کو تعبیر کرتے تھے کہ وہ مسند قضا پر بیٹھنے کے بعد اس جرأت اور آزادی سے دینی احکام کی روشنی میں معاملات کا فیصلہ نہیں کر سکتے تھے جس آزادی سے وہ عہدہ افتاء پر رہ کر کر سکتے تھے مگر اس سبب کے باوجود امام ابویوسف نے عہدہ قضاء کیوں قبول کیا اس کے متعلق تفصیل ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہؒ نے اسلامی احکام کی ترویج اور غلبہ وتنفیذ کے لیے فقہاء اور مجتہدین کی ایک جماعت تیار کی تھی اس کی غرض بھی یہ تھی کہ ذاتی طور پر وہ حکومت کے ساتھ ہر قسم کے اشتراک عمل تعاون اور قضا وغیرہ کے قبول کرنے سے بے نیاز رہیں۔

مگر امام ابوحنیفہ نے تربیت کے اہلیت کے لحاظ سے اس قدر اسپرٹ بھر دی کہ مستقبل کی کوئی حکومت بھی ان کے تلامذہ کے دیئے ہوئے خاکہ پر عمل کیے بغیر ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکے۔

یہ ایک حقیقت ہے تاریخ قاضی القضاء (چیف جسٹس) کا عہدہ عملاً حضرت امام ابویوسفؒ کو ملا مگر اس کے لیے قضا اور ماحول کی سازگاری اور عہدہ کی تجویز وایجاد اس سے قبل امام ابوحنیفہ کر چکے تھے۔ امام اعظم کے بقول پھر امام ابویوسفؒ اور امام زفرؒ تو ایسے قاضیوں میں سے تھے کہ وہ قاضیوں اور مفتیوں کو تیار کر سکتے تھے۔

شرعی احکام کی ترویج واشاعت میں علمی قوت کے ساتھ سیاسی قوت کی بھی ضرورت ہوتی ہے جب ایمان اور اسلام محفوظ رہے اور سیاسی قوت کے بل بوتے پر نفاذ شریعت اور ترویج احکام کا مقدس کام انجام پذیر ہو سکے تو پھر عہدۂ قضاء یا وزارت عدل قبول کر لینا یا حکومت کے ساتھ کسی بھی صورت میں اشتراک عمل کر لینا شرعاً مذموم نہیں بلکہ محمود ہے۔ امام ابویوسفؒ دین کی مصلحت اسی میں سمجھتے تھے کہ عہدہ قضاء کو قبول کر لیا جائے اور اس کے ذریعہ اسلامی نظام کے ان قوانین کو نافذ کیا جائے جو امام اعظم کی وفات کے بعد خود انھوں نے اور ان کے احباب نے کتاب وسنت کے مستنبط کیے تھے۔

امام ابو یوسفؒ کی سترہ سالہ قضاء وافتاء اور وزارت عدل و انصاب کے منصب جلیل کی پوری تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ وہ اپنے استاد ابو حنیفہ کی ہدایت، تعلیم اور ان کے طریق کار کے مطابق اپنے مجددانہ عزم اور ارادہ کے ساتھ حکومت میں ہوتے ہوئے اس کی غلط پالیسیوں کے مقابلہ میں سینہ سپر ہو گئے تو اس سے بڑی حد تک زمانہ کی رفتار اور حکومت کی پالیسیوں کا رخ مڑ گیا۔ امام ابو یوسفؒ نے اپنی جرأت دینی حمیت اور اظہار حق سے قضا اور وزارت عدل کے عہدہ کو اس قدر اونچا اور بلند کر دیا کہ مطلق العنان خلفاء تک کو ان کے فیصلوں کے آگے سر جھکا دینا پڑتا تھا۔

امام ابو یوسف کسی علمی اور تحقیقی مجالس خود اس بات کی گواہ ہیں کہ ان کا شمار متقین میں ہوتا ہے اور قاضی کا عہدۂ قضا قبول کر لینے کا ایک سبب معاشی تنگی پریشانی لیکن اس کو مستقل سبب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ امام ابو یوسف سے اس بات کی توقع ہر گز نہیں تھی بلکہ یہ تو اسلامی انقلاب کا اور غلبہ شریعت کا کام وجود میں آنا تھا جو ماحول امام ابو حنیفہ نے اپنے طلباء کی دینی اور فقہی انداز سے تربیت تقریباً ۱۰۰۰ اطلبہ پر مشتمل تعداد میں کی تھی یہ امام ابو حنیفہؒ کی تعلیم اور مستقبل کی سیاسی پالیسی کا ایک حصہ تھا۔

اظہار حق

امام ابو یوسفؒ اظہار حق کہنے میں کسی کی پرواہ نہ کرتے تھے خواہ وہ سلطان ہی کیوں نہ ہو وہ کسی بھی صاحب وجاہت اور صاحب حکومت کو دین کے معاملہ میں خاطر میں نہ لائے یہی وجہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کی مدد ان کے شامل حال ہوتی تھی خود بادشاہ سے بھی اگر کوئی نامناسب اور دین کے خلاف بات صادر ہوتی تو صاف کہہ دیتے کہ عہدۂ قضا کے لحاظ سے میں تمہارا مطیع ہوں لیکن کسی غلطی پر آپ کو متنبہ کر دینا میرا فرض ہے جب بھی ان کی عدالت میں کوئی مقدمہ پیش ہوتا تھا تو راعی اور رعیت غنی اور فقیر ملوک و راہزن سب کو ایک صف میں رکھتے تھے، یہی وہ چیز تھی جس نے انکے رتبہ کو بلند کر دیا تھا اور اسلام میں قضا کا معیار بھی ان ہی امثال و روایت کی بناء پر رفیع ہو گیا، اسلام کی پیدا کردہ حریت، آزادی فکر اور آزادی نطق و کلام کی اصل روح کو ائمہ احناف

بالخصوص امام ابو یوسف نے قائم رکھا ہر طرح کے فاسد، لرزہ خیز اور مہیب حالات میں بھی نہ ان کے قدموں میں لغزش پیدا ہوئی نہ ان کی زبان لڑکھڑائی، انہوں نے وہی کیا جسے حق سمجھا اور وہی کیا جو ان کے نزدیک مبنی بر صواب تھا خواہ نتائج کتنے ہی مہلک اور خطرناک کیوں نہ ہوں۔

خلیفہ ہارون رشید کے نام امام ابو یوسفؒ کی ہدایات

امیر المؤمنین! خدا کا شکر ہے کہ اس نے ایک بڑی ذمہ داری (حکومت) آپ کے سپرد کی ہے اس کی ادائیگی کا ثواب بھی تمام ثوابوں سے بڑا اور اعلیٰ ہے اور اس میں کوتاہی کی سزا بھی تمام سزاؤں سے بدتر اور سخت تر ہے، آپ کے سپرد اس امت مسلمہ کے تمام معاملات کیے گئے ہیں، آپ دن رات کوشش کریں کہ ان کے حقوق کی بنیادیں مستحکم ہوں اور آپ ان کے جان و مال کے امین ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ پر یہ ذمہ داری ڈال کر آپ کی آزمائش کی ہے، میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ خدا تعالیٰ کے خوف اور ڈر پر جس تعمیر کی بنیاد نہیں رکھی جائے گی اس کے لئے ہر وقت خطرہ ہے کہ کسی وقت خدائے قدوس اوندھے منہ بنانے والے کے اوپر اسے گرادے، تو آپ امت اور عام رعیت کے افراد کی اوران کے حقوق کی حفاظت کی اور ان کے معاملات کی دیکھ بھال میں کوتاہی نہ کریں عمل میں خدا قوت بخشتا ہے، آج کے کام کو کل پر نہ اٹھا رکھئے اگر آپ نے ایسا کیا تو نقصان ہوگا، وقت کو توقع اور امید کے ساتھ نہ رکھئے بلکہ وقت کو عمل کے ساتھ رکھئے (یعنی امید پر کوئی کام اٹھا نہ رکھیے بلکہ ہر کام وقت پر کیجئے) ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے وقت کے بعد کام بیکار ہے، پھر بہت سی نصیحتیں کرنے کے بعد فرماتے ہیں، قیامت کے دن وہی حکمران سب سے زیادہ خوش بخت ثابت ہوگا جس نے اپنی رعیت کو خوشحال رکھنے کی کوشش کی، دیکھئے آپ کسی معاملہ میں جادہ مستقیم سے نہ ہٹیے گا ورنہ آپ کی رعیت بھی ہٹ جائے گی، خبردار! کسی معاملہ میں خواہش نفسانی اور اپنے غیض وغضب کو دخل نہ دیجئے گا، جب دین و دنیا میں کش مکش کی صورت پیدا ہو جائے تو چاہئے کہ آپ دین کے پہلو کو اختیار کریں اور دنیا کو چھوڑ دیں، دین باقی رہنے والی چیز ہے اور دنیا فانی ہے، آپ خدا کے قانون کے نفاذ میں آپ ملامت کرنے والوں کی بالکل پرواہ

نہ کیجئے۔(۳۸)

شجاعت و حق پرستی اور انصاف کے تقاضے

اسلام نے حریت و آزادی فکر اور آزادی نطق و کلام کی جو روح اپنی امت میں پیدا کی تھی وہ بہت جلد اضمحلال کا شکار ہو گئی، لیکن اگر کسی نے اسے قائم اور باقی رکھا وہ علماء اسلام اور بالخصوص ائمہ احناف تھے، ہر طرح کے فاسد، لرزہ خیز اور مہیب حالات میں بھی نہ ان کے قدموں میں لغزش ہوئی نہ ان کی زبان لڑکھڑائی، انہوں نے وہی کیا جسے حق سمجھا اور وہی کیا جو ان کے نزدیک مبنی بر صواب تھا خواہ نتائج کتنے ہی مہلک اور خطرناک کیوں نہ ہوں۔

امام ابو یوسفؒ بھی اسی قافلہ کے ایک فرد تھے جب تک زندہ رہے پوری صداقت، خلوص، جرات، بے خوفی، دلیری اور عدل و انصاف کے ساتھ اس راستے پر گامزن رہے، ذیل میں اس سلسلہ کا ایک واقعہ درج کیے دیتی ہوں جو امام صاحبؒ کے تمام سوانح نگار نقل کرتے چلے آئے ہیں:

امام ابو یوسفؒ کے منصب قضا پر تقرر کے بعد ایک مرتبہ امیر المؤمنین ہادی کے ایک باغ پر کسی شخص نے دعویٰ دائر کر دیا، مقدمہ بظاہر امیر المؤمنین کے حق میں تھا کہ قانونی طور پر اس کا پہلو زبردست تھا مگر درحقیقت واقعہ اس کے خلاف تھا، امام ابو یوسفؒ اپنی فقہی فراست سے اصل صورتحال پر آگاہ ہو گئے تھے، وہ چاہتے تھے کہ ظاہری اور قانونی تقاضوں سے قطع نظر ''حق بہ حقدار رسید'' کر دیا جائے، چنانچہ کسی موقع پر امیر المؤمنین ہادی سے نشست کے موقع پر باغ کا تذکرہ چھیڑ دیا گیا، امیر المؤمنین نے امام ابو یوسفؒ سے دریافت کیا کہ فلاں باغ کا معاملہ جو آپ کی عدالت میں دائر ہے اس کی کیا صورتحال ہے اور آپ اس میں کیا کرنا چاہتے ہیں؟

قاضی ابو یوسفؒ اپنے فیصلے اور عدالتی طریقہ کار اور ظاہری صورت حال سے قطع نظر ذہنی طور پر ہادی کو آمادہ کر کے عدل و انصاف کے تقاضوں پر عمل کرانا چاہتے تھے، فرمانے لگے:۔

امیر المؤمنین! مدعی کی درخواست اور اصرار یہ ہے کہ امیر المؤمنین سے اس بات کا حلف لیا جائے کہ ان کے گواہ سچے ہیں۔

ہادی نے پوچھا کیا مدعی کی درخواست واجبی ہے اور کیا آپ مجھے حلف اٹھانے کا حکم دیں گے؟

امام ابو یوسفؒ نے فرمایا قاضی ابن ابی لیلیٰؒ کا فتویٰ تو یہی ہے۔اور باغ کے کیس میں تو میں اس پر عمل کروں گا، خلیفہ جھوٹی قسم کے تصور سے لرز گیا اور قاضی ابو یوسفؒ سے عرض کیا: ''میں مدعی کو باغ واپس کیے دیتا ہوں۔''

یہ امام ابو یوسفؒ کی ایک تدبیر تھی جو کارگر اور تیر بہدف ثابت ہوئی۔(۳۹)

عدل وانصاف کی عدالت میں شاہ وگدا سب برابر ہیں

امام ابو یوسفؒ کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ خلیفہ ہارون رشید اور ایک یہودی کا مقدمہ امام ابو یوسف کی عدالت میں پیش ہوا اور اس سلسلہ میں دونوں آپ کے پاس عدالت میں حاضر ہوئے، تاہم یہودی کو ایک عام رعیت کی حیثیت ہونے کے پیش نظر احساس کمتری بھی تھا، اس لیے وہ خلیفہ سے ذرا پیچھے ہٹ کر قاضی ابو یوسفؒ کے سامنے بیٹھ گیا، مگر قاضی صاحبؒ سے یہ تفاوت بھی نہ برداشت کیا گیا اور کھلی عدالت میں یہودی کو مخالب کر کے فرمایا:

''ذرا آگے اور قریب آ کر خلیفہ کے برابر بیٹھ جاو، یہ اسلامی عدالت ہے اس میں ایک کو دوسرے پر کوئی تقدم اور تفوق نہیں، عدل وانصاف کی عدالت میں شاہ وگدا سب برابر ہیں۔''(۴۰)

ہارون رشید کے دربار میں زندیق کے قتل کا فیصلہ

قاضی ابو یوسفؒ کے سوانح نگاروں نے عثمان ابن حکیم کی ایک روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ ایک زندیق خلیفہ ہارون رشید کی خدمت میں پیش کیا گیا، ہارون رشید نے امام صاحبؒ کو طلب کیا، جب وہ تشریف لے آئے تو کہا آپ اس زندیق سے بحث اور مناظرہ کیجئے، امام ابو یوسفؒ نے فرمایا:۔

"اے امیر المؤمنین! جلاد کو طلب کیجئے، چمڑے کا نطع بچھوائیے، پھر اس شخص پر اسلام پیش کیجئے، اگر قبول کر لے تو بہت اچھا ورنہ گردن اڑا دیجئے، یہ اس قابل نہیں ہے کہ اس سے مناظرہ کیا جائے یہ تو اسلام قبول کر کے اس سے منحرف ہو چکا ہے۔"(۴۱)

امام کسائی رحمہ اللہ کا نحوی اعتراض اور امام ابو یوسفؒ کا فقہی جواب

ایک دفعہ ہارون رشید کے زیر نگرانی امام ابو یوسفؒ اور امام کسائیؒ کے درمیان خوب مناظرہ ہوا جو نحوی انداز کا تھا، سب سے پہلے خود خلیفہ نے امام ابو یوسفؒ پر چند سوالات کیے پھر امام ابو یوسفؒ کے جواب پر امام کسائیؒ نے نحوی اصول کے تحت جرح کی۔

سوال(۱):

ہارون رشید! انت طالق تین بار کہنے سے کتنی طلاقیں واقع ہوئیں؟ شریعت کے مطابق اس کا واضح جواب دیجئے۔

جواب:

امام ابو یوسفؒ! اس کلام سے ایک طلاق واقع ہوئی۔

سوال(۲):

انت طالق، او طالق، او طالق سے کتنی طلاقیں ہوں گی؟ اس کا واضح جواب مرحمت فرمائیں:۔

جواب:

اس صورت میں بھی ایک طلاق ہو گئی۔

سوال(۳):

انت طالق ثم طالق ثم طالق سے کتنی طلاقیں ہوں گی؟

جواب:

اس صورت میں بھی ایک طلاق واقع ہوگئی۔

سوال (۴):

انت طالق وطالق وطالق سے کتنی طلاقیں واقع ہوں گی؟

جواب:

ان الفاظ سے بھی ایک طلاق واقع ہوگئی۔

تنقید کسائیؒ:

جب امام ابو یوسفؒ نے ان چاروں سوالوں کا جواب دے دیا تو امام کسائیؒ نے فرمایا کہ یا امیر المؤمنین! امام ابو یوسفؒ کے دو جواب ٹھیک ہیں اور دو غلط ہیں، یعنی صورت اول ٹھیک ہے، اس لئے کہ انت طالق سے ایک طلاق ہوئی، طالق طالق بطور تاکید کہا، اس کی صحت میں شک نہیں۔ صورت دوم کا جواب بھی درست ہے، اس لیے کہ انت طالق سے بصیغہ تیقن ایک طلاق واقع ہوگئی، اس کے بعد اوطالق اوطالق میں شک کی وجہ سے کوئی طلاق نہ پڑے گی۔ صورت سوم کا جواب یہ ہے کہ غلط ہے کہ انت طالق ثم طالق ثم طالق میں بجائے ایک کے تین طلاقیں واقع ہوں گی اس عبارت میں لفظ ثم سے بالترتیب طلاق دی گئی ہے۔

صورت چہارم کا جواب بھی ٹھیک نہیں، اس لئے کہ انت طالق وطالق وطالق میں بھی بجائے ایک کے تین طلاقیں ہوں گی، اس صورت میں واو عاطفہ ترتیب پر دلالت کرتی ہے، یہ اصول نحو سے غلط ہے۔

جواب اور اس کا حل

امام ابو یوسفؒ سے ایسی غلطی کا صادر ہونا نہایت تعجب خیز امر ہے۔

دراصل حقیقت یہ ہے کہ خلیفہ عباسی نے طلاق غیر مدخولہ کے متعلق سوال کیا تھا اس قسم کے سوال کے مطابق چار صورتوں میں صرف ایک طلاق بائن پڑے گی، کیوں کہ فقہاء نے مدخولہ اور غیر مدخولہ کی خوب وضاحت کی ہے۔

تفصیل یہ ہے کہ صورت اول و ثانی میں تو بحث نہیں، صورت ثالث وصورت الرابع میں جب غیر مدخولہ کو ایک طلاق پڑ گئی تو محل طلاق نہ رہا، لھذا تمام صورتوں میں ایک طلاق واقع ہوگی، یہ تاویل بے جا نہیں، ظاہر ہے کہ علامہ کسائیؒ اصول نحو کے عالم تو تھے مگر فقہ سے نا آشنا، پھر غلطیوں کا علاقہ ہے ہر فریق کر سکتا ہے، جیسا کہ علامہ کسائیؒ اپنی غلطی کا اعتراف خود کرتے ہیں کیونکہ اپنی غلطی ماننا عیب نہیں۔(۴۲)

با جماعت نماز نہ پڑھنے کی وجہ سے خلیفہ کا چہیتا وزیر مردود الشہادت قرار پایا

قاضی ابو یوسفؒ نے خلیفہ کے ایک چہیتے وزیر کو مردود الشہادت قرار دیا، یعنی کسی مقدمہ میں وزیر نے قاضی ابو یوسفؒ کی عدالت میں گواہی دی تھی خلیفہ کے بعد جو سب سے بڑا وزیر تھا، قاضی ابو یوسفؒ کی عدالت میں اسے سنایا جا رہا ہے کہ تمہاری شہادت قابل قبول نہیں قرار دی جا سکتی۔

وزیر نے اسے اپنی سبکی اور توہین خیال کرتے ہوئے قاضی ابو یوسفؒ کی عدالت سے سیدھا خلیفہ کے دربار میں پہنچا اور قاضی ابو یوسفؒ کے اس برتاؤ کی خلیفہ سے شکایت کر دی۔ وزیر کی اس شکایت پر ہارون رشید نے قاضی ابو یوسفؒ کو بلا کر دریافت کیا کہ اس بے چارے کو آپ نے کیوں مردود الشہادت قرار دیا؟

روایتیں مختلف ہیں، مثلاً:

(الف) بعض کہتے ہیں کہ قاضی صاحبؒ نے کہا کہ میں نے اپنے کانوں سے اس شخص کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں تو خلیفہ کا عبد، بندہ یا غلام ہوں۔

اس زمانہ کے خوشامدی امیروں میں کچھ یہ دستور چل پڑا تھا کہ اپنے آپ کو خلیفہ وقت کا عبد اور غلام کہتے تھے، درحقیقت یہ لوگ خلیفہ کے نہیں درہم اور دینار کے بندے تھے، ایسا کہنے والے تمام امراء کو قاضی ابو یوسفؒ نے مردود الشہادۃ قرار دے دیا تھا۔

(ب) اور بعض روایتوں میں ہے کہ قاضی صاحبؒ نے وزیر مذکور پر جرح کی کہ یہ جماعت کے ساتھ نماز نہیں پڑھتا اور میں ایسے آدمی کی شہادت قبول نہیں کر سکتا۔

خلیفہ ہارون رشید خاموش رہا اور حنفی قاضی کی عظمت اور عوامی دباؤ کے پیش نظر اسے حکومت کے وقار کا مسئلہ نہ بنا سکا، بعض دوسری روایات سے پتہ چلتا ہے کہ بالآخر اس وزیر نے اپنی ڈیوڑھی میں مسجد بنائی اور جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا پابند ہوگیا۔(۴۳)

امام ابو یوسفؒ کا ایک جواب نصف سلطنت کے برابر ہے

امام ابو یوسفؒ نہایت ذکی ذہین اور حاضر جواب تھے، جب بھی کوئی مسئلہ یا اہم بات سامنے آتی تو اس کو فوراً حل فرماتے اور سلجھا ہوا جواب دیتے۔ ایک دفعہ خلیفہ ہارون رشید کے ساتھ حج کے لئے تشریف لے گئے، ظہر یا عصر کے وقت انہوں نے نماز کی امامت کی، چونکہ یہ مسافر تھے اسلئے نماز کا قصر کیا، یعنی دو رکعت کے بعد سلام پھیر کر نمازیوں سے کہا کہ اپنی نمازیں پوری کرلو میں مسافر ہوں۔(۴۴)

تو اہل مکہ میں سے ایک شخص نے نماز ہی میں کہا: ''ہم لوگ یہ مسئلہ تم سے اور جس نے تم کو سکھلایا ہے اس سے بہتر جانتے ہیں'' امام ابو یوسفؒ نے کہا ''یہ تو ٹھیک ہے لیکن اگر تم کو یہ مسئلہ معلوم ہوتا تو نماز میں بات چیت نہ شروع کر دیتے''۔ اس جواب پر ہارون رشید بہت خوش ہوا اور اس نے کہا کہ اگر نصف سلطنت کے بدلے مجھے یہ جواب مل جاتا تو بھی میں پسند کرتا۔

ہارون رشید کا اشتیاق اور امام ابو یوسفؒ کی استغناء

ایک مرتبہ ہارون رشید نے امام ابو یوسفؒ سے کہا:

''جناب! آپ ہمارے پاس بہت کم آیا کرتے ہیں میں ہر وقت آپ کی صحبت اور زیارت کا مشتاق رہتا ہوں''

امام ابو یوسفؒ نے فرمایا کہ:

''یہ اشتیاق اس وقت تک ہے جب تک کہ میں کم آتا ہوں، جب زیادہ آنے لگوں گا تو اشتیاق و اعزاز باقی نہیں رہے گا۔'' ہارون رشید نے اس جواب کی زبردست تحسین فرمائی۔(۴۵)

امام ابو یوسفؒ کی تدبیر اصلاح اور حق گوئی و بے باکی

سعید بن عثمانؒ الزیات اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ: ایک مرتبہ جمعہ کے روز مدینہ ابی جعفر میں ایک شخص خلیفہ ہارون رشید کے سامنے کھڑا ہوا جبکہ وہ منبر پر خطبہ دے رہا تھا، اس شخص نے علی الاعلان برسر منبر بادشاہ کو ٹوک دیا اور کہا: ''خدا کی قسم! تم تقسیم دولت میں مساوات کو ملحوظ نہیں رکھتے اور نہ رعیت کے ساتھ عدل کرتے ہو، تم نے یہ کیا، تم نے وہ کیا وغیرہ۔''

خلیفہ ہارون رشید کے حکم سے وہ شخص فوراً گرفتار کر لیا گیا اور نماز جمعہ کے بعد اس کے حضور پیش کیا گیا، ہارون رشید نے امام ابو یوسفؒ کو بلوایا، جب وہ پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ وہ شخص ہتھکڑی اور بیڑی میں جکڑا ہوا کھڑا ہے اور دو جلاد اس کے سر پر کوڑے لیے کھڑے ہیں، خلیفہ ہارون رشید امام ابو یوسفؒ کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا:۔

اے یعقوب! اس شخص نے جو تمہیں ہتھکڑیوں میں جکڑا ہوا نظر آتا ہے مجھ سے ایسی ایسی باتیں کہی ہیں جو آج تک کسی کو کہنے کی جرات نہیں ہوئی تھی۔

امام ابو یوسفؒ نے عدل و انصاف، صلح و آشتی، عفو و درگزر اور حق و راستی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ہارون رشید سے کہا:

اے امیر المؤمنین! اس میں کون سی بات ہوگئی، اس طرح کی باتیں تو آنحضرت ﷺ کے ساتھ بھی کی گئی ہیں اور آپ ﷺ نے معاف کر دیا ہے اور درگذر سے کام لیا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک شخص نے حضور اقدس ﷺ کو

قسم دی اور کہا: ''اگر میں عدل نہ کروں گا تو کون کرے گا''؟ اور یہ فرما کر اسے معاف کر دیا۔

ایک مرتبہ اس سے بھی زیادہ سنگین واقعہ ہوا، حضرت زبیرؓ اور ایک انصاری مدعی اور مدعی علیہ بن کر حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ (ﷺ) نے حضرت زبیرؓ کے حق میں فیصلہ دیا، اس پر

انصاری نے کہا: ''یارسول اللہ! کیا یہ فیصلہ آپ نے اس لئے کہا ہے کہ زبیر ؓ آپ کی پھوپھی کے بیٹے ہیں، حضور اقدس ﷺ نے یہ سنا تو معاف کر دیا۔

قاضی امام ابو یوسفؒ کی نرم، نصیحت آموز اور مبنی بر اخلاص گفتگو ہارون رشید جیسے جابر، مطلق العنان اور خود پرست خلیفہ نے سنی تو اس کا دل بھی پسیج گیا، غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور اس گرفتار شخص کی رہائی کا حکم دے دیا۔(۴۶)

قیاسات حضرت عمرؓ سے مخالف کا اعتراض اور امام ابو یوسفؒ کا جواب

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں یہ عرض کیا گیا ہے کہ ''کتاب الخراج'' امام ابو یوسفؒ کا ایک تفصیلی مکتوب ہے جو انہوں نے خلیفہ ہارون رشید کے نام لکھا تھا، اس میں انہوں نے حکومت کے مالی وسائل اور ذرائع اور آمدنی کی تفصیلات کا ذکر کیا ہے۔ ان کا زیادہ اعتماد قرآنی دلائل، احادیث نبویہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے فتاویٰ پر ہے، احادیث روایت کر کے ان سے علل کا استنباط اور حضرات صحابہؓ کا ان پر عمل کا ذکر کرتے ہیں اور ان کے اقوال سے ان کے افعال کا مبنیٰ نکالتے ہیں اور جب قیاس و رائے میں صحابہ کرامؓ کی مخالفت کرتے ہیں تو اسے علل پر مبنی قرار دیتے ہیں۔

آپ کے بعض قیاسات جب حضرت عمرؓ کی رائے کے خلاف معلوم ہوتے تو آپ اپنے قیاس پر فرضی اعتراض وارد کر کے اس کا جواب دیتے مثلاً وہ ایک فرضی اعتراض وارد کر کے اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''ابو یوسفؒ سے دریافت کیا گیا کہ اہل خراج کی اراضی سے حاصل شدہ غلے اور ان کے پھل دار درختوں مثلاً کھجور، انگور اور دیگر اشجار کے پھلوں میں آپ جو ایک مخصوص تقسیم کے قائل ہیں، اس کی کیا دلیل ہے؟ آپ نے حضرت عمرؓ کی پیروی کرتے ہوئے وہی خراج کیوں نہیں لیا جو حضرت عمرؓ نے اہل خراج کی اراضی، کھجوروں اور درختوں پر مقرر کیا تھا جب کہ اہل خراج اس پر راضی تھے اور بخوشی اسے برداشت کرتے

تھے۔''

ابو یوسفؒ نے جواب دیا: ''حضرت عمرؓ کو بخوبی علم تھا کہ خراج اس زمین پر مقرر کیا گیا ہے وہ اس کی حیثیت سے زیادہ نہیں اور زمین اسے برداشت کرنے کے قابل ہے آپ نے خراج مقرر کرتے وقت یہ نہیں فرمایا تھا کہ اہل خراج کے لئے ہمیشہ یہ ادائیگی ضروری ہے اور مجھے اور میرے جانشینوں کو یہ حق حاصل نہیں کہ اس میں کمی بیشی کرسکیں، بلکہ سرزمین عراق میں آپ کے عامل حذیفہؓ اور عثمانؓ جب وہاں کی بہترین پیداوار لے کر آئے تو آپ نے انہیں مخاطب کر کے فرمایا: ''شاید تم نے اس زمین پر اتنا خراج مقرر کیا ہے جسے وہ برداشت کرنے کے قابل نہیں۔'' حضرت عمرؓ کے الفاظ اس بات کی روشن دلیل ہیں کہ اگر آپ کے عامل اعتراف کر لیتے کہ زمین خراج کی اتنی بھاری رقم کو برداشت نہیں کرسکتی تو آپ ضرور اسے کم کر دیتے اور اگر آپ کا مقرر کردہ خراج قطعی اور حتمی ہوتا اور اس میں کمی بیشی کا امکان نہ ہوتا تو آپ ان سے ہرگز نہ پوچھتے کہ زمین قابل برداشت ہے یا نہیں اور یہ کیسے ممکن ہے کہ اس میں کمی یا اضافہ کا احتمال نہ ہو جبکہ عثمان بن حنیفؓ حضرت عمرؓ کو جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں: ''زمین کے لئے یہ خراج قابل برداشت ہے اور اگر میں چاہوں تو اسے دگنا کروں''۔ کیا عثمانؓ یہ ذکر نہیں کر رہے کہ ان کا مقرر کردہ خراج حد اعتدال سے زائد نہیں؟ اور اس میں ابھی اضافہ کا امکان ہے، حذیفہؓ حضرت عمرؓ کو جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں: ''میں نے زمین پر جو خراج مقرر کیا ہے وہ اسے برداشت کرسکتی ہے اور اس میں کوئی زیادتی نہیں''۔(۴۷)

امام ابو یوسفؒ کی دانائی کام آئی

خلیفہ ہارون رشید اور ملکہ زبیدہ کے درمیان کسی بات پر نزاع ہو گیا، بات بڑھ گئی اور ملکہ نے شاہی مزاج کے خلاف کوئی بات کہہ دی جس پر خلیفہ بگڑ گیا اور جذباتی طور پر بیوی سے یہ کہہ دیا کہ:

''اگر آج ہی میری مملکت سے نہ نکل جائے تو تجھ پر طلاق ہے''

جس پر قاضی ابو یوسف نے یہ تعبیر بتائی:

''خلیفہ کی حکومت شرقاً غرباً پھیلی ہوئی ہے اس سے باہر جانا تو ممکن نہیں، ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ ملکہ زبیدہ خانہ خدا (مسجد) میں چلی جائے کہ وہ (خلیفہ کی) سلطنت میں نہیں آتا۔''

قاضی صاحبؒ کی اس تدبیر پر عمل کیا گیا الجھا ہوا مسئلہ سلجھ گیا، اس جواب سے خلیفہ اور ملکہ دونوں نہال ہوگئے اور قاضی ابو یوسفؒ کو بیش بہا تحائف سے مالا مال کیا گیا۔ (۴۸)

امام ابو یوسفؒ کی سوانح اور حالات زندگی اور طرز سیاست و انقلاب کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکھر کر سامنے آتا ہے کہ ان کا رویہ اور اصول عام علماء سے مختلف مگر معتدل تھا۔

عام طور پر سلاطین و خلفاء کے دربار میں علماء کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ بس ان کی ہاں میں ہاں ملائے چلے جاتے ہیں یا اعلاء کلمۃ الحق اس زور شور سے کرتے ہیں کہ اصلاح کا امکان ہی باقی نہیں رہتا۔

امام ابو یوسفؒ نے بین بین کا راستہ اختیار کیا، انہوں نے خلفاء کی مجالست کی اور انہیں راہ ثواب پر بڑی حد تک گامزن رکھا۔

امام ابو یوسفؒ کی وسعت قلبی کا ایک دلچسپ قصہ

اسی سلسلہ کا ایک دوسرا دلچسپ قصہ علامہ زاہد الکوثریؒ نے اپنے رسالہ میں نقل کیا ہے لکھتے ہیں ابراہیم بن الجراح کہا کرتے تھے کہ جب میں نے تحصیل علم کی غرض سے بصرہ جانے کا ارادہ کیا تو امام ابو یوسفؒ کی خدمت میں مشورہ کے لئے حاضر ہوا کہ بصرہ جا کر میں کس کے حلقہ درس میں شریک ہو کر استفادہ کروں تو امام ابو یوسفؒ بڑی شفقت سے پیش آئے اور ارشاد فرمایا: ''حماد بن زیدؒ بہت بڑے عالم ہیں ان کا تلمذ اختیار کرلو۔''

ابراہیم بن الجراحؒ کہتے ہیں چنانچہ میں بصرہ آیا اور حماد بن زیدؒ کی مجلس درس میں باقاعدگی سے حاضری دینے لگا مگر خدا کی قسم! مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی تھی کہ جب بھی حمادؒ کی مجلس میں امام ابو یوسفؒ کا ذکر ہوتا تھا تو نہایت ہی ناشائستہ اور اہانت آمیز الفاظ کے ساتھ، میں دل ہی دل میں کڑھا کرتا تھا آخر میں

کر بھی کیا سکتا تھا؟ ایک روز حسب معمول میں حمادؒ کے درس میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک عورت حاضر ہوئی اور اس نے حمادؒ سے استدعا کی کہ۔ ''مجھے ایک دستاویز لکھ دیں۔'' حماد بن زیدؒ جو ہمہ تن تدریس اور افادہ علم میں مشغول تھے عورت کی یہ استدعا سنکر کشمکش میں پڑ گئے، نہ تو اس عورت کو انکار کر کے اس کا دل توڑنا چاہتے تھے اور نہ طلبہ حدیث سے جو حاضر مجلس تھے بے توجہ ہونا چاہتے تھے، ابراہیم بن الجراحؒ کہتے ہیں کہ میں نے حمادؒ کی اس ذہنی کشمکش کا اندازہ کرلیا اور ان کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت! ''عورت سے کہیے کاغذ مجھے دے دے میں اسے لکھے دیتا ہوں اور آپ اپنے درس میں مشغول رہئے۔'' عورت نے کاغذ مجھے دے دیا اور میں دستاویز لکھنے لگا، مجھے مصروف دیکھ کر حمادؒ درس حدیث سے رک گئے میں محروم نہ رہ جاوں۔ میں نے عرض کیا حضرت! درس روکنے کی ضرورت نہیں میں اپنے کام میں مشغول ہوں آپ اپنا کام جاری رکھیئے، چنانچہ انہوں نے پھر درس حدیث شروع کر دیا، جب میں نے دستاویز لکھ لی اور ملاحظہ کے لئے حضرت حمادؒ کی خدمت میں پیش کر دی تو انہوں نے اسے پڑھا، بہت پسند کی اور خوش ہوئے اور مجھ سے پوچھا ابراہیم! تم نے یہ علم کس سے سیکھا ہے؟ میں نے عرض کیا حضرت! اس شخص سے سیکھا ہے جس کا ذکر آپ کی مجلس میں ہمیشہ برے الفاظ میں ہوتا ہے۔ میں ان سے رخصت ہو کر جب بصرہ تحصیل علم کی غرض سے آنے لگا تو میں ان کی خدمت میں مشورہ کے لئے حاضر ہوا کہ میں بصرہ جا کر کس کے حلقہ درس میں شریک ہو کر استفادہ علم کروں اور بصرہ میں میں کس کو اپنا استاذ علم بناوں، تو انہوں نے مجھے تاکید کی کہ: ''آپ کے سوا کسی اور کے دامن علم سے وابستہ نہ ہوں'' حمادؒ یہ سنکر ششدر رہ گئے اور مجھ سے پوچھا ''لیکن کون ہے وہ شخص''؟ میں نے جواب دیا ''وہ ابو یوسفؒ ہے۔'' نام سنتے ہی حماد پر ندامت کے آثار طاری ہوئے۔ اور اس کے بعد انہوں نے جب بھی امام ابو یوسفؒ کا ذکر کیا تو ذکر خیر کے سوا کچھ نہ تھا۔ (۴۹)

اس واقعہ میں عبرت و موعظت، ادب و احترام، اساتذہ سے تعلق و طلب علم اور اجتماعی حقوق کو ملحوظ رکھنے کے کئی ایک پہلو نکھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ اولاً یہ کہ اہل روایت کے لئے امام ابو یوسفؒ کا دل بے

حد وسیع تھا۔ ثانیاً یہ کہ ابراہیم بن الجراحؒ امام ابو یوسفؒ کے بھی شاگرد تھے اور حماد بن زیدؒ کے بھی، تاہم حمادؒ سے اپنے استاذ امام ابو یوسفؒ کی توہین برداشت نہ سکے، مگر ان کے ازالہ توہین کے لئے اپنے استاذ حمادؒ کی توہین بھی نہیں کی بلکہ مناسب موقعہ کے منتظر رہے۔ جب موقع مہیا ہوا تو پھر بغیر کسی تامل اور تاخیر کے تلافی کر کے رہے۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اجتماعی اور معاشرتی امور میں اگر حکمت و موعظت سے کام لیا جائے تو مخالف کو بھی کسی طرح موافق بنایا جا سکتا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اس زمانہ میں بھی ائمہ احنافؒ سے متعلق بڑے بڑوں کو غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں کی وجہ سے سوءِ ظن ہوا تھا اور ائمہ احنافؒ کی مخالفت کا یہ سلسلہ چہار طرف پھیلا ہوا تھا۔

ہمعصر علماء کی توقیر اور اہل علم کی قدر و منزلت

علی العموم اہل علم چشمک اور قابت کی بناء پر ایک دوسرے سے کھٹکتے رہتے ہیں اور ان کی منزلت کا اعتراف نہیں کرتے۔ لیکن امام ابو یوسفؒ ایسے لوگوں میں سے نہیں تھے وہ اگر کسی اہل علم کو خستہ اور در ماندہ و پریشان حال اور زبوں حال دیکھ لیتے تھے تو تڑپ جاتے تھے اور جب تک اس کے مصائب دور نہ کر لیتے تھے انہیں چین نہیں آتا تھا۔ اسی طرح کا واقعہ واقدیؒ کے ساتھ بھی گذرا۔

عزرم بن فروہ کہتے ہیں کہ جب امام ابو یوسفؒ حج کے ارادے سے حجاز تشریف لے گئے تو وہاں ان کی ملاقات واقدیؒ کے ساتھ ہوئی جو بہت مسکنت کی حالت میں تھے۔ حضرت امام ابو یوسفؒ سے ان کا یہ حال دیکھا نہ گیا، انہیں وہ اپنے ساتھ بغداد لے آئے، جب وہ ہارون رشید کی مجلس میں گئے تو وہاں یحیٰی بن خالد برمکی (جو اس وقت کے با اختیار وزیر تھے) نے امام ابو یوسفؒ سے پوچھا: ''کہیے! آپ مکہ مکرمہ سے ہمارے واسطے بھی کوئی تحفہ لائے؟'' امام ابو یوسفؒ نے جواب دیا: ''میں آپ کے لئے ایک ایسا گراں بہا اور گراں مایہ تحفہ لایا ہوں کہ مجھ سے پہلے ایسا نادر تحفہ کسی نے بھی آپ کی خدمت میں پیش نہ کیا ہوگا۔'' یحیٰی منتظر ہوئے اور پوچھنے لگے کیا ہے وہ تحفہ؟ امام ابو یوسفؒ نے فرمایا: ''میں آپ کے لئے ایسا ہمہ دان شخص لایا ہوں

کہ اس سے جو پوچھیئے فورا! جواب لے لیجیے۔'' یحییٰ نے اشتیاق اور بیتابی کے ساتھ کہا کہاں ہے وہ؟

خود واقدیؒ کی روایت ہے کہ اس کے بعد امام ابو یوسفؒ نے مجھے یحییٰ وزیر کے پاس دربار خلافت میں بھیج دیا۔ یحییٰ برمکی سارا دن مجھ سے باتیں کرتا رہا، جب رات ہوئی تو حکم دیا کہ میرا بستر بھی ان کے بستر کے قریب بچھا دیا جائے۔ جب صبح ہوئی تو اس نے قلم دوات طلب کی، ایک چٹھی لکھی اور خادم کو دی اور اس سے کہا: ''جب یہ (یعنی واقدی) نماز پڑھ لیں تو انہیں لے کر فلاں شخص کے پاس چلے جاؤ۔'' جب میں نماز سے فارغ ہوا تو خادم نے عرض کیا ''چلیے تشریف لے چلیے'' وہ خادم مجھے ایک شخص کے پاس لے گیا اور وہ چٹھی اسے دے دی۔ اس آدمی نے خادم سے کہا بس تم چلے جاؤ، اور مجھ سے کہا ''تشریف رکھیئے۔'' پھر ایک غلام کو بلایا اور اس سے کہا کہ تھیلیاں یہاں لا لا کر ڈھیر کر دی جائیں، چنانچہ اس کے حکم کی تعمیل کی گئی یہاں تک کہ دوپہر ہوگئی، میں نے اس شخص سے کہا یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ مجھے دیر ہوگئی ہے۔ وہ شخص کہنے لگا جی! تمہارا کام ہی تو کر رہا ہوں، مجھے وزیر یحییٰ برمکی نے کہا ہے کہ میں آپ کو ایک لاکھ درہم دے دوں، اب وہی گنوار رہا ہوں، واقدیؒ کہتے ہیں کہ میں نے کہا اس رقم میں سے دس ہزار تو خدام کو انعام دیدیجئے، باقی اپنے پاس رکھئے۔ اس کے بعد پھر ابو یوسفؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور انہیں سارا ماجرا سنا دیا، امام ابو یوسفؒ سب کچھ سنکر فرمانے لگے نہیں یہ رقم کم ہے میں اس میں مزید اضافہ کراؤں گا۔

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ واقدیؒ کی امام ابو یوسفؒ کے دل میں کتنی قدر و منزلت تھی، اور خلیفہ کے با اختیار اور با اقتدار وزیر سے بھی وہ کس طرح جو کام چاہتے تھے لے لیتے تھے اور اس سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں علم اور اہل علم کی قدر و منزلت کا کیا عالم تھا۔(۵۰)

قاضی ابو یوسفؒ اور ربیعۃ الرائےؒ کے درمیان ایک دلچسپ مباحثہ

ایک مرتبہ قاضی ابو یوسفؒ اور امام مالکؒ کے استاذ ربیعۃ الرائےؒ کے درمیان مشترکہ غلام کا مسئلہ زیر بحث آیا۔ قاضی ابو یوسفؒ نے ان سے کہا: ''آپ اس غلام کے بارے میں کیا کہتے ہیں جو بیک وقت دو

آدمیوں کا غلام ہو اور ان دو میں سے ایک نے اسے آزاد کر دیا ہو۔" ربیعہ نے جواب دیا کہ ایسے غلام کا عتق (یعنی آزادی) جائز نہیں ہے، ابو یوسفؒ نے پوچھا کیوں جائز نہیں آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ ربیعہ نے کہا اس لیے کہ اس میں ضرر کا پہلو ہے اور حدیث میں آیا ہے لاضرر ولاضرار۔ ایک آقا کے آزاد کر دینے سے دوسرے کو ضرر کا اندیشہ ہے بلکہ یقین ہے، ابو یوسفؒ نے پھر دریافت کیا کہ جی! اگر دوسرا مالک بھی اسے آزاد کر دے تو پھر آپ کیا فرماتے ہیں؟ ربیعہ نے کہا یہ عتق جائز ہے اور غلام آزاد ہو جائے گا، تب ابو یوسفؒ نے بڑے احترام سے عرض کیا حضرت! آپ ہی کے اصول کے پیش نظر میں آپ کی بات نہیں مان سکتا، وجہ یہ ہے کہ آپ کے ارشاد کے مطابق جب غلام دو آقاؤں کے درمیان مشترک ہے اور پہلے آقا کی آزادی بے اثر ہے اور غلامی بدستور قائم ہے تو دوسرے مالک کے آزاد کرنے کے بعد وہ کس طرح آزاد ہو جائے گا جبکہ ابھی تک تو وہ بدستور غلام ہے ربیعہ یہ سنکر خاموش ہو گئے اور کوئی جواب نہ دے سکے۔(۵۱)

علوم اور معارف میں ام، ام ابو یوسفؒ کی یکتائی

قاضی ابو یوسفؒ کی ذکاوت ذہانت، فراست اور بصیرت دیکھ کر داؤد بن رشید نے کہا اگر ابو یوسفؒ کے سوا ابو حنیفہؒ کا کوئی شاگرد نہ ہوتا تب بھی تمام لوگوں پر انہیں فخر حاصل ہوتا۔ جب ابواب علم میں سے کسی بات پر میں امام ابو یوسفؒ کو مصروف تکلم دیکھتا تو ایسا محسوس ہوتا کہ ایک بحر ذخار سے چلو بھر بھر کر علم اور معرفت کے خزانے لٹا رہے ہیں۔ حدیث ان کے نوک زبان، فقہ ان کے نوک زبان، کلام ان کے نوک زبان، کوئی موضوع بھی ایسا نہ تھا جس میں وہ یکتا نہ ہوں، جس میں وہ عاجز اور ماندہ نظر آئیں۔(۵۲)

جب تک فریقین حاضر نہ ہوں میں فیصلہ نہیں کیا کرتا

ایک مرتبہ ہاروں رشید نے امام ابو یوسفؒ سے پوچھا کہ فالودہ اور لوزینہ کے بارے میں آپ کا کیا فیصلہ ہے، دونوں میں سے کون اعلیٰ ہے؟ امام ابو یوسفؒ نے فرمایا اے امیر المومنین! فریقین جب تک حاضر نہ ہوں میں فیصلہ نہیں کیا کرتا۔ ہارون رشید نے حکم دیا اور دونوں چیزیں تیار کر کے حاضر خدمت کر دی گئیں۔

اب امام ابو یوسفؒ نے دونوں سے تھوڑا تھوڑا کر کے کھانا شروع کیا، کبھی فالودہ میں سے کھاتے اور کبھی لوزینہ میں سے، جب دونوں سے ایک مقدار کھالی اور پیالے آدھے ہو گئے تو فرمانے لگے اے امیر المومنین! میں نے آج کوئی دو حریف ان دونوں سے زیادہ لڑنے والے نہیں دیکھے، جب بھی میں نے ایک کے حق میں فیصلہ دینے کا ارادہ کیا تو فوراً دوسرے نے اپنی برتری کی دلیل پیش کر دی۔(۵۳)

عیسائی باپ اور مسلمان بیٹا

امام ابو یوسفؒ کے یہ چند ایک واقعات قارئین نے مطالعہ کر لیے ہوں گے اور یہ بات سب پر منکشف ہوگئی ہوگی کہ امام ابو یوسفؒ بہت بڑے عالم، بہت بڑے مجتہد اور بڑے وسیع النظر اہل علم تھے، ہماری یہ باتیں محض حسن ظن نہیں یا ادعائی تعلّی نہیں، ایک ایک واقعہ اور امام ابو یوسفؒ کی زندگی کا ہر ہر لمحہ اپنے ساتھ نا قابل تردید صداقتوں اور حقائق کا پس منظر بھی رکھتا ہے، فقہ ان کا خاص موضوع تھا اور اس فن میں انہیں پایہ اجتہاد حاصل تھا، ذیل کا ایک واقعہ اس کا منہ بولتا ثبوت ہے:۔

بشیر بن ولید کندیؒ سے روایت ہے کہ ایک روز انہوں نے امام ابو یوسفؒ سے عرض کیا حضرت! میرا والد عیسائی ہے اور بہت لاغر، بوڑھا اور کمزور، اکثر ایسا ہوتا ہے اسے کہیں آتے جاتے دیکھتا ہوں اور راستے میں آمنا سامنا ہو جائے تو کیا اس کا ہاتھ پکڑ کر سہارا دے دیا کروں؟ امام ابو یوسفؒ نے فرمایا ہاں! جب کلیسا سے واپس آ رہا ہو لیکن جب جا رہا ہو تب نہیں۔(۵۴)

اعتراف سرقہ کے باوجود چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا

ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ کی مجلس علم میں بڑے بڑے علماء شریک ہوتے تھے حتیٰ کہ امام احمد بن حنبلؒ بھی شریک ہوتے تھے۔

امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں آپ کی ذہانت و فقاہت کا یہ قصہ ذکر کیا ہے کہ ایک مجلس میں امام ابو یوسفؒ کے پاس بہت سے علماء بیٹھے تھے کہ ایک چور کو لایا گیا، اس چور نے اخذ مال کا اعتراف کیا، تو سارے

علماء نے کہا کہ اب چوری کی وجہ سے اس کا ہاتھ کاٹنا لازمی ہو گیا، ابو یوسفؒ نے فرمایا نہیں ہاتھ کاٹنا لازم نہیں، تمام علماء حیران ہو گئے کہ چور کے اعتراف سرقہ کے باوجود ہاتھ کاٹنا کیوں کر لازم نہیں ہے، لہٰذا چور سے دوبارہ استفسار کرنا چاہیے، چنانچہ علماء نے اس شخص سے دوسری مرتبہ دریافت فرمایا کہ:

''ھل سرقت'' کیا تو نے چوری کی ہے؟ اس نے جواب میں کہا قال نعم! ہاں میں نے چوری کی ہے، علماء نے کہا اب تو ہاتھ کاٹنا واجب ہے، قاضی ابو یوسفؒ اب بھی مصر تھے کہ ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

علماء نے حیرت کے ساتھ امام ابو یوسفؒ سے اس کی وجہ دریافت کی تو آپ نے فرمایا کہ: ''اقرار اول اخذ مال غیر کا تھا اور وہ موجب ضمان مالی ہے، لہٰذا اس شخص کے ذمہ مال واجب ہو گیا، اس کے بعد اعتراف بالسرقۃ انکار ہے اس ضمان مالی سے اور رجوع ہے سابقہ اعتراف سے، کیونکہ قطع ید اور ضمان مالی دونوں جمع نہیں ہوتے اور ایسے موقع پر رجوع عن الاقرار السابق جائز نہیں لہٰذا اس شخص پر ضمان مالی واجب ہے نہ کہ قطع ید۔'' علماء کا مجمع آپ کی فقاہت و ذہانت پر دنگ رہ گیا اور سب نے اپنی غلطی تسلیم کر لی۔(۵۵)

کشتی خرید لو طلاق نہیں واقع ہو گی

علامہ زاہد الکوثریؒ اپنے رسالہ میں لکھتے ہیں کہ امام مالکؒ نے ایک مرتبہ فرمایا مجھے معلوم ہوا ہے کہ ایک شخص ابو یوسفؒ کے پاس آیا اور اس نے کہا ''میں نے قسم کھائی ہے کہ اگر میں ایک جاریہ (باندی) نہ خریدوں تو میری بیوی مجھ پر طلاق ......مگر اب میں سوچتا ہوں کہ ایسا کرنا میرے لیے آسان نہیں ہے، کیونکہ میں اپنی بیوی سے بہت محبت اور الفت کرتا ہوں اور میری نظر میں اس کی بڑی وقعت اور عظمت ہے۔'' یہ سنکر قاضی ابو یوسفؒ نے کہا:۔''تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ ایک کشتی خرید لو وہ بھی تو ''جاریہ'' ہی ہے۔''(۵۶)

فقہی حیلہ کی شرعی حیثیت

بعض حضرات نے فقہ حنفیہ اور قاضی ابو یوسفؒ کو اس سلسلہ میں مطعون کیا ہے اور سنگین الزام یہ لگایا ہے کہ انہوں نے دنیا کو دین پر ترجیح دی ہے اور ایسے فقہی حیلے ایجاد کیے ہیں جن سے کام لے کر انسان قانون کو

دھوکہ دے سکتا ہے، سزا سے بچ سکتا ہے، ٹیکس اور زکوۃ سے محفوظ رہ سکتا ہے اور دوسری پابندیوں سے بھی خود کو محفوظ اور بری رکھ سکتا ہے۔ مگر اس اعتراض کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں، ائمہ احناف کی نظر داعی اسلام علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے ارشادات پر تھی، وہ دوسرے فقہاء کی طرح صرف الفاظ کو نہیں دیکھتے بلکہ الفاظ کے ساتھ معنٰی پر بھی نظر رکھتے ہیں، لفظ اور معنی کے مابین جو اصل مقصد کا فرق ہوتا ہے اسے بھی پیش نظر رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے فتووں میں جو وسعت اور جامعیت ہے وہ دوسری جگہ نہیں ملتی۔ امام ابو یوسفؒ کی طرف جو بعض حیلے منسوب ہیں ان کا مقصد "تخلیص الناس من الحرج" یعنی لوگوں کو حرج اور زحمت سے بچانا تھا۔

علامہ ذہبیؒ نے لکھا ہے کہ: "ایسا حیلہ جو تشریع احکام میں کسی حکم شرعی کو ختم کر دینے کا موجب ہو اس شخص سے صادر ہوسکتا ہے جس کا دین ضعیف اور جس کا یقین و ایمان کمزور ہو لیکن تنگی زحمت اور پریشانی سے کسی حیلہ کی مدد سے اس طرح نکلنا کہ ابطال حق نہ ہوتا ہو، تدابیر لطیفہ پر مبنی ہو، نصوص شرعیہ سے متصادم نہ ہوتا ہے نہ صرف جائز بلکہ مستحن ہے، اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول ﷺ نے اسے پسندیدہ قرار دیا ہے، سلف و خلف سب اس پر عامل رہے ہیں۔"

اور واقعہ بھی یہی ہے کہ فقہ اسلامی اسلام کے بنیادی اصولوں اور تعلیم کی نگہبانی کرتی ہے، اجتہادات میں انسانی مجبوریوں اور معزوریوں کو پورے طور پر ملحوظ رکھتی ہے اور جہاں تک ممکن ہوسکتا ہے اور اصول اور بنیاد سے روگرداں ہوئے بغیر ایسے وسائل مہیا کرتی ہے جس سے سکون اور یکسوئی کے ساتھ مذہب کے احکام و ہدایات پر عمل ہوسکتا ہے۔ یہ طرز عمل مذہب سے فرار نہیں اور نہ اسے مذہب کی روح کے منافی قرار دے سکتے ہیں اور نہ یہ مذہب سے بغاوت ہے بلکہ اگر غور کیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ یہ مذہب کی بہت بڑی خدمت ہے۔

حیلہ جائز اور لطیف تدبیر کا نام ہے

امام محمدؒ کی طرح امام ابو یوسفؒ کے تذکرہ میں بھی تذکرہ نگاروں نے بعض حیلے نقل کیے ہیں اور بعض تو

ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ بات سے بتنگڑ بن کر افسانہ ہوگئے ہیں اور ان کی فی الواقع کوئی اصلیت نہیں ہے، لیکن اس سلسلہ میں یہ بات ملحوظ رہے کہ کوئی ایسی لطیف تدبیر کرنا جس سے نہ تو شریعت کا حکم بدلتا ہو نہ وہ کسی نص صریح سے ٹکراتی ہو اور نہ اس تدبیر سے کسی کا حق مارا جاتا ہو اور نہ اس سے کسی باطل کو ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہو کوئی ممنوع چیز نہیں ہے بلکہ وہ مباح ہے۔ تاریخ اور تذکرہ تو اپنی جگہ خود سیرت اور صحابہؓ کی زندگی میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں، مثلاً ہجرت کا واقعہ سامنے رکھئے، جب راستہ میں کسی نے حضرت ابو بکر صدیقؓ سے حضور اقدس ﷺ کے بارہ میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا:۔

هذا رجل يهديني السبيل

یہ ایک صاحب ہیں جو مجھے راستہ بتا رہے ہیں۔

دیکھئے حضرت ابو بکر صدیقؓ نے کس قدر لطیف تدبیر سے سائل کو جواب دیدیا اور حضور سید دو عالم ﷺ کو خطرہ سے بھی بچالیا اور حیلہ ایسا اختیار کیا کہ واقعیت میں بھی کوئی فرق نہیں آنے دیا۔

بہر حال اگر امام ابو یوسفؒ یا امام محمدؒ سے حیلوں کے جواز میں کچھ منقول ہوا بھی ہے تو ان کے سامنے یہی مثال تھی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مکر وفریب اور دروغ وتزویر کو وہ حیلہ سمجھتے تھے اور اس کے جواز کے وہ قائل تھے، ایسا ہرگز نہیں، حاشا وکلا

امام ابو یوسفؒ کا محتاط طرز عمل

موفق نے لکھا ہے کہ امام ابو یوسفؒ نے ایک بار ایک شخص کو اس کا مال بچانے کی ایک جائز تدبیر اور نہایت ہی لطیف حیلہ تجویز فرمایا۔ جس پر امام ابو یوسفؒ کے تلمیذ خاص ابو یقظان نے ان سے عرض کیا کہ حضرت! یہ تو وہی بات ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے لئے چربی حرام کردی تھی تو انہوں نے یہ تدبیر کی کہ اسے پگھلا کر فروخت کر دیا کرتے تھے اور اس کی قیمت اپنے مصرف میں لاتے، امام ابو یوسفؒ نے فرمایا کہ انہوں نے ایک حرام چیز کو حلال کرنے کے لئے ایسا کیا تھا، مگر ہم اگر کوئی تدبیر کرتے ہیں تو اس لئے کہ حلال کو

حرام نہ ہونے دیں۔(۵۷)

بہر حال اس نوع کی تدبیر اور حیلہ شرعی نقطہ نظر سے کوئی قابل اعتراض چیز نہیں ہے اور اس نوع کے واقعات سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ امام ابو یوسفؒ اور آپ کے رفقاء اور ائمہ مجتہدین کو بہت سے مظلوموں کی جان بچانے اور کتنے لوگوں کے حق واپس کرنے کے لئے بھی اس قسم کی تدبیریں کرنی پڑتی تھیں، بہر حال اگر ایسے عمل خیر و برکت کا نام حیلہ ہے اور اس کو معترضین مطعون کرتے ہیں تو پھر شرعی نقطہ نظر سے اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

خاموش رہنا ہی اچھا تھا

ایک شخص امام ابو یوسفؒ کی مجلس درس میں خاموش بیٹھے رہتے تھے، ایک بار امام ابو یوسفؒ نے اس سے کہا: ''تم بولتے کیوں نہیں ہو، کچھ تو بول لیا کرو۔'' کہنے لگا بہت اچھا، جب حکم ہے تو میں بھی کچھ پوچھ لیا کروں گا۔ کہنے لگا حضرت! ''روزہ کب افطار کرنا چاہئے''؟ امام صاحبؒ نے جواب دیا جب آفتاب غروب ہر جائے۔'' وہ شخص کہنے لگا: ''اور اگر آفتاب آدھی رات تک غائب نہ ہوتو'' امام ابو یوسفؒ یہ سنکر ہنس پڑے اور فرمایا: ''بھائی تمہارا خاموش رہنا ہی اچھا تھا، تمہاری زبان کھلوا کر میں نے خطا کی۔''(۵۸)

قرآن مجید کا ادب اور احترام

امام ابو یوسفؒ قرآن مجید کے حافظ تھے، آپ کے استاذ امام اعظم ابو حنیفہؒ کے درس کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ حفظ قرآن کے بغیر اپنے درس میں کسی کو شریک ہونے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

قرآن حکیم کا ادب و احترام اور اعزاز و اکرام بھی انہوں نے اپنے استاد سے سیکھا تھا۔ موفق نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ امام ابو یوسفؒ کہیں جا رہے تھے، اچانک دیکھا کہ دو آدمی راستہ میں خرید و فروخت کے کسی معاملہ میں باہمی جھگڑا کر رہے ہیں، ان میں ایک نے اپنے ساتھی سے کہا کہ میری اور تمہاری مثال تو قرآن کی اس آیت کے مطابق ہے، اس کے بعد اس نے دورہ ص کی یہ آیت پڑھی:۔

إِنَّ هَذَا أَخِي لَهُ تِسْعٌ وَتِسْعُونَ نَعْجَةً وَلِيَ نَعْجَةٌ وَاحِدَةٌ فَقَالَ أَكْفِلْنِيهَا ۔ (۵۹)

یہ میرا بھائی ہے جس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس صرف ایک دنبی ہے یہ کہتا ہے کہ یہ ایک بھی مجھے دے دو۔

امام ابو یوسفؒ نے یہ سنا تو ان پر غصہ اور افسوس سے ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی، قریب تھا کہ بے ہوش ہو جائیں، جب ذرا یہ کیفیت دور ہوئی تو اس شخص سے بڑے درشت لہجہ میں فرمایا کہ:۔

''تو اللہ سے بھی نہیں ڈرتا، کلام الٰہی کو تو نے معمولی بات چیت بنالی ہے، قرآن پڑھنے والے کو چاہئے کہ وہ اس کو نہایت خشوع و خضوع اور خوف و ہیبت کے ساتھ پڑھے ایسا نہ ہو کہ وہ ناراضگی کا سبب بن جائے، میں تجھ میں یہ کیفیت بالکل نہیں پاتا، کیا تیری عقل جاتی رہی کہ تو نے کلام الٰہی کو لہو و لعب بنالیا ہے۔'' (۶۰)

محمد بن فضیلؒ فرماتے ہیں کہ مجھے امام ابو یوسفؒ سے قلبی کدورت تھی اور مجھے وہ اس لئے ناپسند تھے کہ وہ حکومت کے ارکان سے اختلاط رکھتے تھے لیکن جس روز سے ان کو یہ تنبیہ کرتے ہوئے دیکھا تو اس روز سے میں ان سے محبت کرنے لگا۔ (۶۱)

سخاوت وایثار

امام ابو یوسفؒ جب قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) مقرر ہوئے تو اللہ نے فراخی بھی دے دی اور مال و اسباب کی کافی فراوانی ہوئی مگر سب کچھ کے ہوتے ہوئے بھی وہ نہ کبھی اس پر مغرور ہوئے اور نہ کبھی دروازہ پر کوئی دربان بٹھایا بلکہ وزارت عدل و قانون پر براجمان ہونے کے باوجود اپنی زندگی اور بود و باش کو طالب علمانہ رکھا۔ تاہم جب وسائل ہوتے تو حسب ضرورت دنیوی ساز و سامان بھی حاصل ہوتا رہا، مگر اس کا بھی ان کو زندگی بھر افسوس رہا آخر وقت میں فرمایا کرتے تھے:۔

''کاش! میں فقر و فاقہ کی حالت میں اس دنیا سے رخصت ہو جاتا اور یہ عہدہ قضا قبول نہ کرتا۔''

اور جب وزارت عدل و قانون کی مطلق العنان فرمانروائی ملی تو ان کو دو ہزار سے زائد ماہوار تنخواہ ملتی

تھی ،صرف یہ نہیں بلکہ ہارون رشید کے دربار سے بعض اوقات شاہانہ دادودہش اور انعام واکرام اس کے علاوہ تھا، جب وفات کا وقت قریب ہوا تو اپنا رزق حلال کافی موجود تھا تو وفات سے قبل سب کو غرباء میں تقسیم کرنے کی وصیت اور تاکید فرمائی ،تقریباً چار لاکھ روپے اہل مکہ، اہل مدینہ، اہل کوفہ اور اہل بغداد میں تقسیم کیے گئے۔(۶۲)

خلیفہ ہارون رشید نے امام ابو یوسفؒ کو اپنی طرف سے کچھ خراجی زمین بھی دی تھی جس پر کوئی سرکاری ٹیکس نہیں لیا جاتا تھا۔ اس کی سالانہ آمدنی سے جو کچھ حاصل ہوتا تھا امام ابو یوسفؒ وہ صدقہ کردیا کرتے تھے۔(۶۳)

صرف مٹی کا ایک برتن جس سے والدہ اور بیٹا وضو کیا کرتے تھے

امام ابو یوسفؒ کا صحیفہ حیات ہر قسم کے محاسن واخلاق اور فضائل سے پر ہے، عہدہ قضا پر رہتے ہوئے انہوں نے جس اخلاق وکردار کا ثبوت دیا وہ ان ہی کی خصوصیت ہے، اس عہدہ پر پہنچنے کے بعد بڑے بڑے پاکباز لوگوں کا دامن بھی آلودہ ہوجاتا ہے مگر انہوں نے اپنا دامن کبھی بھی داغدار نہ ہونے دیا۔لوگوں سے ملنا جلنا، تواضع وخاکساری، لوگوں کی امداد اور اعانت، علم کی عزت وتوقیر، فیاضی وسیر چشمی یہ سب چیزیں اس زمانہ میں بھی ان کے ساتھ سایہ کی طرح رہیں۔

ان کے ظاہری محاسن واخلاق کی جھلکیاں تو آپ جگہ جگہ دیکھتے آئے ہیں باطنی محاسن واخلاق اور فیاضی وشکر گزاری کا اندازہ بھی ذیل کی تحریر سے لگایا جاسکتا ہے۔

بچپن سے فقر وفاقہ کی زندگی تھی مگر کبھی بھی اس پر ناشکری کے کلمات زبان سے نہیں نکلے، فقر وفاقہ کے ساتھ ان کی شکر گزاری کی حالت یہ تھی : حضرت عبداللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں امام ابو یوسفؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو باہمی گفتگو کے دوران انہوں نے مجھ سے اپنی معاشی تنگی کی شکایت کی، میں نے تسلی دی، جب ان کے پاس سے چلنے لگا تو دیکھا کہ مٹی کا ایک میلا سا برتن انکے پاس رکھا ہوا ہے اور وہ

اتفاق سے میرے دامن سے لگ کر ٹوٹ گیا اور اس کی وجہ سے امام ابو یوسفؒ کے چہرہ پر شکن آ گئی اور ان کا رنگ فق ہو گیا مگر زبان سے کچھ نہ کہا، میں نے کہا کیا بات ہے؟ ارشاد فرمایا:۔

''یہی ایک برتن تھا جس سے میں اور میری والدہ وضو کرتے تھے اور اسی سے پانی پیتے تھے''

عبداللہ بن مبارکؒ ان کا یہ حال سنکر بہت متاثر ہوئے اور ان کے ساتھ تعاون اور نصرت کے لئے کچھ رقم بھی دی۔(۶۴)

نرم خوئی وفیاضی اور احساس ذمہ داری

امام ابو یوسفؒ اپنے دیگر اوصاف اور کمالات کی طرح نرم خو بھی تھے اور فیاض بھی، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ نرم خوئی سے بعض اوقات لوگ غلط فائدے حاصل کر لیتے ہیں اور فیاضی بھی اسراف کی حدود میں داخل ہو جاتی ہے، یہ تب ہوسکتا ہے جب صاحب اوصاف کو احساس ذمہ داری نہ ہو، مگر امام ابو یوسفؒ کی نرم خوئی اور فیاضی اس احساس ذمہ داری سے خالی نہیں تھی جس کا اندازہ ذیل کے واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے، جسے موفق نے نقل کیا ہے کہ:۔

ایک مرتبہ کوئی شخص ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا حضرت! میں نے آپ کی جانب سے ایک فرضی خط لکھ کر فلاں صاحب سے اتنی رقم حاصل کر لی ہے اب وہ شخص مجھ سے مانگتا ہے، از راہ کرم آپ مجھے اس سے چھٹکارا دلا یئے، امام انو یوسفؒ نے بات سنی تو فوراً اس شخص کے گرفتار کرنے اور جیل میں ڈال دینے کا حکم دے دیا اور حکم دیا کہ جب تک رقم ادا نہیں کرو گے اس وقت تک جیل سے رہائی نہیں مل سکے گی۔

اس شخص نے عرض کیا حضرت! میں نے ایک بار اسی طرح آپ کے استاد امام اعظم ابوحنیفہؒ کی طرف سے بھی ایک فرضی خط لکھ کر ایک شخص سے روپے حاصل کر لیے تھے مگر جب مین نے ان کو اس کی اطلاع دی تو انہوں نے وہ روپیہ میری طرف سے ادا کر دیا اور امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ جس شخص کے بارے میں آپ کو یہ خیال ہو کہ وہ میرا خط دیکھ کر تمہیں روپیہ دے دے گا تو تم خط لکھ کر روپیہ منگا لیا کرو۔(۶۵)

امام ابو یوسفؒ سے کہنے لگا جناب! آپ بھی تو انہی کے اصحاب سے ہیں آپ سے بھی مجھے یہی توقع تھی مگر آپ ہیں کہ نہ صرف انکار کرتے ہیں بلکہ مجھے سزا بھی دلوا رہے ہیں۔

امام ابو یوسفؒ نے فرمایا بھائی! میں امام ابو حنیفہؒ نہیں ہوں، وہ ایک جلیل القدر عالم اور فقیہ تھے، لوگ ان کا ان کے علم و فضل کی وجہ سے احترام اور اعزاز کرتے تھے اور اسی وجہ سے ان کے نام پر روپیہ دے دیتے تھے اور میں حکومت کا ایک ذمہ دار عہدیدار ہوں، اس لیے اس بات کا واضح امکان موجود ہے کہ جس کو تم نے میری طرف سے خط لکھا ہو وہ روپیہ نہ دینا چاہتا ہو مگر میرے خوف سے اس نے دے دیا ہو۔

ایک روز تک اس کو جیل میں بند کر کے مایوس رکھا جب اسے واقعی اپنی غلطی پر تنبہ ہو گیا اور امام ابو یوسفؒ اس کی ندامت کو بھانپ گئے تو دوسرے روز اس کو اپنے پاس بلایا اور اسے فرمایا کہ جس سے تم نے روپے لئے تھے میں نے اسے واپس دے دیئے ہیں، اور تم کو رہا کر رہا ہوں، خبر دار! اب اگر وہ شخص دوبارہ وہ رقم بطیّب نفس بھی تمہیں واپس کرے تو ہرگز نہ لینا، جاؤ ایسا ہرگز نہ کرنا۔(٦٦)

پورے واقعہ کا خلاصہ آپ کے سامنے ہے، حکومت کے متعلق اور اس کے ذمہ داروں کے نام سے عام طور پر جو فائدے حاصل کئے جاتے ہیں، امام ابو یوسفؒ نے اس کے سد باب کے لئے اس شخص کو قید کر دیا، مگر ان کی طبعی فیاضی اور نرم خوئی کا اثر تھا کے روپیہ بھی ادا کر دیا اور رہائی بھی مرحمت فرمائی۔

اہل بدعت اور دروغ گوئی کا جواب

ایک دفعہ دشمنوں، حاسدوں اور مخالفین نے مشہور کر دیا کہ امام ابو یوسفؒ خود القرآن مخلوق (یعنی قرآن مخلوق ہے) کے قائل ہیں، چنانچہ امام صاحبؒ کے خاص تعلق والے تلامذہ یا معتقدین و مخلصین حاضر خدمت ہوئے اور عرض کیا حضرت! آپ ہمیں تو ایسے عقیدہ اور اقوال سے روکتے ہیں مگر خود دوسروں کو اسی کی تعلیم دیتے ہیں! امام ابو یوسفؒ کو حیرت ہوئی تو انہوں نے سارا قصہ ذکر کیا اور بتایا کہ باہر اس کی اسی طرح کی شہرت ہے۔

امام ابو یوسفؒ نے فرمایا کہ آپ لوگ بھی بڑے سادہ لوح ہیں کہ حاسد لوگوں اور مخالفین کی باتوں میں آ گئے، وہ پاگل دیوانے تو خدا پر بھی جھوٹ بولتے ہیں (کہ قرآن کو خدا کی مخلوق بتاتے ہیں) تو مجھ پر جھوٹ لگانا ان کے لئے کیا مشکل ہے؟ پھر ارشاد فرمایا کہ اہل بدعت کا طریقہ یہی ہے کہ وہ اپنے دل کی باتیں دوسروں پر رکھ کر چلاتے ہیں حالانکہ وہ لوگ ان کے جھوٹ سے بری ہوتے ہیں۔(٦٧)

بعض اہل زیغ فلسفی، ملحدین اور امام ابو یوسفؒ کا حکم

اسی طرح کا ایک دوسرا واقعہ بھی تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ لوگوں نے آ کر عرض کیا کہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ ایسے شخص کی شہادت بھی قبول کر لیتے ہیں جو یہ کہے کہ خدا تعالیٰ کو واقعات کے ظہور پذیر ہونے سے قبل تک ان کا علم نہیں ہوتا (اس زمانہ کے بعض اہل زیغ، فلسفی مزاج اور ملحدین کی طرف اشارہ تھا) تو امام ابو یوسفؒ نے فرمایا بالکل غلط ہے، ایسا شخص اگر میرے سامنے آ جائے تو اس سے فوراً توبہ کراؤں اور اگر توبہ نہ کرے تو اس کے قتل کر دینے کا حکم دوں۔(٦٨)

جگہ جگہ ہم نے اس قسم کے واقعات بھی نقل کر دئے ہیں جس سے اس زمانہ کے متنازعہ فیہ مسائل کلامیہ میں امام ابو یوسفؒ کی آراء معلوم ہو جاتی ہیں جو بہت جچی تلی، متوازن اور معتدل ہیں اور جس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس زمانے کے فرق باطلہ کے زیغ والحاد کا امام موصوف نے بڑی حکمت اور دانائی سے مقابلہ کیا۔

امام ابو یوسفؒ کے علم فقہ سے تعلق کی ایک مثال

حسن بن ابی مالکؒ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ امام ابو یوسفؒ نے فرمایا: ''میں بیمار پڑا اور اس بیماری نے میرے حافظہ پر چھاپا مارا، بیماری کی شدت کی وجہ سے جو کچھ بھی یاد تھا سب بھول گیا سوائے علم فقہ کے۔'' سوال کیا گیا حضرت یہ کیونکر؟ امام ابو یوسفؒ نے فرمایا: علم فقہ کے سوا جو دوسرے علوم میرے پاس تھے ان کی بنیاد صرف قوت حافظہ پر تھی اور وہ شدت مرض کی وجہ سے جواب دے گئی تو وہ علوم بھی جاتے رہے، اور علم فقہ تو

میرا جانا پہچانا علم تھا۔ ابتدائے شعور سے آج تک اس کے ساتھ تلبس رہا، علم فقہ میں میری مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص کئی سال تک اپنے وطن سے غیر حاضر رہے، پھر اس کے بعد آئے تو کیا وہ اپنے گھر کا راستہ بھول جائے؟ بلکہ قدم خود بخود اس طرف بڑھیں گے۔(۶۹)

علم و فضل اور زبان و بیان کا بادشاہ

قاضی ابو یوسفؒ امام اجل، فقیہ اکمل، عالم ماہر فاضل متجر، حافظ سنن، مجتہد فی المذہب اور حضرت امام ابو حنیفہؒ کے اصحاب میں سب سے متقدم تھے۔ آپ ہی نے پہلے پہل امام ابو حنیفہؒ کے مذہب پر کتابیں لکھیں اور مسائل کو املاء اور نشر کرایا، ان کے مذہب کو اقطار عالم میں پھیلایا، آپ ہی سب سے پہلے قاضی القضاۃ، افقہ العلماء اور سید العلماء کے لقب سے ملقب ہوئے، آپ ہی نے اس ہیئت کا لباس جو آجکل علماء میں مروج ہے ایجاد کیا۔

علامہ ابن عبد البرؒ کا قول ہے کہ میرے علم میں کوئی ایسا قاضی سوائے امام ابو یوسفؒ کے نہیں جس کا حکم مشرق سے، مغرب تک سارے آفاق میں رواں ہو۔(۷۰)

محمد بن جعفرؒ کا قول ہے کہ امام ابو یوسفؒ اپنے زمانہ کے سب سے بڑے فقیہ تھے، علم، حلم، ریاست، قدر و جلالت میں انتہاء کو پہنچے ہوئے تھے۔(۷۱)

حسین بن الولیدؒ کہتے ہیں کہ امام ابو یوسفؒ جب کلام کرتے تھے تو انسان چکر کھا جاتا تھا، ان کے نزاکت بیان اور حسن کلام سے حیران رہ جاتا تھا۔ میں نے ایک روز دیکھا کہ ایک مسئلہ غامضہ پر گفتگو کر رہے ہیں زبان اس طرح چل رہی تھی جیسے تیر بے خطا اکثر لوگ نزاکت بیان و معنیٰ کی بناء پر ان کا مفہوم پوری طرح نہ سمجھ سکے۔ ہم سب اس بات پر بہت متعجب تھے اور بڑی دیر تک آپس میں چہ میگوئیاں کرتے رہے کہ خدا نے اس شخص کے لئے زبان و بیان کا جوہر کس طرح مسخر کر دیا ہے اور ہر مشکل اس کے لئے کس درجہ آسان ہے۔(۷۲)

امام ابو یوسفؒ کا نام لو تو پہلے زبان دھولو

طحاویؒ نے سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ ایک مرتبہ ابن ابی عمران نے بیان فرمایا کہ عظیم محدث علی بن الجعدؒ ہمیں حدیث و مسائل کی املاء کرار ہے تھے اتنے میں انہوں نے فرمایا: ''امام ابو یوسفؒ نے ہم سے حدیث بیان کی۔''

درس گاہ شائقین علم، شاگردوں اور محبین و معتقدین سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا: ''کیا آپ ابو یوسفؒ کا ذکر کر رہے ہیں؟''

اس انداز گفتگو سے علی بن الجعدؒ نے محسوس کیا کہ بات کرنے والا امام ابو یوسفؒ کا ذکر اجلال و احترام اور اکرام سے نہیں کر رہا ہے اور جن شایان شان الفاظ میں یہ نام لینا چاہتے تھا اس سے گریز کر رہا ہے تو علی بن الجعدؒ نے غصہ اور بپھرے ہوئے لہجہ میں اس شخص سے مخاطب ہو کر فرمایا:۔

''جب تم امام ابو یوسفؒ کا ذکر کرنا یا ان کا نام لینا چاہو تو تمہیں چاہیے کہ پہلے اپنا منہ اشنان (ایک خوشبودار گھاس) اور گرم پانی سے دھولو پھر یہ نام نامی و گرامی زبان پر لاؤ۔'' (۷۳)

مخالفوں کا اعتراف

حدائق الحنفیہ میں لکھا ہے کہ امام ابو یوسفؒ کے مخالفوں میں سے ایک شخص کو آپ کی وفات کے دوسرے روز بڑا رنجیدہ اور نہایت غمگین پایا گیا۔ لوگوں نے وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ میں نے کل رات خواب میں امام ابو یوسفؒ کو بڑی زینت و تجمل کے ساتھ خلد بریں میں دیکھا ہے میں نے جنت کے دربانوں سے پوچھا کہ ابو یوسفؒ نے ایسا کون سا کام کیا ہے جس سے وہ اس بلند مقام کے مستحق ہوئے ہیں؟ جواب ملا کہ انہوں نے بڑے صبر و تحمل سے علم کی تحصیل و تعلیم اور افادہ و اشاعت کا کام کیا۔ (۷۴)

جنت کا پروانہ منامی

خود امام ابو یوسفؒ کی روایت ہے، فرمایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ امام اعظم ابو حنیفہؒ کو خواب میں دیکھا کہ

آپ جنت میں تشریف فرما یا ہیں اس شان سے کہ چاروں طرف حضرات صحابہ کرامؓ موجود ہیں اور آپ وسط میں ہیں، مجھے دیکھ کر ارشاد فرمایا: ''ابو یوسفؒ! کاغذ اور قلم لاؤ کہ میں اپنے جنتی اصحاب کے نام لکھ لوں''۔ میں نے عرض کیا حضرت! میرا نام بھی اس مبارک فہرست میں لکھ لیجیے۔ تو میری درخواست پر امام اعظم ابوحنیفہؒ نے میرا نام بھی جنتیوں کی فہرست میں لکھ لیا۔ (۷۵)

محدث اعمشؒ اور فقیہ ابو یوسفؒ

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ مشہور محدث حضرت اعمشؒ (جو امام ابو یوسفؒ کے استاد بھی ہیں) نے امام ابو یوسفؒ سے کہا تم نے اس مسئلے کا یہ حل کہاں سے ڈھونڈا ہے اور تمہارے اس جواب کی بنیاد کیا ہے؟ ابو یوسفؒ نے عرض کیا حضرت! فلاں حدیث جو آپ نے ہم سے بیان کی تھی، سے اس مسئلے کا یہ جواب میں نے اخذ کر کے آپکی خدمت میں پیش کیا محدث اعمش مسکرائے اور فرمانے لگے، اے ابو یوسفؒ! یہ حدیث تو مجھے اس وقت سے یاد ہے جب تمہارے باپ کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ مگر اس کی تاویل تم نے اس وقت بیان کی وہ آج معلوم ہوئی جو بالکل صحیح ہے، اس طرف تو کبھی ہمارا ذہن منتقل ہی نہیں ہوا تھا۔ (۷۶)

قاضی ابو یوسفؒ امام اعظم ابوحنیفہؒ کی نگاہ میں

قاضی ابو یوسفؒ نے طلب علم کے زمانہ میں امام اعظم ابوحنیفہؒ کی بارگاہ میں تحصیل علم کی خاطر زانوئے تلمذ تہہ کیا تو پھر دوسری طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

شناوران محبت تو سیکڑوں ہیں مگر
جو ڈوب جائے وہ پکا ہے آشنائی کا

خودسپردگی، تواضع و انکسار اور اپنے استاد امام اعظم ابوحنیفہؒ سے محبت اور وارفتگی کی برکت تھی کہ امام اعظم ابوحنیفہ بھی آپ کو دل و جان سے چاہنے والے بن گئے۔

ایک مرتبہ بیمار ہوئے تو امام ابوحنیفہ بھی تیمارداری اور بیمار پرسی کے لئے تشریف لائے، واپس جاتے

ہوئے قاضی ابو یوسفؒ کے دروازے پر متفکر ہو کر کھڑے ہو گئے، کسی نے حیرت و استعجاب اور تفکر و ملال کا سبب پوچھا تو امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا:۔

''خدانخواستہ اگر یہ جوان مر گیا تو زمین کا سب سے بڑا عالم اٹھ جائے گا۔''(۷۷)

امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے پوتے اسمٰعیل بن حمادؒ فرماتے ہیں کہ میرے دادا (ابوحنیفہؒ) کے خاص اصحاب دس تھے لیکن ان میں امام ابو یوسفؒ سے بڑھ کر کوئی نہیں تھا۔(۷۸)

امام ابو یوسفؒ کی علمی عظمت اور اعاظم رجال علماء کا اعتراف

علم و فضل اور خدمت فقہ و حدیث اور عدل و انصاف امام ابو یوسفؒ کی زندگی کا سب سے جلی عنوان ہے۔امام ابو یوسفؒ ائمہ تابعین اور تبع تابعین کے اس دور میں تھے جس میں علم و فن کا گھر گھر چرچا تھا، دینی علوم، تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت، رجال، طبقات اور مذاہب اربعہ کے ائمہ اور اعاظم رجال علماء اسی دور میں تھے، مثلاً امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام شافعیؒ، امام سیفان ثوریؒ، امام اوزاعیؒ، عبداللہ بن مبارکؒ، سفیان بن عینیہؒ، محمد بن اسحٰقؒ، یحییٰ بن معینؒ، وکیع بن جراحؒ وغیرہ۔اس قدر جلیل القدر ائمہ کبار کی موجودگی میں کسی دوسرے کے علم و فضل کا چراغ اس وقت تک روشن نہیں ہوسکتا تھا جب تک اس کے اندر غیر معمولی صلاحیت موجود نہ ہو، ان میں متعدد ائمہ کرام تو خود امام ابو یوسفؒ کے استاد تھے اور متعدد شاگرد تھے، مگر اس کے باوجود بھی اعظم ابوحنیفہؒ اور دیگر ائمہ مذکورین نے امام ابو یوسفؒ کے علم و فضل کا جن الفاظ کے ساتھ اعتراف کیا ہے اس سے امام ابو یوسفؒ کی علمی عظمت، بلند پائیگی اور رفعت و منزلت کا اندازہ ہوتا ہے۔اس سلسلہ میں ائمہ کے اقوال و اعترافات جگہ جگہ ہم نقل کرتے چلے آئے ہیں۔ذیل میں بھی اس کا کچھ حصہ نقل کر دیا جاتا ہے:

سید العلماء

علی بن صالحؒ جو امام شعبہؒ اور ابن ابی ذئبؒ جیسے مشہور روزگار ائمہ کی خدمت اور صحبت میں رہ چکے تھے۔جب امام ابو یوسفؒ سے روایت کرتے تھے تو فرماتے تھے سید العلماء، افقہ الفقہاء، علماء کے سردار، سب سے

بڑے فقیہ یعنی امام ابو یوسفؒ نے یہ روایت کی ہے۔(۷۹)

ابو حنیفہؒ کا ممتاز شاگرد

طلحہ بن جعفرؒ فرماتے ہیں کہ امام ابو یوسفؒ مشہور اور معروف تھے، ان کا علم وفضل بلند درجہ کا تھا ان سے بڑھ کر ان کے زمانے میں کوئی نہیں تھا، علم وحکمت اور ریاست وقدر میں انتہاء کو پہنچے ہوئے تھے، وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے امام اعظم ابو حنیفہؒ کا علم تمام عالم میں پھیلایا، یعنی عملاً امام اعظم ابو حنیفہؒ کے مستنبط مسائل کی سب سے زیادہ اشاعت ان ہی کے ذریعہ ہوئی۔

امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ ائمہ ثلاثہ سے کسی طرح کم نہ تھے

امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ دونوں علم وعمل، فقہ واجتہاد اور استنباط واستخراج مسائل کے بلند ترین مقام پر فائز تھے اور دونوں اجتہاد واستنباط مسائل میں ائمہ ثلاثہ امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ سے کسی طرح بھی کم نہ تھے، امام شافعیؒ اور امام محمدؒ نے تو دونوں سے استفادہ بھی کیا ہے اور اس پر فخر بھی، چنانچہ علامہ مرجانیؒ (م ۱۳۰۶ھ) لکھتے ہیں:۔

وحالهم في الفقه ان لم يكن ارفع من مالك والشافعي وامثا لهما فليسوا بد و نهما (۸۰)

امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ کا مرتبہ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ سے بلند نہیں ہے تو ان سے کمتر بھی ہرگز نہیں۔

لاؤ! اگر ابو یوسفؒ کا سا کوئی آدمی پیش کر سکتے ہو

جب عباسی حکمرانوں کا حنفی فقہ اور حنفی فقہاء کے بغیر نظام حکومت کے تاراج ہونے کا اندیشہ یقین سے بدل گیا تب ہارون الرشید نے قاضی ابو یوسفؒ کو عام قاضی کے عہدے سے ترقی دے کر قاضی القضاۃ (لارڈ چیف جسٹس) کا مقام دے دیا گویا محکمہ عدلیہ کی مطلق العنان وزارت پر قاضی ابو یوسفؒ براجمان ہو گئے،

حافظ ابن عبد البرؒ نے لکھا ہے کہ:

کان الیه تولیة القضاء فی ا لا فاق من المشرق الی المغرب (۸۱)

یعنی قاضی ابو یوسفؒ کے اختیار میں تھا کہ مشرق سے مغرب تک قاضیوں کا تقرر کریں۔

خود امام ابو یوسفؒ کا ارشاد ہے:۔

فولا نی قضاء البلاد کلهما (۸۲)

پھر مجھ کو تمام ممالک عروسہ کی قضاء کی ذمہ داری سونپ دی۔

مگر مخالفین اور حاسدین سے قاضی ابو یوسفؒ کی یہ وسیع تر ذمہ داریاں، اختیار اور عظمت نہ دیکھی جا سکی اور ہارون رشید سے طرح طرح کی شکایات شروع کر دیں، اور کہنے لگے:۔

کان فقیهاً عالماً انك رفعت ابا یوسف فوق المقدار وانزلته المنزلة الجلیة الرفیعة فبای وجه نال ذٰلك منك (۸۳)

ابو یوسفؒ تو محض ایک عالم اور فقیہ تھے آپ نے ان کی حیثیت سے کہیں زیادہ ان کو بلند کر دیا اور غیر معمولی اعزاز و اکرام بخش دیا تو یہ مرتبہ آپ کے ہاں انہوں نے کس وجہ سے حاصل کیا۔

ایسے ہی شکایت کرنے والوں سے ایک روز ہارون الرشید نے (جو خود بھی بہت بڑا فقیہ، اچھا عالم اور نقاد تھا) جواب میں کہا:۔

''اس لیے کہ مجھے قاضی ابو یوسفؒ کی معرفت حاصل ہے، از روئے تجربہ میں ان کی قدر و منزلت بڑھانے پر مجبور ہوں، خدا کی قسم! ابواب علم میں سے کوئی ایسا باب نہیں جس میں میں نے ابو یوسفؒ کا امتحان نہ لیا ہو، مگر میں نے ہمیشہ اور ہر موقعہ پر انہیں کامل اور یکتا پایا، وہ ہمارے ساتھ حدیث کے حلقوں میں جاتے تھے ہم لکھ لیتے تھے وہ نہیں لکھتے تھے، پھر جب ہم مجلس سے اٹھتے تو اصحاب حدیث انہیں گھیر لیتے، وہ اپنے لکھے ہوئے نوٹوں کی تصحیح ان کے حافظہ سے کرتے اور فقہ میں تو انہیں وہ مرتبہ حاصل ہے جس پر آج تک کوئی

آدمی نہیں پہنچ سکا، بڑے بڑے لوگ ان کے سامنے پہنچکر چھوٹے اور کم مایہ نظر آنے لگتے تھے، ان کے پاس بڑے بڑے فقیہ آتے تھے جبکہ وہ عام مجلس میں بیٹھے ہوتے تو اس موقعہ پر نہ ان کے پاس کوئی نوٹ بک ہوتی اور نہ کوئی کتاب، وہ ہمارے ساتھ شریک مجلس رہتے اور ان آنے والے علماء اور فقہاء سے سوال کرتے کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟ وہ جواب دیتے: ''فلاں فلاں باب کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہیں۔'' ابو یوسفؒ وہیں بیٹھے بیٹھے برجستہ ان کے ہر سوال کا جواب دیتے اور چٹکی بجانے میں ہر مشکل حل کر دیتے، یہ وہ خصوصیت تھی جس سے ان کے ہمعصر علماء عاجز تھے، پھر ان سب باتوں کے علاوہ وہ استقامت فی المذہب اور صیانت فی الدین کا بھی نمونہ کامل تھے، اس کے بعد ہارون الرشید نے کہا! لاؤ اگر ابو یوسفؒ کا سا کوئی آدمی لا سکتے ہو''

امام ابو یوسفؒ نے عہدہ قضا کو بلندی بخشی تھی

یہ صرف ایک دو واقعات نہیں بلکہ امام ابو یوسفؒ کی پوری زندگی اس کی عملی تفسیر تھی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام ابو یوسفؒ نے جس مقصد کی خاطر یہ عہدہ قضا قبول کیا تھا وہ اس میں کتنے کامیاب تھے۔ انہوں نے اپنے ذاتی کردار اور علم و تفقہ سے اس عہدہ کو کتنا بلند اور خود حکومت میں کتنا اثر اور رسوخ پیدا کر لیا تھا کہ وزراء اور ارکان حکومت تک کے دل میں رشک و حسد پیدا ہونے لگا تھا، یہ ہارون ہی کے عہد کا ایک واقعہ ہے جس میں برامکہ جیسے بیدار مغز وزراء اور ارکان دولت تھے۔

امام ابو یوسفؒ کے بعد اسی عہدہ پر جب وہب بن وہب ابی البختری کا تقرر ہوا تو وہ خلیفہ ہارون رشید کے ہر کام کے جواز کے لئے حدیثیں وضع کرنے لگتا تھا۔ مشہور ہے کہ انہوں نے کئی بار اس طرح کا اقدام کیا، دو ایک بار تو ہارون کچھ نہ بولا، مگر وہ بھی تو صاحب علم و نظر تھا اور پھر امام ابو یوسفؒ جیسے متدین اور محتاط قاضی کی رفاقت میں رہ چکا تھا کب خاموش رہ سکتا تھا۔ چنانچہ ایک روز خلیفہ کبوتر اڑا رہا تھا کہ قاضی وہب آ گئے پوچھا جناب! کبوتر بازی کے لئے بھی کوئی حدیث آئی ہے؟ بے محابا شیخ نے یہ روایت سنا دی کہ:۔

''مجھ سے ہشام بن عروہؒ یہ روایت کی ہے کہ ان کے والد ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کے واسطے سے بیان کرتے تھے کہ وہ فرماتی تھیں کہ آنحضرت ﷺ نے کبوتر بازی کی ہے اور اس سے شغف فرمایا ہے''۔ ہارون رشید یہ سن کر آپے سے باہر ہو گیا اور نہایت خشمگیں آواز میں بولا: ''نکل جاؤ میرے سامنے سے، اگر تمہارا تعلق قریش سے نہ ہوتا تو میں ابھی تمہیں معزول کر دیتا۔'' اور یہی ہوا کہ کچھ دنوں کے بعد معزول کر دیئے گئے۔(۸۴)

اس ایک واقعہ سے امام ابو یوسفؒ کی عظمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، امام ابو یوسفؒ محض اسمأیا تبرکا قاضی نہیں تھے بلکہ وہ حکومت کے محکمہ عدلیہ کے پورے انچارج یا بالفاظ دیگر وزیر عدل و قانون تھے۔ ہارون رشید جیسا باجبروت اور خود پرست خلیفہ ان کا اس قدر اکرام کرتا تھا کہ باب خلافت تک پہنچ جانے کے باوجود وہ سواری سے نہیں اترتے تھے حریم خلاف کا پردہ اٹھا دیا جاتا اور آپ کی سواری اندر چلی جاتی تھی، جب ہارون رشید کا سامنا ہوتا تو وہ خود سلام میں سبقت کرتا تھا، ان کے لئے ہر وقت دربار میں باریابی کی اجازت تھی اور کسی وقت بھی کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔

امام ابو یوسفؒ کی موجودگی میں محدث ابو معاویہؒ کے پاس کیوں آتے ہو

حسن بن ابی مالکؒ کی روایت ہے کہ ہم لوگ محدث ابو معاویہؒ کے پاس جایا کرتے تھے تاکہ ان سے حجاج بن ارطاۃ کی احادیث میں احادیث احکام فقہ حاصل کریں، تو وہ ہم سے فرمایا کرتے کیا تمہارے پاس قاضی ابو یوسفؒ نہیں ہیں؟ ہم عرض کرتے تھے کہ ہیں، تو وہ بڑی حیرت اور تعجب سے فرماتے تھے کہ: ''تم لوگ بھی عجیب ہو کہ امام ابو یوسفؒ کو چھوڑ کر میرے پاس آتے ہو،'' ....فرمایا کہ ہم لوگ حجاج بن ارطاۃ کے پاس اکٹھے جایا کرتے تھے، تو جس وقت حضرت حجاجؒ حدیث کی املاء کراتے تھے تو امام ابو یوسفؒ سب حدیثیں یاد کر لیا کرتے تھے، پھر جب ان کی مجلس سے نکل آتے تو ہم امام ابو یوسفؒ کے حافظہ سے ہی وہ سب احادیث لکھ لیا کرتے تھے۔(۸۵)

ائمہ احناف کی فقہی ڈگریاں

امام مزنیؒ سے کسی نے اہل عراق کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے امام ابو حنیفہؒ کے متعلق فرمایا:۔

سیدھم (ترجمہ) ان کے سردار

امام ابو یوسفؒ کے بارے میں فرمایا:

اتبعھم للحدیث (ترجمہ) ان میں سب سے زیادہ حدیث کے پیرو

امام محمدؒ کے متعلق فرمایا:

اکثرھم تفریعاً (ترجمہ) سب سے زیادہ مسائل اخذ کرنے والے

امام زفرؒ کے بارے میں فرمایا:

احد ھم قیاساً (ترجمہ) سب سے زیادہ قیاس میں تیز (۸۶)

امام ابو حنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے درجات

ابن ابی رجاء نے محمد یہؒ سے (جو ابدال میں شمار ہوتے تھے) روایت کی ہے کہ میں نے وفات کے بعد ایک مرتبہ امام محمدؒ کو خواب میں دیکھا تو ان سے پوچھا

اے ابو عبداللہ! خدا تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا؟ فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے میری مغفرت فرمادی اور خدا تعالیٰ نے مجھے ارشاد فرمایا کہ میں تم کو علم کا خزانہ نہ بناتا اگر تم کو عذاب دینے کا ارادہ رکھتا۔'' میں نے پوچھا امام ابو یوسفؒ کے ساتھ کیا گزری؟ امام محمدؒ نے جواب دیا ''فوقی'' یعنی وہ مجھ سے ایک درجہ اونچے ہیں جنت میں۔'' میں نے پھر سوال کیا اور امام ابو حنیفہؒ کا سنایئے؟ امام محمدؒ نے فرمایا: ''فوقہ بطبقاتٍ یعنی وہ امام ابو یوسفؒ سے بھی بہت طبقے اوپر اعلیٰ علیین میں ہیں۔'' (۸۷)

تو مجھ کو بھری بزم میں تنہا نظر آیا

ابن ابی عمرانؒ جو امام طحاویؒ کے شیوخ میں سے ہیں، فرماتے ہیں میں نے علی بن الجعد ثوریؒ جیسے صاحب فضل کمال کو دیکھا، میں نے حسن بن صالحؒ جیسے یگانہ روزگار فرد کو دیکھا، میں نے امیر المومنین فی الحدیث امام مالکؒ کو دیکھا، میں نے ابن ابی ذئبؒ جیسی گونا گوں کمالات و خصائص رکھنے والی شخصیت دیکھی، میں نے لیث بن سعدؒ جیسے نابغہ روزگار شخص کا دیکھا، میں نے شعبہ بن الحجاجؒ جیسے فرد فرید کو دیکھا، لیکن کسی میں وہ بات نہ پائی جو امام ابو یوسفؒ میں دیکھی۔(۸۸)

تو مجھ کو بھری بزم میں تنہا نظر آیا

امام ابو یوسفؒ کی شان میں وقت کے اکابر نے ثناوصفت کے جو الفاظ استعمال کیے ہیں سب کا استقصاء طوالت کا باعث ہے۔ابن ابی عمرانؒ کے قول سے بھی یہ بات صاف طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے علم، اجتہاد، اصابت رائے اور پختگی فکر سے ان کے معاصرین کس درجہ متاثر تھے اور کس طرح بیساختہ وہ ان گھمبیر عالم کے حضور خراج عقیدت پیش کرنے پر اپنے تئیں مجبور پاتے ہیں، اس کی وجہ ان کی ذاتی شرافت اور بے داغ کردار تھا۔

اپنے کام سے کام

درحقیقت اہل علم کے بھی دو طبقے ہیں (۱) ارباب صلاح وتقوٰی، (۲) اصحاب ہوا وظن، دوسرا گروہ صرف اپنے لیے، اپنی جماعت کے لئے اور صرف اپنے ہم خیالوں کے لئے کلمہ خیر کہنے کا عادی اور مدح و ستائش کا خوگر ہوتا ہے، اس کے برعکس اول الذکر گروہ کسی کے لئے بھی اپنے دل میں برائی کا جذبہ نہیں رکھتا سب کے لئے نیک گمان رکھتا ہے اور ہر کسی کے فضل و کمال کے اعتراف وستائش کے لئے تیار رہتا ہے، امام ابو یوسفؒ کا شمار بھی اسی گروہ میں ہوتا ہے، انہوں نے اپنے مخالفوں اور نکتہ چینوں تک کی تعریف میں اور ان کے فضل و کرم کے اعتراف اور اقرار میں ذرا بھی تامل نہیں کیا بلکہ فراخدلی کے ساتھ یہ فریضہ انجام دیا اور اس طرح دنیا پر ثابت کر دیا کہ ان کا دل کتنا وسیع تھا اور وہ بدگمانی اور ظن فاسد سے کتنے دور تھے انہوں نے کبھی کسی

کی برائی نہیں کی، کبھی کسی کے لئے سخت ددرشت اور نازیبا الفاظ استعمال نہیں کیے، کبھی کسی کے بارے میں ایسی رائے کا اظہار نہ کیا جو اس کے لیے موجب توہین اور اس کے ماننے والوں کے لیے باعث تکلیف ہو، انہوں نے اپنے کام سے کام رکھا اور اس کی ذرا پرواہ نہیں کی کہ لوگ کیا کہتے اور کیا کرتے ہیں۔

امام ابو یوسفؒ کا قصر جمیل

القواس کی روایت ہے کہتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ حضرت معروف کرخیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے مجھ سے امام ابو یوسفؒ کی خیریت دریافت کی، میں نے عرض کیا حضرت! امام ابو یوسفؒ علیل ہیں اور بیماری بڑھ رہی ہے۔ ارشاد فرمایا:۔

''اگر امام ابو یوسفؒ کی علالت بڑھ جائے اور کوئی حادثہ واقع ہو جائے (یعنی وفات پا جائیں) تو دیکھو! مجھے فوراً مطلع کرنا، ایسی خبر میں ہرگز تاخیر نہ کرنا۔''

راوی کا بیان ہے کہ میں ان سے رخصت ہو کر دارالرقیق کے دروازہ پر پہنچا تو امام ابو یوسفؒ کا جنازہ نکل رہا تھا اور لوگ انبوہ درانبوہ جنازہ میں شریک ہو رہے تھے میں بھی ساتھ ہو لیا، معروف کرخیؒ کا ارشاد اور تاکید مجھے یاد تھی مگر دل میں سوچا کہ اب اگر معروف کرخیؒ کو اطلاع کرنے جاتا ہوں تو نماز جنازہ سے رہ جاتا ہوں اور نہ حضرت معروف کرخیؒ اسے پاسکیں گے۔ بہر حال میں نماز جنازہ میں شریک ہو گیا۔ اس کے بعد جب حضرت کرخیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور وفات کی خبر سنائی تو ان کو بے حد صدمہ ہوا چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا، بار بار اناللہ پڑھتے جاتے تھے، میں نے عرض کیا اسے ابو محفوظ! (یہ حضرت معروف کرخیؒ کی کنیت ہے) آپ کو نماز جنازہ میں شریک نہ ہونے کا اس قدر صدمہ کیوں ہے اور آپ اس قدر مغموم کیوں ہیں؟ فرمانے لگے:۔

''میں نے آج رات ایک خواب دیکھا گویا میں جنت داخل ہوا ہوں دیکھتا ہوں کہ وہاں ایک شاندار محل تعمیر ہوا ہے اور اس کا بالائی حصہ بھی مکمل ہو چکا ہے، حسین پردے آویزاں کر دیے گئے ہیں۔ میں نے اہل

جنت سے پوچھا یہ محل کس کے لیے تیار ہوا ہے؟ انہوں نے جواب دیا ''قاضی امام ابو یوسفؒ کے لئے'' میں نے پوچھا انہوں نے یہ مرتبہ کیونکر پایا اور کس بات پر وہ اس قصر جمیل کے مستحق ٹھہرے؟ اہل جنت نے جواب دیا: ''اس بات پر کہ انہوں نے علم کو پھیلایا اور لوگوں کی کڑوی کسیلی باتیں صبر و شکر کے ساتھ سنیں اور لوگوں نے جو اذیتیں انہیں پہنچائیں انہیں خندہ جبینی سے برداشت کیا'' (۸۹)

امام ابو یوسفؒ نے ہارون رشید کے خلاف فیصلہ دیا

امام ابو یوسفؒ نے ایک فیصلہ ہارون رشید کے خلاف بھی دیا تھا مگر اس میں ان سے ذرا سی غلطی ہو گئی تھی جس کا ان کو زندگی بھر افسوس رہا، واقعہ یہ ہے کہ سواد عراق کے ایک بوڑھے نے ہارون رشید کے خلاف یہ دعوٰی دائر کیا کہ فلاں باغ میرا ہے لیکن خلیفہ نے اس پر غاصبانہ قبضہ کر لیا ہے۔ اتفاق سے یہ مقدمہ اس روز پیش ہوا جس روز خود ہارون رشید فیصلے کے لئے بیٹھا تھا۔ قاضی ابو یوسفؒ فریقین کے بیانات اور ان کے دعوے ہارون رشید کے سامنے پیش کر رہے تھے۔ جب اس مقدمہ کی باری آئی تو انہوں نے خلیفہ کے سامنے اس کو پیش کیا اور کہا کہ آپ کے اوپر دعوٰی ہے کہ آپ نے فلاں آدمی کا باغ زبردستی لے لیا ہے، مدعی یہاں موجود ہے، حکم ہو تو حاضر کیا جائے بڈھا سامنے آیا تو قاضی ابو یوسفؒ نے پوچھا بڑے میاں آپ کا دعوٰی کیا ہے؟ اس نے کہا کہ میرے باغ پر امیر المومنین نے ناحق قبضہ کر لیا ہے جس کے خلاف دادرسی چاہتا ہوں۔ قاضی نے سوال کیا اس وقت وہ باغ کس کے قبضہ اور نگرانی میں ہے؟ بولا امیر المومنین کے ذاتی قبضہ میں ہے۔ اب قاضی ابو یوسفؒ نے ہاورن رشید سے مخاطب ہو کر کہا کہ دعوٰی کے جواب میں آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں! ہارون رشید نے کہا میرے قبضہ میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس میں اس شخص کا حق ہو، نہ خود باغ ہی میں اس کا کوئی حق ہے۔ قاضی صاحبؒ نے فریقین کے بیانات سننے کے بعد مدعی سے پوچھا کہ تمہارے دعوے کے ثبوت کے لئے کوئی دلیل بھی ہے؟ کہا ہاں خود امیر المومنین سے قسم لے لی جائے۔ ہاورن رشید نے قسم کھا کر کہا کہ یہ باغ میرے والد مہدی نے مجھے عطا کیا تھا، میں اس کا مالک ہوں بوڑھے نے یہ سنا تو اس کو بہت

غصہ آیا اور یہ بڑبڑاتا ہوا عدالت سے نکل گیا کہ جس طرح کوئی شخص آسانی سے ستو گھول کر پی جائے، اسی طرح اس شخص نے آسانی سے قسم کھالی۔

ایک معمولی آدمی کی زبان سے یہ الفاظ سنکر ہارون رشید کا چہرہ غصہ سے تمتما اٹھا، یحیی برمکیؒ نے ہارون کو خوش کرنے کے لئے امام ابو یوسفؒ سے مخاطب ہوکر کہا آپ نے دیکھا اس عدل واحسان کی نظیر دنیا میں مل سکتی ہے؟ امام ابو یوسفؒ نے اس کی تحسین کی اور کہا مگر انصاف کے بغیر کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔

مذکورہ بالا معاملہ میں امام ابو یوسفؒ نے انصاف کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، مگر پھر بھی آخر وقت تک ان کو جب اس واقعہ کا خیال آجاتا تو فرماتے تھے میں اپنے اندر سخت کوفت، اذیت، رنج محسوس کرتا ہوں اور ڈرتا ہوں کہ میں نے انصاف میں جو کوتاہی کی ہے اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا کیا جواب دوں گا، لوگوں نے پوچھا آپ نے انصاف میں کیا کوتاہی کی، اور آپ اس سے زیادہ کر بھی کیا سکتے تھے کہ ایک معمولی کسان کے مقابلہ میں وقت کے سب سے بڑے بادشاہ کو قسم کھانے پر مجبور کر دیا؟ فرمایا تم لوگوں نے نہیں سمجھا کہ مجھے کس خیال سے تکلیف ہوتی ہے، پھر افسوس کے لہجہ میں فرمایا کہ مجھے تکلیف اور کڑھن اس کی ہے کہ میں ہارون رشید سے یہ نہ کہہ سکا کہ آپ کرسی سے اتر جائے جہاں آپ کا فریق کھڑا ہے وہیں ایک فریق کی حیثیت سے آپ بھی کھڑے ہو جائے یا پھر اجازت دیجئے کہ اس کیلیے بھی کرسی لائی جائے۔(۹۰)

کاش ایسا نہ ہوتا

ابو بکر خصافؒ بھی غالباً یہی واقعہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں:

جب امام ابو یوسفؒ پر نزع کا عالم طاری ہوا تو تم ہم ان کے سرہانے بیٹھ گئے تھے۔ ہم نے ان سے سوال کیا کیا آپ موت کے خیال سے کچھ پریشان ہیں؟ انہوں نے جواب دیا خدا کی قسم ہاں! مگر ایک بات ہے، ہوا یوں تھا کہ ایک مرتبہ ایک عیسائی نے خلیفہؒ ہارون رشید پر میری عدالت میں دعوٰی دائر کر دیا، میں خلیفہ ہارون رشید اور نصرانی دونوں کو طلب کیا، خلیفہ ہارون رشید تو اس حالت میں آیا کہ اس کے لیے

ایک مصلی لایا گیا تھا جس پر وہ بیٹھ گیا مگر میں نے ایسا ہی مصلی نصرانی کے لیے منگا کر اسے نہیں بیٹھایا، بس یہی ایک کھٹکا ہے، یہ میرے دل کی خلش ہے اور افسوس ہے جو اپنے ساتھ لیے جا رہا ہوں، کاش ایسا نہ ہوتا۔(۹۱)

تقویٰ و دیانت اور اولاد کی تربیت

ابراہیم بن الجراحؒ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ ہم امام یوسفؒ کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے، اس مجلس میں بشر بن ولیدؒ بھی موجود تھے کہ ان کی اسی مجلس میں ان کے صاحبزادے یوسفؒ بھی تشریف لائے اور ایک مسئلہ پر بحث و گفتگو شروع تھی۔ مگر ابو یوسفؒ اپنے صاحبزادے یوسفؒ کو گھور گھور کر دیکھتے اور ڈانٹ کر فرماتے:۔

''یہ تم کیا پہنے ہوئے ہو''؟

وجہ یہ تھی کہ یوسفؒ نے ایک قیمتی جبہ زیب تن کیا ہوا تھا اور امام ابو یوسفؒ کی دیانت اور تقویٰ اس کا متحمل نہیں تھا کہ وہ اپنی اولاد امجاد کو قیمتی اور بھڑک دار لباس میں دیکھیں۔(۹۲)

زہد و ورع اور ذوق عبادت

احمد بن عطیہؒ کی روایت ہے فرماتے محمد ابن سماعہؒ کہا کرتے تھے:

''حضرت امام ابو یوسفؒ قاضی القضاۃ کے عظیم منصب پر فائز ہوئے، منصب کی عظمت، ذمہ داریوں کی نزاکت، وسیع و عریض مملکت کے مسائل، طبعی اور فطری احوال، عام حوائج اور عامۃ الناس کی ضرورتوں اور بشری تقاضوں کے باوجود بھی امام ابو یوسفؒ کا ہمیشہ معمول یہ تھا کہ روزانہ دو سو رکعت نفل پڑھا کرتے تھے''

محمد بن صباحؒ سے بھی یہ روایت ہے کہ امام ابو یوسفؒ مرد صالح تھے اور اکثر روزے رکھا کرتے تھے۔

تقویٰ اور خوف آخرت

امام ابو یوسفؒ نہایت پاکدامن اور عفت مآب تھے، گاہے گاہے بارگاہ ربوبیت میں مناجات کرتے سنا گیا تو عرض کرتے:۔

بارالہٰ! تو جانتا ہے کہ میں نے کبھی کوئی حرام فعل نہیں کیا اور نہ حرام کا ایک پیسہ کھایا ہے۔(۹۳)

بارالہٰ! تو جانتا ہے کہ جب دو آمی میرے پاس کوئی معاملہ لائے تو میں نے کبھی کوئی جانبداری نہیں کی اور نہ میری کبھی یہ خواہش ہوئی کہ فلاں کے حق میں فیصلہ ہو خواہ وہ خلیفہ وقت ہی کیوں نہ ہو، بارالہٰ اس کے بدلے تو مجھے معاف کردے۔(۹۴)

ان روایتوں کے راوی ابو حفصؒ ہیں وہ فرماتے ہیں کہ یہ نہ سمجھا جائے کہ انہوں نے آخر وقت میں ایسی بات کہی ہے جس پر زندگی میں ان کا عمل نہیں تھا، بلکہ ان کی ساری زندگی اس کی آئینہ دار تھی۔

سیر الصحابہ میں آپ کے اقوال زریں کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ آپ گاہے گاہے بارگاہ صمدیت میں یوں مناجات کیا کرتے تھے:۔

اے اللہ! تو جانتا ہے کہ جب میرے پاس دو فریق آئے اور ان میں سے ایک ضعیف اور دوسرا اقوی تھا تو میں نے دونوں میں ہمیشہ مساوات رکھی، میں نے اس بارے میں خلیفہ اور ایک بازاری آدمی کو یکساں سمجھا، میرا قلب کبھی کسی وجاہت وقوت کی طرف مائل نہیں ہوا، اے اللہ! اگر میں نے ایسا کیا بھی ہے تو میری مغفرت فرمادے۔(۹۵)

عالم نزع میں توجہ وانابت الی اللہ

امام ابو یوسفؒ موت سے کچھ دن پہلے بیمار پڑے، ان کو اپنی موت کا اس سے قبل ہی کچھ اندازہ ہو گیا تھا وہ برابر کہتے تھے کہ میں ۱۷ برس امام اعظم ابو حنیفہؒ کی خدمت میں رہا اور ۱۷ برس دنیا (قضاء وافتاء) کے کاموں میں، اب میرا وقت قریب ہے، علالت کے ایام میں ان پر عجیب رقت طاری رہتی تھی، عہدہ قضا کی

ذمہ داریوں کو انہوں نے جس دیانتداری سے انجام دیا، اس کی تفصیلات آ چکی ہیں لیکن آخر وقت وہ یہ کہتے تھے کاش! میں فقر و فاقہ کی حالت میں اسی دنیا سے چلا جاتا اور عہد قضا قبول نہ کرتا، پھر بھی میں اللہ کا شکرادا کرتا ہوں کہ میں نے قصداً نہ کسی پر ظلم کیا ہے اور نہ کسی فریق کی پاسداری کی ہے اور نہ میری یہ خواہش ہوئی کہ فلاں فریق کامیاب ہو اور فلاں ناکام۔

امام شعبی رحمہ اللہ اپنی کتاب کفایہ میں روایت کرتے ہیں کہ امام ابو یوسفؒ پر جب نزع کا عالم طاری ہوا تو انہوں نے اپنے رب سے مناجات کرتے ہوئے عرض کیا:

یا اللہ! میں نے تیری کتاب، تیرے نبی ﷺ کی سنت اور اقاویل صحابہؓ پر ہمیشہ نظر رکھی، میں نے امام ابو حنیفہؒ کو اپنے اور تیرے درمیان ایک پل بنالیا ہے، تو جانتا ہے میں نے نہ کبھی کسی قوی سے مخاصمت رکھی نہ ضعیف سے، نہ قوی کی طرف مائل ہوا نہ ضعیف سے تنگ دل، اے اللہ! اگر تو جانتا ہے کہ میں سچ کہہ رہا ہوں تو تو میری مغفرت فرمادے۔(۹۶)

علامہ ابن الجوزیؒ لکھتے ہیں کہ وفات کے وقت امام ابو یوسفؒ بارگاہ ربوبیت میں یوں عرض کر رہے تھے:

''اے اللہ! تو خوب جانتا ہے میں نے کسی پر زیادتی نہیں کی، کسی پر جور نہیں کیا، جان بوجھ کر کوئی غلط حکم میں نے تیرے بندوں پر نہیں تھوپا، میں نے تیری کتاب اور تیرے نبی ﷺ کی سنت کو پیش نظر رکھ کر اجتہاد کیا، جب کبھی مجھے کوئی مشکل پیش آئی تو میں نے امام ابو حنیفہؒ کو اپنے اور تیرے مابین کرلیا، امام ابو حنیفہؒ تیرے احکام سے مجھ سے زیادہ واقف تھے اور تیرے حکم کے دائرے سے کبھی باہر نہیں نکلتے تھے۔(۹۷)

گرانقدر نصائح

☆ اپنے تلامذہ سے فرماتے تھے کہ لوگو! علم صرف رضائے الٰہی کے لئے حاصل کرو، اس میں کوئی دوسری غرض شامل نہ ہو، میرا خود اپنا حال یہ تھا کہ جس مجلس میں متواضع ہو کر شریک ہوا اس سے بلند ہو کر اٹھا اور

جس مجلس میں علم کے غرور اور پندار کے ساتھ گیا اس میں میری ذلت اور فضیحت ہوئی، پس خبر دار اللہ ہی کے لیے علم حاصل کرو۔

☆اس شخص کی صحبت سے بچو جو قیامت کی ذلت اور رسوائی سے نہیں ڈرتا۔

☆ فرماتے تھے تین نعمتیں اصلی ہیں: ایک اسلام کہ دنیا کی کوئی نعمت اس کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی ،دوسری صحت کہ اس کے بغیر کوئی راحت خوشگوار نہیں ہوسکتی، تیسری فارغ البالی کہ اس کے بغیر زندگی پرسکون نہیں ہوتی۔

☆فرماتے تھے علم ایسی چیز ہے کہ جب تم اپنی پوری زندگی اس کو دے دو گے تب جا کر اس کا کچھ حصہ تم کو ملے گا، جب تم کو اس کا بعض حصہ ملے تو اس پر تکیہ نہ کرو بلکہ برابر اس میں لگے رہو۔

☆فرماتے تھے حکومت کے ذمہ داروں کا پھٹے حال رہنا اور جھوٹی موٹی زندگی اختیار کرنا ذلت کا باعث ہے اور قضاۃ اور علماء کے لئے سادہ زندگی قابل فخر ہے۔

☆فرماتے تھے جو شخص شاذ ونادر حدیث کے پیچھے پڑے گا وہ حضورﷺ پر بہتان تراشی میں ضرور مبتلا ہو جائے گا۔

☆فرمایا جو شخص کیمیا سازی کے ذریعہ مال و دولت کمانے کی کوشش کرے گا وہ مفلس ہی رہے گا۔(۹۸)

امام ابو یوسفؒ کے مصنفات اور مولفات میں اگر تلاش اور استقصاء سے کام لیا جائے تو آپ کے ارشادات وکلمات جو اپنی معنویت، بلاغت، اثر آفرینی اور موقع ومحل کے لحاظ سے جاذب فکر ونظر ہیں بہت سے مل سکتے ہیں بلکہ اس سلسلہ میں ایک پوری کتاب مرتب ہوسکتی ہے ہم نے بسط وتفصیل کے بجائے ایجاز و اختصار کو ملحوظ رکھا ہے۔

☆☆☆☆☆

المراجع والمصادر باب دوم

(١) أبو الفداء إسماعيل بن عمر بن كثير القرشي البصرى ثم الدمشقي المتوفى 774 :هـج، "البداية والنهاية"، دار إحياء التراث العربى، 1408، هـ 1988 -م، صفحه /جلد١٠/١٨٠

(٢) محمد زاهد الكوثرى، "حسن التقاضى فى سيرة الإمام أبى يوسف القاضى" ، ایچ ایم سعید کمپنی ادب منزل پاکستان چوک کراچی، طبع ثانی صفحه /جلد٦

(٣) محمد زاهد الكوثرى، "حسن التقاضى فى سيرة الإمام أبى يوسف القاضى" ، ایچ ایم سعید کمپنی ادب منزل پاکستان چوک کراچی، طبع ثانی صفحه /جلد٩

(٤) أبو بكر أحمد بن على بن ثابت بن أحمد بن مهدى الخطيب البغدادى المتوفى463 :هجرى،"ـ تاريخ بغداد"،دار الغرب الإسلامى -بيروت،1422هـ 2002 -م،صفحه /جلد ٣٥٩/١

(٥) مفتی محمد شفیع عثمانی، "کشکول"، دارالاشاعت اردوبازار کراچی ،صفحه /جلد١٤٢

(٦) مؤفق بن احمد المكى، "مناقب موفق"،دائرة المعارف النظامية، ١٩٠٣ء، صفحه /جلد٤٦٩/٢

(٧) محمد بن محمد بن شهاب بن يوسف الكردرى البريقينى البزازى،"مناقب كردرى"،دائرة المعارف، صفحه /جلد٣٩٤/٢

(٨)مولوی فقیر محمد جهلمی ، " حدائق الحنفیه"،مکتبه ربیعه سلام مارکیٹ بنوری ٹاؤن کراچی ،صفحه /جلد١٤٤

(٩) محمد بن محمد بن شهاب بن يوسف الكردرى البريقينى البزازى،"مناقب كردرى"،دائرة المعارف، صفحه /جلد٢/ ٣٩٥،٣٩٤

(١٠) محمد زاهد الكوثرى، "حسن التقاضى فى سيرة الإمام أبى يوسف القاضى" ، ایچ ایم سعید کمپنی ادب منزل پاکستان چوک کراچی، طبع ثانی صفحه /جلد٨

(۱۱)أبو عبد الله محمد بن الحسن بن فرقد الشيباني المتوفى 189 :هـ،"الأصل المعروف بالمبسوط"،إدارة القرآن والعلوم الإسلامية -كراتشي، صفحه /جلد۳ /۱۲۸

(۱۲)أبو عمر يوسف بن عبد الله بن محمد بن عبد البر بن عاصم النمري القرطبي،"الانتقاء في فضائل الثلاثة الأئمة الفقهاء مالك والشافعي وأبي حنيفة رضي الله عنهم"دار الكتب العلمية -بيروت،صفحه /جلد ۲۵٦

(۱۳) شيخ زاهد الكوثري، "بلوغ الاماني"، ايچ ايم سعيد كمپنى كراچي،صفحه /جلد ۱٤

(۱٤) محمد زاهد الكوثري، "حسن التقاضي في سيرة الإمام أبي يوسف القاضي " ، ايچ ايم سعيد كمپنى ادب منزل پاكستان چوك كراچي، طبع ثاني صفحه /جلد ۱۵

(۱۵) محمد زاهد الكوثري، "حسن التقاضي في سيرة الإمام أبي يوسف القاضي " ، ايچ ايم سعيد كمپنى ادب منزل پاكستان چوك كراچي، طبع ثاني صفحه /جلد ٤٠

(۱٦)محمد زاهد الكوثري، "حسن التقاضي في سيرة الإمام أبي يوسف القاضي " ، ايچ ايم سعيد كمپنى ادب منزل پاكستان چوك كراچي، طبع ثاني صفحه /جلد ۱٦

(۱۷) محمد زاهد الكوثري، "حسن التقاضي في سيرة الإمام أبي يوسف القاضي " ، ايچ ايم سعيد كمپنى ادب منزل پاكستان چوك كراچي، طبع ثاني صفحه /جلد۱۷

(۱۸)محمد بن محمد بن شهاب بن يوسف الكردري البريقيني البزازي،"مناقب كردري "،دائرة المعارف، صفحه /جلد۲/۳٦۲

(۱۹)محمد انور شاه ,احمد رضا بجنوري، "مقدمه انوار الباري "، اداره تاليفات اشرفيه، ۱۳۵۲ه، صفحه /جلد۱۵۵

(۲۰) محمد زاهد الكوثري، "حسن التقاضي في سيرة الإمام أبي يوسف القاضي " ، ايچ ايم سعيد كمپنى ادب منزل پاكستان چوك كراچي، طبع ثاني صفحه /جلد۱۲

(۲۱) محمد زاهد الكوثري، "حسن التقاضي في سيرة الإمام أبي يوسف القاضي " ، ايچ ايم سعيد كمپنى ادب

منزل پاکستان چوك کراچی، طبع ثانی صفحه /جلد٥٨

(٢٢)محمد بن محمد بن شهاب بن یوسف الکردری البریقینی البزازی،"مناقب کردری "،دائرة المعارف، صفحه /جلد٢/٣٩٥

(٢٣) محمد زاهد الکوثری، "حسن التقاضی فی سیرة الإمام أبی یوسف القاضی " ، ایچ ایم سعید کمپنی ادب منزل پاکستان چوك کراچی، طبع ثانی صفحه /جلد٥٨

(٢٤)محمد بن محمد بن شهاب بن یوسف الکردری البریقینی البزازی،"مناقب کردری "،دائرة المعارف، صفحه /جلد٢/ ٣٩٦

(٢٥) محمد بن محمد بن شهاب بن یوسف الکردری البریقینی البزازی،"مناقب کردری "،دائرة المعارف، صفحه /جلد٢/ ٣٩٧

(٢٦) محمد زاهد الکوثری، "حسن التقاضی فی سیرة الإمام أبی یوسف القاضی " ، ایچ ایم سعید کمپنی ادب منزل پاکستان چوك کراچی، طبع ثانی صفحه /جلد١٩

(٢٧)محمد زاهد الکوثری، "حسن التقاضی فی سیرة الإمام أبی یوسف القاضی " ، ایچ ایم سعید کمپنی ادب منزل پاکستان چوك کراچی، طبع ثانی صفحه /جلد١٩

(٢٨)محمد زاهد الکوثری، "حسن التقاضی فی سیرة الإمام أبی یوسف القاضی " ، ایچ ایم سعید کمپنی ادب منزل پاکستان چوك کراچی، طبع ثانی صفحه /جلد١٩

(٢٩) محمد زاهد الکوثری، "حسن التقاضی فی سیرة الإمام أبی یوسف القاضی " ، ایچ ایم سعید کمپنی ادب منزل پاکستان چوك کراچی، طبع ثانی صفحه /جلد٤٩

(٣٠) محمد زاهد الکوثری، "حسن التقاضی فی سیرة الإمام أبی یوسف القاضی " ، ایچ ایم سعید کمپنی ادب منزل پاکستان چوك کراچی، طبع ثانی صفحه /جلد٣٦

(۳۱)مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، "سیر الصحابہ"، دارالاشاعت اردو بازار کراچی، ۲۰۰٤ء، صفحہ /جلد ۱۰۷/۸

(۳۲)سورۃ المائدہ:۳

(۳۳) محمد زاهد الكوثرى، "حسن التقاضى فى سيرة الإمام أبى يوسف القاضى"، ایچ ایم سعید کمپنی ادب منزل پاکستان چوک کراچی، طبع ثانی صفحہ /جلد۳٦

(۳٤)محمد بن محمد بن شهاب بن يوسف الكردرى البريقينى البزازى،"مناقب كردرى"،دائرة المعارف، صفحہ /جلد۱٦٤/۲

(۳۵) محمد زاهد الكوثرى، "حسن التقاضى فى سيرة الإمام أبى يوسف القاضى"، ایچ ایم سعید کمپنی ادب منزل پاکستان چوک کراچی، طبع ثانی صفحہ /جلد۳۲ تا ۳٤

(۳٦)ماهنامه الخير جامعه خير المدارس ملتان بابت رجب المرجب ۱٤۰۷ھ

(۳۷)سید مناظر احسن گیلانی، "امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی"، المیزان ۲۰۰٦،صفحہ /جلد٤۳٤

(۳۸)قاضى ابو يوسف يعقوب ابن ابراهيم و محمد نجات الله صديقى ،"اسلام کا نظام محاصل (ترجمہ کتاب الخراج)"،اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ،لاہور ،صفحہ /جلد۱۳۲

(۳۹) مؤفق بن احمد المكى، "مناقب موفق"،دائرة المعارف النظامية، ۱۹۰۳ء، صفحہ /جلد ۲/ ٤٤٤

(٤۰)مولوی فقیر محمد جہلمی ، " حدائق الحنفیہ"،مکتبہ ربیعہ سلام مارکیٹ بنوری ٹاؤن کراچی ،صفحہ /جلد۱٤٤

(٤۱) مؤفق بن احمد المكى، "مناقب موفق"،دائرة المعارف النظامية، ۱۹۰۳ء، صفحہ /جلد٤۹۷/۲

(٤۲)عبدالقیوم حقانی، "علمائے احناف کے حیرت انگیز واقعات"، القاسم اکیڈمی جامعہ ابو ہریرہ نوشہرہ، ۲۰۰۹ء، صفحہ /جلد ۸۸

(٤٣)مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، "سیر الصحابہ"، دارالاشاعت اردو بازار کراچی، ٢٠٠٤ء، صفحہ /جلد ٧٤/٨

(٤٤) محمد زاھد الکوثری، "حسن التقاضی فی سیرۃ الإمام أبی یوسف القاضی"، ایچ ایم سعید کمپنی ادب منزل پاکستان چوک کراچی، طبع ثانی صفحہ /جلد١٧

(٤٥)مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، "سیر الصحابہ"، دارالاشاعت اردو بازار کراچی، ٢٠٠٤ء، صفحہ /جلد ٨٥/٨

(٤٦) محمد زاھد الکوثری، "حسن التقاضی فی سیرۃ الإمام أبی یوسف القاضی"، ایچ ایم سعید کمپنی ادب منزل پاکستان چوک کراچی، طبع ثانی صفحہ /جلد٦٣

(٤٧)قاضی ابو یوسف یعقوب ابن ابراھیم و محمد نجات اللہ صدیقی ،"اسلام کا نظام محاصل (ترجمہ کتاب الخراج)"،اسلامك پبلیکیشنز لمیٹڈ ،لاھور ،صفحہ /جلد١٣٢

(٤٨)ماھنامہ الخیر جامعہ خیر المدارس ملتان بابت رجب المرجب ١٤٠٧ھ

(٤٩) محمد زاھد الکوثری، "حسن التقاضی فی سیرۃ الإمام أبی یوسف القاضی"، ایچ ایم سعید کمپنی ادب منزل پاکستان چوک کراچی، طبع ثانی صفحہ /جلد٥

(٥٠) محمد زاھد الکوثری، "حسن التقاضی فی سیرۃ الإمام أبی یوسف القاضی"، ایچ ایم سعید کمپنی ادب منزل پاکستان چوک کراچی، طبع ثانی صفحہ /جلد٥٠

(٥١) محمد زاھد الکوثری، "حسن التقاضی فی سیرۃ الإمام أبی یوسف القاضی"، ایچ ایم سعید کمپنی ادب منزل پاکستان چوک کراچی، طبع ثانی صفحہ /جلد١٦١

(٥٢) محمد زاھد الکوثری، "حسن التقاضی فی سیرۃ الإمام أبی یوسف القاضی"، ایچ ایم سعید کمپنی ادب منزل پاکستان چوک کراچی، طبع ثانی صفحہ /جلد١٥

(۵۳) عبد الرحمن بن علی بن محمد الجوزی،"کتاب الاذکیاء لابن جوزی"،مکتبة الغزالی،صفحه /جلد ۱۰٤/۲

(٥٤) محمد زاهد الكوثری، "حسن التقاضی فی سیرة الإمام أبی یوسف القاضی " ، ایچ ایم سعید کمپنی ادب منزل پاکستان چوک کراچی، طبع ثانی صفحه /جلد٥٤

(۵۵)محمد موسیٰ، "اثمار التکمیل"، مکتبه امدادیه ملتان، ۱۹۸۳ء،صفحه /جلد ۳۲/۱

(٥٦) محمد زاهد الكوثری، "حسن التقاضی فی سیرة الإمام أبی یوسف القاضی " ، ایچ ایم سعید کمپنی ادب منزل پاکستان چوک کراچی، طبع ثانی صفحه /جلد٤٥

(۵۷) مؤفق بن احمد المکی، "مناقب موفق "،دائرة المعارف النظامیة، ۱۹۰۳ء، صفحه /جلد ۴۷۹/۲

(۵۸)مولانا شاه معین الدین احمد ندوی، "سیر الصحابه " ، دارالاشاعت اردو بازار کراچی، ۲۰۰٤ء، صفحه /جلد ۸۵/۸

(۵۹)سورة الصاد:۲۳

(٦٠)مولانا شاه معین الدین احمد ندوی، "سیر الصحابه " ، دارالاشاعت اردو بازار کراچی، ۲۰۰٤ء، صفحه /جلد ۸۳/۸

(٦١) مؤفق بن احمد المکی، "مناقب موفق "،دائرة المعارف النظامیة، ۱۹۰۳ء، صفحه /جلد۴۸۰/۲

(٦٢)عبد القادر بن محمد بن نصر الله القرشی، أبو محمد، محیی الدین الحنفی المتوفی 775 :هجری، "الجواهر المضیة فی طبقات الحنفیة"، میر محمد کتب خانه -کراتشی، صفحه /جلد۵۲/۲

(٦٣)عبد القادر بن محمد بن نصر الله القرشی، أبو محمد، محیی الدین الحنفی المتوفی 775 :هجری، "الجواهر المضیة فی طبقات الحنفیة"، میر محمد کتب خانه -کراتشی، صفحه /جلد ۱٤٠/۲

(٦٤)مولانا شاه معین الدین احمد ندوی، "سیر الصحابه " ، دارالاشاعت اردو بازار کراچی، ۲۰۰٤ء، صفحه /جلد ۸۱/۸

(٦٥)مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، "سیر الصحابہ "، دارالاشاعت اردو بازار کراچی، ٢٠٠٤ء، صفحہ /جلد ٨٢/٨

(٦٦)مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، "سیر الصحابہ "، دارالاشاعت اردو بازار کراچی، ٢٠٠٤ء، صفحہ /جلد ٨٢/٨

(٦٧)محمد انور شاہ ,احمد رضا بجنوری، "مقدمہ انوار الباری "، ادارہ تالیفات اشرفیہ، ١٣٥٢ھ، صفحہ /جلد ١٧٨

(٦٨)محمد انور شاہ ,احمد رضا بجنوری، "مقدمہ انوار الباری "، ادارہ تالیفات اشرفیہ، ١٣٥٢ھ، صفحہ /جلد ١٧٨

(٦٩) محمد زاهد الکوثری، "حسن التقاضی فی سیرة الإمام أبی یوسف القاضی "، ایچ ایم سعید کمپنی ادب منزل پاکستان چوک کراچی، طبع ثانی صفحہ /جلد٥٤

(٧٠)عبد الحی بن أحمد بن محمد ابن العماد العکری الحنبلی، أبو الفلاح، "شذرات الذهب فی أخبار من ذهب "، دار ابن کثیر، - 1406 ،صفحہ /جلد٢/٣٧٠

(٧١)عبد الحی بن أحمد بن محمد ابن العماد العکری الحنبلی، أبو الفلاح، "شذرات الذهب فی أخبار من ذهب "، دار ابن کثیر، - 1406 ،صفحہ /جلد٢/٣٧١

(٧٢) محمد زاهد الکوثری، "حسن التقاضی فی سیرة الإمام أبی یوسف القاضی "، ایچ ایم سعید کمپنی ادب منزل پاکستان چوک کراچی، طبع ثانی صفحہ /جلد٣٠

(٧٣) محمد زاهد الکوثری، "حسن التقاضی فی سیرة الإمام أبی یوسف القاضی "، ایچ ایم سعید کمپنی ادب منزل پاکستان چوک کراچی، طبع ثانی صفحہ /جلد٣٠

(٧٤)مولوی فقیر محمد جہلمی، " حدائق الحنفیہ "،مکتبہ ربیعہ سلام مارکیٹ بنوری ٹاؤن کراچی ،صفحہ

/جلد١٤٤

(٧٥)محمد بن محمد بن شهاب بن يوسف الكردرى البريقينى البزازى،"مناقب كردرى "،دائرة المعارف، صفحه /جلد١٦٣/٢

(٧٦) محمد زاهد الكوثرى، "حسن التقاضى فى سيرة الإمام أبى يوسف القاضى " ، ايچ ايم سعيد كمپنى ادب منزل پاكستان چوك كراچى، طبع ثانى صفحه /جلد٢٤

(٧٧) محمد زاهد الكوثرى، "حسن التقاضى فى سيرة الإمام أبى يوسف القاضى " ، ايچ ايم سعيد كمپنى ادب منزل پاكستان چوك كراچى، طبع ثانى صفحه /جلد٢٨

(٧٨)مولانا شاه معين الدين احمد ندوى، "سير الصحابه " ، دارالاشاعت اردو بازار كراچى، ٢٠٠٤ء، صفحه /جلد ٨٧/٨

(٧٩) محمد بن محمد بن شهاب بن يوسف الكردرى البريقينى البزازى،"مناقب كردرى "،دائرة المعارف، صفحه /جلد١٦٢/٢

(٨٠)مولانا شاه معين الدين احمد ندوى، "سير الصحابه " ، دارالاشاعت اردو بازار كراچى، ٢٠٠٤ء، صفحه /جلد ٧٥/٨

(٨١)عبد القادر بن محمد بن نصر الله القرشي، أبو محمد، محيي الدين الحنفي المتوفى775 :هجرى، "الجواهر المضية في طبقات الحنفية"، مير محمد كتب خانه -كراتشي، صفحه /جلد ٢٢١/٢

(٨٢) مؤفق بن احمد المكى، "مناقب موفق "،دائرة المعارف النظامية، ١٩٠٣ء، صفحه /جلد٤٨٣/٢

(٨٣) مؤفق بن احمد المكى، "مناقب موفق "،دائرة المعارف النظامية، ١٩٠٣ء، صفحه /جلد ٤٨٣/٢

(٨٤)أبو بكر أحمد بن علي بن ثابت بن أحمد بن مهدي الخطيب البغدادي المتوفى 463 :هجرى،"- تاريخ بغداد"،دار الغرب الإسلامي -بيروت،1422هـ 2002 م،صفحه /جلد٦٢٥/١٥

(۸۵)محمد انور شاہ ,احمد رضا بجنوری، ''مقدمہ انوار الباری ''، ادارہ تالیفات اشرفیہ، ۱۳۵۲ھ، صفحہ /جلد ۱۷۱

(۸٦) محمد زاهد الكوثری، ''حسن التقاضی فی سیرة الإمام أبی یوسف القاضی '' ، ایچ ایم سعید کمپنی ادب منزل پاکستان چوک کراچی، طبع ثانی صفحہ /جلد۲۹

(۸۷)محمد زاهد الكوثری، ''حسن التقاضی فی سیرة الإمام أبی یوسف القاضی '' ، ایچ ایم سعید کمپنی ادب منزل پاکستان چوک کراچی، طبع ثانی صفحہ /جلد۷٤

(۸۸) محمد زاهد الكوثری، ''حسن التقاضی فی سیرة الإمام أبی یوسف القاضی '' ، ایچ ایم سعید کمپنی ادب منزل پاکستان چوک کراچی، طبع ثانی صفحہ /جلد۲۳

(۸۹)أبو بكر أحمد بن علی بن ثابت بن أحمد بن مهدی الخطيب البغدادی المتوفی463 :هجری،''۔ تاریخ بغداد''،دار الغرب الإسلامی -بیروت،1422هـ 2002 م،صفحہ /جلد۳۷۲/۱٦

(۹۰) مؤفق بن احمد المکی، ''مناقب موفق ''،دائرة المعارف النظامیة، ۱۹۰۳ء، صفحہ /جلد ۲۴٤/۲

(۹۱) محمد زاهد الكوثری، ''حسن التقاضی فی سیرة الإمام أبی یوسف القاضی '' ، ایچ ایم سعید کمپنی ادب منزل پاکستان چوک کراچی، طبع ثانی صفحہ /جلد۵۷

(۹۲) محمد زاهد الكوثری، ''حسن التقاضی فی سیرة الإمام أبی یوسف القاضی '' ، ایچ ایم سعید کمپنی ادب منزل پاکستان چوک کراچی، طبع ثانی صفحہ /جلد۵۷ -

(۹۳) مؤفق بن احمد المکی، ''مناقب موفق ''،دائرة المعارف النظامیة، ۱۹۰۳ء، صفحہ /جلد۲/ ۸۲

(۹٤) مؤفق بن احمد المکی، ''مناقب موفق ''،دائرة المعارف النظامیة، ۱۹۰۳ء، صفحہ /جلد۲/ ۸۲

(۹۵)مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، ''سیر الصحابہ '' ، دارالاشاعت اردو بازار کراچی، ۲۰۰٤ء، صفحہ /جلد۱۱۳/۸

(٩٦)أبو العباس شمس الدين أحمد بن محمد بن إبراهيم بن أبي بكر ابن خلكان البرمكي الإربلي ،"وفيات الأعيان وأنباء أبناء الزمان"،دار صادر -بيروت،صفحه /جلد٦ /٢٨٨

(٩٧) مولوی فقیر محمد جهلمی ، " حدائق الحنفیه "،مکتبه ربیعه سلام مارکیٹ بنوری ٹاؤن کراچی ،صفحه /جلد ١٠٦

(٩٨)مولانا شاه معین الدین احمد ندوی، "سیر الصحابه " ، دارالاشاعت اردو بازار کراچی، ٢٠٠٤ء، صفحه /جلد ١١٤/٨

☆

باب سوم

☆☆☆

امام ابو یوسف کا فقہی مقام

☆

﴿بسم اللہ الرحمان الرحیم﴾

باب سوم

امام ابو یوسفؒ کا فقہی مقام

عموماً مجتہدین کی دو قسم مانی جاتی ہے، ایک مجتہد مطلق غیر منتسب (اگر مجتہد مطلق غیر منتسب کا مطلب یہ ہے کہ ان کا اجتہاد کسی کے فیض ترتیب کا امر ہوں منسب بھی ہے تو پھر اسی لحاظ سے مجتہد مطلق غیر منتسب تو سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا، مجتہد مطلق منتسب کی تعریف میں ائمہ اربعہ داخل ہو سکتے ہیں، مگر عام طور پر ائمہ اربعہ کو پہلی قسم میں شمار کیا گیا ہے، حالانکہ ان ائمہ میں سے ہر ایک کسی نہ کسی صحابی یا تابعی کی طرف منتسب ہے) دوسرے مجتہد منتسب مطلق یا مجتہد مطلق مقید بمذہب، متاخرین علمائے احناف کی کتابوں میں ائمہ مجتہدین اور اصحاب فتاویٰ کے درجات کی جو تقسیم کی گئی ہے اس میں یہ کہا گیا ہے کہ امام ابو یوسف امام محمد وغیرہ مجتہد مطلق نہیں، بلکہ مجتہد فی المذہب تھے، مجتہد مطلق سے مراد یہ ہے کہ جن لوگوں نے کتاب وسنت سے براہِ راست اجتہاد کے اصول مرتب کیے اور اس سے تفریع مسائل کی، جیسے ائمہ اربعہ تھے، مجتہد فی المذہب یا مجتہد منتسب ان کو کہتے ہیں کہ جنہوں نے ان ائمہ کے مرتب کردہ اصول کی روشنی مسائل کی تخریج کی، جیسے امام ابو یوسف رحمہ اللہ، امام محمد اور دوسرے ائمہ کے مشہور تلامذہ، بعض فقہ وتذکرہ کی کتابوں میں یہ بھی درج ہے کہ صاحبین فرماتے تھے کہ ہم نے امام صاحب سے جہاں اختلاف کیا ہے اور ان کے قول کو مرجوع قرار دیا ہے، وہ بھی امام صاحب ہی کا قدیم قول تھا، جسے انہوں نے مرجوح سمجھ کر ترک کر دیا تھا، اسی طرح کے اور بھی اقوال منقول ہیں، جن سے ان کا مجتہد مقید بہ مذہب ہونا معلوم ہوتا ہے، مگر یہ کہنا بڑا ظلم ہے کہ صاحبین امام صاحب کے مقلد محض تھے، حالانکہ وہ خود امام اور مجتہد مطلق تھے، یہ ان کی احسان شناسی ہے کہ انہوں نے اپنی ذات کو پنے اساتذہ سے بے نیاز کر کے دنیا کے سامنے پیش نہیں کیا، حالانکہ وہ کر سکتے تھے، پھر امام ابو یوسف کو اور امام محمد کو اجتہاد واستنباط میں ائمہ ثلاثہ امام

مالک، امام شافعی اور امام احمد سے گھٹانا اور کم رتبہ قرار دینا بھی بڑی زیادتی ہے، جب کہ خود ان ائمہ اور ان کے مشہور تلامذہ نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ یہ لوگ اجتہاد واستنباط میں ان سے کسی طرح کم نہ تھے، ہم پہلے مختصراً اجتہاد واستنباط کی تعریف اس کے اصول وشرائط پر بحث کرتے ہیں، تاکہ اندازہ ہو جائے کہ یہ ائمہ فقہ خصوصیت سے امام ابو یوسف مجتہد مطلق تھے یا مجتہد منتسب، اجتہاد کی تعریف علماء نے یہ کی ہے:

هواستفراغ المجهود في استنباط الحكم الفرعي عن دليله.

ترجمہ: اصل سے کسی فروعی سلسلہ کے استنباط میں اپنی وسعت بھر کوشش کرنے کا نام اجتہاد ہے۔

اجتہاد کے اصول وشرائط کیا ہونے چاہیں، اس میں مختلف رائیں ہیں، جو چیزیں سب میں مشترک ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) کتاب اللہ کا عالم ہو، یعنی قرآن کے لغوی اور شرعی معانی سے واقف ہو، اس کے طرزِ کلام کو جانتا ہو، افراد وترکیب اور ناسخ ومنسوخ پر اس کی نظر ہو۔

(۲) سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اسے درک ہو، یعنی روایات کی سند اور ان کی متون سے واقف ہو، بعض لوگوں نے قرآن کی آیات اور احادیث کی تعداد پر بھی بحث کی ہے، یعنی یہ کہ مجتہد کے لیے کتنی آیتوں اور حدیثوں میں بصیرت پیدا کرنا ضروری ہے، مگر یہ بحث فضول ہے، مجتہد کے لیے پورے قرآن اور احادیث کے تمام متداول ذخیروں پر نظر رکھنی ضروری ہے۔

(۳) اجماع کے موارد اور مواقع سے واقف ہو۔

(۴) قیاس کے شرعی طریقوں سے واقف ہو۔

ان شرائط کو سامنے رکھیے اور پھر امام ابو یوسف کے علم وفضل اور کتاب وسنت آثار صحابہ اور تعدیل صحابہ سے ان کی واقفیت کا جو ذکر اوپر کیا گیا ہے، اس پر ایک نظر ڈالیے اور دیکھئے کہ کیا ان کے مجتہد مطلق قرار دینے کے لیے وہ کافی نہیں ہے؟

اس تفصیل کو سمجھنے کے لئے فقہ و اصول فقہ کی تاریخ و تدوین کا سمجھنا ضروری ہے، لہٰذا اس کی کچھ تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

فقہ کی لغوی تعریف

فقہ کے لغوی معنی کسی بات کو جاننے اور سمجھنے کے ہیں، قرآن مجید میں کم سے کم دو موقعوں پر یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے(۱) اس مناسبت سے احکامِ شرعیہ کے علم کو بھی فقہ سے تعبیر کیا گیا۔

فقہ کی اصطلاحی تعریف

ابتداءً شریعت کے تمام احکام کے جاننے کو فقہ کہا جاتا تھا، خواہ عقائد ہوں یا اخلاق اور عبادات ہوں یا معاملات، لیکن اب فقہ میں صرف عملی احکام باقی رہ گئے، جو محض اخلاقی حیثیت کے حامل نہیں، بلکہ قانونی حیثیت رکھتے ہیں اور اس لحاظ سے فقہ کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی:

"العلم بالاحکام الشرعية عن ادلتها التفصيلية"(۲)

تفصیلی دلائل سے شرعی احکام کو جاننے کا نام فقہ ہے۔

"شرعی احکام" سے مکلّف کے افعال پر شریعت کی جانب سے جو حکم اور صفت مرتب ہوتی ہے وہ مراد ہے، جیسے کسی عمل کا فرض، واجب، مستحب یا مباح یا اسی طرح حرام و مکروہ ہونا اور تفصیلی دلائل کا مطلب یہ ہے کہ یہ مسئلہ کس دلیل شرعی پر مبنی ہے، کتاب اللہ پر، سنت رسول پر، اجماع پر، یا قیاس وغیرہ پر، اسی طرح حکم اور دلیل کے درمیان ارتباط کو جاننا بھی فقہ میں شامل ہے۔

ضرورت فقہ

انسان کی مکمل زندگی میں عقائد، عبادات، معاملات اور معاشرت وغیرہ سے متعلق شرعی احکام و مسائل ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں، قرآن، حدیث اور صحابہ وغیرہ کے اقوال میں بکھرے پڑے ہیں، اب ہر انسان یہ چاہتا ہے کہ میں ہر مسئلہ بلاواسطہ قرآن، حدیث اور آثار صحابہ وغیرہ سے خود ہی تلاش

کرلوں گا یہ ناممکن اور بے حد دشوار ہے اس کے ناممکن ہونے کی وجوہات بہت ساری ہیں مثلاً:

(۱)　انسان کی اپنی اپنی لامتناہی مصروفیات

(۲)　شریعت کے تمام احکام عربی زبان میں ہیں اور ہر انسان عربی زبان سے واقف نہیں ہوتا اور ہوتا بھی ہے تو اس کے معانی مختلف ہونے کی وجہ سے صحیح معنی تک اس کا پہنچنا دشوار ہوتا ہے۔

(۳)　شریعت کے بعض احکام ایسے ہیں جو آیات قرآنی اور احادیثِ صحیحہ سے صراحتاً ثابت ہیں لیکن بعض احکام ایسے ہیں کہ جن میں کسی قدر ابہام و اجمال ہے اور بعض آیات و احادیث ایسی ہیں جو چند معانی کا احتمال رکھتی ہیں اور کچھ احکام ایسے ہیں جو بظاہر قرآن کی کسی دوسری آیت یا کسی دوسری حدیث سے متعارض معلوم ہوتے ہیں تو وہاں اجتہاد و استنباط سے کام لینا پڑتا ہے اور خود زبان نبوت سے اس کی تائید و تصویب بھی ہوتی ہے (۳) اور اجتہاد و استنباط ہر ایک کے بس کی بات نہیں، ایسے موقع پر عمل کرنے والے کے لیے الجھن اور دشواری یہ پیدا ہوتی ہے کہ وہ اپنا عمل شریعت کے مطابق کیسے بنائے؟ کس پر عمل کرے اور کونسا راستہ اختیار کرے؟ اسی الجھن کی وجہ سے خود صحابہ کرام حضور ﷺ کی موجودگی میں بلا واسطہ نبی قرآن کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے تھے بلکہ کچھ خاص صحابہ کرام حضور ﷺ کے پاس جا کر قرآنی تعلیمات مستقل طور پر سمجھا کرتے تھے۔(۴)

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہر شخص قرآن و حدیث سے بغیر کسی واسطے کے کوئی مسئلہ اپنے لیے تجویز نہیں کرتا تھا بلکہ جو عالم صحابہ کرام تھے ان سے مسئلہ معلوم کر کے عمل کیا کرتا تھا اسی طرح ہر زمانہ میں ہوتا رہا۔

بہر حال بعض حضرات ہر زمانے میں ایسے رہے جو قرآن و حدیث کے علوم میں ماہر، فہم و بصیرت میں اعلیٰ، تقویٰ اور طہارت میں فائق اور حافظہ و ذکاوت میں اوقع تھے لوگ ان ہی سے مسائل معلوم کر کے عمل کرتے اور اپنی فہم و بصیرت پر بالکل اعتماد نہیں کرتے تو اور اگر ہر کوئی خود ہی اپنے مسئلہ کو قرآن و حدیث میں

تلاش کرنے لگے تو گویا ایسا ہی ہو جائے گا جیسے کہ ہر شخص اپنے مرض کا علاج خود ہی طبی کتابوں میں تلاش کر لے ڈاکٹر وغیرہ کی اس کو ضرورت ہی نہیں اگر ایسا ہوا تو کیا ہر مریض اپنے مرض کا علاج ان کتابوں میں تلاش کر پائے گا؟ ہر گز نہیں، بالکل اسی طرح دینی وشرعی مسئلہ کو سمجھیں کہ اس کا حل ہر کوئی نہیں کر سکتا۔

بہر حال جو لوگ قرآن وحدیث کو مکمل طور پر سمجھے ہیں اور اپنی مکمل زندگی کو مسائل کے حل کرنے اور قرآن وحدیث کے مطابق اس کو ڈھالنے میں وقف کر دیا اور ہر مسئلہ کا جواب قرآن وحدیث اور اس کے مطابق اصول کی روشنی میں بتایا ان میں مقبول چار حضرات کے مکاتب فکر ہوئے ہیں جن کے نام یہ ہیں، حضرت امام ابوحنیفہ، حضرت امام شافعی، حضرت امام مالک اور حضرت امام احمد بن حنبل، ان حضرات کے بعد ان کے شاگرد حضرات ہر ایک کا مسئلہ قرآن وحدیث اور ان حضرات کے بتائے ہوئے اصول کے مطابق بتلایا کرتے تھے اسی طرح یہی معمول اب تک چلا آیا اور آئندہ بھی چلتا رہے گا (انشاء اللہ)۔

ان چاروں حضرات نے مسائل کے حل کرنے میں جو طرز عمل اختیار فرمایا وہ اس طرح ہے۔

فقہ اسلامی کے مصادر

چونکہ اسلامی نقطۂ نظر سے قانون کا اصل سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک ہے، اس لیے تمام قوانین کا رشتہ بہر حال اللہ تعالیٰ ہی سے ہے، البتہ بعض احکام کی نسبت صراحتاً اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہے اور بعض احکام قرآن وحدیث سے ثابت ہونے والے اصول وقواعد کی روشنی میں اہلِ علم نے استنباط کیے ہیں، ان کی بھی بالواسطہ اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کی جا سکتی ہے، فرق یہ ہے کہ پہلا ذریعہ معصوم ہے، اگر قرآن وحدیث سے اس کا ثبوت یقینی ہو تو اس میں غلطی کا احتمال نہیں اور دوسرا ذریعہ معصوم نہیں، کیونکہ اس میں انسانی اجتہاد کو دخل ہے اور انسان کی سوچ غلط بھی ہو سکتی ہے، اس طرح فقہ اسلامی کے مصادر کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) نصوص (۲) اجتہاد کے دوسرے مسائل۔

منصوص مصادر

فقہ اسلامی کے منصوص مصادر چار ہیں:

(۱) کتاب اللہ.

(۲) سنت رسول اللہ.

(۳) شرائع ماقبل.

(۴) جن مسائل میں اجتہاد کی گنجائش نہ ہوان میں صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے آثار۔

کتاب اللہ

کتاب اللہ سے مراد قرآن مجید ہے، جو بے کم وکاست محفوظ ہے اور قیامت تک رہے گا، قرآن مجید میں فقہی احکام سے متعلق آیات کی تعداد لوگوں نے دوڈھائی سو سے لیکر پانچ سو تک لکھی ہے، پانچ سو کی تعداد اس لحاظ سے ہوسکتی ہے کہ قرآن سے ثابت ہونے والے صریح احکام کے علاوہ اصولی احکام کو بھی شامل کرلیا جائے، صریح حکم کی مثال: جیسا کہ اللہ تعالی نے کھانے کی حرام چیزوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

"حُرِّمَت عَلَيكُمُ المَيتَةُ وَالدَّمُ وَلَحمُ الخِنزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيرِ اللّهِ بِهِ وَالمُنخَنِقَةُ وَالمَوقُوذَةُ وَالمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ إِلاَّ مَا ذَكَّيتُم وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَأَن تَستَقسِمُوا بِالأَزلاَمِ ذَلِكُم فِسقٌ اليَومَ يَئِسَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن دِينِكُم فَلاَ تَخشَوهُم وَاخشَونِ اليَومَ أَكمَلتُ لَكُم دِينَكُم وَأَتمَمتُ عَلَيكُم نِعمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الإِسلاَمَ دِيناً فَمَنِ اضطُرَّ فِي مَخمَصَةٍ غَيرَ مُتَجَانِفٍ لِّإِثمٍ فَإِنَّ اللّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ"(۵)

تم پر مردار جانور اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جانور حرام کردیا گیا ہے جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا گیا ہو اور وہ جو گلا گھٹنے سے مرا ہو اور جسے چوٹ مار کر ہلاک کیا گیا ہو اور جو اوپر سے گر کر مرا ہو اور جسے کسی جانور نے سینگ مار کر ہلاک کیا ہو اور جسے کسی درندے نے کھالیا ہو، اِلاَّ یہ کہ تم (اس کے مرنے سے

پہلے) اس کو ذبح کر چکے ہو اور وہ (جانور بھی حرام ہے) جسے بتوں کی قربان گاہ پر ذبح کیا گیا ہو اور یہ بات بھی (تمہارے لیے حرام ہے) کہ تم جوے کے تیروں سے (گوشت وغیرہ) تقسیم کرو، یہ ساری باتیں سخت گناہ کی ہیں۔

سنت رسول

احکامِ شرعیہ کا دوسرا ماخذ سنت رسول ہے، سنت رسول سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات، آپ ﷺ کا عمل نیز وہ قول و فعل ہے جو آپ کے سامنے آیا ہو اور آپ نے اس پر نکیر نہیں فرمائی ہو، سنت کے حجت ہونے پر امت کا اجماع و اتفاق ہے، کیونکہ قرآن مجید میں کثرت سے مستقل طور پر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، فرمایا گیا کہ رسول کی اطاعت دراصل اللہ کی اطاعت ہے، مَّن يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَد أَطَاعَ اللّهَ "(٦) نیز اللہ تعالیٰ کا واضح ارشاد ہے:

"وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُم عَنهُ فَانتَهُوا"(٧)

رسول جو کچھ لائے اسے قبول کرو اور جس سے منع کر دے اس سے رک جاؤ۔

نیز سنت رسول اصل میں قرآن مجید کی تفسیر و توضیح ہے، اسی لیے امام شافعی رحمہ اللہ علیہ نے فرمایا:

حضور ﷺ کی سنتیں تین طرح کی ہیں، یا تو قرآن میں جو حکم ہے وہی سنت رسول میں بھی ہے، یا قرآن میں کوئی حکم مجمل ہے اور سنت نے اس کو واضح کر دیا ہے، یا قرآن مجید اس سلسلہ میں خاموش ہے اور سنت کے ذریعہ اس صورت کا حکم معلوم ہوتا ہے۔(٨)

لیکن غور کیا جائے تو یہ صورت بھی قرآن مجید کے بتائے ہوئے اصولوں کے دائرہ میں آتی ہے، گویا قرآن نے ایک اصول بیان کر دیا اور سنت کے ذریعہ اس کی تطبیق اور عملی صورتگری سامنے آگئی، اس لیے امام اوزاعی نے فرمایا کہ بیان وضاحت اور فہم مراد کے اعتبار سے قرآن کو حدیث کی حاجت زیادہ ہے، بمقابلہ اس حاجت کے جو حدیث کو قرآن کی ہے:

"الكتاب أحوج إلى السنة من السنة إلى الكتاب".(۹)

حقیقت یہ ہے کہ فقہی اعتبار سے احادیث کی بڑی اہمیت ہے، قرآن مجید ایک دستوری کتاب ہے، جس میں اصولی احکام دیئے گئے ہیں اور دین کے حدود دِاربعہ کو متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے، حدیث کے ذریعہ ان قرآنی احکام کی عملی تصویر سامنے آجاتی ہے اوراس طرح اہل ہوس کے لیے قرآن کے معنوں میں الٹ پھیر، تحریف اور من چاہی تاویل کا دروازہ بند ہوجاتا ہے، جہاں حفاظ اور قاریوں کے ذریعہ الفاظِ قرآن کی حفاظت کا غیبی انتظام ہوا ہے، وہیں معنوی تحریف اور آمیزش سے حفاظت کا سروسامان حدیث کے ذریعہ انجام پایا ہے، اس طرح احادیث قرآن مجید کی معنوی حفاظت کا ذریعہ ہیں، ایسے قرآنی حکم کی مثال جس کو عملی شکل حدیث نے دی ہے یہ کہ اللہ تعالی نے قرآن مجید میں "أَقِيمُوا الصَّلاةَ" اور "وَيُقِيمُونَ الصَّلاةَ" کے ذریعہ نماز کا حکم بارہا فرمایا، لیکن اس کے ادا کرنے کا طریقہ احادیث میں اللہ کے رسول ﷺ نے بتلایا۔

آثارِ صحابہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس دین کو براہِ راست حضرات صحابہ نے حاصل کیا ہے اور انہی کے واسطہ سے یہ دین پوری امت تک پہنچا ہے، صحابہ سب کے سب عادل، معتبر، خداترس اور مخلص تھے، لہٰذا ان کے اقوال اور آراء کی خاص اہمیت ہے، بعض مسائل تو ایسے ہیں جن میں رائے اور اجتہاد کی گنجائش ہے اور بعض مسائل وہ ہیں جسے کوئی شخص اپنے اجتہاد سے اخذ نہیں کرسکتا، بلکہ لازماً ان کی بنیاد قرآن وحدیث ہی پر ہوگی، اس دوسرے قسم کے مسائل میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی رائے احناف و مالکیہ کے نزدیک حجت اور دلیل ہے، اس لیے کہ ان کی رائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوئی کسی بات پر ہی مبنی ہوگی، گویا یہ بھی حدیث ہی کے درجہ میں ہے، جیسا کہ جمعہ میں اذانِ ثانیہ کے سلسلہ میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی رائے کو لیا گیا۔

شرائع ماقبل

تمام پیغمبروں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے جو دین بھیجا ہے وہ ایک ہی دین ہے، اعتقادی اور اخلاقی احکام

میں ان کے درمیان کوئی فرق نہیں پایا جاتا ہے، اس لیے کہ اس کا سرچشمہ ایک ہی ذات ہے اور اگر عقیدہ واخلاق کی ہدایت میں کوئی فرق پایا جاتا ہو تو یقینی طور پر یہ انسانی تحریفات اور آمیزش کا نتیجہ ہے، البتہ "عملی زندگی" کے احکام جو فقہ کا اصل موضوع ہے، مختلف شریعتوں میں مختلف رہے ہیں، کیونکہ انسانی تمدن کے مرحلہ بہ مرحلہ ارتقاء کا تقاضہ یہی تھا، پہلی قسم کے احکام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحاً وَالَّذِي أَوحَينَا إِلَيكَ وَمَا وَصَّينَا بِهِ إِبرَاهِيمَ وَمُوسَى وَعِيسَى أَن أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ"(۱۰)

اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے واسطے وہی دین مقرر کیا جس کا اس نے نوح (علیہ السلام) کو حکم دیا تھا اور جس کو ہم نے آپ کے پاس وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے اور جس کا ہم نے ابراہیم وموسی (علیہ السلام) کو (مع ان سب کے اتباع کے) حکم دیا تھا (اور ان کی امم کو یہ کہا تھا) کہ اس دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔

دوسری قسم کے احکام کے بارے میں ارشاد ہے:

"لِكُلٍّ جَعَلنَا مِنكُم شِرعَةً وَمِنهَاجاً"(۱۱)

تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے ایک (خاص) شریعت اور راہ رکھی ہے۔

اس پس منظر میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ گذشتہ شریعتوں کے احکام کی کیا حیثیت ہوگی، اس سلسلہ میں اہل علم نے جو گفتگو کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ پچھلی کتابوں میں جو احکام آئے ہیں وہ چار طرح کے ہیں، اول وہ احکام جن کا قرآن وحدیث میں کوئی ذکر نہیں ہے، بالاتفاق اس امت میں وہ احکام قابل عمل نہیں ہیں، دوسرے وہ احکام جن کا قرآن وحدیث میں ذکر آیا ہے اور یہ بات بھی واضح کردی گئی ہے کہ یہ حکم سابقہ امت کے لیے تھا، اس امت میں یہ حکم باقی نہیں بلکہ منسوخ ہو چکا ہے، اس کے بارے میں بھی کوئی اختلاف نہیں کہ امت محمدیہ میں اس حکم پر عمل نہیں کیا جائے گا، تیسرے وہ احکام ہیں جو قرآن وحدیث میں وارد ہوئے ہیں اور یہ بھی بتادیا گیا کہ یہ احکام اس امت کے لیے بھی ہیں، بالاتفاق اس شریعت میں بھی ان احکام پر عمل کیا جائے

گا، چوتھے وہ احکام ہیں جن کو قرآن وحدیث نے پچھلی قوموں کی نسبت سے بیان کیا ہے، لیکن اس بات کی وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ اس امت کے لیے یہ حکم باقی ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں دو نظریہ ہیں، ایک تو یہ ہے کہ اس امت کے لیے بھی یہ حکم باقی ہے، احناف اسی کے قائل ہیں اور دوسرا نظریہ یہ ہے کہ اس امت کے لیے یہ حکم باقی نہیں۔ (۱۲)

لیکن یہ اختلاف عملی اعتبار سے زیادہ اہم نہیں ہے، کیونکہ عملاً شاید ہی کسی مسئلہ میں اس کی وجہ سے اختلاف رہا ہو، شرائع ماقبل جو منسوخ نہیں ہوئی ہیں وہ کتاب اللہ میں داخل ہیں، ایسا حکم جو ماقبل شریعتوں میں بھی تھا اور اس کو شریعتِ محمدیہ میں بھی رکھا گیا، جیسا کہ روزوں کی فرضیت، کہ پہلی شریعتوں میں بھی روزہ فرض تھا اور اب بھی فرض ہے۔

غیر منصوص مصادر

اجماع

جن شرعی دلائل کا ماخذ انسانی اجتہاد ہے ان میں سب سے قوی اجماع ہے، اجماع سے مراد کسی رائے پر رسول اللہ کی وفات کے بعد امت کے مجتہدین کا متفق ہو جانا، کیونکہ رسول اللہ نے ارشاد فرمایا کہ: یہ امت کسی غلط بات پر متفق نہیں ہو سکتی، گویا امت کے افراد کے انفرادی اجتہاد میں تو خطا کا احتمال ہے، لیکن اجتماعی حیثیت میں وہ معصوم ہیں اور کسی غلط بات پر متفق نہیں ہو سکتے۔

اجماعی احکام میں کچھ تو وہ ہیں جن کی بنیاد احادیث پر ہے، یعنی ایک حکم خبر واحد سے ثابت ہوا اور بعد کو تمام فقہاء اس پر متفق ہو گئے، اس طرح اس مسئلہ پر اجماع منعقد ہو گیا اور اجماع کی وجہ سے اس حکم نے قطعی اور یقینی حکم کا درجہ حاصل کر لیا اور کچھ احکام وہ ہیں جن کی بنیاد قیاس و مصلحت پر ہے اور اس میں اجتہاد اور ایک سے زیادہ نقطہ نظر کی گنجائش ہے۔

اس طرح کے احکام میں زیادہ تر اجماع کا انعقاد عہدِ صحابہ میں ہوا ہے، کیونکہ اس عہد میں تمام

مجتہدین کی آراء سے واقف ہونا آسان تھا، خاص کر سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے اجتماعی غور وفکر اور شورائی اجتہاد کا خاص ذوق عطا فرمایا تھا، اس لیے ان کے عہد میں نسبتاً زیادہ اجماع منعقد ہوئے، جیسا کہ تراویح بیس رکعات باجماعت پڑھنے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اجماع ہوا۔

قیاس

غیر منصوص مصادر میں سے ایک قیاس بھی ہے، قیاس کے اصل معنی ایک چیز کو دوسری چیز کے برابر کرنے کے ہیں۔

کسی مسئلہ کے سلسلے میں قرآن وحدیث کی صراحت موجود نہ ہو لیکن قرآن وحدیث میں اس سے ملتا جلتا کوئی مسئلہ موجود ہو اور اس مسئلہ میں اللہ اور رسول کے حکم کی جو وجہ ہو سکتی ہو وہ اس مسئلہ میں بھی موجود ہو چنانچہ یہاں بھی وہی حکم لگا دیا جائے، اس کو قیاس کہتے ہیں۔

غور کیا جائے تو قیاس قرآن وحدیث کے مقابلہ میں دی جانے والی رائے نہیں ہے، بلکہ قیاس کے ذریعہ قرآن وحدیث کے حکم کے دائرہ کو وسیع کیا جاتا ہے۔

جن مسائل کی بابت نص موجود نہ ہو ان میں قیاس پر عمل کیا جائے گا، یہ بات تقریباً متفق علیہ ہے، شرعی دلیلوں میں قیاس کو چوتھے درجہ پر رکھا گیا ہے، لیکن حدیث وقیاس یہ دونوں ایسے مصادر ہیں جن سے بیشتر فقہی احکام متعلق ہیں اور معاملات کے احکام کی بنیاد تو بڑی حد تک قیاس ہی پر ہے، اس لحاظ سے یہ نہایت اہم ماخذ ہے، جیسا کہ شراب کی حرمت کی علت نشہ اور سکر کو نکال کر افیون، گانجہ وغیرہ کو نشہ کی وجہ سے حرام قرار دیا گیا۔

دوسرے دلائل

ان دونوں کے علاوہ کچھ اور غیر منصوص مصادر ہیں جن سے وقتاً فوقتاً فقہ اسلامی میں مدد لی جاتی ہے، مثلاً: استحسان، مصالح مرسلہ، استصحاب، عرف اور ذریعہ ان کی تفصیل ذیلی مضامین میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

فقہ اسلامی کا امتیاز

جامعیت و ہمہ گیری

فقہ اسلامی کو جو باتیں انسان کے خود ساختہ قوانین سے ممتاز کرتی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس میں جامعیت و ہمہ گیری پائی جاتی ہے کہ یہ تمام انسانوں کی ضروریات کو پوری طرح حاوی (گھیرے ہوئے) ہے اور ان کی زندگی اور زندگی کے ہر حال کے متعلق مرتب و جامع نظام پیش کرتی ہے، جو انسان کی شخصی زندگی، عائلی زندگی، قبائلی و شہری زندگی اور ظاہری و روحانی زندگی کے ہر پہلو سے اس کی رہبری کرتی ہے، وہ صرف اجتماعی و سیاسی زندگی ہی تک محدود نہیں، بلکہ وہ انسان کی انفرادی و شخصی زندگی کے اصول بھی سکھاتی ہے، معاملہ عقائد و عبادات کا ہو، اخلاق و تمدن کا ہو، سیاست و حکومت کا ہو، ملازمت و تجارت کا ہو، تعلیم و تربیت کا ہو، شادی بیاہ کا ہو، سیر و تفریح اور غم و مصیبت کا ہو، غرض یہ کہ انسانی زندگی سے متعلق جس قسم کا بھی معاملہ ہو فقہ اسلامی اس میں انسان کی بھرپور رہنمائی کرتی ہے۔

عقل و حکمت سے مطابقت

فقہ اسلامی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں معقولیت بھی پائی جاتی ہے، علماء، محققین نے اپنی اپنی تصانیف میں پورے شرح وبسط (تفصیل) کے ساتھ اس کی معقولیت پر گفتگو فرمائی ہے، علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ، ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ، امام رازی رحمۃ اللہ علیہ، شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہم نے اس پہلو پر سیر حاصل بحث کی ہیں اور یہ ثابت کیا ہے کہ شریعت کے احکام عقل کے تقاضوں اور مصلحتوں کے عین مطابق ہیں، حتی کہ بعض اہل علم نے تو یہاں تک کہا ہے کہ شریعت تمام تر مصلحت ہی سے عبارت ہے اور ہر حکمِ شرعی کا مقصد یا تو کسی مصلحت کو پانا ہے یا کسی نقصان اور مفسدہ کا ازالہ ہے:

"اِنَّ الشَّرِیعۃَ کلّھَا مَصَالِح اِمَّادَرا مَفَاسِدِ اَو جَلب مَصَالِحِ". (۱۳)

اس کے برخلاف انسان کی عقل کوتاہ و نارسا ہے اور خود اپنے نفع ونقصان کو سمجھنے سے بھی قاصر و عاجز ہے، دوسرے انسان بعض اوقات خواہشات سے اس قدر مغلوب ہو جاتا ہے کہ کسی بات کو نقصان جانتے ہوئے بھی اس کو قبول کر لیتا ہے، اس کی واضح مثال شراب ہے، شراب انسان کے لیے نہایت نقصان دہ اور اس کی صحت کو برباد کر دینے والی چیز ہے، اس پر اتفاق ہے، لیکن آج دنیا کے ان تمام ملکوں میں جو انسانی قانون کے زیر سایہ زندگی بسر کر رہے ہیں شراب کی اجازت ہے، غیر قانونی جنسی تعلق اور ہم جنسی کے بارے میں تمام میڈیکل ماہرین متفق ہیں کہ یہ صحت کے لیے نہایت مہلک فعل ہے اور نہ صرف اخلاق کے لیے تباہ کن ہے بلکہ طبی نقطہ نظر سے بھی سماج کے لیے زہر ہلاہل سے کم نہیں ہے، اس کے باوجود عوامی دباؤ اور آوارہ خیال لوگوں کی کثرت سے مجبور ہو کر بہت سے ترقی یافتہ ملکوں میں ان خلافِ فطرت امور کی بھی اجازت دے دی گئی ہے، فقہ اسلامی کہیں بھی عقل اور حکمت و مصلحت سے برسرِ پیکار نظر نہیں آتی اور اس کا ایک ایک حکم انسانی مفاد و مصلحت پر مبنی ہے۔

ابدیت و دوام

کسی بھی قانون کے مفید اور فعال رہنے کے لیے جہاں یہ ضروری ہے کہ اس میں حالات و مواقع کے لحاظ سے تغیرات کو قبول کرنے کی گنجائش رہے وہیں ایک گونہ ثبات و دوام اور بقاء و استمرار بھی ضروری ہے، جو قانون بالکل بے لچک اور تغیر نا آشنا ہو وہ زمانہ کی تبدیلیوں کا ساتھ نہیں دے سکتا اور جس قانون میں کوئی بقاء و استحکام نہ ہو وہ انصاف قائم کرنے اور لوگوں کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس کے ہر اصول میں شکست و ریخت کی گنجائش ہوگی اور کسی بھی قانون کو لوگ اپنی خواہش کے سانچے میں ڈھال سکیں گے۔

اسلام میں ان دونوں پہلوؤں کی رعایت ملحوظ ہے، کچھ احکام وہ ہیں جن کی بابت اصول و قواعد اور شریعت کے مقاصد کی وضاحت پر اکتفاء کیا گیا ہے، ہر عہد میں جو مسائل پیدا ہوں ان کو ان اصولوں کی روشنی

میں حل کیا جائے گا اور بعض مسائل میں شریعت نے جزوی تفصیلات کو بغیر کسی استثناء اور تخصیص کے متعین کر دیا ہے، یہ تحدید اس بات کی علامت ہے کہ یہ قیامت تک قابلِ عمل ہے، اس طرح شریعت میں جو اصولی ہدایات دی گئی ہیں اور جن قواعد و مقاصد کی رہنمائی کی گئی ہے وہ نا قابلِ تبدیل ہیں، اس لیے قرآن نے اشارہ کیا ہے کہ قرآنی ہدایات کے ذریعہ دین پایہ کمال کو پہنچ گیا ہے (المائدہ:۳) اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر سلسلہ نبوت کو ختم کر دیا گیا ہے (الاحزاب:۴۰) لہٰذا اب خالقِ کائنات کی طرف سے کسی نئی شریعت کے آنے کا امکان باقی نہیں رہا، اب یہ انسانی سماج کے لیے ایسا موزوں قانون ہے کہ قیامت تک اس کی موزونیت اور اس کی افادیت کم نہیں ہو سکتی، کیونکہ فقہ اسلامی کا سرچشمہ وہ نصوص ہیں جو قیامت تک ہر طرح کے تغیرات واصلاح سے ماوراء ہیں اور وضعی قوانین کی اساس انسانی خیالات و جذبات ہیں جو ہر آن و زمان تغیر و تبدیلی سے دو چار ہیں۔

فطرت انسانی سے ہم آہنگی

اللہ خود انسان کا خالق ہے اور اس کی ضروریات و تقاضے سے بھی پوری طرح واقف ہے، اس لیے اس نے جو شریعت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے انسانیت کو عطا کی وہ پوری طرح فطرتِ انسانی سے ہم آہنگ ہے، اس لیے قرآن نے اسلام کو دینِ فطرت سے تعبیر کیا ہے۔

فطرت سے بغاوت ہمیشہ انسان کے لیے نقصان و خسران اور تباہی و بربادی کا سبب بنا ہے، انسان کے بنائے ہوئے قانون میں فطرت سے بغاوت کا رجحان قدم قدم پر ملتا ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ نے عورت کی فطرت میں جلد بازی، زود رنجی اور بعجلت قدم اٹھانے کا مزاج رکھا ہے، اس لیے اسلام نے طلاق کا اختیار عورت کے ہاتھ میں نہیں رکھا، بلکہ مرد کو طلاق کا اختیار دیا، لیکن مغرب نے مرد و عورت کو مساوی درجہ دیتے ہوئے طلاق کے معاملہ میں بھی دونوں کو یکساں حیثیت دے دی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طلاق کی شرح اس معاشرہ میں بہت بڑھ گئی، حتیٰ کہ بہت سے ملکوں میں نکاح کے مقابلہ میں طلاق کی شرح بڑھی ہوئی ہے اور اس

کے نتیجہ میں خاندانی نظام بکھر کر رہ گیا ہے، اسی طرح انسانی فطرت ہے کہ سخت اور مناسب سزائیں ہی انسان کو جرم سے باز رکھ سکتی ہیں اور مجرم کے ساتھ حسنِ سلوک دراصل مظلوم کے ساتھ ناانصافی اور سماج کو امن سے محروم کردینے کے مترادف ہے، اس لیے اسلام میں قتل کی سزا قتل رکھی گئی ہے اور بعض دیگر جرائم میں بھی سخت سزائیں رکھی گئی ہیں، لیکن بعض ممالک میں ہمدردی وانسانیت کے نام پر مجرم کو سہولتیں دی گئیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرائم پر جسارت روزمرہ بڑھتی جارہی ہے اور جو سزائیں دی جارہی ہیں وہ جرائم کے سدباب کے لیے ناکافی ہیں، اس کے برخلاف شریعتِ اسلامی کے جس حکم کو بھی حقیقت پسندی کے ساتھ دیکھا جائے تو محسوس ہوگا کہ اس میں قانونِ فطرت کی مطابقت غیر معمولی حد تک پائی جاتی ہے، جبکہ انسان کے خودساختہ قوانین میں فطرت سے بغاوت اور خواہشات کے غلبہ کا رجحان ہر جگہ نمایاں ہے۔

توازن واعتدال

شریعتِ اسلامی کا ایک وصف اس کا توازن واعتدال بھی ہے، مثلاً مرد وعورت انسانی سماج کے دو لازمی جز ہیں، دنیا میں کچھ ایسے قوانین وضع کیے گئے ہیں جن میں عورت کی حیثیت جانور اور بے جان املاک کی سی قرار دے دی گئی، نہ وہ کسی جائیداد کی مالک ہوسکتی تھی، نہ ہی تصرف کرسکتی تھی، نہ اس کو اپنے مال پر اختیار تھا، نہ اپنی جان پر، یہاں تک کہ اہلِ علم کے درمیان بحث جاری تھی کہ عورتوں میں انسانی روح پائی جاتی ہے یا حیوانی؟ اس کے بالمقابل دوسری طرف کچھ لوگوں نے عورتوں کو تمام ذمہ داریوں میں مردوں کے مساوی قرار دے دیا، عورتوں کی جسمانی کمزوری، اس کے ساتھ پیش آنے والے قدرتی حالات وعوارض اور طبیعت ومزاج اور قوتِ فیصلہ پر ان کے اثرات کو نظر انداز کردیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بظاہر تو اسے عورت کی حمایت سمجھا گیا لیکن انجام کار اس آزادی نے سماج کو بے حیائی، اخلاقی گراوٹ، ناقابلِ علاج امراض اور خود عورتوں کو ناقابلِ تحمل ذمہ داریوں میں جکڑ دیا۔

اسلام نے مردوں اور عورتوں سے متعلق نہایت متوازن قانون دیا ہے، انسانی حقوق میں مردوں اور

عورتوں کو مساوی درجہ دیا گیا ہے" وَلَهُنَّ مِثلُ الَّذِی عَلَیهِنَّ بِالمَعرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَیهِنَّ دَرَجَةٌ"(۱۴) لیکن سماجی زندگی میں دونوں کے قویٰ اور صلاحیت کے لحاظ سے فرق کیا گیا ہے اور بال بچوں کی تربیت کی ذمہ داری عورتوں پر اور کسبِ معاش کی ذمہ داری مردوں پر رکھی گئی ہے، سماجی زندگی کا یہ نہایت زریں اصول ہے، جس میں خاندانی نظام کا بقاء، اخلاقی اقدار کی حفاظت اور عورت کو نا قابلِ برداشت مصائب سے بچانا ہے۔

دولت مندوں اور غریبوں، تاجروں اور مزدوروں، عوام اور حکومت کے تعلقات اور مجرموں اور جرم سے متاثر مظلوموں کے درمیان انصاف وغیرہ احکام کو اگر حقیقت پسندی کے ساتھ دیکھا جائے تو قانونِ شریعت میں جو اعتدال نظر آئے گا گذشتہ اور موجودہ ادوار میں انسانوں کے بنائے ہوئے کسی قانون میں اس کی مثال نہیں ملے گی۔

عدل وانصاف

شریعتِ اسلامی کا ایک امتیازی پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں انسانیت کے ساتھ مساویانہ سلوک ہے، دین کی بنیاد ہی دراصل عدل پر ہے، اس لیے اسلام کی نگاہ میں رنگ ونسل، جنس اور قبیلہ وخاندان کی بنیاد پر کوئی تفریق نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"یَا أَیُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقنَاکُم مِّن ذَکَرٍ وَأُنثَی وَجَعَلنَاکُم شُعُوباً وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَکرَمَکُم عِندَ اللَّهِ أَتقَاکُم "(۱۵)

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک ہی مرد وعورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو خاندانوں اور قبیلوں میں اس لیے تقسیم کیا ہے تاکہ ایک دوسرے کو پہچان سکو، بے شک تم میں سب سے زیادہ معزز اللہ کے نزدیک وہ ہے جو سب سے زیادہ تقوی اختیار کرنے والا ہو۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مزید واضح فرمایا کہ کسی گورے کو کالے پر اور کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے، اسلام کے تمام قوانین کی اساس اسی اصول پر ہے، برخلاف انسانی قوانین

کے،انسانوں نے جو بھی قوانین وضع کئے ہیں وہ ایک گروہ کی برتری اور دوسرے طبقہ کی تذلیل وحق تلفی پر مبنی رہا ہے،لیکن اسلام نے دنیا کو ایک ایسے قانون سے روشناس کیا جس کی بنیاد انسانی وحدت مساوات اور ہر طبقہ کے ساتھ ایسے انصاف پر مبنی ہے جو کسی طبقہ کو حقیر اور اچھوت بنانے کی اجازت نہیں دیتا۔

حقیقی نافعیت

شریعتِ اسلامی حقیقی نافعیت اور مال وانجام کی سعادت پر مبنی ہے،انسان کے بنائے ہوئے قوانین میں حقیقی نفع وضرر سے زیادہ خواہشات وجذبات کی رعایت ہے،شراب صحت انسانی کے لیے مضر ہے،نشہ جنون کا ایک درجہ ہے،خنزیر کا گوشت مختلف طبعی بیماریوں اور اخلاقی مفاسد کی جڑ ہے،عصمت وعفت کے مذہبی تصور کے خلاف برہنگی ہے جو اخلاقی اقدار کے بھی منافی ہے اور امن وسکون کی غارت گر ہے،اسلام نے ان مضرتوں پر نظر رکھی اور ان امور کے بارے میں اس کی مخالفت ناقابلِ تبدیل ہے،مگر وضعی قوانین ان تمام نقصانات کو تسلیم کرنے کے باوجود ہوائے نفسانی اور ہوسِ انسانی کے سامنے سپر انداز (جھکے ہوئے) ہیں۔

تنفیذ کی قوت

کسی بھی قانون کا نفاذ دو طریقوں سے ہوتا ہے،ایک تو سماج کے اندر قبولِ اطاعت کا جذبہ پیدا کر کے اور دوسرے قانون کے خلاف کرنے والوں کے لیے جبر وقوت کا استعمال کر کے،کچھ طبیعتیں سلامتی اور شرافت کی حامل ہوتی ہیں،ان میں از خود قانون پر عمل کرنے کا جذبہ موجود ہوتا ہے،لیکن جن طبیعتوں میں سرکشی اور بغاوت ہوتی ہے یا جو خواہشات سے مغلوب ہوتی ہیں وہ جبر وخوف کے بغیر سرِ تسلیم خم نہیں کرتیں، انسانی قوانین میں عدالت اور پولیس اور دونوں شعبوں کے ذریعے سزاؤں کا خوف ہی انسان کو جرم سے باز رکھتا ہے،جبکہ شریعتِ اسلامی میں اس سے آگے ایک اور عقیدہ "آخرت کے ثواب وعذاب" کا ہے،اس لیے قرآن وحدیث میں ہر حکم کے ساتھ اس کے ماننے پر آخرت کا اجر اور نہ ماننے پر آخرت کی سزا کا ذکر موجود ہے، یہ ایسا انقلاب انگیز عقیدہ ہے جو طاقتور سے طاقتور انسان کے دل کو ہلا کر رکھ دیتا ہے اور بڑے

بڑے مجرموں کو قانون کے سامنے سپر انداز ہونے پر مجبور کرتا ہے، جب کوئی آنکھ دیکھنے والی اور کوئی زبان ٹوکنے والی نہیں ہوتی اس وقت بھی یہ عقیدہ اس کے ہاتھوں کے لیے ہتھکڑی اور اس کے پاؤں کے لیے زنجیر بن جاتا ہے۔

مسلم سماج میں اس گئے گذرے دور میں بھی اس کی مثالیں بآسانی دیکھی جاسکتی ہیں، مثلاً یہی منشیات کا مسئلہ ہے، آج پوری دنیا اس سے دوچار ہے اور اس کے نقصانات تسلیم شدہ ہیں، امریکہ نے ان حالات کو دیکھتے ہوئے سنہ ۱۹۳۰ء میں نشہ بندی کا ایک قانون بنایا اور شراب کی مضرتوں کو واضح کرنے کے لیے صرف تشہیر پر ۶۵ ملین ڈالر خرچ کیے، نو ہزار ملین صفحات شراب کے نقصانات پر لکھے گئے، ۲۰۰ آدمی قتل کیے گئے، ۵۰ لاکھ کو قید کی سزا دی گئی، ان لوگوں پر جو جرمانے کیے گئے وہ بے شمار ہیں، لیکن اس کے باوجود طاقت سے قانون کو منوایا نہیں جاسکا اور سنہ ۱۹۳۳ء میں امریکی حکومت اس بات پر مجبور ہوئی کہ اس قانون کو واپس لے لے، لیکن قرآن مجید نے جب شراب کو حرام قرار دیا تو عرب اس کے بے حد عادی تھے، یہاں تک کہ اسلام سے پہلے ان کی مذہبی تقریبات بھی شراب سے خالی نہیں ہوتی تھیں، لیکن شراب کی حرمت کا حکم آتے ہی لوگوں نے اپنا سر جھکا دیا اور مدینہ کی گلیوں اور کوچوں میں شراب بہنے لگی، آج بھی صورتحال یہ ہے کہ جہالت وغفلت کے باوجود مسلمان سماج میں شراب سے جو احتیاط برتی جاتی ہے شاید ہی اس کی مثال مل سکے، مغربی ممالک میں خاص طور پر اس کو محسوس کیا جاسکتا ہے کہ دوش بدوش زندگی گذارنے والے مسلمان اور غیر مسلم مے نوشی کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بہت مختلف کردار کے حامل ہوتے ہیں۔

اسی طرح زنا اور غیر قانونی جنسی تعلق کا معاملہ ہے کہ آج بھی اس معاملہ میں مسلم سماج دوسری قوموں سے بدرجہا غنیمت ہے، یہی وجہ ہے کہ ایڈس کی بیماری کی شرح مسلم ملکوں میں سب سے کم ہے، مغربی ملکوں میں شہر شہر بوڑھے لوگوں کے لیے ہاسٹل قائم کردیئے گئے ہیں، لوگ بوڑھے ماں باپ اور بزرگانِ خاندان کو ان ہاسٹلوں میں رکھ کر اپنا بوجھ ہلکا کرلیتے ہیں، لیکن مسلم سماج میں آج بھی ایسی خودغرضی نسبتاً کم پائی جاتی ہے،

والدین کا احترام اور بزرگوں کی قدر دانی کو لوگ اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے ہیں، یہ آخرت کے خوف اور آخرت میں جوابدہی کے احساس کے بغیر نہیں ہوسکتا، الغرض وضعی قوانین کا نفاذ قانون کی طاقت ہی سے ممکن ہے، لیکن قانونِ شریعت کے نفاذ میں عقیدہ وایمان کی طاقت بھی موثر کردار ادا کرتی ہے۔

فقہ پر اعتماد نہ کرنے کا نقصان

اگر فقہ پر اعتماد نہ کر کے کوئی شخص اپنے ہر عمل کا تعلق بلا واسطہ قرآن یا حدیث سے کریگا تو یہ اجماع کے خلاف ہوگا اور دوسری بات یہ ہے کہ اس کے سامنے مکمل قرآنی علم یا مکمل احادیث کا مجموعہ ہونے کے ساتھ ساتھ دیگر بہت سارے علوم وغیرہ کا ہونا ضروری ہے، اس لیے کہ بعض جگہ قرآنی آیات مجمل ہیں تو بعض جگہ قرآنی آیات اور احادیث میں ابہام بھی ہے اور کچھ احادیث ایک ہی عمل کے مختلف طریقے اور مختلف حکم پیش کرتی ہے اور الفاظ قرآن یا حدیث ایک معنی پیش کرتے ہیں اور مرادی معنی اور ہوتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سحری کے وقت کے سلسلہ میں فرمایا:

"و فَالآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابتَغُوا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُم وَكُلُوا وَاشرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الخَيطُ الأَبيَضُ مِنَ الخَيطِ الأَسوَدِ مِنَ الفَجرِ"(١٦)

اور اس وقت تک کھاؤ پیو جب تک صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے ممتاز ہو کر تم پر واضح (نہ) ہوجائے۔

بظاہر اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اس وقت تک کھا پی سکتے ہیں جب تک کہ صبح کی روشنی سے سفید اور کالے دھاگے میں امتیاز ہوجائے جیسا کہ بعض صحابہ نے ایسا ہی سمجھا تھا، مگر حقیقی معنی یہ نہیں ہیں، بلکہ خیط ابیض سے مراد صبح صادق اور خیط اسود سے مراد صبح کاذب ہے۔(١٧)

اسی طرح ایک حدیث میں آیا ہے کہ جو انسان اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو اس کے لیے حلال نہیں کہ وہ اپنے پانی سے دوسرے کے کھیت کو سیراب کرے۔(١٨)

اس حدیث سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب باغ میں پانی زیادہ ہو جائے تو اسے دوسرے کے باغ میں نہ چھوڑا جائے جیسا کہ بعض حدیث پڑھنے والے یہی معنی سمجھ کر کئی دن اسی پر عمل کرتے رہے، حالانکہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ حاملہ لونڈیوں سے صحبت نہ کی جائے، اس طرح بلاواسطہ قرآن وحدیث کے سمجھنے میں غلطی ہونے کا قوی امکان ہوسکتا ہے، اس کے علاوہ بہت سارے نئے مسائل (خواہ وہ مسائل عبادات کے ہوں یا معاملات کے ہوں یا معاشرت کے ہوں وہ) قرآن وحدیث سے بلاواسطہ (ڈائرکٹ) نہیں سمجھ سکتا، بہرحال ہر انسان اپنے کم علمی کے ذریعہ زندگی کے ہر عمل کو شریعت کے مطابق نہیں بنا سکتا، اس لیے علوم شرعیہ کے ماہرین سے رجوع کرنا ضروری ہوگا، اس کے بغیر وہ اپنی زندگی کو شریعت کے منشا کے مطابق نہیں بنا پائیگا اور بہت ساری خرابیاں وجود میں آتی ہیں جو تفصیلی مضامین میں انشاء اللہ آئیں گی۔

ہر علم وفن کی تدوین اور اس کے ارتقاء بتدریج پایہ کمال کو پہونچتا ہے، فقہ اسلامی پر بھی تدوین کے کئی مراحل گذر چکے ہیں۔

فقہ اسلامی کا پہلا دور اور اس کی خصوصیات

آپ کی رسالت ونبوت سنہ ۶۱۰ء سے شروع ہوتی ہے اور وفات سنہ ۱۰ھ مطابق سنہ ۶۳۲ء میں ہوئی، اس دور میں فقہ اسلامی کا سرچشمہ قرآن تھا، آپ کے ارشادات اور آپکی مکی ومدنی زندگی کے حالات وواقعات قرآن کریم کی تشریح کی حیثیت رکھتے تھے، الغرض دورِ نبوت میں فقہ اسلامی کا تمام تر مدار وحی پر تھا، چاہے وحی متلو قرآن کریم ہو یا غیر متلو احادیث مبارکہ۔

آپ کے دور میں موجودہ زمانہ کی طرح فقہ اسلامی مدون نہیں ہوا تھا، جس طرح بعد میں فقہاء کرام نے ہر مسئلہ کی تحقیق وتفتیش کر کے اس کے ارکان وشرائط اور آداب وسنن کی وضاحت کردی، یہ تحدید زمانہ نبوت میں نہیں ملتی ہے، آپ سے جو عمل جس طور پر صادر ہوتا، صحابہ کرام بعینہ بغیر کمی وبیشی کے اپنا لیتے، مثال کے طور پر آپ کو جس طرح وضو کرتے اور نماز پڑھتے دیکھا صحابہ نے اسے اپنا لیا، انہوں نے اس بات کی تحقیق

وجستجو نہیں کی کہ وضو میں کتنے ارکان اور کیا کیا ہیں؟ نماز میں کون سا رکن فرض ہے؟ کون سا واجب اور کون سا سنت ہے؟

آپ نے اپنے دور میں قرآن کریم کے علاوہ دیگر چیزوں کو لکھنے سے منع فرما دیا تھا حتی کہ احادیثِ مبارکہ کو تحریر کرنے سے بھی روک دیا تھا، تاکہ قرآن کریم کا غیر قرآن سے اختلاط نہ ہو جائے اور سابقہ امتوں کی طرح آسمانی کتابوں کا صلحاء اور علماء کے اقوال سے اختلاط ہو کر ان کی روحانیت اور اعجازی شان فنا نہ ہو جائے اور نہ محرف ہو جائے، چونکہ دورِ نبوت میں کاغذات اور پریس وغیرہ کی موجودہ سہولت نہ تھی، بلکہ ہڈیوں چمڑوں اور پتوں کو تحریر کے کام میں لاتے تھے، اس لیے قوی اندیشہ تھا کہ قرآن غیر قرآن سے خلط ملط ہو کر ضائع نہ ہو جائے، اگرچہ انفرادی طور پر جمع قرآن کے علاوہ جمع حدیث کے تعلق سے بھی کام ہوا۔

آپ کی ممانعت کی وجہ سے حدیث وفقہ کی باضابطہ تدوین کا آغاز آپ کے دور میں نہ ہو سکا۔

فقہ اسلامی کا دوسرا دور اور اس کی خصوصیات

یہ خلفاءِ راشدین اور کبارِ صحابہ کرام کا دور ہے، نبی کریم کی وفات کے بعد سنہ ۱۱ھ سے خلفاء راشدین اور دیگر کبار صحابہ کا دور شروع ہوتا ہے اور یہ دور سنہ ۴۰ھ میں اختتام کو پہونچتا ہے، آپ کی وفات کے بعد فتوحات اسلامی کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا، بالخصوص حضرت عمر کے دورِ خلافت میں تو ہر روز کوئی نہ کوئی علاقہ مملکتِ اسلامیہ میں داخل ہو، صحابہ کرام "بلغوا عني ولو آيه" (۱۹) کے تحت اسلام کا پیغام پہونچانے کے لیے چہار دانگِ عالم میں پھیل گئے جس کی وجہ سے مسلمانوں کا دوسری اقوام سے اختلاط بڑھتا گیا، بعض عجمی اقوام دامن اسلام میں آئیں اور نئے نئے مسائل وواقعات درپیش ہونے لگے، صحابہ کرام کو ان حوادث اور واقعات کا حکم شرعی معلوم کرنے اور جاننے کی فکر لاحق ہوئی، چنانچہ خلفاء راشدین اور کبارِ صحابہ جو فتویٰ دینے کی اہلیت رکھتے تھے، قرآن وحدیث کی طرف رجوع ہوئے اور قرآن وحدیث کے قواعد وجزئیات کو سامنے رکھ کر احکام شرعی بیان کرنا شروع کیا، جو حکم قرآن وحدیث میں مذکور نہ ہوتا تو آپس میں مشورہ کرتے

اور اجتہاد واستنباط سے کام لیتے، اس شورائی اور اجتماعی اجتہاد کے ذریعہ بہت سے مسائل حل ہوئے۔

فقہاء صحابہ

علامہ ابن خلدون نے تحریر کیا ہے کہ صحابہ سب کے سب صاحب فتویٰ نہ تھے اور نہ ہی ان سب سے دین کا علم حاصل کیا جاتا تھا، بلکہ دین کے خصوصی معلمین حاملین قرآن تھے، جو قرآن کے ناسخ ومنسوخ، مشابہ ومحکم اور اس کے سارے دلائل سے پوری طرح واقف تھے، انھوں نے یا تو نبی اکرم سے براہِ راست تعلیم وتربیت حاصل کی تھی یا ان جلیل القدر صحابہ سے اکتساب فیض کیا تھا جنھوں نے براہِ راست نبی اکرم سے فیض پایا تھا، ان حضرات کو اس زمانہ میں قراء کہا جاتا تھا، صحابہ کرام میں ایک سو تیس افراد فقہ وفتاویٰ کی رونق تھے، جن میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی، ان میں سے سات صحابہ کرام اپنی فقہی خدمات اور کثرت فتاویٰ کی وجہ سے مکثرین کہلاتے ہیں، کیونکہ ان حضرات کے فتاویٰ کثرت سے منقول ہیں، ان کے اسماء گرامی یہ ہیں:

(۱) حضرت عمر بن خطاب

(۲) حضرت علی بن طالب

(۳) حضرت عبداللہ بن مسعود

(۴) ام المومنین حضرت عائشہ

(۵) حضرت زید بن ثابت

(۶) حضرت عبداللہ بن عباس

(۷) حضرت عبداللہ بن عمر۔(۲۰)

جو صحابہ فقہ وفتاویٰ میں متوسط تھے ان کی تعداد تیرہ تھی:

(۱) حضرت ابو بکر صدیق

(۲) حضرت ام سلمہ

(۳) حضرت انس بن مالک

(۴) حضرت ابو سعید خدری

(۵) حضرت ابو ہریرہ

(۶) حضرت عثمان

(۷) حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص

(۸) حضرت عبداللہ بن زبیر

(۹) حضرت ابو موسیٰ اشعری

(۱۰) حضرت سعد بن ابی وقاص

(۱۱) حضرت سلمان فارسی

(۱۲) حضرت جابر بن عبداللہ

(۱۳) حضرت معاذ بن جبل،

ان حضرات کے علاوہ جو صحابہ ہیں انہیں مقلین کہا جاتا ہے، یعنی ان حضرات سے صرف ایک یا دو فتاویٰ منقول ہیں۔(۲۱)

فقہ اسلامی کا تیسرا دور

یہ دور پہلی صدی کے نصف آخر سے چوتھی صدی کے نصف اوّل تک ہے۔

اس دور کی چند خصوصیات درجِ ذیل ہیں:

الف　اس دور میں داخلی سیاسی کشمکش میں شدت پیدا ہوگئی، شیعہ اور خوارج کے گروہ مضبوط ہوئے جن کی بنیاد عہد عثمانی اور عہد علوی ہی میں پڑ چکی تھی، انہوں نے باہم تکفیر و تفسیق کا بازار گرم کر رکھا تھا دوسری طرف مملکت اسلامیہ کا دائرہ چین کی سرحدوں سے اندلس تک پھیل گیا، صحابہ اس عہد میں فتوحات کے ساتھ دوسرے

ممالک میں پھیلتے چلے گئے۔(۲۲)

ب　　. یہ دور چونکہ زمانہ نبوت سے قریب تھا، جس کی وجہ سے اس دور کے لوگوں میں دینی مزاج راسخ اور پختہ تھا، وہ ہر بات کے لیے سند کے طلب گار ہوتے تھے، اس لیے کہ بعض فرقوں نے احادیث گھڑنا اور آپ کی طرف منسوب کرنا شروع کر دیا، چنانچہ اسی دور میں وضع حدیث کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔

ج　　اس دور میں سب سے بڑا کام تدوین حدیث کا ہوا اور اس دور میں حدیث کے مشہور ائمہ کرام کی قیادت کو جمہور نے تسلیم کیا، اسی دور میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کو اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ احادیث کا ذخیرہ اور صحابہ کرام کے فتاویٰ اور اقوال ضائع نہ ہو جائیں، ادھر قرآن کا غیر قرآن سے اختلاط کا خوف بھی نہ تھا، کیونکہ قرآن کریم سینوں اور اوراق میں محفوظ ہو چکا تھا، حفاظ کرام ہزاروں کی تعداد میں پائے جاتے تھے، کوئی ایسا گھر نہ تھا جہاں قرآن کریم کا نسخہ موجود نہ ہو، لہٰذا حضرت عمر بن عبدالعزیز نے تدوین حدیث کی طرف توجہ فرمائی اور حاملین علوم حدیث کو اس کی تدوین کا حکم دیا، چنانچہ آپ کے حکم پر بنِ شہاب زہری نے اسلامی تاریخ میں سب سے پہلے یہ کام انجام دیا۔(۲۳)

د　　اس عہد کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ صحابہ چونکہ مختلف علاقوں میں پھیل گئے اس لیے ہر علاقہ کے فقہی مسالک پر ان کا اثر ہوا، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس مکہ میں رہے تو امام شافعی کی فقہ پر ان کے گہرے اثرات پڑے اور آپ نے زیادہ تر انہی کی روایات پر اپنی فقہ کی بنیاد رکھی، کوفہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود قیام پذیر تھے اور آپ کے علوم کے حامل حضرت ابراہیم نخعی تھے تو امام ابوحنیفہ کی فقہ کا غالب ترین حصہ انہی سے ماخوذ ہے، اسی طرح جن علاقوں میں صحابہ پہونچے وہاں ان کا منہج فکر زیادہ مشہور رہا۔

ھ　　یہ دور سابقہ ادوار سے اس اعتبار سے بھی امتیازی حیثیت رکھتا ہے کہ اس دور میں فقہی نقطہ نگاہ سے علماء دو گروہ میں منقسم ہو گئے اور دو مدرسہ فکر وجود میں آئے، ایک حجاز، وہاں کے فقہاء اہل حجاز و اصحاب حدیث سے مشہور ہوئے، دوسرا عراق میں اور یہاں کے فقہاء اہل عراق اور اصحاب الرائے سے مشہور ہوئے۔(۲۴)

دونوں مدرسوں کا نہج اور طرزِ تعلیم کسی قدر مختلف اور جداگانہ تھا، مدرسہ حجاز کی بنیاد کتاب وسنت کے ظاہر اور الفاظ پر تھی اور یہاں کے علماء رائے اور قیاس سے حتی الامکان اجتناب کرتے، مدرسہ عراق کے علماء اور اساتذہ نصوص کے الفاظ کے ساتھ معانی میں بھی غواصی کرتے، شریعت کے اصل منشاء کو پیش نظر رکھتے اور روایت و درایت کو ساتھ لیکر چلتے۔(۲۵)

و	اس دور میں باب وار فقہی احکام کی ترتیب کے مطابق جمع حدیث کا آغاز ہوا، چنانچہ بہت سے آئمہ نے احادیث کو فقہی ترتیب کے مطابق ایک مکمل کتابی اور فنی صورت میں مرتب کیا، مدینہ میں امام مالک نے، کوفہ میں امام ابو حنیفہ اور سفیان ثوری نے، بصرہ میں حماد بن سلمہ اور شام میں عبدالرحمٰن بن اوزاعی نے، مکہ میں عبدالعزیز ابن جریج نے اور خراسان میں عبداللہ بن مبارک نے احادیث کی تدوین شروع کی۔(۲۶)

پھر اسی دور کے اواخر میں احادیث کے بڑے بڑے مجموعے صحیح اور مستند طریقہ سے مرتب ہوئے، بعض میں صرف احادیث صحیحہ کے جمع کرنے کا التزام کیا گیا اور ضعیف وغیر مستند احادیث کو اس میں جگہ دینے سے اجتناب کیا گیا اور اس سلسلہ کی مشہور کتابوں میں صحاحِ ستہ خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں، جسے امت نے صحیح ترین مجموعہ تسلیم کیا ہے اور وہ یہ ہیں۔

(۱) بخاری

(۲) مسلم

(۳) ابوداود

(۴) ترمذی

(۵) ابن ماجہ

(۶) نسائی۔

پھر اس دور میں صحیح اور غیر صحیح مستند، قوی اور ضعیف حدیث کے درمیان امتیاز کے لیے فن اسماء رجال

مرتب ہوااور اس فن پر بڑی بڑی کتابوں کی تصنیف ہوئی۔(۲۷)

ز　اس عہد میں قواعد فقہ اور فن اصول فقہ کا بھی وجود ہوااور اس کی با قاعدہ تدوین وترتیب عمل میں آئی۔

ح　فقہی اصطلاحات کا ظہور بھی اسی دور میں ہوا، یعنی جائز و ناجائز، حلال وحرام، مکروہ و مستحب، فرض، واجب وغیرہ کی درجہ بندی گو عملاً یہ درجات پہلے بھی پائے جاتے تھے۔

ط　اس دور میں چار بڑے مکاتب فقہ وجود میں آئے اور ہر مکتب فکر کے لحاظ سے فقہی کتب کی تدوین وترتیب کا سلسلہ شروع ہوا۔(۲۸)

یہ تو طے ہے کہ اسلام ایک ہمہ گیر وسیع اور دائمی نظام حیات ہے اور اس نے اپنی اس امتیازی شان ہمہ گیری اور دائمی حیثیت کی بقاء کے واسطے اپنے اندر ایک ایسی لچک اور گنجائش رکھی ہے کہ ہر دور میں اور ہر جگہ انسانی ضرورت کا ساتھ دے سکے اور کسی منزل پر اپنے پیرو کی رہبری سے قاصر نہ رہے، چنانچہ علماء ربانین نے اس ضرورت کا احساس کیا اور اس کے لیے سب سے پہلے سراج الامت حضرت امام ابوحنیفہ متوفی: سنہ ۱۵۰ھ آمادہ ہوئے۔(۲۹)

فقہ حنفی

ائمہ اربعہ جن کے مذاہب اس وقت دنیا میں رائج ہیں، ان میں امام ابوحنیفہ اپنے علم وفضل اور سن وصال میں سب سے مقدم تھے اور بالواسطہ یا بلاواسطہ تمام ائمہ آپ کے فیض یافتہ تھے۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو ایک طرف تابعی ہونے کا شرف حاصل ہے، جو بقیہ ائمہ میں سے کسی کو حاصل نہیں، دوسری طرف آپ عمر میں ان میں سب سے بڑے ہیں، ملا علی قاری امام ابوحنیفہ کے فضائل مناقب میں تحریر فرماتے ہیں:

"الحاصل ان التابعی افضل الام بعد الصحاب ونعتقد ان الامام الاعظم والهمام الاقدم ابوحنيفه افضل المجتهدين واكمل الفقهاء فی علوم الدين ثم الامام مالك فانه من

اتباع الدين ثم الامام الشافعي لكونه تلميذ الامام مالك بل تلميذ الامام محمد ثم الامام احمد بن حنبل فانه كتلميذ الشافعي "(۳۰)

ترجمہ: حاصل یہ ہے کہ تابعین کا درجہ صحابہ کرام کے بعد امت میں سب سے بڑھا ہوا ہے، اسی وجہ سے ہمارا اعتقاد ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ کا مرتبہ ائمہ مجتہدین میں سب سے اونچا ہے اور فقہاء علوم دینیہ میں آپ سب سے بلند واکمل ہیں، آپ کے بعد امام مالک کا درجہ ہے، جو تبع تابعین کی صف میں ہیں، پھر امام شافعی کا اس لیے کہ آپ امام مالک، بلکہ امام محمد کے شاگرد ہیں، پھر امام احمد کا جو امام شافعی کے شاگرد کے درجہ میں ہیں۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے تلامذہ جو فقہ کی تدوین میں شریک تھے

امام ابوحنیفہ نے جس طریقہ سے فقہ کی تدوین کا ارادہ کیا وہ نہایت وسیع اور پرخطر کام تھا، اس لیے انہوں نے اتنے بڑے کام کو اپنی ذاتی رائے اور معلومات پر منحصر کرنا نہیں چاہا، اس غرض سے امام صاحب نے اپنے شاگردوں میں سے چند نامور اشخاص کا انتخاب کیا، جن میں سے اکثر خاص خاص فنون میں ماہر تھے، مثلاً یحییٰ بن ابی زائدہ، حفص بن غیاث، قاضی ابو یوسف، داود الطائی، ابن حبان مندل، آپ کو حدیث اور آثار میں نہایت کمال تھا۔

امام صاحب نے ان لوگوں پر مشتمل ایک مجلس مرتب کی اور باقاعدہ طور پر فقہ کی تدوین شروع ہوئی، امام طحاوی نے بسند متصل اسد بن فرات سے روایت کی ہے کہ ابوحنیفہ کے تلامذہ جنھوں نے فقہ کی تدوین میں حصہ لیا تھا ان کی مجموعی تعداد چالیس تھی، جن میں یہ لوگ زیادہ ممتاز تھے: ابو یوسف، زفر، داود طائی، اسد بن عمر، یوسف بن خالد التیمی، یحییٰ بن ابی زائدہ۔ امام طحاوی نے یہ بھی روایت کی ہے کہ لکھنے کی خدمت یحییٰ سے متعلق تھی، امام طحاوی نے جن لوگوں کے نام گنائے ہیں ان کے سوا عافیہ، ازی، ابو علی، علی بن مسہر، قاسم بن معن، ابن مندل اس مجلس کے ممبر رہے تھے۔ (۳۱)

طریقہ تدوین

تدوین کا طریقہ یہ تھا کہ کسی خاص باب کا کوئی مسئلہ پیش کیا جاتا تھا، اگر اس کے جواب میں سب لوگ متفق الرائے ہوتے تھے تو اسی وقت قلمبند کرلیا جاتا، ورنہ نہایت آزادی سے بحثیں شروع ہوتیں، کبھی کبھی بہت دیر تک بحث قائم رہتی، امام صاحب غور و تحمل کے ساتھ سب کے دلائل سنتے اور بالآخر ایسا جچا تلا فیصلہ کرتے کہ سب کو تسلیم کرنا پڑتا، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ امام صاحب کے فیصلہ کے بعد بھی آپ کے شاگردان اپنی اپنی آراء پر قائم رہتے اس وقت ان سب کے مختلف اقوال قلم بند کر لیے جاتے۔

جب کوئی نیا مسئلہ سامنے آتا تو اسے مجلس میں پیش کیا جاتا اس پر اصول شرع کی روشنی میں غور وخوض ہوتا کبھی اس کی تحقیق میں مہینوں لگ جاتے امام ابو حنیفہ اپنی رائے کو اپنے شاگردوں پر مسلط نہیں کرتے اور نہ بغیر تحقیق و مناقشہ کے اپنی آراء لکھواتے، بلکہ جدید مسائل کے بارے میں پوری تحقیق کی جاتی، مسائل کے مختلف پہلوؤں پر گہری نظر ڈالی جاتی، پھر بحث و مباحثہ میں تلامذہ کو پوری آزادی رائے دیتے، اگر مجلس کا کوئی رکن حاضر نہیں ہوتا تو انتظار کیا جاتا، بیان کیا جاتا ہے کہ "امام عافیہ" آپ کے اس مجلس کے ایک رکن تھے، جب وہ موجود ہوتے اور بحث و مباحثہ میں حصہ لیکر اتفاق کر لیتے تو اس مسئلہ کو لکھ لیا جاتا اگر وہ شریک نہیں ہوتے تو امام صاحب فرماتے "لا ترفعوها حتى يحضر عافيه" عافیہ کے آنے تک اس مسئلہ کو آخری شکل نہ دو، پھر جب وہ حاضر ہوتے اور اس مسئلہ میں اتفاق کر لیتے تو امام صاحب اسے قلمبند کر لینے کا حکم دیتے اور اگر اختلاف کرتے تو اسے مجموعہ میں شامل نہیں کیا جاتا۔ (۳۲)

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ علیہ کا منہج استنباط

مسائل کی تحقیق و تخریج میں امام ابو حنیفہ کا طریقہ اجتہاد کیا تھا؟ اس کی وضاحت کرتے ہوئے خود امام ابو حنیفہ نے فرمایا ہے میں سب سے پہلے کتاب اللہ کی طرف رجوع کرتا ہوں، اگر اس میں مسئلہ نہیں ملتا ہے تو سنت رسول کی طرف رجوع کرتا ہوں اور اگر اس میں بھی کوئی مسئلہ نہیں ملتا ہے تو پھر اقوال صحابہ کی طرف

رجوع کرتا ہوں اور جس صحابی کا قول کتاب وسنت سے زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے اسے اختیار کر لیتا ہوں، لیکن اقوال صحابہ کے دائرہ سے قدم باہر نہیں نکالتا، لیکن جب صحابہ کے بعد معاملہ ابراہیم، شعبی، ابن سیرین، حسن، عطاء اور سعید ابن مسیّب وغیرہ تک جاتا ہے تو یہ وہ لوگ تھے جو اجتہاد کرتے تھے اور میں بھی ان کی طرح اجتہاد کرتا ہوں۔ (۳۳)

علامہ مکی نے مناقب میں امام ابو حنیفہ کے طریقہ اجتہاد کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آپ حسب ضرورت قیاس سے کام لیتے تھے، اس سے کام نہ چلتا تو استحسان کو اپناتے اور اس سے بات نہ بنتی تو تعامل مسلمین کو دلیل بناتے۔

غرض امام ابو حنیفہ کے نزدیک مصادر فقہ اور اصولِ استنباط سات تھے:

(۱) کتاب اللہ

(۲) سنتِ رسول

(۳) اقوالِ صحابہ

(۴) اجماعِ امت

(۵) قیاس

(۶) استحسان

(۷) عرف یعنی تعاملِ ناس۔

فقہ مالکی

یہ فقہ امام دارالہجرۃ مالک بن انس کی طرف منسوب ہے، فقہ مالکی اہل سنت والجماعت کا دوسرا بڑا فقہی مسلک ہے اس کی نشوونما "مدینۃ الرسول" میں ہوئی، جو مہبط وحی، مسکن رسول اور ہزاروں جلیل القدر صحابہ کا ماؤی وملجا تھا اور یہاں سے پورے حجاز میں اس کی اشاعت ہوئی، پھر بصرہ، مصر، افریقہ، اندلس وغیرہ

میں اس کو غلبہ حاصل ہوا، امام مالک کے اصول میں سے سب سے اہم چیز علامہ ابن خلدون کے بقول اہلِ مدینہ کا تعامل تھا۔(۳۴)

امام مالک تقریباً پچاس سال درس وافتاء میں مشغول رہے، طلبہ اور عوام جو مسائل آپ سے پوچھتے تھے آپ کے شاگردان مسائل کے جوابات یاد کر لیتے یا لکھ لیتے تھے، آپ کی وفات کے بعد آپ کے شاگردوں نے آپ کے جوابات اور فقہی اقوال وآراء کو مدون کیا، یہ مجموعہ فقہ مالکی کے نام سے مشہور ہوا۔

امام مالک رحمہ اللہ کا طریقہ اجتہاد

امام مالک کا طریقہ اجتہاد اور منہج استنباط یہ تھا کہ اگر کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو آپ سب سے پہلے کتاب اللہ کی طرف مراجعت فرماتے اور اگر اس مسئلہ کی کتاب اللہ میں کوئی صراحت نہیں ملتی تو پھر آپ سنتِ رسول کی طرف متوجہ ہوتے، اگر اس میں بھی کوئی حکم شرعی نہیں ملتا تو پھر اقوالِ صحابہ، تعامل مدینہ، قیاس، اجتہاد، استحسان اور سدذرائع کی طرف متوجہ ہوتے۔(۳۵)

فقہ شافعی

یہ فقہ امام محمد بن ادریس شافعی کی طرف منسوب ہے، اس کی نشو ونما مکہ مکرمہ میں ہوئی اور پھر اطراف واکناف عالم میں پھیل گئی اور امام شافعی نے اوّلاً مالک بن انس کی خدمت میں رہ کر ان کے مناہج استنباط اور اصول استنباط وطرق اجتہاد سے خوب آگاہی حاصل کی، پھر امام اعظم کے معتمد شاگرد رشید امام محمد بن الحسن الشیبانی کی صحبت میں رہ کر فقہ حنفی کے مناہج اور اس کے اصول وکلیات کو اپنے سینہ میں محفوظ کیا اور پھر دونوں مکاتب فقہ کا نچوڑ وماحصل فقہ شافعی کی صورت میں مدون کر کے ایک نئی راہ قائم کی، آپ کی فقہ دو حصوں پر مشتمل ہے.

(۱)　فقہ شافعی قدیم

(۲)　فقہ شافعی جدید۔

فقہ شافعی قدیم فقہ شافعی کا وہ حصہ ہے جسے امام شافعی نے عراق میں آ کر مرتب کیا تھا، اس میں عراقی رنگ کا غلبہ ہے، فقہ شافعی جدید یہ وہ حصہ ہے جسے آپ نے مصر میں آ کر مرتب کیا تھا، اس میں حجازی رنگ کا غلبہ ہے، فقہ شافعی میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی فقہی آراء اوران کے مناہج فکر سے بہت فائدہ اٹھایا گیا ہے۔(۳۶)

امام شافعی رحمہ اللہ کا منہج استنباط

ائمہ اربعہ میں سے امام شافعی وہ خوش بخت انسان ہیں جنھیں اپنے مناہج فکر اور اصول استنباط واستخراج کو خود مدون کرنے کا موقع ملا ہے، امام صاحب کی تحریرات سے معلوم ہوتا ہے، وہ بالترتیب سات ادلہ کو پیش نظر رکھ کر مسائل مستنبط کرتے تھے۔

(۱) اولاً کتاب اللہ کی طرف رجوع کرتے اور اسے اپنے مسائل کی بنیاد بناتے۔

(۲) اگر کتاب اللہ میں حکم نہیں ملتا تو سنت رسول کی طرف متوجہ ہوتے۔

(۳) اگر سنت رسول میں کوئی حکم نہیں ملتا تو پھر اجماع امت کا سہارا لیتے۔

(۴) اگر ان تینوں میں حکم نہیں ملتا تو پہلے کتاب اللہ کی روشنی میں قیاس کرتے۔

(۵) پھر سنت رسول کی روشنی میں قیاس کرتے۔

(۶) اجماع کی روشنی میں قیاس کرتے۔

(۷) اور آخر میں مختلف فیہ احکام پر قیاس کرتے۔(۳۷)

فقہ حنبلی

فقہ حنبلی امام احمد بن حنبل کی طرف منسوب ہے، امام احمد بن حنبل بلند پایہ محدث ہونے کے ساتھ ساتھ فقہ شافعی کے سربراہ امام شافعی سے فقہ میں کمال پیدا کیا اور ان کی خدمت میں رہ کر ان کے اصول اور مصادر فقہ سے پوری طرح واقفیت حاصل کی اور پھر حدیث وفقہ کے امتزاج سے ایک نئے فقہی مسلک کی بنیاد

ڈالی، جو فقہ حنبلی کے نام سے موسوم ہوئی، آپ کی فقہ بہت سادہ اور زیادہ تر نصوص کے ظاہر تک محدود ہے، کیونکہ آپ عقل و درایت سے کام لینے کے زیادہ قائل نہ تھے، آپ کی فقہ کی بنیاد دراصل احادیث وآثار پر ہے، قیاس واجتہاد کو اس میں بہت کم دخل ہے، اس لیے بعض بعض مسائل میں امام صاحب کے سات سات اقوال بھی ملتے ہیں۔(۳۸)

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا طریقہ اجتہاد

وہ اصول استنباط اور مناہج استخراج جن پر امام احمد بن حنبل نے اپنے فقہ وفتاویٰ کی بنیاد رکھی ہے، علامہ ابن قیم حنبلی رحمہ اللہ کی تحقیق کے مطابق چار ہیں:

(۱)　نصوص: امام صاحب جب کسی مسئلہ میں قرآن وحدیث کی نص پاتے تو اس کے مطابق فیصلہ فرماتے اور اس کے خلاف جو اقوال وفتاویٰ ہوتے ان کا اعتبار نہیں کرتے۔

(۲)　فتاویٰ صحابہ: اگر کسی مسئلہ میں نص نہیں ملتی اور اس مسئلہ میں کسی صحابی کا فتویٰ ہوتا، اس کو اختیار کرتے اور صحابہ کے اقوال کے دائرہ سے باہر نہیں نکلتے۔

(۳)　اگر کسی مسئلہ میں مرفوع اور صحیح حدیث نہیں ملتی تو حدیث مرسل اور ضعیف کو اپنے فتویٰ کی بنیاد بنا لیتے۔

(۴)　ضرورۃً ہی قیاس سے کام لیتے۔(۳۹)

دیگر فقہی مکاتب

ائمہ اربعہ کے فقہی مکاتب ان کے طریقہ کار اور اصول فقہ کی تدوین کے ساتھ اسی دور میں بعض دیگر ائمہ مجتہدین کے فقہی مکاتب بھی وجود میں آئے، مثلاً امام ابوسعید، حسن بن یسار بصری، امام اوزاعی، امام سفیان بن سعید ثوری، امام لیث بن سعد، امام سفیان بن عیینہ، امام داود بن علی اصبھانی ظاہری، امام اسحاق بن راہویہ وغیرہ، لیکن ان حضرات کا مسلک مدون نہ ہو سکا، اس لیے امت مسلمہ کی اکثریت مذاہب اربعہ کی مقلد ہوئی اور قبول عام انہی ائمہ اربعہ کے مسائل مستخرج کو حاصل ہوا۔(۴۰)

فقہ اسلامی کا چوتھا دور

یہ دور تقلید شخصی کا دور ہے اور امت کا سواد اعظم تقلید شخصی کا پابند ہے اور امت کے علماء نے ائمہ اربعہ امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل میں سے کسی ایک کی تقلید کو امت کے لیے لازم اور ضروری قرار دیا ہے، چنانچہ اس دور میں بڑے بڑے علماء نے ان ائمہ کی تقلید کو اپنے لیے ضروری تصور کیا اور اس پر عمل کیا اور آج تک پوری امت سوائے چند حضرات کے تقلید شخصی کے وجوب کے قائل ہیں۔(۴۱)

فقہ اسلامی کا پانچواں دور

چوتھی صدی کے نصف آخر سے عصر حاضر تک ہے، اس دور کی چند خصوصیات درجِ ذیل ہیں:

الف: اس دور کے اہم امور میں سے یہ ہے کہ فقہی کتابوں کی طباعت شروع ہوئی اگر اس زمانہ میں کتابوں کی طباعت نہ ہوتی تو آج اتنی کتابیں میسر نہ ہوتیں۔

ب: فقہ کے قواعد اور اصطلاحات کتابی شکل میں جمع کیے گئے۔

ج: اسی عہد میں شخصی اور عائلی مسائل کو کتابی شکل میں جمع کیا گیا۔

د: اسی عہد میں فقہی تطبیقات کی تدوین اور کتب فتاویٰ کی تالیف ہوئی گو اس کا آغاز پہلے ہی ہو چکا تھا، مگر اس دور میں اس کی کثرت ہوگئی اس لیے جو حضرات سرکاری مفتی کی حیثیت سے کام کرتے تھے یا بلند پایہ علماء جن سے عوام الناس استفادہ کرتے تھے وہ اپنے فتاویٰ کو کتابی صورت میں جمع کرتے تھے ان میں سے اکثر کتب فتاویٰ ابواب فقہی پر مرتب کی گئی ہیں۔(۴۲)

ہ: اس عہد میں کتبِ فتاویٰ کی اہم کتابیں تصنیف کی گئیں، مثلاً فتاویٰ تاتارخانیہ، فتاویٰ خانیہ، فتاویٰ حامدیہ، فتاویٰ ہندیہ وغیرہ۔

و: اسی عہد میں مجلۃ الاحکام الشرعیہ کی اشاعت بحیثیت قانون مدنی از روئے فقہ احناف ہوئی۔

ز: اسی عہد میں قانون سازی کا حلقہ بے حد وسیع ہوگیا، چنانچہ تمام بلاد اسلامیہ میں مختلف موضوعات کے

متعلق قوانین وضع ہوئے ،مثلاً تجارتی قوانین، جائیداد کے قوانین، اصولی قوانین، جسے قانون اجراء اور قانونِ مرافعہ جس کو ہمارے یہاں قانونِ محکمات حقوق کہا جاتا ہے، مملکتِ عثمانیہ اور ممالکِ اسلامیہ جیسے شام، فلسطین اور عراق میں اس زور شور سے قوانین وضع ہوئے کہ قریب قریب فقہ کے تمام ابواب کے احکام میں کم وبیش قانونی تعدیل یا نسخ کا عمل نظر آتا ہے۔

عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

(۱) قرآن وحدیث کی بنیاد براہِ راست فرمانِ باری پر ہے، فرق یہ ہے کہ قرآن مجید میں الفاظ ومعانی دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور حدیث میں الفاظ اور تعبیر رسول اللہ کی طرف سے ہے، پس قرآن وحدیث کا سرچشمہ ذاتِ خداوندی ہے اور واسطہ رسول اللہ کا ہے، اس لیے اس کے ذریعہ جو علم حاصل ہوگا وہ معصوم ہوگا، یعنی غلطیوں اور خطاؤں سے محفوظ اور اجتہاد کے ذریعہ جو احکام اخذ کیے جاتے ہیں، ان میں خطاء کا احتمال موجود ہوتا ہے اور جب محفوظ طریقہ علم موجود ہو تو غیر محفوظ اور غلطی کا احتمال رکھنے والے ذریعہ علم کی ضرورت نہیں رہتی، اسی لیے عہدِ نبوی میں احکامِ فقہیہ کا مدار کتاب وسنت پر تھا۔

(۲) پھر چونکہ مکی زندگی میں آپ کے مخاطب زیادہ تر کفار ومشرکین تھے اور ابھی سب سے اہم مسئلہ ان کے دلوں میں ایمان کا پودا لگانے کا تھا، اس لیے زیادہ توجہ اعتقادی اور اخلاقی اصلاح کی طرف تھی، مکہ میں نبوت کے بعد آپ کا قیام بارہ سال پانچ مہینہ، تیرہ دن رہا ہے، قرآنِ مجید کی ایک سو چودہ سورتوں میں سے زیادہ تر سورتیں مکہ ہی میں نازل ہوئیں، کیونکہ بیس سورتوں کے مدنی ہونے پر اتفاق ہے اور بارہ کے مکی یا مدنی ہونے کی بابت اختلاف ہے، باقی بیاسی سورتیں بالاتفاق مکی ہیں۔

مکی زندگی میں قرآن کا خاص موضوع دعوتِ ایمان اور اصلاحِ عقیدہ تھا، ہاں بعض اصولی احکام اور بعض متفق علیہ برائیوں کی مذمت سے متعلق ہدایاتِ زندگی میں بھی دی گئیں، جیسے قتل ناحق کی ممانعت، لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کی مذمت، زنا کی حرمت، یتیموں کے ساتھ بدسلوکی کی ممانعت اور ناپ تول کو درست

رکھنے کی ہدایات، غیر اللہ پر جانور یا نذر کی ممانعت، ان ہی جانوروں کا گوشت کھانے کی اجازت جن پر ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا گیا ہو، عبادات میں بالاتفاق "نماز" مکی زندگی میں فرض ہوچکی تھی اور زکوٰۃ کے بارے میں اختلاف ہے، لیکن زکوٰۃ کا ذکر مکی آیات میں بھی ملتا ہے، ممکن ہے کہ مکہ میں اجمالی حکم دیا گیا ہو اور مدنی زندگی میں اس کی تنفیذ عمل میں آئی ہو، عملی زندگی سے متعلق احکام عام طور پر مدنی زندگی میں ہی دیئے گئے ہیں۔

(۳)　قرآنِ مجید میں جو فقہی احکام آئے ہیں، ان میں بعض اپنے منشاء ومراد کے اعتبار سے بالکل واضح ہیں، جیسے: نماز، روزہ، زکوٰۃ، وغیرہ کا فرض ہونا، زنا، قتل، تہمت تراشی کی حرمت، میراث کے احکام، نکاح میں محرم اور غیر محرم رشتہ داروں کی تعیین، یہ عقیدہ کے درجہ میں ہیں اور ان کا انکار موجب کفر ہے اور بعض میں ایک سے زیادہ معنوں کا احتمال اور اختلافِ رائے کی گنجائش ہے، لہٰذا ان مسائل میں استنباط میں اختلافِ رائے کی وجہ سے ایک دوسرے کی تکفیر نہیں کی جاسکتی۔

قرآن کا طرزِ بیان فقہی اور قانونی کتابوں جیسا نہیں ہے کہ ایک موضوع سے متعلق تمام مسائل ایک ہی جگہ ذکر کردیئے گئے ہوں، بلکہ قرآن میں حسب ضرورت ایک موضوع سے متعلق احکام مختلف مقامات پر آیا کرتے ہیں اور فقہی احکام کے ساتھ ترغیبات وترہیبات اور ان احکام کی حکمتوں اور مصلحتوں پر بھی روشنی ڈالی جاتی ہے، تاکہ انسان کو اس کے تقاضے پر عمل کرنے کی رغبت ہو، کیونکہ قرآن مجید کا اصل مقصد ہدایت ہے۔

(۴)　حدیث نبوی کے سلسلہ میں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ رسول اللہ کی دو حیثیتیں تھیں، ایک بشری اور دوسرے نبوی، چنانچہ آپ کی بشری حیثیت کو قرآن نے پوری تاکید سے بیان کیا ہے:

"قُل إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُم"۔(۴۳)

اس حیثیت سے آپ نے جو بات فرمائی ہو، اس کی حیثیت حکم شرعی کی نہیں ہوگی، جیسا کہ آپ نے ابتداء اہلِ مدینہ کو کھجور میں "تابیر" یعنی کھجور کے مادہ درخت میں نر درخت کے ایک خاص حصہ کو ڈالنے سے منع

فرمایا تھا، لیکن جب اس کی وجہ سے پیداوار گھٹ گئی تو آپ نے اپنی ہدایت کو واپس لے لیا اور فرمایا:

"انتم اعلم بأمر دنیاکم"(٤٤)

لیکن یہ فرق کرنا بہت دشوار ہے کہ آپ کے کون سے احکام بشری حیثیت سے تھے، اس لیے جب تک اس پر کوئی واضح دلیل موجود نہ ہو، آپ کے تمام فرمودات اور معمولات کی حیثیت شرعی ہی ہوگی۔

(٥) آپ کے بعض افعالِ طبعی نوعیت کے ہیں، مثلاً: آپ کے استراحت کا انداز، کسی غذا کا آپ کو پسند آنا اور کسی غذا کا آپ کو پسند نہ آنا، چلنے، بیٹھنے، گفتگو کرنے، ہنسنے اور مسکرانے کی مبارک ادائیں، ان میں جن امور کو باختیار عمل میں لایا جاسکتا ہو، وہ بھی مستحب کے درجہ میں ہوں گے اور جو باتیں آدمی کے ارادہ واختیار سے باہر ہیں، ان سے شرعی حکم متعلق نہیں ہوگا، کیونکہ حکم شرعی کا تعلق ارادہ واختیار اور قوت واستطاعت سے ہے۔

(٦) بعض افعال آپ نے بطورِ وقتی تدبیر کے کیے ہیں، جیسے میدانِ جنگ میں جگہ کا انتخاب، راستہ کا انتخاب، فوجوں کی صف بندی، وغیرہ، یہ احکام بحیثیت امیر آپ کی طرف سے تھے اور اس وقت جو صحابہ موجود تھے، ان پر اس کی اطاعت فرض تھی، آئندہ ان امور کے سلسلہ میں مناسب حال تدبیر کا اختیار کرنا درست ہوگا۔

(٧) جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ اس عہد میں احکامِ شرعیہ کا اصل ماخذ تو قرآن وحدیث ہی تھا، لیکن آپ سے اجتہاد کرنا بھی ثابت ہے، ایک خاتون آپ کی خدمت میں آئیں اور عرض کیا کہ میری والدہ کا انتقال ہوگیا، ان کے ذمہ نذر کے روزے باقی تھے، کیا میں ان کی طرف سے روزے رکھ لوں؟ آپ نے فرمایا اگر تمہاری ماں پر کسی کا قرض باقی ہوتا تو کیا اسے ادا کرتیں؟ انھوں نے کہا: ہاں! آپ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کا قرض زیادہ قابل ادائیگی ہے:

"فدین الله احق أن یقضی"(٤٥)

دیکھئے! یہاں حضور نے اجتہاد وقیاس سے کام لیا ہے، البتہ اگر آپ سے اجتہاد میں لغزش ہوجاتی

تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے متنبہ کر دیا جاتا، چنانچہ غزوہ بدر کے قیدیوں کے سلسلہ میں آپ نے فدیہ لے کر رہا کر دینے کا فیصلہ فرمایا، اس فیصلہ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ نازل ہوئی، اسی طرح غزوہ تبوک کے موقع سے آپ نے پیچھے رہ جانے والے منافقین کی معذرت اپنے اجتہاد سے قبول کی اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ ہوئی۔

پس آپ نے اجتہاد بھی فرمایا ہے، فرق یہ ہے کہ اگر آپ سے اجتہاد میں کوئی لغزش ہو جاتی تو آپ کو اس پر تنبیہ فرما دیا جاتا، اس لیے آپ کا اجتہاد بھی نص کے حکم میں ہے۔

(۸)　آپ کے عہد میں صحابہ نے بھی اجتہاد کیا ہے، آپ کی عدم موجودگی میں تو کیا ہی ہے، کیونکہ خود آپ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو اجازت دی تھی کہ اگر قرآن وحدیث میں حکم نہ ملے تو اجتہاد سے کام لو اور صحابہ نے آپ کے ارشاد پر عمل بھی کیا، مثلاً حضرت علی کے پاس یمن میں ایک لڑکے کے سلسلہ میں تین دعویدار پہنچے، حضرت علی نے پہلے تو ہر ایک کو راضی کرنے کی کوشش کی کہ وہ دوسرے کے حق میں دستبردار ہو جائے، لیکن جب کوئی اس پر آمادہ نہ ہوا تو قرعہ اندازی کر کے جس کے حق میں قرعہ نکلا اس کو لڑکا حوالہ کر دیا اور باقی دونوں سے کہا کہ وہ دونوں کو ایک ایک تہائی دیت ادا کرے:

"ومن حكم باجتهاده" (٤٦)

رسول اللہ کی عدم موجودگی میں صحابہ کے اجتہاد کے اور بھی متعدد واقعات موجود ہیں۔

(۹)　بعض اوقات حضور کی موجودگی میں بھی صحابہ نے اجتہاد فرمایا ہے، اس کی واضح مثال آپ کی موجودگی میں غزوہ بنوقریظہ کے موقع سے بنوقریظہ کے معاملہ میں حضرت سعد بن معاذ کا فیصلہ کرنا ہے، اسی طرح امام احمد نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے نقل کیا ہے کہ آپکی خدمت میں ایک مقدمہ آیا، آپ نے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو اس کا فیصلہ کرنے کا حکم فرمایا، انھوں نے معذرت بھی کرنی چاہی، لیکن آپ نے حکم دیا اور فرمایا کہ اگر صحیح فیصلہ کرو گے تو دس نیکیاں ملیں گی اور اگر کوشش کے بعد غلطی ہو جائے، تب بھی ایک

نیکی ضرور ہی حاصل ہو گی۔(۴۷)

(۱۰) عرب چونکہ اصل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امت تھے، اس لیے بہت سی روایات ورواجات، صالح، منصفانہ اور شریفانہ بھی پائے جاتے تھے، جیسے: قصاص، دیت، قسامت، مقدمات کے ثابت کرنے کا طریقہ، نکاح میں حرام رشتے وغیرہ، لیکن بہت سے طریقے غیر شریفانہ اور غیر منصفانہ تھے، شریعتِ اسلامی نے عام طور پر پہلی قسم کے احکام کو باقی رکھا اور دوسری قسم کے احکام کی اصلاح فرمائی، یہاں اختصار کے ساتھ کچھ اصلاحی ہدایات وترمیمات کا ذکر کیا جاتا ہے:

زمانہ جاہلیت میں ایک طریقہ "نکاح شغار" کا تھا، دو مرد ایک دوسرے سے اپنی محرم خاتون کا نکاح کرتے تھے اور ایک نکاح کو دوسرے کے لیے مہر ٹھہراتے تھے، رسول اللہ نے اس سے منع فرمایا، اسی کو نکاحِ شغار کہا جاتا تھا۔(۴۸)

والد کی وفات کے بعد لڑکا سوتیلی ماں سے اپنا نکاح کر لیتا تھا، اگر وہ خود نکاح نہ کرتا تو اسے یہ حق ہوتا کہ کسی اور سے نکاح کر دے اور مہر وصول کر لے یا اسے نکاح کرنے سے روک دے، یہاں تک کہ اس کی موت ہو جائے اور یہ اس کے مال کا وارث ہو جائے، قرآن نے اس طریقہ کی مذمت فرمائی اور اس سے منع کر دیا۔

نکاح میں دو بہنوں کو جمع کیا جاتا تھا اور غیر محدود تعداد ازدواج کی اجازت تھی، یہاں تک کہ جب غیلان ثقفی مسلمان ہوئے تو ان کی دس بیویاں تھیں، قرآن نے دو بہنوں کو جمع کرنے اور چار سے زیادہ نکاح کرنے کو منع فرما دیا۔

زمانہ جاہلیت میں منہ بولے بیٹے اور بیٹی کو بھی اپنی اولاد کا درجہ دیا جاتا تھا، نکاح کے معاملہ میں بھی اور میراث کے معاملہ میں بھی، اللہ تعالیٰ نے اس کی تردید فرمائی:

" وَمَا جَعَلَ أَدعِيَاءَ كُم أَبنَاءَ كُم "(۴۹)

زمانہ جاہلیت میں عورت کے مہر پر ولی قبضہ کر لیتا تھا، قرآن مجید نے کہا کہ عورت کا مہر عورت کو دیا جائے "وَآتُوا النِّسَاء صَدُقَاتِهِنَّ نِحلَةً" (۵۰)

طلاق کی کوئی تعداد متعین نہ تھی، جتنی چاہتے طلاق دیتے جاتے اور عورت کو نکاح سے آزاد بھی نہ ہونے دیتے۔ قرآن نے طلاق کو تین تک محدود کر دیا۔

"ایلاء" سال دو سال کا بھی ہوا کرتا تھا، جو ظاہر ہے کہ عورت کے لیے نہایت ہی تکلیف دہ بات تھی، قرآن مجید نے چار ماہ کی مدت مقرر کر دی کہ اگر قسم کھا کر اس سے زیادہ بیوی سے بے تعلق رہے تو طلاق واقع ہو جائے گی۔ ظہار یعنی بیوی کو محرم کے کسی عضو حرام سے تشبیہ دینے کو طلاق تصور کیا جاتا تھا، قرآن نے اسے طلاق تو قرار نہیں دیا، لیکن اس پر کفارہ واجب قرار دیا۔

عدت سال بھر ہوا کرتی تھی، قرآن نے وضع حمل اور غیر حاملہ کے لیے وفات کی صورت میں چار ماہ دس دن اور طلاق کی صورت میں جوان عورت کے لیے تین حیض اور دوسروں کے لیے تین ماہ قرار دی۔

اسلام سے پہلے وارث اور غیر وارث دونوں کے لیے جتنے مال کی چاہے وصیت کر سکتے تھے، اسلام نے وارث کے لیے وصیت کو غیر معتبر قرار دیا اور وصیت کی مقدار ایک تہائی تک محدود کر دیا۔

میراث کا قانون بڑا ظالمانہ تھا، صرف ان مردوں کو جو جنگ میں لڑنے کے قابل ہوتے، انھیں میراث دی جاتی تھی اور نابالغوں کے لیے میراث میں حصہ نہیں تھا، اسلام نے عورتوں اور نابالغ بچوں کو حق میراث عطا کیا۔

عرب سود کو درست سمجھتے تھے، اسلام نے نہایت سختی کے ساتھ اس کو منع کر دیا۔

مال رہن کا قرض دینے والا مالک ہو جاتا تھا، اگر مقروض نے وقت پر قرض ادا نہیں کیا، اسلام نے اس بات کی تو اجازت دی کہ اگر مقروض قرض ادا نہیں کرے تو بعض صورتوں میں مال کو فروخت کر کے اپنا قرض وصول کر لے اور باقی پیسہ واپس کر دے، لیکن یہ درست نہیں کہ پورے مال رہن کا مالک

ہو جائے۔(۵۱)

زمانہ جاہلیت میں ایک طریقہ یہ تھا کہ خرید و فروخت کے درمیان اگر بیچی جانے والی شئی کو چھوڑ دیا، یا اس پر کنکری پھینک دی تو اس کے ذمہ اس کا خریدنا لازم ہو گیا، جس کو منابذہ، ملامسہ، بیع حصا کہا کرتے تھے، رسول اللہ نے اس طریقہ پر خرید و فروخت کو منع فرمایا، بیع ملامسہ وغیرہ کی بعض اور تعریفیں بھی کی گئی ہیں جسے بیع کے لفظ میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

لوگ کسی سامان کی قیمت کو بڑھانے کے لیے مصنوعی طور پر بولی لگا دیتے تھے، اس کو "نجش" کہتے ہیں، آپ نے اس کو بھی منع فرمایا۔

قتل اور جسمانی تعدی میں لوگ صرف قاتل اور ظالم ہی سے بدلہ نہیں لیتے تھے، بلکہ اس کے متعلقین اور پورے قبیلہ کو مجرم کا درجہ دیتے تھے، قرآن نے اس کو منع کیا اور صرف مجرم کو سزاوار ٹھہرایا۔

حج میں قریش مزدلفہ سے آگے نہیں جاتے تھے اور اسے اپنے لیے باعثِ ہتک سمجھتے تھے، قرآن مجید نے سب کو عرفات جانے کا حکم دیا، بلکہ وقوفِ عرفہ کو حج کا رکنِ اعظم قرار دیا گیا۔

پس زمانہ جاہلیت کے بہت سے احکام میں شریعتِ اسلامی نے اصلاح کی اور جو رواجات عدل وانصاف کے تقاضوں کے خلاف تھے، ان کو کالعدم قرار دے دیا۔

دوسرا مرحلہ خلافتِ راشدہ

یہ عہد ۱۱ ہجری سے شروع ہو کر ۴۰ ہجری پر ختم ہوتا ہے۔

(۱)　اس عہد میں احکامِ شریعت کے اخذ واستنباط کا سرچشمہ قرآن مجید اور حدیثِ نبوی کے علاوہ اجماعِ امت اور قیاس تھا، چنانچہ حضرت عمر نے قاضی شریح کو جو خط لکھا، اس میں حسب ذیل نصیحت فرمائی:

"جب کتاب اللہ میں کوئی حکم پاو تو اس کے مطابق فیصلہ کرو، کسی اور طرف توجہ نہ کرو، اگر کوئی ایسا معاملہ سامنے آئے کہ کتاب اللہ میں اس کا حکم نہ ہو، تو رسول اللہ کی سنت کے مطابق فیصلہ کرو، اگر کتاب اللہ

میں نہ ملے اور نہ سنتِ رسول میں، تو جس بات پر لوگوں کا اجماع ہو اس کے مطابق فیصلہ کرو، نہ کتاب اللہ میں ہو، نہ سنتِ رسول میں اور نہ تم سے پہلوں نے اس سلسلہ میں کوئی رائے ظاہر کی ہو، تو اگر تم اجتہاد کرنا چاہو تو اجتہاد کے لیے آگے بڑھو اور اس سے پیچھے ہٹنا چاہو، تو پیچھے ہٹ جاو اور اس کو میں تمہارے حق میں بہتر ہی سمجھتا ہوں"۔(۵۲)

(۲) حضرت ابوبکر بھی اس بات کے لیے کوشاں رہتے تھے کہ جن مسائل کے بارے میں قرآن وحدیث کی کوئی نص موجود نہ ہو، ان میں اہم شخصیتوں کو جمع کیا جائے اور ان سے مشورہ کیا جائے اور اگر وہ کسی بات پر متفق ہو جائیں تو اس کے مطابق فیصلہ کیا جائے، چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر جو اتفاق ہوا، وہ آپ ہی کی پہل پر، اسی طرح بعض مسائل پر اجماع منعقد ہونے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی سعی کو دخل رہا ہے، جیسے مانعین زکوٰۃ سے جہاد، رسول اللہ کی متروکات میں میراث کا جاری نہ ہونا، رسول اللہ کا آپ کی جائے وفات پر دفن کیا جانا، قرآن مجید کی جمع وترتیب، وغیرہ۔

(۳) چونکہ رسول اللہ کے بعد غیر منصوص مسائل میں اجتہاد کے سوا چارہ نہیں تھا، اس لیے صحابہ کے درمیان اختلافِ رائے بھی پیدا ہوا، بعض مواقع پر کوشش کی گئی کہ لوگوں کو ایک رائے پر جمع کیا جائے، لیکن اس کے باوجود نقاطِ نظر کا اختلاف باقی رہا، صحابہ کا مزاج یہ تھا کہ وہ اس طرح کے اختلافات کو مذموم نہیں سمجھتے تھے اور پورے احترام اور فراخ قلبی کے ساتھ دوسرے کو اختلاف کا حق دیتے تھے، اس کی چند مثالیں یہاں ذکر کی جاتی ہیں:

حضرت عمر اور عبداللہ بن مسعود کے نزدیک بیوہ حاملہ عورت کی عدت ولادت تک تھی اور غیر حاملہ کی چار مہینے دس روز، حضرت علی اور عبداللہ بن عباس کا نقطہ نظر یہ تھا کہ ولادت اور چار ماہ دس دنوں میں سے جو مدت طویل ہو وہ عدتِ وفات ہوگی۔

حضرت عمر اور عبداللہ بن مسعود کے نزدیک مطلقہ عورت کی عدت تیسرے حیض کے غسل کے بعد

پوری ہوتی تھی اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے نزدیک تیسرا حیض شروع ہوتے ہی عدت پوری ہو جاتی تھی، حضرت ابو بکر اور عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ باپ کی طرح دادا بھی سگے بھائیوں کو میراث سے محروم کر دے گا، حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو اس سے اختلاف تھا۔

ایک بڑا اختلاف عراق و شام کی فتوحات کے وقت پیدا ہوا، حضرت عبد الرحمٰن بن عوف اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کا نقطہ نظر یہ تھا کہ مالِ غنیمت کے عام اصول کے مطابق اسے مجاہدین پر تقسیم کر دیا جائے اور حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی وغیرہ کی رائے تھی کہ اسے بیت المال کی ملکیت میں رکھا جائے، تاکہ تمام مسلمانوں کو اس سے نفع پہنچے اور طویل بحث و مباحثہ کے بعد اسی پر فیصلہ ہوا۔

حضرت عثمانِ غنی کا فتویٰ یہ تھا کہ خلع حاصل کرنے والی عورت پر عدت واجب نہیں، صرف فراغتِ رحم کو جاننے کے لیے ایک حیض گذارنا ضروری ہوگا، دوسرے صحابہ مکمل عدت گذارنے کو واجب قرار دیتے تھے۔

اس طرح کے بیسیوں اختلاف عہدِ صحابہ میں موجود تھے، کتبِ فقہ اور خاص کر شروحِ حدیث ان کی تفصیلات سے بھری پڑی ہیں اور موجودہ دور کے معروف صاحب علم ڈاکٹر رواس قلعہ جی نے صحابہ کی موسوعات کو جمع کرنے کا کام شروع کیا ہے، اس سے مختلف صحابہ کی فقہ اور ان کا فقہی ذوق اور منہج استنباط واضح طور پر سامنے آتا ہے۔

(۴) حضرت عمر نے لوگوں کو بعض اختلافی مسائل میں ایک رائے پر جمع کرنے کی خاص طور پر کوشش فرمائی، چنانچہ بعض مسائل پر اتفاق رائے ہو گیا اور جن میں اتفاق نہیں ہو سکا، ان میں بھی کم سے کم جمہور ایک نقطہ نظر پر آ گئے، ان میں سے چند مسائل یہ ہیں:

اس وقت تک شراب نوشی کی کوئی سزا متعین نہیں تھی، حضرت عمر نے اس سلسلہ میں اکابر صحابہ سے مشورہ کیا، حضرت علی نے فرمایا کہ جب کوئی شخص شراب پیتا ہے تو نشہ میں مبتلا ہوتا ہے، پھر نشہ کی حالت میں ہذیان گوئی شروع کرتا ہے اور اسمیں لوگوں پر بہتان تراشی بھی کر گزرتا ہے، اس لیے جو سزا تہمت اندازی

(قذف) کی ہے، یعنی اسی (۸۰) کوڑے، وہی سزا شراب نوشی پر بھی دے دی جانی چاہئے، چنانچہ اسی پر فیصلہ ہوا، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے بھی اسی (۸۰) کوڑے کا مشورہ دیا تھا۔

اگر کوئی شخص لفظ بتہ کے ذریعہ طلاق دے، تو اس میں ایک طلاق کا معنی بھی ہوسکتا ہے اور تین طلاق کا بھی، چنانچہ ہوتا یہ تھا کہ طلاق دینے والے کی نیت کے مطابق فیصلہ کیا جاتا تھا، حضرت عمر کا احساس یہ تھا کہ بعض لوگ اس گنجائش سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں اور غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے کہہ دیتے ہیں کہ میری نیت ایک طلاق کی تھی، اس لیے انھوں نے اس کے تین طلاق ہونے کا فیصلہ فرمایا۔

رسول اللہ سے نمازِ تراویح کی رکعات کی تعداد صحیح طور پر ثابت نہیں ہے، کیونکہ آپ نے اس نماز کے واجب ہوجانے کے اندیشے سے دو تین شب کے علاوہ صحابہ کے سامنے یہ نماز ادا نہیں فرمائی، مختلف لوگ تنہا تنہا پڑھ لیتے تھے، حضرت عمر نے ایک جماعت بنادی، ان پر حضرت ابی بن کعب کو امام مقرر کیا اور تراویح کی بیس رکعتیں مقرر فرمادیں، جو آج تک متوارثاً چلا آرہا ہے۔

(۵)　صحابہ اور خاص کر حضرت عمر نے بعض فیصلے شریعت کی مصلحت اور اس کے عمومی مقاصد کو سامنے رکھ کر بھی کئے ہیں، جیسے: حضرت عمر نے اپنے عہد میں "مولف القلوب" جو زکوٰۃ کی ایک اہم مد ہے، کو روک دیا تھا، کیونکہ مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی تھی اور اسلام کی شوکت قائم ہوگئی تھی، لہٰذا ان کے خیال میں اب اس مد کی ضرورت باقی نہیں تھی۔

حضرت عمر کے دور میں ایک شدید قحط پڑا کہ لوگ اضطرار کی کیفیت میں مبتلا ہوگئے، اس زمانہ میں حضرت عمر نے چوری کی سزا موقوف فرمادی، اسی طرح حضرت حاطب بن بلتعہ کے غلاموں نے قبیلہ مزینہ کے ایک شخص کی اونٹنی چوری کرلی، آپ نے ان غلاموں کے ہاتھ نہیں کاٹے، حضرت عمر کا نقطہ نظر یہ تھا کہ اس وقت لوگ حالتِ اضطرار میں ہیں اور اضطراری حالت میں چوری کرنے سے حد جاری نہیں ہوگی، کیونکہ انسان

اختیاری افعال کے بارے میں جواب دہ ہے، نہ کہ اضطراری افعال کے بارے میں۔

حضور نے بھٹکی ہوئی اونٹنی کو پکڑنے سے منع فرمایا، کیونکہ وہ خود اپنی حفاظت کر سکتی ہے، یہاں تک کہ اس کا مالک اس کو پالے، حضرت ابوبکر و عمر کے دور میں اسی پر عمل رہا، لیکن حضرت عثمان غنی نے اپنے زمانہ میں ایسی اونٹنی کو پکڑ لینے اور بیچ کر اس کی قیمت کو محفوظ رکھنے کا حکم دیا تا آنکہ اس کا مالک آجائے۔

کیونکہ اخلاقی انحطاط کی وجہ سے اس بات کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ بدقماش لوگ ایسی اونٹنی کو پکڑ لیں، گویا منشا اونٹنی کی حفاظت تھا، طریقہ کار، زمانہ کے حالات کے لحاظ سے بدل گیا۔

اسی طرح اگر کوئی شخص مرضِ وفات میں اپنی بیوی کو طلاق بائن دے دے، تو شریعت کے عمومی اصول کا تقاضا تو یہی تھا کہ مطلقہ کو اس مرد سے میراث نہ ملے، لیکن چونکہ اس کو بعض غیر منصف مزاج لوگ بیوی کو میراث سے محروم کرنے کا ذریعہ بنا سکتے تھے، اس لیے صحابہ نے ظلم کے سد باب کی غرض سے ایسی مطلقہ کو بھی مستحق میراث قرار دیا، حضرت عثمان غنی کا خیال تو یہ تھا کہ اگر عدت ختم ہونے کے بعد شوہر کی موت ہو، تب بھی عورت وارث ہوگی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے تھی کہ عدت کے اندر شوہر کی وفات کی صورت میں عورت کو میراث ملے گی۔

اسی طرح امن وامان اور حفاظتِ جان کی مصلحت کے پیشِ نظر حضرت علی کے مشورہ پر حضرت عمر نے فرمایا کہ اگر ایک شخص کے قتل میں ایک جماعت شریک ہو تو تمام شرکاء قتل کیے جائیں گے۔

(۶) صحابہ فروعی مسائل میں اختلاف رائے کو برا نہیں سمجھتے تھے اور ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے، ایک دوسرے کی اقتداء میں نماز ادا کرتے تھے، اگر کوئی شخص سوال کرنے آئے تو ایک دوسرے کے پاس تحقیق مسئلہ کے لیے بھیجتے تھے اور اپنی رائے پر شدت نہ اختیار کرتے تھے، حضرت عمر سے ایک صاحب ملے اور حضرت علی اور زید بن ثابت کا فیصلہ انھیں سنایا، حضرت عمر نے سن کر کہا: کہ اگر میں فیصلہ کرتا تو اس کے برخلاف اس طرح کرتا، ان صاحب نے کہا کہ آپ کو تو اس کا حق اور اختیار حاصل ہے، پھر آپ اپنی رائے

کے مطابق فیصلہ فرمادیں، حضرت عمر نے فرمایا کہ اگر میرے پاس اللہ، رسول کا حکم ہوتا تو میں اس کو نافذ کر دیتا، لیکن میری بھی رائے ہے اور رائے میں سب شریک ہیں، چنانچہ انھوں نے حضرت علی اور حضرت زید کے فیصلہ کو برقرار رکھا:

"والرای مشترك فلم ینقص ماقال علی وزید"(۵۳)

(۷)　فقہاءِ صحابہ کے درمیان اختلافِ رائے کے مختلف اسباب ہیں:

(الف)　قرآن وحدیث کے کسی لفظ میں ایک سے زیادہ معنوں کا احتمال، جیسے قرآن نے تین "قرو" کو عدت قرار دیا ہے "قرا" کے معنی حیض کے بھی ہیں اور طہر کے بھی، چنانچہ حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم نے اس سے حیض کا معنی مراد لیا اور حضرت عائشہ، حضرت زید بن ثابت نے طہر کا۔

(ب)　بعض احادیث ایک صحابی تک پہنچی اور دوسرے تک نہیں پہنچی، جیسے جدہ کی میراث کے سلسلہ میں حضرت ابوبکر اس بات سے واقف نہیں تھے کہ آپ نے اسے چھٹا حصہ دیا ہے، حضرت مغیرہ بن شعبہ اور محمد بن مسلم نے شہادت دی کہ حضور نے دادی کو چھٹا حصہ دیا ہے، چنانچہ اسی پر فیصلہ ہوا۔

(ج)　بعض دفعہ حضور کے کسی عمل کا مقصد ومنشاء متعین کرنے میں اختلافِ رائے ہوتا تھا، جیسے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی رائے تھی کہ طواف میں رمل کا عمل آپ نے مشرکین کی تردید کے لیے فرمایا، جو کہتے تھے کہ مدینہ کے بخار نے مسلمانوں کو کمزور کر کے رکھ دیا ہے، یہ آپ کی مستقل سنت نہیں، دوسرے صحابہ اس کو مستقل قرار دیتے تھے، یا حج میں منی سے مکہ لوٹتے ہوئے وادی ابطح میں توقف، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عائشہ اسے سنت نہیں سمجھتے تھے اور اس کو حضور کا ایک طبعی فعل قرار دیتے تھے کہ اس کا مقصد آرام کرنا تھا، لیکن دوسرے صحابہ اسے سنت قرار دیتے تھے۔

جن مسائل میں کوئی نص موجود نہ ہوتی اور اجتہاد سے کام لیا جاتا، ان میں نقطہ نظر کا اختلاف پیدا ہوتا،

مثلاً اگر کوئی مرد کسی عورت سے عدت کے درمیان نکاح کر لے، تو حضرت عمر بطورِ سرزنش اس عورت کو ہمیشہ کے لیے اس مرد پر حرام قرار دیتے تھے اور حضرت علی کی رائے یہ تھی کہ دونوں میں تفریق کر دی جائے اور سرزنش کی جائے، لیکن اس کی وجہ سے ان دونوں مرد وعورت کے درمیان دائمی حرمت پیدا نہیں ہوگی، اسی طرح حضرت ابو بکر کا طریقہ یہ تھا کہ بیت المال میں جو کچھ آتا، اسے تمام مسلمانوں پر مساوی تقسیم فرماتے اور حضرت عمر نے اپنے زمانہ میں برابر تقسیم کرنے کے بجائے لوگوں کے درجہ ومقام اور اسلام کے لیے ان کی خدمات کو سامنے رکھ کر تقسیم کرنا شروع کیا۔

(۸) غور کیا جائے! تو صحابہ کے درمیان اختلاف رائے کا ایک سبب ذوق اور طریقہ استنباط کا فرق بھی تھا، بعض صحابہ کا مزاج حدیث کے ظاہری الفاظ پر قناعت کا تھا، جیسے حضرت ابو ہریرہ، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت ابوذر غفاری وغیرہ بعض صحابہ حدیث کے مقصد ومنشاء پر نظر رکھتے تھے اور قرآن مجید اور دین کے عمومی مزاج ومذاق کی کسوٹی پر اسے پرکھنے کی کوشش کرتے تھے، حضرت عمر، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت علی وغیرہ اسی گروہ سے تعلق رکھتے تھے، چند مثالوں سے اس کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے:

حضرت فاطمہ بنت قیس نے روایت کیا کہ مطلقہ بائنہ عدت میں نہ نفقہ کی حق دار ہے، نہ رہائش کی، حضرت عمر نے سنا تو اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ میں ایک عورت کی بات پر نہ معلوم کہ اس نے یاد رکھا یا بھول گئی، کتاب اللہ اور سنتِ رسول کو نہیں چھوڑ سکتا حضرت عمر کو خیال تھا کہ یہ فاطمہ بنت قیس کا وہم ہو سکتا ہے، کیونکہ قرآن میں مطلقہ کے لیے رہائش فراہم کرنے کی ہدایت موجود ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر نے روایت کیا کہ مردہ کو لوگوں کے اس پر رونے کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے، حضرت عائشہ نے اس پر نکیر فرمائی اور کہا کہ یہ قرآن کے حکم "وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزرَ أُخرَىٰ" (۵۴) یعنی "ایک شخص پر دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہیں ہوگا" کے خلاف ہے۔

حضرت ابو ہریرہ نے روایت کیا کہ جنازہ کو اٹھانے والے پر وضو واجب ہے، حضرت عبداللہ بن

عباس نے سوال کیا کہ کیا سوکھی ہوئی لکڑیوں کو چھونے سے وضوٹوٹ جاتا ہے، حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا کہ پھر تو گرم پانی سے غسل کیا جائے تو اس سے بھی وضو واجب ہو جائے گا؟ اس طرح کی بہت سی مثالیں صحابہ کے درمیان باہمی مناقشات کی پائی جاتی ہیں، جن سے ظاہر ہے کہ مسائل شرعیہ کو اخذ کرنے کے سلسلہ میں دونوں طرح کا ذوق پایا جاتا تھا اور یہی ذوق بعد کو فقہاء مجتہدین تک منتقل ہوا اور اس کی وجہ سے الگ الگ دبستانِ فقہ وجود میں آئے۔

(۹) اس عہد میں سب سے اہم کام حضرت ابوبکر کے عہدِ خلافت میں سرکاری طور پر قرآن مجید کی جمع وتدوین کا اور حضرت عثمان غنی کے دور میں قرات قریش پر مصحفِ قرآنی کی کتابت اور اس کی اشاعت کا ہوا، حضرت عمر کے دل میں جمع احادیث کا داعیہ بھی پیدا ہوا، لیکن انھوں نے کافی غور وفکر اور تقریباً ایک ماہ استخارہ کرنے کے بعد اس کا ارادہ ترک کر دیا کہ کہیں یہ قرآن مجید کی طرف سے بے توجہی اور بے التفاتی کا سبب نہ بن جائے۔(۵۵)

(۱۰) یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ صحابہ سب کے سب فقیہ ومجتہد تھے، بلکہ ایک محدود تعداد ہی اس جانب متوجہ تھی، کیونکہ استعداد وصلاحیت کے فرق کے علاوہ دین کے بہت سے کام اور وقت کے بہت سے تقاضے تھے اور سب کے لیے افرادِ کار کی ضرورت تھی، علامہ ابن قیم نے ان صحابہ کا ذکر کیا ہے، جن سے فتاویٰ منقول ہیں، مرد وخواتین کو لیکر ان کی تعداد ۱۳۰ ہوتی ہے، پھر ان کے تین گروہ کئے ہیں، ایک وہ جن سے بہت زیادہ فتاویٰ منقول ہیں، ان کی تعداد سات ہے، حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عائشہ، حضرت زید بن ثابت، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن عمر، خلیفہ مامون کے پڑپوتے ابوبکر محمد نے صرف حضرت عبداللہ بن عباس کے فتاویٰ کو جمع کیا تو ان کی بیس جلدیں ہوئیں۔

بیس صحابہ متوسطین میں شمار کئے گئے ہیں، جن سے بہت زیادہ نہیں، لیکن مناسب تعداد میں فتاویٰ منقول ہیں اور بقول ابنِ قیم ان کے فتاویٰ کو ایک چھوٹے جزء میں جمع کیا جا سکتا ہے، حضرت ابوبکر، حضرت

عثمان، حضرت ام سلمہ اور حضرت ابو ہریرہ وغیرہ اسی گروہ میں ہیں، بقیہ صحابہ وہ ہیں جن سے ایک دو مسئلہ میں فتویٰ دینا منقول ہے، ان کی تعداد (۱۲۵) ہے، اسی گروہ میں حضرت حسن وحسین، سید النساء حضرت فاطمہ، حضرت حفصہ، حضرت صفیہ، حضرت ام حبیبہ، حضرت میمونہ، حضرت بلال، حضرت عباد اور حضرت امِ ایمن وغیرہ ہیں۔(۵٦)

تیسرا مرحلہ اصاغر صحابہ اور اکابر تابعین

یہ مرحلہ حضرت معاویہ کی امارت سے شروع ہوتا ہے اور بنو امیہ کی حکومت کے خاتمہ کے قریبی زمانہ تک کا احاطہ کرتا ہے، اس عہد میں بھی بنیادی طور پر اجتہاد واستنباط کا وہی منہج رہا جو صحابہ نے اختیار کیا تھا اس عہد کی چند خصوصیات قابل ذکر ہیں:

(۱)　فقہاء صحابہ کسی ایک شہر میں مقیم نہیں رہے، بلکہ مختلف شہروں میں مختلف صحابہ کا ورود ہوا، وہاں لوگوں نے ان سے استفادہ کیا اور اس شہر میں ان کی آراء اور فتاویٰ کو قبولیت حاصل ہوئی، مدینہ میں حضرت عبداللہ بن عمر، مکہ میں حضرت عبداللہ بن عباس اور ان کے تلامذہ مجاہد بن جبیر، عطاء بن ابی رباح، طاوس بن کیسان، کوفہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کے شاگردانِ باتوفیق، علقمہ، نخعی، اسود بن یزید اور ابراہیم نخعی، بصرہ میں حضرت ابوموسیٰ اشعری، حضرت حسن بصری، حضرت انس بن مالک اور ان کے شاگرد محمد بن سیرین، شام میں حضرت معاذ بن جبل، حضرت عبادہ بن صامت اور ان صحابہ سے استفادہ کرنے والے تابعین، ابوادریس خولانی، اسی طرح مصر میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص اور ان کے بعد یزید بن حبیب وغیرہ کے فتاویٰ کو بقبول حاصل ہوا۔

(۲)　صحابہ اور فقہاءِ تابعین کے مختلف شہروں میں مقیم ہونے کی وجہ سے فقہی مسائل میں اختلاف کی بھی کثرت ہوئی، کیونکہ ایک تو خلافتِ راشدہ میں خاص کر حضرت عثمان غنی کی شہادت تک اہل علم یکجا تھے یا ایک دوسرے سے قریب واقع تھے، اس کی وجہ سے بہت سے مسائل میں اتفاق رائے ہوجاتا تھا، اب عالم اسلام کا

دائرہ وسیع ہو جانے، دراز شہروں میں مقیم ہونے اور ذرائع ابلاغ کے مفقود ہونے کی وجہ سے اجتماعی اجتہاد کی جگہ انفرادی اجتہاد کا غلبہ تھا، دوسرے مختلف شہروں کے خالات، رواجات، کاروباری طریقے اور لوگوں کے فکری وعملی رجحانات بھی مختلف تھے، اس اختلاف کا اثر مختلف شہروں میں بسنے والے فقہاء کے نقطہ نظر پر بھی پڑتا تھا، اس لیے بمقابلہ گذشتہ ادوار کے، اس دور میں اختلافِ رائے کی کثرت ملتی ہے۔

(۳) یوں تو اکابرِ صحابہ میں بھی دونوں طرح کے فقہاء پائے جاتے تھے، ایک وہ جن کی نگاہ حدیث کے ظاہری الفاظ پر ہوتی تھی، دوسرے وہ جو معانی حدیث کے غواص تھے اور احکامِ شرعیہ میں شریعت کی مصالح اور لوگوں کے احوال کو بھی پیشِ نظر رکھتے تھے، تابعین کے عہد میں یہ دونوں طریقہ اجتہاد اور ان کے طرزِ استنباط کا تفاوت زیادہ نمایاں ہو گیا، جو لوگ ظاہر حدیث پر قانع تھے وہ "اصحاب الحدیث" کہلائے اور جو نصوص اور ان کے مقاصد ومصالح کو سامنے رکھ کر رائے قائم کرتے تھے وہ "اصحاب الرائے" کہلائے، اصحاب الحدیث کا مرکز مدینہ تھا اور اصحاب الرائے کا عراق اور خاص طور پر عراق کا شہر کوفہ، گو مدینہ میں بعض ایسے اہل علم موجود تھے، جو اصحاب الرائے کے طریقہ استنباط سے متاثر تھے، جیسے امام مالک کے استاذ ربیعہ بن عبدالرحمن، جو اصحاب الرائے کے طرزِ استنباط میں ماہر ہونے سے "ربیع الرای" کہلائے اور "رائی" ان کے نام کا جزو ٹھہرا، اسی طرح کوفہ میں امام عامر شراحیل شعبی جو امام ابو حنیفہ کے اساتذہ میں ہیں، لیکن ان کا منہج اصحاب الحدیث کا تھا۔

اصحاب الرائی اور اصحاب الحدیث کے درمیان دو امور میں نمایاں فرق تھا، ایک یہ کہ اصحاب الحدیث کسی حدیث کو قبول اور رد کرنے میں محض سند کی تحقیق کو کافی سمجھتے تھے اور خارجی وسائل سے کام نہیں لیتے تھے، اصحاب الرائے اصولِ روایت کے ساتھ اصولِ درایت کو بھی ملحوظ رکھتے تھے، وہ حدیث کو سند کے علاوہ اس طور پر بھی پرکھتے تھے کہ وہ قرآن کے مضمون سے ہم آہنگ ہے یا اس سے متعارض؟ دین کے مسلمہ اصول اور مقاصد کے موافق ہے یا نہیں؟ دوسری مشہور حدیثوں سے متعارض تو نہیں ہے؟ صحابہ کا اس حدیث پر عمل تھا

یا نہیں؟ اور نہیں تھا تو اس کے اسباب کیا ہو سکتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اصحاب الرائی کا منہج زیادہ درست بھی تھا اور دشوار بھی، دوسرا فرق یہ تھا کہ اصحاب الحدیث ان مسائل سے آگے نہیں بڑھتے تھے جو حدیث میں مذکور ہوں، یہاں تک کہ بعض اوقات کوئی مسئلہ پیش آجاتا اور ان سے اس سلسلہ میں رائے دریافت کی جاتی، اگر حدیث میں اس کا ذکر نہیں ہوتا تو وہ جواب دینے سے انکار کر جاتے اور لوگ ان کی رہنمائی سے محروم رہتے، ایک صاحب سالم بن عبداللہ بن عمر کے پاس آئے اور ایک مسئلہ دریافت کیا، انھوں نے کہا کہ میں نے اس سلسلہ میں کوئی حدیث نہیں سنی، استفسار کرنے والے نے کہا کہ آپ اپنی رائے بتائیں، انھوں نے انکار کیا، اس نے دوبارہ استفسار کیا اور کہا کہ میں آپ کی رائے پر راضی ہوں، سالم نے کہا کہ اگر اپنی رائے بتاؤں تو ہوسکتا ہے کہ تم چلے جاؤ اس کے بعد میری رائے بدل جائے اور میں تم کو نہ پاؤں۔(۵۷)

یہ واقعہ ایک طرف ان کے احتیاط کی دلیل ہے، لیکن سوال ہے کہ کیا ایسی احتیاط سے امت کی رہنمائی کا حق ادا ہوسکتا ہے؟ اصحاب الرائی نہ صرف یہ کہ جن مسائل میں نص موجود نہ ہوتی، ان میں مصالح شریعت کو سامنے رکھتے ہوئے اجتہاد کرتے، بلکہ جو مسائل ابھی وجود میں نہیں آئے، لیکن ان کے واقع ہونے کا امکان ہے، ان کے بارے میں بھی پیشگی تیاری کے طور پر غور کرتے اور اپنی رائے کا اظہار کرتے، اسی کو "فقہ تقدیری" کہتے ہیں، اصحاب حدیث اصحاب الرائی کے اس طرزِ عمل پر طعنہ دیتے تھے، لیکن آج اسی فقہ تقدیری کا نتیجہ ہے کہ نئے مسائل کو حل کرنے میں قدیم ترین فقہی ذخیرہ سے مدد مل رہی ہے۔

اس وضاحت سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اصحاب الرائی کا کام بمقابلہ اصحاب الحدیث کے زیادہ دشوار تھا، اسی لیے متقدمین کے یہاں "اصحاب الرائی" میں سے ہونا ایک قابل تعریف بات تھی اور مدح سمجھی جاتی تھی، بعد کو جن لوگوں نے اس حقیقت کو نہیں سمجھا، انھوں نے رائے سے مراد ایسی رائے کو سمجھا جو قرآن وحدیث کے مقابلہ خود رائی پر مبنی ہو، یہ کھلی ہوئی غلط فہمی اور نا سمجھی ہے۔

حجاز کا اصحاب الحدیث کا مرکز بننا اور عراق کا اصحاب الرائی کا مرکز بننا کوئی اتفاقی امر نہیں تھا، اس کے

چند بنیادی اسباب تھے، اوّل یہ کہ حجاز عرب تہذیب کا مرکز تھا، عرب اپنی سادہ زندگی کے لیے مشہور رہے ہیں، ان کی تہذیب میں بھی یہی سادگی رچی بسی تھی، عراق ہمیشہ سے دنیا کی عظیم تہذیبوں کا مرکز رہا ہے اور زندگی میں تکلفات و تعیّشات اس تہذیب کا جزو تھا، پھر مسلمانوں کے زیرنگین آنے کے بعد یہ علاقہ عربی اور عجمی تہذیب کا سنگم بن گیا تھا، اس لیے بمقابلہ حجاز کے یہاں مسائل زیادہ پیدا ہوتے تھے اور دین کے عمومی مقاصد ومصالح کو سامنے رکھ کر اجتہاد سے کام لینا پڑتا تھا، یہاں کے فقہاء اگر علمائے اصحاب حدیث کی طرح منصوص مسائل کے آگے سوچنے کو تیار ہی نہ ہوتے تو آخر امت کی رہنمائی کا فرض کیوں کر ادا ہوتا؟۔

دوسرے دبستانِ حجاز پر حضرت عبداللہ بن عمر وغیرہ صحابہ کی چھاپ تھی، جن کا ذوق ظاہر نص پر قناعت کرنے کا تھا اور عراق کے استاذ اول حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود جیسے فقہاء تھے، جن پر اصحاب الرائی کے طریقہ اجتہاد کا غلبہ تھا، اس لیے دونوں جگہ بعد کے علماء پر ان صحابہ کے اندازِ فکر کی چھاپ گہری ہوتی چلی گئی۔

تیسرے اکثر فرقِ باطلہ کا مرکز عراق ہی تھا، یہ لوگ اپنی فکر کی اشاعت کے لیے حدیثیں وضع کیا کرتے تھے، اس لیے علماءِ عراق تحقیق حدیث میں اصول روایت کے ساتھ ساتھ اصولِ درایت سے کام لیتے تھے، اس کے برخلاف علماءِ حجاز کو وضع حدیث کے اس فتنہ سے نسبتاً کم سابقہ تھا۔

(۴) اسی دور میں فرقِ باطلہ کا ظہور ہوا اور سیاسی اختلاف نے آہستہ آہستہ مذہبی رنگ اختیار کر لیا، ایک طرف شیعانِ علی تھے جو اہل بیت کو ہی خلافت کا مستحق جانتے تھے اور چند صحابہ کو چھوڑ کر تمام ہی صحابہ کی تکفیر کیا کرتے تھے، دوسری طرف ناصبیہ تھے، جو اہل بیت پر بنوامیہ کے ظلم و جور کو سند جواز عطا کرتے تھے اور حضرت علی اور اہلِ بیت کو برا بھلا کہنے سے بھی نہیں چوکتے تھے، تاہم ناصبیہ کی تعداد بہت کم تھی اور انھیں کبھی کسی طبقہ میں قبول حاصل نہیں ہوا، تیسرا گروہ خوارج کا تھا، جو حضرت عثمان غنی، حضرت علی، حضرت معاویہ اور بعد کے تمام صحابہ کو قرار دیتا تھا، شیعہ اور خوارج کا مرکز عراق اور مشرق کا علاقہ تھا، حالانکہ اس اختلاف کی بنیاد سیاسی

تھی، لیکن چونکہ لوگوں کے ذہن پر مذہب کی گرفت بہت مضبوط تھی، اس لیے جلد ہی اس اختلاف نے عقیدہ کی صورت اختیار کر لی اور اس کو تقویت پہنچانے کے لیے لوگوں نے روایتیں گھڑنی شروع کر دیں، پس اسی دور سے وضع حدیث کا فتنہ بھی شروع ہوا۔

(۵) عہد صحابہ میں اکثر لوگ وہ تھے، جنھوں نے حضور کے عمل کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اس لیے روایت حدیث کی ضرورت کم پیش آتی تھی، اب چونکہ زیادہ تر صحابہ رخصت ہو چکے تھے اور دوسری طرف فرقِ باطلہ کے نمائندوں نے اپنی طرف سے حدیثیں گھڑنی شروع کر دی تھیں، اس لیے روایتِ حدیث کے سلسلہ میں بمقابلہ گذشتہ دور کے اضافہ ہو گیا۔

(۶) البتہ اس دور میں حدیث یا فقہ کی باضابطہ تدوین عمل میں نہ آئی، حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس سلسلہ میں کوشش تو کی اور گورنر مدینہ ابوبکر محمد بن عمرو بن حزم کو اس کام کی طرف متوجہ کیا، لیکن اس سے پہلے کہ ابن حزم اس خواب کو شرمندہ تعبیر کرتے، خود حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی وفات ہو گئی۔

(۷) اس دور کے اہم فقہاء و ارباب افتاء کے نام اس طرح ہیں:

مدینہ: ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت ابو ہریرہ، سعید بن مسیّب، عروہ بن زبیر، ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام، امام زین العابدین علی بن حسین، عبداللہ بن مسعود، سالم بن عبداللہ بن عمر، سلیمان بن یسار، قاسم بن محمد بن ابوبکر، نافع مولیٰ عبداللہ بن عمر، محمد بن مسلم ابن شہاب زہری، امام ابو جعفر محمد باقر، ابوالزناد عبداللہ بن ذکوان، یحییٰ بن سعید انصاری، ربیع الرائے رضی اللہ عنہم اجمعین۔

مکہ: حضرت عبداللہ بن عباس، امام مجاہد، عکرمہ، عطاء بن ابی رباح۔

کوفہ: علقمہ نخعی، مسروق، عبید بن عمرو سلمانی، اسود بن یزید نخعی، قاضی شریح، ابراہیم نخعی، سعید بن جبیر، عامر بن شراحیل شعبی رحمہم اللہ۔

بصرہ: حضرت انس بن مالک انصاری، ابوالعالیہ، رفیع بن مہران، حسن بن ابی الحسن یسار، ابوالشعثاء، جابر بن زید، محمد بن سیرین، قتادہ رحمہم اللہ۔

شام: عبدالرحمٰن بن غانم، ابوادریس خولانی، مکحول، قبیصہ بن ذویب، رجاء بن حیوہ، حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہم اللہ۔

مصر: حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص، مرثد بن عبداللہ بن الیزنی، یزید بن ابی حبیب رحمہم اللہ۔

یمن: طاوس بن کیسان، وہب بن منبہ صنعانی، یحییٰ بن ابی کثیر۔

چوتھا مرحلہ اوائل دوسری صدی تا نصف چوتھی صدی

تدوین فقہ کا چوتھا مرحلہ جو عباسی دور کی ابتداء سے شروع ہو کر چوتھی صدی ہجری کے وسط تک محیط ہے، نہایت اہم ہے اور اسے نہ صرف فقہ اسلامی بلکہ تمام ہی اسلامی و عربی علوم و فنون کا سنہرا دور کہہ سکتے ہیں، فقہ اور فقہ سے متعلق جو علوم ہیں ان کے علاوہ اسی عہد میں تفسیر قرآن کے فن کو کمال حاصل ہوا اور تفسیر طبری جیسی عظیم الشان تفسیر وجود میں آئی، جو آج تک کتبِ تفسیر کا نہایت اہم مرجع ہے، اسی عہد میں عربی زبان کے قواعد مرتب ہوئے، اسی دور میں عباسی خلفاء کی خواہش پر یونانی علوم، منطق اور فلسفہ وغیرہ عربی زبان میں منتقل کیا گیا اور اس کو بنیاد بنا کر مسلمان محققین نے بڑے بڑے سائنسی کارنامے انجام دیئے اور علم و تحقیق کی دنیا میں اپنی فتح مندی کے علم نصب کئے اور فقہ کے لیے تو یہ دور نہایت ہی اہم ہے۔

اس دور کی چند اہم خصوصیات اس طرح ہیں:

(۱) یوں تو رسول اللہ کے عہدِ مبارک ہی سے حدیث کی جمع و کتابت کا کام شروع ہو چکا تھا، لیکن کتابی انداز پر اس کی ترتیب عمل میں نہیں آئی تھی، بلکہ مختلف لوگوں نے اپنی اپنی یادداشتیں لکھ رکھی تھیں، سب سے پہلے احادیث کو باضابطہ طور پر جمع کرنے کا خیال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اور ان کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کو آیا، لیکن حضرت عمر نے اسے مناسب نہ سمجھا اور حضرت عمر بن عبدالعزیز کی اس کام کی

تکمیل سے پہلے ہی وفات ہوگئی، اب عباسی دور میں باضابطہ حدیث کی تدوین کا کام شروع ہوا۔

یہ تدوین تین مرحلوں میں انجام پائی، پہلے مرحلہ میں حضور کی احادیث اور صحابہ کے فتاویٰ اور فیصلے، بلکہ کہیں کہیں تابعین کے فتاویٰ بھی ملے جلے جمع کیے گئے، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہ اللہ کی کتاب الآثار اور امام مالک رحمہ اللہ کی موطا میں آج بھی اس طریقہ ترتیب کو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے، پھر دوسری صدی ہجری کے آخر میں مسانید کا طریقہ مروج ہوا کہ راوی پنی تمام مرویات کو صحابہ کے ناموں کی ترتیب سے جمع کرتا اور حدیث کے مضامین وموضوعات سے قطع نظر ایک صحابی کی تمام مرویات ایک جگہ ذکر کی جاتیں، اس سلسلہ کی سب سے ممتاز کتاب "مسند امام احمد بن حنبل" ہے، لیکن ان میں صحیح ومستند اور ضعیف ونامعتبر دونوں طرح کی روایتیں مذکور ہوتیں، چنانچہ تیسری صدی ہجری میں دوامور کی رعایت کے ساتھ کتب حدیث مرتب کی گئیں، ایک یہ کہ ان کی ترتیب مضمون کے اعتبار سے ہواور فقہی ابواب کی ترتیب پر روایتیں جمع کی جائیں، دوسرے یہ کہ نقل حدیث میں صحیح وضعیف کا فرق ملحوظ رکھا جائے اور اپنے گمان کے مطابق صحیح روایتیں نقل کی جائیں، صحاحِ ستہ، اسی دور کی یادگاریں ہیں، جن کو کتبِ حدیث میں خاص طور پر قبولِ عام اور شہرت ودوام حاصل ہوا۔

اس وقت جو کتبِ حدیث موجود ہیں، ان میں امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی کتاب الآثار، امام مالک رحمہ اللہ کی موطا اور امام محمد رحمہ اللہ کی موطا اور کتاب الآثار سب سے قدیم کتابیں ہیں، باقی بہت سی کتابیں وہ ہیں کہ ان کے مصنفین کی نسبت سے تاریخ کی کتابوں میں ان کا ذکر ملتا ہے، لیکن اب دستیاب نہیں ہیں، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی مسند گوایک قدیم ترین مسند ہے، لیکن یہ ان کے تلامذہ کی جمع کی ہوئی ہے نہ کہ خود امام صاحب رحمہ اللہ کی۔

(۲)　چونکہ تدوین حدیث کے شانہ بشانہ بلکہ اس سے پہلے ہی گمراہ فرقوں اور خدانا ترس افراد واشخاص کی طرف سے وضع حدیث کا قبیح سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا اس لیے کچھ عالی ہمت، اہل علم نے روایت کی تحقیق

کو اپنا موضوع بنایا اور کسی رعایت اور لحاظ کے بغیر مشکوک و نامعتبر راویوں کے احوال سے لوگوں کو باخبر کرنے کی اہم ترین ذمہ داری اپنے سر لی، یہ فن "جرح و تعدیل" کہلاتا ہے، اسی دور میں اس فن کی بنیاد پڑی، اس فن کے سب سے بڑے امام یحییٰ بن سعید القطان (متوفی:۸۹) اسی عہد کے تھے، اسی طرح امام عبدالرحمٰن بن مہدی (متوفی:۱۹۸ھ)، یحییٰ بن معین (متوفی:۲۳۰ھ) اور امام احمد بن حنبل (متوفی:۲۴۱ھ) جو اس فن کے اوّلین معماروں میں ہیں، اسی خوش نصیب عہد کی یادگار ہیں۔

(۳) مسائل فقہیہ کے استنباط اور اجتہاد میں قرآن مجید کی مختلف قراتوں کا بھی بڑا دخل ہے، چنانچہ اس عہد میں قرات کے فن نے بھی بڑا عروج حاصل کیا اور قراءِ سبعہ نافع رحمہ اللہ (متوفی:۱۶۷ھ)، عبداللہ بن کثیر (متوفی:۱۲۰ھ)، ابوعمرو بن علاء (متوفی:۱۴۵ھ)، عبداللہ بن عامر (متوفی:۱۱۸ھ)، ابوبکر عاصم (متوفی:۱۲۸ھ) جن کے تلامذہ میں حفص بن سلیمان ہیں، حمزہ بن حبیب زیارت (متوفی:۱۴۵ھ) اور ابوالحسن کسائی رحمہ اللہ (متوفی:۱۸۹ھ) اسی عہد کے قراء ہیں قراء سبعہ پر جن تین قراء کا اضافہ کیا گیا ہے اور ان کو قراءِ عشرہ کہا جاتا ہے، ان کا تعلق بھی اسی عہد سے ہے۔

(۴) اصولِ فقہ کی باضابطہ تدوین بھی اسی عہد میں ہوئی، کہا جاتا ہے کہ اس موضوع پر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی کوئی تالیف "کتاب الرائی" کے نام سے تھی، لیکن اب اس کا کوئی وجود نہیں، امام محمد رحمہ اللہ کی طرف بھی اصول کی ایک کتاب اسی نام سے منسوب کی جاتی ہے، یہ بھی دستیاب نہیں، لیکن ماضی قریب میں ابوالحسین بصری معتزلی کی کتاب "المعتمد فی اصول الفقہ" طبع ہوئی ہے، اس کتاب میں امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی کتاب کا حوالہ موجود ہے، اس لیے حقیقت یہی ہے کہ اس فن کے موسس اوّل امام ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ ہیں، اس وقت اس موضوع پر جو قدیم ترین کتاب پائی جاتی ہے، وہ امام شافعی رحمہ اللہ کی "الرسالہ" ہے۔

یہ نہایت اہم کتاب ہے اور ابتدائی دور کی تالیف ہونے کے لحاظ سے نہایت جامع، واضح اور مدلل تالیف ہے، جس میں قرآن مجید کے بیان کے اصول، سنّت کی اہمیت اور قرآن سے اس کا ربط، ناسخ و منسوخ،

علل حدیث، خبر واحد کی حجیت، اجماع، قیاس، اجتہاد، استحسان اور فقہی اختلافِ رائے کی حیثیت پر گفتگو کی گئی ہے، امام شافعی نے اس کتاب میں استحسان پر بہت شدید تنقید کی ہے اور ان کا یہی لب ولہجہ " کتاب الام " میں بھی پایا جاتا ہے، لیکن یہ تنقید زیادہ تر غلط فہمی اور اگر اس تنقید کا نشانہ حنفیہ ہوں تو حنفیہ کے نقطہ نظر سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔

(۵) اس دور میں فقہی اصطلاحات کا ظہور ہوا اور احکام میں فرض، واجب، سنت، مباح اور مستحب جیسی اصطلاحات نے رواج پایا، تابعین کے عہد میں عام طور پر ایسی اصطلاحات قائم نہیں تھیں، بلکہ شریعت میں جن باتوں کا حکم دیا گیا، لوگ بلا تفریق اس پر عمل کرتے تھے اور جن باتوں سے منع کیا گیا، بلا کسی فرق کے ان سے اجتناب کرتے تھے۔

(۶) بمقابلہ پچھلے ادوار کے اس عہد میں اجتہاد واستنباط کی کثرت ہوئی، اس کے دو بنیادی اسباب تھے، ایک عباسی حکومت کا علمی ذوق، عباسیوں نے جہاں بغداد جیسا متمدن شہر آباد کیا اور عقلی علوم کو عربی زبان کا جامہ پہنایا، وہیں اسلامی علوم سے بھی ان کو اعتناء تھا اور خود خلفاء علمی ذوق کے حامل ہوا کرتے تھے، بلکہ بعض دفعہ کسی رائے سے تاثر اور غلو کی وجہ سے نقصان بھی ہوتا تھا، چنانچہ بعض عباسی خلفاء کے معتزلہ سے متاثر ہونے کی وجہ سے "خلق قرآن کا فتنہ" پیدا ہوا جس کی خوں آشام داستانیں اب بھی تاریخ میں محفوظ ہیں، عباسی خلفاء کو فقہ سے بھی تعلق تھا، یہی وجہ ہے کہ منصور اور پھر خلیفہ ہارون رشید نے امام مالک رحمہ اللہ کی موطا کو ملکی دستور کی حیثیت دینی چاہی، لیکن یہ امام مالک رحمہ اللہ کا اخلاص تھا کہ انھوں نے اس سے منع فرما دیا، بعض عباسی خلفاء نے امام مالک رحمہ اللہ سے یہ شکایت بھی کی کہ ان کی کتاب میں حضرت عبداللہ بن عباس اور بنو ہاشم کے صحابہ کی مرویات کو وہ اہمیت نہیں دی گئی ہے، جو دوسرے صحابہ کی مرویات کو دی گئی ہے، امام مالک نے اس پر معذرت کی کہ مجھے حضرت عبداللہ بن عباس وغیرہ کے تلامذہ سے استفادہ کا موقع نہیں ملا۔

یہ ان کے علمی ذوق ہی کی بات تھی کہ ہارون رشید قاضی ابو یوسف سے حکومت کے مالیاتی قوانین کے

موضوع پر تالیف کا طلب گار ہوتا ہے اور اسی خواہش کے نتیجہ میں ان کی معروف مقبول تالیف " کتاب الخراج "وجود میں آتی ہے اور یہ بھی خلفاء کی علم پروری ہی ہے کہ ان کے عہد میں بغداد ہر فن کے علماء و ماہرین کا مرکز و ملجا بن جاتا ہے، اس حوصلہ افزائی اور علمی پذیرائی نے علماء کو اپنے اپنے فن کو پایہ کمال تک پہنچانے کا حوصلہ دیا۔

دوسرا سبب عالم اسلام کی وسعت تھی، اب مسلمانوں کی حکومت یورپ میں اسپین سے لے کر ایشیاء میں مشرق بعید چین تک تھی، مختلف قوموں، مختلف تہذیبیں، مختلف لسانی گروہ اور مختلف صلاحیتوں کے لوگ عالم اسلام کے سایہ میں تھے اور ان میں بڑی تعداد نو مسلموں کی تھی، اس لیے لوگوں کی طرف سے سوالات کی کثرت تھی اور اس نسبت سے فقہی اجتہادات کا دائرہ بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا، اسی عہد میں بڑے بلند پایہ، عالی ہمت اور اپنی ذہانت و فطانت کے اعتبار سے محیر العقول علماء و فقہاء پیدا ہوئے، کیونکہ اس عہد میں اسی درجہ کے اہلِ علم کی ضرورت تھی، پھر ان میں سے بعض بلند پایہ فقہاء نے مستقل دبستانِ فقہ کی بنیاد رکھی اور ان سے علمی تاثر کی وجہ سے اہلِ علم کی ایک تعداد ان کے ساتھ ہوگئی اور اس نے ان کے علوم کی اشاعت وتدوین اور تائید وتقویت کے ذریعہ مستقل فقہی مدارس کو وجود بخشا، ان شخصیتوں میں سب سے ممتاز شخصیتیں ائمہ اربعہ کی ہیں۔

(۷) لیکن فقہ کی باضابطہ تدوین کا شرف سب سے پہلے جس شخصیت کو حاصل ہوا، وہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی ذات والا صفات ہے، اسی لیے امام شافعی نے فرمایا:

"مَن اَرَادَ الفِقه فهوَعِيَال عَلىَ اَبِي حَنيفَةَ"(۵۸)

اس کا اعتراف تمام ہی منصف مزاج علماء نے کیا ہے، حافظ جلال الدین سیوطی، شافعی فرماتے ہیں:

"انه اوّل من دون علم الشريعة ورتبها ابوابا ثم تبعه مالك ابن انس فى ترتيب الموطا ولم يسبق اباحنيفة احد"(۵۹)

اس مجلس تدوین میں جو مسائل مرتب ہوئے اور جو زیرِ بحث آئے ان کی تعداد کیا تھی؟ اس سلسلہ میں تذکرہ نگاروں کے مختلف بیانات ملتے ہیں، مسانید امام ابو حنیفہ کے جامع علامہ خوارزمی نے تراسی ہزار کی تعداد لکھی ہے، جس میں اڑتیس ہزار کا تعلق عبادات سے تھا اور باقی کا معاملات سے۔ (۶۳)

بعض حضرات نے ۶ لاکھ اور بعضوں نے ۱۲ لاکھ سے بھی زیادہ بتائی ہے، مشہور محقق مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ کا خیال ہے کہ اس تعداد میں ان مسائل کو بھی شامل کرلیا گیا ہے، جو امام کے مقرر کئے ہوئے اصول وکلیات کی روشنی میں مستنبط کئے گئے تھے۔

پس اگر تراسی ہزار مسائل ہی اس مجلس تدوین کے مستنبط کئے ہوئے مانے جائیں تو یہ کیا کم ہے؟ عام طور پر یہ بات نقل کی جاتی ہے کہ اس مجلس میں اپنے عہد کے چالیس ممتاز علماء شامل تھے، لیکن ان کے سنین وفات اور امام صاحب سے وابستگی کے زمانہ کو دیکھتے ہوئے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ سارے لوگ شروع سے آخر تک اس کام میں شریک نہیں رہے، بلکہ مختلف ارکان نے مختلف ادوار میں کارِ تدوین میں ہاتھ بٹایا اور ان میں بعض وہ تھے جنھوں نے آخری زمانہ میں اس کام میں شرکت کی، عام طور پر شرکاءِ مجلس کا نام ایک جگہ نہیں ملتا ہے، مفتی عزیز الرحمٰن اور ڈاکٹر محمد میاں صدیقی نے ان ناموں کو اکٹھا کرنے کی کوشش کی ہے اور ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی نے ان ہی کے حوالہ سے اسے نقل کیا ہے، نام اس طرح ہیں:

امام ابو یوسف (متوفی: ۱۸۲ھ)　　محمد بن حسن شیبانی رحمہ اللہ (متوفی: ۱۸۹ھ)

حسن بن زیاد (متوفی: ۲۰۴ھ)　　زفر بن ہذیل (متوفی: ۱۵۸ھ)

مالک بن مغول (متوفی: ۱۵۹ھ)　　داود طائی رحمہ اللہ (متوفی: ۱۶۰ھ)

مندل بن علی (متوفی: ۱۶۸ھ)　　نصر بن عبد الکریم (متوفی: ۱۶۹ھ)

عمرو بن میمون (متوفی: ۱۷۱ھ)　　حبان بن علی (متوفی: ۱۷۲ھ)

ابو عصمہ (متوفی: ۱۷۳ھ)　　زہیر بن معاویہ (متوفی: ۱۷۳ھ)

قاسم بن معن رحمہ اللہ (متوفی:۱۷۵ھ)	حماد بن ابی حنیفہ (متوفی:۱۷۶ھ)
ہیاج بن بطام (متوفی:۱۷۷ھ)	شریک بن عبداللہ (متوفی:۱۷۸ھ)
عافیہ بن یزید (متوفی:۱۸۱ھ)	عبداللہ بن مبارک (متوفی:۱۸۱ھ)
نوح بن دراج (متوفی:۱۸۲ھ)	ہشیم بن بشیر سلمی (متوفی:۱۸۳ھ)
ابوسعید یحییٰ بن زکریا (متوفی:۱۸۴ھ)	فضیل بن عیاض (متوفی:۱۸۷ھ)
اسد بن عمرو (متوفی:۱۸۸ھ)	علی بن مسہر (متوفی:۱۸۹ھ)
یوسف بن خالد (متوفی:۱۸۹ھ)	عبداللہ بن ادریس (متوفی:۱۹۲ھ)
فضل بن موسیٰ (متوفی:۱۹۲ھ)	حفص بن غیاث (متوفی:۱۹۴ھ)
وکیع بن جراح (متوفی:۱۹۷ھ)	یحییٰ بن سعید القطان (متوفی:۱۹۸ھ)
شعیب بن اسحاق (متوفی:۱۹۸ھ)	ابوحفص بن عبدالرحمٰن (متوفی:۱۹۹ھ)
ابومطیع بلخی (متوفی:۱۹۹ھ)	خالد بن سلیمان (متوفی:۱۹۹ھ)
عبدالحمید (متوفی:۲۰۳ھ)	ابوعاصم النبیل (متوفی:۲۱۲ھ)
مکی بن ابراہیم (متوفی:۲۱۵ھ)	حماد بن دلیل (متوفی:۲۱۵ھ)
ہشام بن یوسف (متوفی:۱۹۷ھ)	

(۸)　اس دور میں فقہاء اپنی قوتِ اجتہاد اور لیاقتِ استنباط میں نہایت اعلیٰ درجہ کے حامل تھے، اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ بات مقدر نہیں تھی کہ ان کے مذہب کو بقاء واستحکام حاصل ہو سکے، چنانچہ کم ہی عرصہ میں یہ مذاہب ناپید ہو گئے، البتہ ان کی چیدہ چیدہ آراء، کتابوں اب بھی موجود ہیں، ان میں سے چار شخصیتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں:

امام اوزاعی:

ان کا پورا نام ابو عمر عبد الرحمٰن بن محمد ہے، یمن کے قبیلہ ذی الکاع کی ایک شاخ اوزاع تھی، اسی نسبت سے اوزاعی کہلائے، ۸۸ھ میں شام میں پیدا ہوئے سنہ ۱۵۷ھ میں وفات پائی، حدیث کے بڑے عالم تھے، اصحاب حدیث کے گروہ سے تعلق تھا اور قیاس سے اجتناب کرتے تھے، شام اور اندلس کے علاقہ میں ان کے مذہب کو قبولیت حاصل ہوئی، لیکن جلد ہی ان کے متبعین ناپید ہو گئے۔ (٦٤)

سفیان ثوری:

ابو عبد اللہ سفیان بن سعید ثوری سنہ ۹۷ھ میں کوفہ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۶۱ھ میں بصرہ میں وفات پائی، فقہ اور حدیث دونوں پر نظر تھی، عام طور پر ان کی آراء سے قریب ہوتی ہیں، ابتداء امام صاحب سے چشمک تھی، پھر بعد کو غلط فہمی دور ہو گئی اور امام ابو حنیفہ کے قدر داں ہو گئے۔

لیث بن سعد:

یہ مصر میں پیدا ہوئے اور وہیں سنہ ۱۷۵ھ میں وفات پائی، کہا جاتا ہے کہ تفقہ میں ان کا درجہ امام مالک اور شافعی سے کم نہیں تھا، خود امام شافعی ان کو امام مالک سے زیادہ فقیہ قرار دیتے تھے، لیکن ان کے مذہب کو زیادہ رواج حاصل نہیں ہو سکا اور جلد ہی ختم ہو گیا۔

داود ظاہری:

ان کا پورا نام ابو سلیمان داود بن علی اصفہانی ہے سنہ ۲۰۰ھ میں کوفہ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۲۷۰ھ میں وفات پائی، ابتدا میں فقہ شافعی کے متبع تھے، بعد میں پھر اپنے مسلک کی بنیاد رکھی، ظاہر نص پر عمل کرنے میں غلو تھا اور اسی غلو کی وجہ سے بعض آراء حد معقولیت سے گذر جاتی ہیں، داود ظاہری نے بہت سی کتابیں بھی تالیف کی ہیں، اس مکتب فکر کی نمائندہ شخصیت علامہ ابن حزم اندلسی (متوفی: ۴۵٦ھ) ہیں، جنھوں نے اپنی معروف کتاب "المحلیٰ" لکھ کر اصحاب ظواہر کی فکر کی آراء کو محفوظ کر دیا ہے، ابن حزم ہی کی کتاب "الاحکام فی اصول

الاحکام" بھی ہے، جس میں اصحابِ ظواہر کے اصولِ فقہ مدون ہیں، پانچویں صدی ہجری تک یہ مذہب پایا جاتا تھا (تاریخ التشریع الاسلامی لخضرمی: ۱۸۰) ابنِ خلدون نے لکھا ہے کہ آٹھویں صدی ہجری تک بھی یہ مذہب باقی تھا، پھر اس کا نام ونشان مٹ گیا، موجودہ دور میں سلفیت کو اسی دبستانِ فقہ کا حیاء قرار دیا جاسکتا ہے۔

ابن جریر طبری:

ابوجعفر محمد بن جریر طبری سنہ۲۲۴ھ میں طبرستان میں پیدا ہوئے سنہ۳۱۰ھ میں وفات پائی، انھوں نے فقہ حنفی، فقہ مالکی اور فقہ شافعی تینوں کو حاصل کیا، لیکن کسی کی تقلید نہیں کی اور خود اجتہاد کیا، تفسیر طبری اور تاریخ طبری ان کی معروف کتابیں ہیں، جو بعد کے اہلِ علم کے لیے اولین مرجع کا درجہ رکھتی ہیں، اسی طرح فقہی اختلافات پر " کتاب اختلافات الفقہاء " چھپ چکی ہے، ختم ہوجانے والے مذاہب میں اسی کو زیادہ دنوں تک زندگی حاصل رہی اور پانچویں صدی کے نصف تک بہت سے لوگ اس فقہ پر عمل تھے۔(۶۵)

پانچواں مرحلہ سقوطِ بغداد تک (۶۵۶ھ)

فقہ کی تدوین وترتیب کا چوتھا مرحلہ چوتھی صدی ہجری کے اوائل سے شروع ہوتا ہے اور ۶۵۶ھ میں سقوطِ بغداد پر ختم ہوتا ہے، جب چنگیز خان کے پوتے ہلاکوخان نے عالمِ اسلامی کے دارالخلافہ بغداد پر غلبہ حاصل کیا، آخری عباسی خلیفہ کو نہایت بے دردی سے قتل کردیا اور ایسی خوں آشامی اور ہلاکت خیزی کا ثبوت دیا کہ انسانیت سوزی اور قتل وغارت گری کی تاریخ میں کم ہی اس کی مثال مل سکے گی۔

اس عہد کی خصوصیات اس طرح ہیں:

(۱)　اسی عہد میں شخصی تقلید کا رواج ہوا اور لوگ تمام احکام میں ایک متعین مجتہد کی پیروی کرنے لگے، تقلید کی اس صورت کو مختلف اسباب کی وجہ سے تقویت پہنچی، جن کا تذکرہ مناسب محسوس ہوتا ہے:

(الف)　بہت سے ایسے لوگ دعوی اجتہاد کرنے لگے جو حقیقت میں اس منصب کے اہل نہیں تھے اور

وہ اجتہاد کو قرآن وحدیث سے انحراف کا چور دروازہ بنانے لگے، اس لیے دین کے تحفظ اور دفع فساد کے لیے اس زمانہ کے بالغ نظر اور محتاط علماء نے ضروری سمجھا کہ موجودہ حالات میں باب اجتہاد کو بند کر دیا جائے اور امت کو ان آوارہ خیالوں کے فتنہ سے بچایا جائے۔

(ب) ائمہ مجتہدین کی سعی ومحنت سے فقہ اسلامی کی ترتیب وتدوین پایہ کمال کو پہنچ چکی تھی اور ان کی مساعی کی وجہ سے لوگوں کے لیے ہر طرح کے مسائل کا حل موجود تھا، اس لیے گذشتہ ادوار میں جس درجہ اجتہاد واستنباط کی ضرورت تھی اب اتنی ضرورت باقی نہیں رہ گئی تھی اور یہ اللہ تعالیٰ کا قدرتی نظام ہے کہ جب کسی چیز کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی ہے تو اس طرف لوگوں کی توجہ بھی کم ہو جاتی ہے۔

(ج) بعض مجتہدین کو من جانب اللہ لائق تلامذہ اور لائق ماہرین ومتبعین ہاتھ آئے اور انھوں نے اس مجتہد کی آراء وافکار کو نہایت بہتر طور پر مرتب کر دیا، اس کی وجہ سے لوگوں میں ان کے اجتہادات کے تئیں قبولِ عام کا رجحان پیدا ہو گیا اور اس طرح ایک مستقل دبستانِ فقہ کی تشکیل عمل میں آ گئی، جن فقہاء کو ایسے لائق شاگرد میسر نہیں آئے، ان کی فقہ باضابطہ طور پر مدون نہیں ہو پائی اور آہستہ آہستہ علمی زندگی سے اس کا رشتہ کٹ گیا، اس کی واضح مثال امام اوزاعی اور لیث بن سعد ہیں، جن کو ان کے معاصرین تفقہ کے اعتبار سے بعض ائمہ متبوعین سے بھی فائق قرار دیتے تھے، لیکن آج کتابوں میں چند مسائل سے متعلق ان کی آراء مل جاتی ہیں اور بس۔

(د) صحابہ اور تابعین کے عہد میں کسی کو قاضی بنایا جاتا تو اسے ہدایت دی جاتی کہ وہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول کو اصل بنائے اور اگر کتاب وسنت میں حکم نہ ملے تو اجتہاد سے کام لے، اس سلسلہ میں وہ خط جو حضرت عمر نے ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو لکھا تھا حدیث وفقہ اور قضاء سے متعلق اکثر کتابوں میں نقل کیا گیا ہے، بعد کے ادوار میں یوں ہوا کہ بعض قضاۃ حق اجتہاد کو جور وزیادتی اور کسی فریق کے حق میں طرف داری کا ذریعہ بنانے لگے، اس پس منظر میں حکومتیں جب کسی کو قاضی مقرر کرتیں تو ان کو پابند کر دیتیں کہ فلاں مذہب

کے مطابق فیصلہ کیا کریں، تا کہ فیصلوں میں یکسانیت رہے اور جانب داری کی گنجائش باقی نہ رہے، چنانچہ عباسی خلفاء عام طور پر فقہ حنفی پر قاضی مقرر کیا کرتے، اسی طرح ترکوں نے بھی عہد قضاء کو احناف کے لیے مخصوص رکھا، صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ نے مصر میں اور سلطان محمود سبکتگین رحمہ اللہ اور نظام الملک طوسی نے مشرقی علاقہ کی عدالتوں کو فقہ شافعی کے مطابق فیصلے کرنے کا حکم دیا، یہ بھی تقلیدِ شخصی کی ترویج کا ایک اہم سبب بنا۔

(ہ) تقلید پر انحصار کا ایک سبب علمی انحطاط بھی تھا، اللہ تعالیٰ کا نظام یہ ہے کہ ہر عہد میں اس عہد کی ضرورت کے مطابق افراد پیدا ہوتے ہیں اور ضرورت جوں جوں کم ہوتی جاتی ہے، اس طرح کے افراد بھی کم ہوتے جاتے ہیں، یہی دیکھئے کہ روایتِ حدیث کے دور میں کیسے قوی الحفظ محدثین پائے جاتے تھے، جنھیں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں حدیثیں یاد ہوتی تھیں اور سند و متن صفحہ ذہن پر اس طرح نقش ہو جاتا تھا کہ گویا وہ پتھر پر کندہ کردیئے گئے ہیں، لیکن تدوین حدیث کا کام مکمل ہونے کے بعد پھر اس صلاحیت کے لوگ پیدا نہیں ہوسکے، زمانہ جاہلیت میں لکھنے پڑھنے کا رواج نہیں تھا، تو لوگوں کو شاعروں کی پوری پوری دیوان نوکِ زبان ہوتی تھیں اور اس طرح جاہلیت کا ادب محفوظ ہوسکا، بعد کے ادوار میں ایسی مثالیں شاذ و نادر ہی مل سکیں، اسی طرح جب تک شریعتِ اسلامی کے ایک مکمل نظامِ حیات کی ترتیب و تدوین اور زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق مسائل کے حل کی ضرورت تھی اور اس ضرورت کو پوری کرنے کے لیے مجتہدانہ بصیرت مطلوب تھی، اجتہادی صلاحیتوں کے لوگ پیدا ہوتے رہے، جب اس کی ضرورت کم ہوگئی تو اس نسبت سے ایسے افراد کی پیدائش بھی کم ہوگئی۔

(۲) تقلید کے رواج نے جو ایک منفی اثر پیدا کیا وہ فقہی تعصب و تنگ نظری اور جدل و مناظرہ کی کیفیت کا پیدا ہوجانا ہے، گذشتہ ادوار میں بھی فقہی مسائل میں اختلافِ رائے پایا جاتا تھا، لیکن ایک دوسرے سے تعصب کی کیفیت نہیں تھی اور نہ اس کیلیے معرکہ جدل برپا ہوتا تھا، اس دور میں بدترین قسم کی تنگ نظری وجود

میں آئی، لوگ اپنے امام کی تعریف میں مبالغہ کی آخری حدود کو بھی پار کر جاتے تھے اور مخالف نقطہ نظر کے حامل امام ذی احترام کی شان میں گستاخی اور بدکلامی سے بھی باز نہیں رہتے تھے، یہاں تک کہ ان مذموم مقاصد کے لیے بعض خدا ناترس لوگوں نے روایتیں بھی گھڑنی شروع کر دیں۔

چونکہ عوام میں فقہ حنفی اور فقہ شافعی کو زیادہ رسوخ حاصل تھا، اس لیے معرکے بھی انھیں دونوں مکاتب فکر کے درمیان نسبتاً گرم ہوتے تھے اور اپنے مسلک کی ترویج کے لیے بعض اوقات بہت ہی پست حرکات کی جاتی تھیں، سلطان محمود سبکتگین اصل میں حنفی تھا اور کچھ زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا، ایک شافعی عالم نے اس کو متاثر کرنے کے لیے اس کے سامنے بے ترتیبی کے ساتھ جیسے تیسے وضو کیا، پھر جلدی جلدی نماز پڑھی اور سلام پھیرنے سے پہلے قصداً وضو توڑنے کا ارتکاب کیا اور بادشاہ سے کہا کہ یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی نماز ہے، پھر اچھی طرح وضو کیا اور بہتر طریقہ پر نماز ادا کی اور بادشاہ سے کہا کہ یہ امام شافعی رحمہ اللہ کی نماز ہے، چنانچہ سلطان محمود نے اس واقعہ سے متاثر ہو کر شافعیت کو اختیار کر لیا اور نقل کرنے والوں کے بہ قول اس حرکت کا ارتکاب کرنے والا کوئی عامی نہیں تھا، بلکہ یہ تھے ممتاز شافعی فقیہ قفال شاشی۔(٦٦)

اب یہ فقہی تعصّبات ہی کا حصہ ہے کہ ہمارے کتابوں میں یہ بحث ملتی ہے کہ حنفی شافعی اور شافعی حنفی کے پیچھے نماز پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟ رسول اللہ نے تو فاجر کے پیچھے بھی نماز پڑھنے کی اجازت دی تھی اور صحابہ نے تو حجاج بن یوسف کے پیچھے بھی نماز ادا فرمائی، لیکن متاخرین کے ہاں یہ ایک سوال بن گیا، احکامِ نماز میں جو اختلافِ رائے مثلاً احناف اور شوافع کے درمیان پایا جاتا ہے، یہ صحابہ کے درمیان بھی تھا اور تابعین وائمہ مجتہدین کے زمانہ میں بھی تھا، لیکن وہ بے تکلف ایک دوسرے کے پیچھے نماز ادا کرتے رہے اور یہ بات ان کے یہاں چنداں قابل اعتناء نہیں تھی۔

اسی طرح احناف کے یہاں یہ بحث ملتی ہے کہ شوافع سے نکاح درست ہے یا نہیں؟ اور "انا مومن انشاء اللہ" (انشاء اللہ میں مومن ہوں) کہنے کی وجہ سے کیا ان کو مسلمان سمجھا جائے گا؟ یہاں تک کہ بعض

لوگوں نے لکھ دیا کہ ان کے ساتھ اہل کتاب کا سا معاملہ کیا جائے یہ کس قدر تعصب انگیز اور مزاجِ دین کے مغائر باتیں ہیں؟سلفِ صالحین کے زمانہ میں مناظرہ ایک طرح کا تبادلہ خیال ہوتا تھا، جس میں ایک دوسرے کا پورا احترام ملحوظ رکھا جاتا اور جو بات صحیح نظر آتی تھی اسے لوگ قبول کرتے تھے،لیکن اس دور میں مناظرہ کے نام پر مجادلہ اور باہمی سب وشتم کا سلسلہ شروع ہوا،اس کا نتیجہ یہ تھا کہ بادشاہوں اور رئیسوں کے دربار اور بڑی بڑی مسجدیں مناظرہ کا اکھاڑہ بن گئی تھیں اور بہت سے جاہل فرماں روا، جیسے مرغوں اور جانوروں کا مقابلہ کراتے اور تماشہ دیکھتے تھے،اسی طرح علماء سے مناظرہ کرا کر ان سے لطف لیا جاتا تھا،اسی لیے اس عہد کے بہت سے حنفی اور شافعی علماء کے حالات میں خاص طور سے اس کا ذکر ملے گا کہ یہ مذہب مخالف کے فلاں عالم سے مناظرہ کرتے تھے اور یہ کہ مناظرہ میں ان کو بڑا کمال حاصل تھا۔

(۳) اس عہد میں مقلد علماء نے دو اہم کام کیے،ایک تو اپنے دبستانِ فقہ کی آراء کے لیے دلائل کی تلاش اور استنباط، کیونکہ اصحاب مذہب سے بہت سے مسائل میں صرف ان کی رائے ملتی تھی اور اس رائے پر دلیل منقول نہیں تھی،لہٰذا کچھ تو علمی اور تحقیقی ضرورت اور کچھ مناظروں کی گرم بازاری اور فریق مخالف کی جواب دہی کے پس منظر میں نصوص اور عقل وقیاس سے مذہب کی آراء پر دلیل فراہم کی گئیں، دوسرا کام ایک ہی مذہب فقہی کی حدود میں مختلف آراء کے درمیان ترجیح کا ہوا، یہ ترجیح کی ضرورت دو موقعوں پر پیش آتی ہے، ایک اس وقت جب امام سے مختلف راویوں نے الگ الگ رائے نقل کی ہو،اس صورت میں راوی کے استناد واعتبار کے لحاظ سے ترجیح دی جاتی ہے کہ کونسی نقل زیادہ درست ہے؟ اسی بناء پر حنفیہ کے یہاں ظاہر روایت کو نوادر پر، مالکیہ کے ہاں ابن قاسم کی روایت کو ابن وھب، ابن ماجشون اور اسد ابن فرات کی روایت پر اور شوافع کے یہاں ربیع ابن سلیمان کی روایت کو مزنی کی روایت پر مقدم رکھا جاتا ہے، دوسرے اس وقت جب امام سے ایک سے زیادہ اقوال صحیح ومستند طریقہ پر ثابت ہوں، ایسی صورت میں امام کے اصول استنباط اور کتاب وسنت اور قیاس سے موافقت اور ہم آہنگی کی بنیاد پر بعض اقوال کو ترجیح دی جاتی ہے، اس لیے ان میں اختلاف رائے کا پیدا ہونا

فطری ہے، اسی لیے ایک ہی مذہب کے مختلف مصنفین کے نزدیک اقوال وآراء کی ترجیح میں خاصا اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔

اس دور کا ایک قابل ذکر کام ائمہ مجتہدین کے اقوال کی تشریح وتوضیح بھی ہے، یعنی مجمل احکام کی توضیح ،بعض مطلق اقوال سے متعلق شرائط وقیود کا بیان اور آراء کی تنقیح اس طرح اس عہد میں ائمہ متبوعین کے مذاہب کی تنظیم وتدوین اور توضیح وتائید کا بڑا اہم کام انجام پایا ہے۔

(۴)اس دور کا تذکرہ نامکمل ہوگا، اگر اس دور کے اہم فقہاء اور اہلِ علم کا ذکر نہ کیا جائے، اس لیے اختصار کے ساتھ ان کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

حنفیہ

امام ابوالحسن عبداللہ بن حسن کرخی (۲۶۰۔۳۴۰)	ابوبکر جصاص رازی (م ۳۷۰ھ)
ابوجعفر محمد بن عبداللہ بلخی ھندوانی (م۳۶۲ھ)	ابواللیث نصر بن محمد سمرقندی، امام الھدیٰ (م۳۷۳ھ)
ابوعبداللہ یوسف بن محمد جرجانی (م۳۹۸ھ)	ابوالحسن احمد قدوری (م۴۲۷ھ)
ابوزید عبداللہ دبوسی، سمرقندی (م۴۰۰ھ)	ابوعبداللہ حسین صیمری (م۴۳۶ھ)
ابوبکر خواہرزادہ بخاری (م۴۳۳ھ)	شمس الائمہ عبدالعزیز حلوانی (م۴۱۸ھ)
شمس الائمہ محمد بن احمد سرخسی صاحب المبسوط (م۴۸۴ھ)	ابوعبداللہ محمد بن علی دامغانی (م۴۰۰ھ۔۴۷۸ھ)
علی بن محمد بزدوی (م۴۸۳ھ)	شمس الائمہ بکر بن محمد زرنجری (۴۲۷۔۵۱۲ھ)
ابواسحاق ابراہیم بن اسماعیل صفار (۵۷۴ھ)	طاہر بن احمد بخاری (م۵۴۲ھ)
ظہیر الدین عبدالرشید والوالجی (م۵۴۰ھ)	ملک العلماء ابوبکر ابن مسعود کاسانی (م۵۸۷ھ)
فخر الدین حسن اوزجندی قاضی خان (م۵۹۲ھ)	علی ابن ابی بکر مرغینانی صاحب ہدایہ (م۵۹۳ھ)
بکر بن علا قشیری (م۳۱۴ھ)	ابوبکر بن عبداللہ المعیطی (م۳۶۷ھ)

یوسف بن عمر بن عبد البر (م ۳۸۰ھ)	ابو محمد عبد اللہ بن ابی زید قیروانی (م ۳۸٦ھ)
ابو بکر محمد بن عبد اللہ ابھری (م ۳۹۵ھ)	قاضی عبد الوھاب بغدادی (م ۴۲۲ھ)
ابو القاسم عبد الرحمٰن حضرمی (م ۴۴۰ھ)	ابو الولید سلیمان باجی (م ۴۹۴ھ)
ابو الحسن علی لخمی (م ۴۹۸ھ)	ابو الولید محمد بن رشد قرطبی (م ۵۲۵ھ)
ابو عبد اللہ محمد تمیمی (م ۵۲٦ھ)	ابو بکر محمد بن عربی صاحب احکام القرآن (م ۵۳٦ھ)
ابو الفضل قاضی عیاض (م ۵۴۱ھ)	عبد اللہ بن نجم سعدی (م ٦۱۰ھ)

محمد بن احمد بن محمد بن ارشد صاحب ہدایۃ المجتہد (م ۵۹۵ھ) یہ اوپر ذکر کیے گئے ابنِ رشد صاحب کتاب المقدمات کے پوتے ہیں، اس لیے "ابن رشد الحفید" کہلاتے ہیں۔

شوافع

ابو اسحاق ابراہیم مروزی (م ۲۴۰ھ)	ابو علی حسین، المعروف بابن ابی ہریرہ (م ۳۴۵ھ)
قاضی ابو حامد مروزی (۳٦۲ھ)	محمد بن اسماعیل قفال کبیر شاشی (م ۳٦۵ھ)
ابو القاسم عبد العزیز دارکی (۳۷۵ھ)	ابو القاسم عبد الواحد یعمری (۳۸٦ھ)
ابو علی حسین سنجی (۴۰۳ھ)	ابو حامد ابن محمد اسفرائنی (م ۴۰۸ھ)
عبد اللہ ابن احمد قفال صغیر (م ۴۱۷ھ)	ابو اسحاق ابراہیم اسفرائنی (م ۴۱۸ھ)
ابو الطیب طاہر طبری (م ۴۵۰ھ)	ابو الحسن علی ماوردی (۳۵۰ھ)
ابو عاصم محمد مروزی (م ۴۵۸ھ)	ابو اسحاق ابراہیم شیرازی (م ۴۷٦ھ)
ابو نصر محمد بن صباغ (م ۴۷۷ھ)	امام الحرمین ابو المعالی عبد الملک جوینی (م ۴۸۷ھ)
حجۃ الاسلام ابو حامد محمد غزالی (۴۵۰۔۵۰۵ھ)	ابو القاسم عبد الکریم رافعی (م ٦۲۳ھ)
محی الدین ابو زکریا نووی (م ٦۳۱ھ)	

چھٹا مرحلہ سقوطِ بغداد تا اختتام تیرہوی صدی

یہ عہد بھی بنیادی طور پر پہلے ہی عہد کے مماثل ہے، جس میں مختلف مسالک کے اہل علم نے اپنے مذہب فقہی کی خدمت کی، مختلف مذاہب سے متعلق متون اور متون پر مبنی شروح و حدیث کی ترتیب عمل میں آئی، فتاویٰ مرتب ہوئے، فتاویٰ سے مراد دو طرح کی تحریریں ہیں، ایک متاخرین کے اجتہادات، دوسرے مستفتیوں کے سوالات کے جوابات اسی طرح علمی اعتبار سے اس دور کی خصوصیات کو تین نکتوں میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

اوّل: یہ کہ گذشتہ ادوار میں علماء کے درمیان باہمی ارتباط اور افادہ واستفادہ کا دائرہ بہت وسیع تھا، خاص کر حج کا موسم ایک ایسی بڑی درسگاہ کی شکل اختیار کر لیتا تھا، جس میں پوری دنیا کے اہلِ علم ایک دوسرے سے کسب فیض کرتے تھے اور ان کی آراء اور علوم سے فائدہ اٹھاتے تھے، لیکن مذہبی تصلب اور مسلمان آبادیوں کی مختلف مملکتوں میں تقسیم وغیرہ کی وجہ سے اب افادہ واستفادہ کا یہ عالمی مزاج محدود ہو گیا اور ایک ملک اور ایک علاقہ کے علماء ایک دوسرے سے استفادہ پر اکتفاء کرنے لگے۔

دوسرے: متقدمین کی کتابوں میں طرزِ گفتگو مجتہدانہ ہوا کرتا ہے، متاخرین کے یہاں زیادہ سے زیادہ جزئیات کو جمع کرنے کا اہتمام پیدا ہوا، اس دور میں متقدمین کی کتابوں سے اہلِ علم کا رشتہ کمزور ہو گیا اور یہ ایک حقیقت ہے کہ جزئیات کی کثرت سے آدمی مسائل کا حافظ ہوسکتا ہے، لیکن اس میں تفقہ کی شان پیدا نہیں ہوسکتی۔

تیسرے: متقدمین کے یہاں طریقہ تالیف سادہ، سلیس اور واضح ہوا کرتا تھا، عبارت سہل ہوا کرتی تھی اور اصل توجہ فن اور مضمون پر ہوتی تھی، لیکن متاخرین کے یہاں الفاظ کی کفایت اور مختصر نویسی کمال ٹھہرا، یہاں تک کہ عبارتیں چیستاں بن گئی، پھر کئی کئی مصنفین نے اس کی عقدہ کشائی میں اپنا زورِ قلم صرف کیا، حاشیے، شرحیں، پھر ان شرحوں پر حواشی اور کبھی ان شروح پر شروح، نتیجہ یہ ہوا کہ فن سے توجہ ہٹ گئی اور غیر متعلق امور پر محنتیں صرف ہونے لگیں، اس اختصار نویسی کا نمونہ علامہ نسفی کی " کنز الدقائق " زکریا انصاری کی " منہج

الطلاب" اور مالکیہ میں "مختصر خلیل" میں دیکھی جا سکتی ہے، خاص کر مالکیہ کے یہاں مسائل کی تعبیر میں اور بھی زیادہ اغلاق پایا جاتا ہے۔

اِس صورتِ حال نے فقہی ارتقاء کے راستے روک دیئے اور زیادہ تر متون کی مختصرات اور پھر ان مختصرات پر شروح وحواشی کا کام ہوتا رہا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ بہت سی گراں قدر تالیفات بھی اسی عہد کی یادگار ہیں، خاص کر دسویں صدی ہجری کے اوائل تک متعدد صاحب نظر اہل علم پیدا ہوئے، جن میں سے چند کا ذکر کیا جاتا ہے:

حنفیہ

ابو البرکات عبد اللہ بن احمد نسفی (م ۷۱۰ھ)　ابو محمد عثمان فخر الدین زیلعی (م ۷۴۳ھ)

محمد بن عبد الواحد کمال الدین ابن ھمام (م ۷۶۱ھ)　محمد بن احمد بدر الدین عینی (م ۷۶۲ـ۸۵۵ھ)

زین العابدین ابن نجیم مصری (م ۹۶۹ھ)　شمس الدین محمد بن امیر الحاج حلبی (م ۸۷۹ھ)

حافظ سیف الدین قطلو بغا (م ۷۹۸ـ۸۸۱ھ)　عمر بن ابراہیم ابن نجیم، صاحب النہر الفائق (م ۱۰۰۵ھ)

مالکیہ

ابو ضیاء خلیل کردی (م ۷۷۶ھ)　ابو الحسن نور الدین اجھوری (م ۹۶۷ـ۱۰۶۶ھ)

محمد بن عبد اللہ قریشی (م ۱۱۱ھ)　نور الدین عدوی (م ۱۱۲ھ)

شوافع

علامہ تقی الدین سبکی (م ۶۸۳ـ۷۵۲ھ)　شیخ الاسلام زکریا انصاری (م ۸۲۶ـ۹۲۶ھ)

شہاب الدین ابن حجر ہیثمی (م ۹۰۹ـ۹۹۵ھ)

حنابلہ

علامہ تقی الدین احمد بن تیمیہ (م ۶۶۱ـ۷۲۸ھ)　شمس الدین ابن قیم جوزی (م ۶۹۱ـ۷۵۱ھ)

فقہ اسلامی عہدِ جدید میں

فقہ اسلامی کے ارتقاء کے سلسلہ میں جدید دور کا نقطہ آغاز تیرہویں صدی ہجری کے اواخر کو قرار دیا جاسکتا ہے، جب خلافتِ عثمانیہ کے حکم پر "مجلل الاحکام العدلی" کی ترتیب عمل میں آئی، اس عہد میں فقہ اسلامی کی خدمت کا ایک رجحان پیدا ہوا ہے اور اس سلسلہ میں جو کاوشیں ہوئی ہیں اور ہورہی ہیں، وہ یہ ہیں:

(۱) مسلکی تعصب جو خلافتِ عباسیہ کے سقوط کے بعد سے بہت شدت اختیار کرگیا تھا اور فقہی مسائل مناظرہ ومجادلہ کا موضوع بن چکے تھے، الحمدللہ اب اس صورتِ حال میں بہتری آئی ہے، اب اہلِ علم مختلف ائمہ اور مجتہدین کی آراء کو پورے احترام اور انصاف کے ساتھ ذکر کرتے ہیں، عوامی مجلسوں میں تمام ہی سلفِ صالحین کے موعظت آمیز واقعات نقل کئے جاتے ہیں، کتابوں میں مخالف دلائل کا بھی انصاف کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے، حرمین شریفین میں چار علاحدہ مصلی کی صورت ختم ہوجانے کے بعد سے ایک دوسرے کے پیچھے نماز ادا کرنے کا مزاج عام ہوا ہے، ان موضوعات پر مناظروں کی گرم بازاری ختم ہوئی ہے اور نئے مسائل پرغور کرنے کے لیے مختلف مسالک کے علماء ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھتے اور پورے جذبہ مسامحت کے ساتھ تمام نقاطِ نظر کو سنتے ہیں، یہ بہت ہی مثبت تبدیلی ہے، جو خاص کر گذشتہ نصف صدی میں ابھر کر سامنے آئی ہے۔

(۲) دوسرا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ جہاں احناف وشوافع اور شوافع و مالکیہ کی بے معنی آتش جنگ بجھ چکی ہے، وہیں اس دور میں "ظاہریت" اپنے اسی مزاج و مذاق کے ساتھ جو ابن حزم وغیرہ کی تحریروں سے ظاہر ہے، نئے لباس اور نئے پیکر میں ظہور پذیر ہوئی ہے، یہ حضرات اپنے آپ کو اہلِ حدیث، سلفی، محمدی، اثری، مختلف ناموں سے موسوم کرتے ہیں، انھوں نے نماز سے متعلق چار، پانچ مسائل، طلاق سے متعلق ایک مسئلہ اور طریقہ مصافحہ کو اپنی تمام علمی کاوشوں اور محنتوں کا محور بنارکھا ہے اور اپنے گمان میں اسے تبلیغ دین تصور کرتے ہیں، اس فرقہ نے امت کے سوادِ اعظم اور سلفِ صالحین پر طعن وتشنیع اور فروعی مسائل پر مناظرہ ومجادلہ،

نیز دوسرے مسلمانوں کی تکفیر و تفسیق کا اس سے زیادہ بدترین طریقہ اختیار کر رکھا ہے، جو کسی زمانہ میں تنگ نظر مقلد عوام ایک دوسرے کے خلاف کیا کرتے تھے، فھد اھم اللہ و وفقھم بالحق۔

یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ برصغیر میں یہ غلو پسند فرقہ اپنی نسبت شیخ محمد بن عبدالوھاب نجدی اور عرب علماء سے کرتا ہے، حالانکہ شیخ نجدی نے خود اپنے آپ کو حنبلی قرار دیا ہے اور عام عرب علماء و محققین ایسی تنگ نظری اور تعصب میں مبتلا نہیں ہیں جو اس فرقہ کا امتیاز ہے، خود ہندوستان میں اس مکتبِ فکر کے بزرگوں نواب صدیق حسن خان، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا عبداللہ غزنوی وغیرہ کے یہاں اس طرح کا غلو نہیں ملتا، برصغیر میں غیر مقلدین کی جو نئی نسل نشو ونما پا رہی ہے افسوس کہ ان کی اکثریت اس وقت امت میں تفریق و انتشار کی نقیب و ترجمان بنی ہوئی ہے۔

(۳) سترھویں صدی کے انقلاب کے بعد سے جدید مسائل کی ایجاد، عالمی تعلقات میں قربت اور مختلف ممالک کے درمیان باہمی ارتباط میں اضافہ، تہذیبی اقدار میں تبدیلی اور سیاسی و معاشی نظام میں آنے والے تغیرات کے پسِ منظر میں جس تیزی سے نئے مسائل پیدا ہو رہے ہیں، ماضی میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، بحمد للہ علماء اور ارباب افتاء کی توجہ ان مسائل کے حل کی طرف مبذول ہوئی ہے، اس سے دوہرا فائدہ ہوا، ایک تو شریعت اسلامی کو اس وقت جس خدمت کی ضرورت ہے، اہلِ علم کی صلاحیتیں اس خدمت میں صرف ہو رہی ہے، دوسرے گذشتہ دو تین صدیوں سے کسی نئے علمی کام کے بجائے تفصیل کا اختصار اور اختصار کی تفصیل، نیز غیر اہم مسائل کی تحقیق اور فریق مخالف کے نقطہ نظر کو کمزور ثابت کرنے پر جو کاوشیں ہو رہی تھیں، صحیح میدانِ عمل مہیا ہونے کی وجہ سے اب اس رویہ کی اصلاح ہوئی ہے۔

(۴) اس دور میں جو علمی کارنامے انجام پائے ہیں یا پا رہے ہیں، ان کو ہم چار حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

اوّل فقہی مضامین کو دفعہ وار جدید قانونی کتابوں کے انداز پر مرتب کرنا کہ اس سے لوگوں کے لیے استفادہ آسان ہو جاتا ہے اور عدالتوں کے لیے یہ بات ممکن ہوتی ہے کہ وہ اس قانون کو اپنے لیے نشانِ راہ

بنائے، اس کی ابتداء "مجلۃ الاحکام" سے ہوئی حکومتِ عثمانیہ ترکی نے اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے، وزیر انصاف کی صدارت میں اکابر فقہاء کی ایک کمیٹی تشکیل دی اور انھیں حکم دیا کہ فقہ حنفی کے مطابق نکاح، تجارت اور تمام معاملات کے احکام کو دفعہ وار مرتبہ کریں، ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۹ء میں یہ کام شروع ہوا اور سات سال کی محنت کے بعد ۱۲۹۳ھ مطابق ۱۸۷۶ء میں پایہ تکمیل کو پہنچا، پھر شعبان ۱۲۹۳ھ کو حکومت کے حکم سے اس کی تنفیذ عمل میں آئی، اس مجموعہ کے شروع میں فقہ، اس کی اقسام اور نوے قواعد پر مشتمل مقدمہ ہے، یہ مجموعہ سولہ مرکزی عنوانات اور اس کے تحت مختلف ابواب پر مشتمل ہے، ہر باب کے شروع میں اس باب سے متعلق فقہی اصطلاحات نقل کی گئی ہیں، کل دفعات (۱۸۵۱) ہیں، یہ مجموعہ فقہ حنفی کے راجح اقوال پر مبنی ہے، البتہ بعض مسائل میں احوالِ زمانہ کی رعایت کرتے ہوئے ضعیف اقوال کو بھی قبول کیا گیا ہے۔

اس کے بعد مختلف مسلم ممالک میں حکومت کی زیر نگرانی احوالِ شخصیہ سے متعلق مجموعہ قوانین کی ترتیب عمل میں آئی، یہ مجموعے کسی ایک فقہ پر مبنی نہیں تھے، بلکہ ان میں مختلف مذاہب سے استفادہ کیا گیا تھا، لیکن بد قسمتی کی بات یہ ہے کہ مختلف ممالک میں یورپ کے اثر سے قانونِ شریعت میں نا قابلِ قبول تبدیلیاں کر دی گئی ہیں، جیسے تعدادِ ازدواج کا مسئلہ، احکامِ طلاق، میراث میں مرد وعورت کے درمیان فرق، وغیرہ، اسی طرح مجموعہ قوانین کی ترتیب کی بہت ہی قابل قدر انفرادی کوششیں بھی عمل میں آئی ہیں، اس سلسلہ میں فقیہ محمد قدری پاشاہ کی "مرشد الحیران لمعرف احوال الانسان" فقہ حنفی کے مطابق احوالِ شخصیہ، وقف اور معاملات سے متعلق احکام پر مشتمل ہے اور جس کی دفعات (۱۰۴۵) ہیں، شیخ ابو زہرہ کی "الاحوال الشخصی" (جس میں کسی ایک مذہب کی پابندی نہیں کی گئی) اور شیخ احمد بن عبداللہ قاری کی "مجلۃ الاحکام الشرعی علی مذھب الامام احمد بن حنبل شیبانی" (جو مجلۃ الاحکام کے طرز پر فقہ حنبلی کے نقطہ نظر سے معاملات کے احکامات کا مجموعہ ہے، ۲۳۸۴ دفعات پر مشتمل ہے) نیز جرم وسزا کے اسلامی قانون سے متعلق ڈاکٹر عبدالقادر عودہ شہید کی "التشریع الجنائی الاسلامی" (۲ حصے، ۹۸۴ دفعات) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، عالم عرب میں اس طرح کی اور بھی بہت سی

کوششیں ہوئی ہیں، جس نے عام لوگوں کے لیے استفادہ کو آسان کردیا ہے۔

برصغیر میں اس سلسلہ میں جو کوشش ہوئی ہیں ان میں ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن صاحب کی مجموعہ قوانین اسلام اور ہندوستان میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے زیر نگرانی پرسنل لاء سے متعلق مجموعہ قوانین (جو غالبًا ۶/جلدوں پر مشتمل ہے) نہایت اہم ہے، یہ دونوں مجموعے بنیادی طور پر فقہ حنفی کے لحاظ سے مرتب کئے گئے ہیں، البتہ بعض مسائل میں دوسرے دبستانِ فقہ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے، اسی سلسلہ کی ایک اہم کوشش اسلام کے عدالتی قوانین سے متعلق حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی کی اسلامی عدالت ہے جو ۴۰۷ دفعات پر مشتمل ہے اور اردو زبان میں اس موضوع پر منفرد کتاب ہے، اس کا عربی ترجمہ بھی بیروت سے شائع ہو چکا ہے۔

(۵)　اس دور میں قدیم کتابوں کی خدمت میں بھی بعض نئے پہلو اختیار کئے گئے ہیں، جیسے مضامین کی فقہ بندی، تفصیلی فہرست سازی، تعلیق وتحقیق اور ایک اہم سلسلہ حروفِ تہجی کی ترتیب پر مضامین فہرست سازی کا بھی شروع ہوا ہے، جو کتاب سے مراجعت کرنے والوں کے لیے بہت ہی سہولت بخش ہے، چنانچہ احمد مہدی نے "ردالمحتار" کی، محمد اشقر نے "المغنی لابن قدامہ" کی اور محمد منتصر کتانی نے "المحلی لابن حزم" کی ابجدی فہرست بنائی ہے، اسی طرح فقہ مالکی میں "الشرح الصغیر للدردیر" ابجدی فہرست کے ضمیمہ کے ساتھ شائع ہوئی ہے، ان فہارس نے طویل کتابوں سے استفادہ اور مطلوبہ مضامین کے حصول کو آسان کردیا ہے، خاص کر جن کتابوں کو کمپیوٹر میں فہارس کے ساتھ محفوظ کردیا گیا ہے، ان سے استفادہ مزید سہل ہو گیا ہے۔

موجودہ دور میں مختلف علوم کی انسائیکلوپیڈیا مرتب کرنے کا رجحان عالمی سطح پر اور ہر زبان میں بڑھ رہا ہے، بحمد للہ فقہ اسلامی میں بھی اس سلسلہ میں متعدد کوششیں کی گئی ہیں، چنانچہ جب مشہور اسلامی مولف اور داعی ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی دمشق یونیورسٹی میں "کلیۃ الشریعۃ" کے صدر شعبہ بنے تو فقہ اسلامی کی "دائرۃ المعارف" کی ترتیب کا منصوبہ پیش کیا اور ۱۹۵۶ھ میں حکومتِ شام نے اسے منظور کرلیا، اس مقصد کے لیے ڈاکٹر مصطفیٰ

سباعی، ڈاکٹر احمد سمان، ڈاکٹر مصطفیٰ زرقاء، ڈاکٹر معروف دوالیبی اور ڈاکٹر یوسف العش جیسے ممتاز اصحاب تحقیق پر مشتمل کمیٹی تشکیل دی گئی اور کام چار مراحل پر تقسیم کیا گیا، جن میں پہلا مرحلہ موسوعہ میں آنے والے فقہی موضوعات کی تعیین و ترتیب تھی، افسوس کہ طویل عرصہ گذر جانے کے باوجود اس کا پہلا مرحلہ ہی تشنہ تکمیل ہے۔

۱۹۵۸ء میں جب مصر و شام کا اتحاد ہوا تو مشترکہ طور پر مصر اور شام نے مل کر اس موسوعہ کی ترتیب کا ذمہ لیا، لیکن یہ اتحاد جلد ہی ۱۹۶۱ء میں ٹوٹ گیا، چنانچہ ۱۹۶۲ء میں حکومتِ مصر نے ازسرنو اس کی منصوبہ سازی کی اور ایک مضحکہ خیز بات یہ ہوئی کہ جمال عبدالناصر جیسے دین بیزار شخص کی طرف منسوب کر کے اس کا نام "موسوعۃ جمال عبدالناصر فی الفقہ الاسلامی" رکھ دیا گیا، موسوعۃ کے لیے مقررہ یہ کمیٹی کام کر رہی ہے اور اب تک اس کی پندرہ سولہ جلدیں منظر عام پر آ چکی ہیں، اس موسوعۃ میں حنفیہ، مالکیہ، شوافع، حنابلہ اور ظاہریہ کے علاوہ امامیہ، زیدیہ اور اباضیہ فرقوں کے نقطہ نظر کو بھی ضروری دلائل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور اصولِ فقہ اور قواعدِ فقہ کو بھی شامل رکھا گیا ہے۔

اسی طرح کی ایک اور کوشش "جمعیۃ الدراسات الاسلامی قاھرہ" نے شیخ محمد ابو زہرہ کی صدارت میں شروع کی تھی، جس میں مذکورہ آٹھوں مذاہب کا نقطہ نظر جمع کرنا پیش نظر ہے، لیکن غالباً یہ کوشش منظر عام پر نہیں آسکی ہے۔

اس سلسلہ کی سب سے کامیاب اور نتیجہ خیز کوشش وزارتِ اوقاف کویت کی طرف سے ہوئی ہے، جس نے ۱۹۶۶ء میں "الموسوعۃ الفقہیہ" کے منصوبہ کی منظوری دی اور اس مقصد کے لیے فقہی موسوعہ کا تصور پیش کرنے والی پہلی شخصیت ڈاکٹر زرقاء کی خدمات حاصل کیں، اس موسوعہ میں بھی حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، ظاہری، زیدی، اثناء عشری اور اباضی نقاط نظر کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، یہ عظیم الشان کام پینتالیس جلدوں میں مکمل ہو چکا ہے اور واقعہ ہے کہ اس موضوع پر ایک تاریخی علمی کام ہوا ہے، جو یقیناً فقہ اسلامی کی نشاۃ ثانیہ کا حصہ ہے، مقامِ مسرت ہے کہ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے اس موسوعہ کو اردو کا جامہ پہنایا ہے، تادمِ تحریر

چالیس جلدوں کا ترجمہ مکمل ہو چکا ہے اور اس وقت نظرِ ثانی اور مراجعت کے آخری مراحل میں ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی اشاعت کو آسان فرمائے اور اردو دنیا کو اس عظیم علمی ذخیرہ کے ذریعہ شادکام کرے۔

انسائیکلوپیڈیائی کاوشوں میں ڈاکٹر رواس قلعہ جی کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا کہ انھوں نے عہدِ صحابہ اور عہدِ تابعین کے ان فقہاء کی آراء کو یکجا، منضبط اور مرتب کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے، جن کے اقوال مختلف کتابوں میں بکھرے ہوئے تھے اور سلف کا ایک بہت بڑا علمی اور فقہی ورثہ لوگوں کی نگاہ سے اوجھل ہوتا جارہا تھا، ڈاکٹر رواس نے الف بائی ترتیب سے حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عائشہ، حضرت عبداللہ بن عمر، حسن بصری اور ابراہیم نخعی وغیرہ کی فقہ کو جمع کیا ہے اور اس طرح اہلِ علم کی نئی نسل کو ابتدائی دور کے فقہاء کے اجتہادات سے مربوط کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے، فجزاہم اللہ خیر الجزاء۔

(۷) اس عہد میں ایک بہتر رجحان نئے مسائل پر اجتماعی غور وفکر کا بھی پیدا ہوا ہے، جس میں مختلف فقہی مذاہب کے اہلِ علم سے استفادہ کیا جائے اور اس دور کی مشکلات کو حل کیا جائے، چنانچہ رابطہ عالم اسلامی کی موتمر منعقدہ مکہ مکرمہ ۱۳۸۴ھ میں "مجمع الفقہ الاسلامی" کے سلسلہ میں ڈاکٹر مصطفیٰ زرقاء نے نہایت اہم تجویز پیش کی، یہ تجویز قبول کی گئی، مجمع کی تشکیل عمل میں آئی چنانچہ اب تک اس کے دسیوں اجلاس ہو چکے ہیں اور کئی درجن مسائل زیر بحث آ چکے ہیں، ان ہی خطوط پر زیادہ وسعت کے ساتھ ۱۹۸۳ء میں جدہ (O.I.C) کے تحت فقہ اکیڈمی کی تشکیل ہوئی، جو اس وقت عالمی سطح پر سب سے زیادہ باوقار اور فعال اکیڈمی سمجھی جاتی ہے ۲۰۰۴ء تک اس اکیڈمی کے ۱۴ سیمینار ہو چکے تھے اور اس میں ۱۳۳ مسائل زیر بحث آ چکے تھے، ان دونوں اکیڈیمیوں کے سیمناروں کی تجاویز کا اردو ترجمہ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا سے شائع ہو چکا ہے، اسی طرح یورپ میں "یورپی افتاء کونسل" قائم ہے، جس کا مرکز برطانیہ ہے اور جس کے عالم اسلام میں اور بھی کئی ادارے ہیں جو خاص کر مسلمانوں کو درپیش جدید فقہی مسائل کو اجتماعی غور وفکر اور تبادلہ خیال کے ذریعہ حل کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔

ہندوستان کے علماء نے بھی اس سمت میں کوششیں کی ہیں، دارالعلوم ندوۃ العلماء نے مجلس تحقیقاتِ شرعیہ اور جمعیۃ علماءِ ہند نے "ادارۃ المباحث الفقہی" کو اسی مقصد کے تحت قائم کیا تھا، پاکستان میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور مولانا محمد یوسف بنوری وغیرہ نے "مجلس تحقیق مسائل حاضرہ" کی بنیاد رکھی تھی، ان مجالس نے وقتاً فوقتاً اجتماعات منعقد کئے ہیں اور متعدد مسائل پر تبادلہ خیال کیا گیا ہے، لیکن مسائل کی رفتار کے اعتبار سے کام آگے نہیں بڑھ سکا، کیونکہ ان اداروں کی حیثیت ضمنی تھی اور جن تنظیموں اور اداروں کے تحت یہ رکھا گیا تھا، ان کے کام کا دائرہ خود بہت وسیع ہے۔

اسی پس منظر میں ۱۹۸۹ء میں حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلامی قاسمی نے اسلامک فقہ اکیڈمی کی بنیاد رکھی، اکیڈمی نے اب تک ۱۵ سیمینار کئے ہیں اور ان سیمیناروں میں پچاس سے زیادہ مسائل زیر بحث آئے ہیں، ان سیمیناروں میں پیش کئے جانے والے مقالات کی ۲۰ سے زیادہ ضخیم جلدیں طبع ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں، اس کے علاوہ فقہی تحقیق اور نئی نسل کو صحیح خطوط پر تربیت کے سلسلہ میں اکیڈمی نے نہایت اہم اور ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔

(۸)　اس عہد سے پہلے عام طور پر فقہی ذخیرہ عربی زبان ہی میں ہوا کرتا تھا، یا چند کتابیں فارسی زبان میں لکھی گئی تھیں، لیکن موجودہ عہد میں فقہ کے عربی ذخیرہ کو اردو اور دوسری زبانوں میں منتقل کرنے کا ذوق پیدا ہوا اور مختلف علاقائی اور عالمی زبانوں میں فقہ کے موضوع پر یا تو ترجمے کئے گئے، یا مستقل طور پر کتابیں لکھی گئیں، ان زبانوں میں اردو زبان کو اوّلیت کا شرف حاصل ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اس وقت اردو زبان میں علوم اسلامی اور فقہ کا جتنا بڑا ذخیرہ موجود ہے، عربی زبان کے سوا کسی اور زبان میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے، بلکہ بعض کتابیں تو ایسی ہیں کہ عربی وانگریزی میں بھی ان کے ترجمے ہوئے اور انھیں قبول عام وخاص حاصل ہوا، ان میں اصولِ فقہ، تاریخ فقہ، قواعدِ فقہ، فقہ کے تمام ابواب کو جامع اور فقہ کے کسی ایک باب نیز فقہ حنفی، فقہ شافعی اور فقہ سلفی سے متعلق ہر طرح کی کتابیں موجود ہیں۔

اور ظاہر ہے کہ بہت سی کتابیں نایاب ہوجانے، یا ان تک رسائی حاصل نہ ہونے کی وجہ سے چھوٹ بھی گئی ہوں گی، اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ اس موضوع پر اردو زبان میں کم وبیش ڈیڑھ ہزار تالیفات موجود ہیں اور یقیناً یہ اردو زبان کی بڑی سعادت اور اس کے لیے تمغہ افتخار ہے، سنہ ۲۰۰۰ء تک کے جائزہ کے مطابق ۱۲۴۷ کتابیں موجود ہیں۔

یہ تو ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ فقہ حنفی کی تدوین شورائی طریقے پر ہوئی ہے، یہی وجہ ہے کہ اجتماعی طریق اجتہاد اور آزادانہ بحث ونقد نے فقہ حنفی میں نصوص ورائے اور مقاصد شریعت وانسانی مصالح کے درمیان ایک خاص قسم کا توازن پیدا کردیا ہے، جو دوسرے مکاتب فقہیہ میں کم نظر آتا ہے، فقہ حنفی کے طریق اجتہاد اور اصول استنباط نیز اس کی مستنبط جزئیات وفروعات پر غور کرنے کے بعد اس فقہ کا عمومی مزاج ومذاق اور خصائص وامتیازات جو سمجھ میں آتے ہیں ان کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے، ذیل میں اسی نقطہ نظر سے گفتگو کی گئی ہے:

نصوص سے غایت اعتناء

فقہ حنفی کی سب سے بڑی خصوصیت اس فقہ میں نصوص شرعیہ سے غایت اعتناء ہے، اس فقہ میں خبر واحد کو قیاس پر مقدم رکھا گیا ہے، حدیث مرسل یعنی وہ حدیث جس کو تابعی نے براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہو اور درمیانی واسطہ یعنی صحابی کا ذکر نہ کیا ہو، امام ابوحنیفہ نے بعض خاص شرطوں اور تفصیلات کے ساتھ قبول کیا ہے، عبادات کے باب میں احناف نے بعض مواقع پر ضعیف روایات کو بھی قبول کرلیا ہے، نماز میں قہقہہ کا ناقض وضو ہونا، اس کی واضح مثال ہے، آثارِ صحابہ کو بھی فقہ حنفی میں حجت مانا گیا ہے، اس سلسلہ میں فقہائے احناف کا نقطہ نظر یہ ہے کہ جن مسائل میں قیاس واجتہاد کی گنجائش نہیں ہے ان میں صحابہ کی رائے حدیث رسول کے درجہ میں ہوگی، کیونکہ ضروری ہے کہ ان حضرات نے یہ رائے آپ سے سن کر یا آپ کو کرتے ہوئے دیکھ کر ہی قائم کی ہوگی، چنانچہ امام ابوحنیفہ نے حیض کی کم سے کم مدت تین دن اور زیادہ

سے زیادہ دس دن، حضرت انس رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ ہی کی آراء پر مقرر کی ہے۔

مصادرِ شرعیہ کے مدارج کی رعایت

مختلف دلائل کے درجات و مراتب کی رعایت اور ان میں غایت درجہ توازن واعتدال، فقہ حنفی کا نمایاں وصف ہے، یہی وجہ ہے کہ کتاب اللہ کی اولیت اور اس کی بالاتری کا اس میں ہر جگہ لحاظ کیا گیا ہے، حدیث سورہ فاتحہ کو نماز کے لیے ضروری قرار دیتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ قرآن پڑھا جائے تو سکوت اور گوش برآواز رہنا ضروری ہے۔

حنفیہ نے ان دونوں کو اپنی اپنی جگہ پر رکھا ہے، چنانچہ سورہ فاتحہ کی تلاوت کو واجب قرار دیا، لیکن اقتداء کر رہا ہو تو کہا کہ امام کی قرات اصل اپنی طرف سے ہوتی ہے اور نیابۃً اپنے مقتدیوں کی طرف سے ہے حدیث سے نیت کی تاکید ثابت ہے، قرآن نے جہاں تفصیل کے ساتھ ارکان وضوء کا ذکر کیا ہے، نیت کے بارے میں کچھ نہیں کہا ہے، احناف نے حدیث و قرآن دونوں پر عمل کیا، وضوء کے انہی افعال کو رکن قرار دیا جن کا ذکر قرآن میں موجود ہے اور حدیث سے جو نیت کی تاکید ثابت ہے اسے مسنون کہا تاکہ دونوں پر عمل ہو جائے، احادیث سے آمین کا ثبوت ہے، روایات آمین بالجھر کی بھی ہیں، اور سر کی بھی، لیکن خود قرآن مجید نے دعا کا جو ادب بتایا وہ یہ کہ کیفیت میں خشوع اور تضرع ہو اور آواز پست ہو، حنفیہ نے دونوں کی رعایت کی ہے، ہدایت قرآنی کے مطابق آمین (چونکہ دعا ہے) آہستہ کہی جائے، اور جہر کی حدیث کو ابتدائے اسلام یا تعلیم و تربیت کے نقطہ نظر سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وقتی عمل سمجھا جائے تاکہ کسی کو انکار کرنے کی نوبت نہ آئے۔(٦٧)

نقد حدیث میں اصول درایت سے استفادہ

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث کو پرکھنے کے لیے درایت سے فائدہ اٹھانے کی طرح ڈالی اور

اس کے لیے دوصورتیں اختیار کیں، اوّل تو خود حدیث کے متن اور اس کے مضمون پر نظر ڈالی کہ آیا یہ دین کے مجموعی مزاج سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو ایسی اخبار آحاد کی کوئی مناسب تاویل کی اور اس پر رائے کی بنیاد نہیں رکھی، دوسرے راوی پر بھی غور کیا کہ خود راوی میں حدیث کے مضمون کو پوری طرح سمجھنے اور منشا نبوی تک پہونچنے کی صلاحیت ہے یا نہیں کہ کبھی راوی معتبر ہوتا ہے، مگر غلط فہمی سے بات کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے، یا کبھی دو روایتیں متعارض نظر آتی ہیں اور تاویل وتوجیہ کے ذریعہ ان میں تطبیق کی گنجائش بھی نہیں رہی تو جس مضمون کی روایت زیادہ فقیہ راویوں سے مروی ہو اس کو ترجیح دی جائیگی، اس سلسلہ میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا وہ واقعہ بہت ہی مشہور ہے جو امام اوزاعی رحمہ اللہ سے ملاقات کے وقت پیش آیا تھا، امام اوزاعی رحمہ اللہ نے دریافت کیا کہ آپ حضرات رکوع سے پہلے اور رکوع کے بعد رفع یدین کیوں نہیں کرتے؟ امام صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ صحیح طور پر اس کا ثبوت نہیں ہے، اوزاعی رحمہ اللہ نے جواب دیا کہ مجھ سے زہری نے اور زہری نے سالم سے اور سالم نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے حضور کا رفع یدین کرنا نقل کیا ہے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ مجھ سے حماد نے، ان سے ابراہیم نے ابراہیم سے علقمہ واسود نے اور ان دونوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صرف آغاز نماز ہی میں رفع یدین فرمایا کرتے تھے، امام اوزاعی رحمہ اللہ کے پیش نظر یہ بات تھی کہ ان کے اور رسول اللہ کے درمیان تین ہی واسطے ہیں اور وہ بھی ایسے کہ اپنے اعتبار وثقاہت کے لحاظ سے حدیث اور روایت کی دنیا کے آفتاب وماہتاب ہیں، لیکن امام ابوحنیفہ نے اپنے نقطہ نظر کی ترجمانی اس طرح کی کہ حماد زہری سے اور ابراہیم سالم سے زیادہ فقیہ ہیں اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ کا شرف صحبت ملحوظ نہ ہوتا تو میں کہتا کہ علقمہ ان سے زیادہ فقیہ ہیں اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تو عبداللہ بن مسعود ہی ہیں، یہ سن کر امام اوزاعی رحمہ اللہ خاموش ہو گئے۔(٦٨)

احناف کی اس اصل سے دوسرے فقہاء ومحدثین نے بھی فائدہ اٹھایا ہے، غور کیجئے عبداللہ بن عباس

سے بسند صحیح مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو چھ سال کے بعد حضرت ابوالعاص رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں نکاح جدید کے بغیر سابقہ نکاح ہی کی بناء پر دے دیا تھا، حالانکہ درمیان میں چھ سال کا وقفہ ہوا، جس میں ابوالعاص مشرک تھے، گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرک کے باوجود رشتہ نکاح کو باقی رکھا، اس کے برخلاف حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ نئے مہر کے ساتھ دونوں کا نکاح فرمایا، اس دوسری روایت کے متعلق امام ترمذی رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ سند کے اعتبار سے اس کی صحت مشکوک ہے، مگر ساتھ ہی امام ترمذی رحمہ اللہ نے یہ صراحت کی ہے کہ ائمہ اربعہ اور دوسرے فقہاء کا اسی پر عمل ہے، امام ترمذی رحمہ اللہ یزید بن ہارون کے واسطے سے لکھتے ہیں:

"حَدِث ابنِ عَبَّاسٍ ىَجوَد اِسنَادًا وَالعَمَل عَلىَ حَديثِ عَمرِو بنِ شعَبٍ".(٦٩)

یہاں دوسرے فقہاء ومحدثین نے بھی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ ہی کے مزاج کے مطابق روایت کے ردوقبول میں درایت ہی سے کام لیا ہے۔

تاہم اس بات کی وضاحت مناسب ہوگی کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا یہ اصول کوئی خود ساختہ نہیں تھا، خود صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور میں ہمیں اس کی مثال ملتی ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مطلقہ بائنہ کی عدت کے نفقہ کے متعلق حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کی روایت کو یہی کہہ کر رد کر دیا تھا کہ ایک ایسی عورت کی بات پر اعتماد کر کے ہم کس طرح کتاب وسنت کو نظر انداز کر دیں جس کے بارے میں معلوم نہیں کہ اس نے صحیح کہا یا غلط اور یاد رکھا یا پھر بھول گئی۔(٧٠)

اسی طرح ہم عمر رضی اللہ عنہم کو دیکھتے ہیں کہ بعض فقہاء صحابہ رضی اللہ عنہم کی تنہا روایت قبول کر لیتے ہیں اور بعض صحابہ کی روایت کسی تائیدی راوی کے بغیر قبول نہیں کرتے، یہی طریقہ تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اپنے طریقہ استنباط میں اختیار کیا ہے۔

حقوق اللہ میں احتیاط

فقہ حنفی کی ایک اہم خصوصیت حقوق اللہ اور حلال وحرام میں احتیاط کی راہ اختیار کرنا ہے، امام کرخی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

"اِنَّ اِلاحتِیَاطَ فِی حقوقِ اللهِ جَائِز وَفِی حقوقِ العِبَادِ لَایَجوز... اِذَادَارَتِ الصَّلوٰۃ بَینَ الجَوَازِ وَالفَسَادِ فَالاِحتِیَاط اَن یعِیدَ الاَدَاء "(۷۱)

حقوق اللہ میں احتیاط جائز ہے، حقوق العباد میں جائز نہیں، چنانچہ جب نماز میں جواز وفساد کے دو پہلو پیدا ہو جائیں تو احتیاط نماز کے اعادہ میں ہے۔

چنانچہ غور کیا جائے تو عبادات میں امام صاحب رحمہ اللہ کے یہاں احتیاط کے پہلو کو خاص طور پر پیشِ نظر رکھا گیا ہے، نماز میں گفتگو کو مطلقاً مفسد قرار دیا گیا ہے، چاہے بھول کر یا اصلاح نماز کی غرض سے کیوں نہ گفتگو کی گئی ہو، مصحف کو دیکھ کر نماز پڑھنے کو مفسد مانا گیا ہے، نماز کی حالت میں قہقہہ کو ناقض وضو قرار دیا گیا، روزہ خواہ کسی طور پر توڑا جائے، خوردونوش کے ذریعہ یا جماع کے ذریعہ، اس کو موجب کفارہ کہا گیا ہے، دسویں ذی الحجہ کو افعال حج میں ترتیب ضروری قرار دی گئی ہے، حرمت مصاہرت میں بھی سختی برتی گئی، زنا بلکہ دواعی زنا کو بھی حرمت کے ثبوت کے لیے کافی سمجھا گیا، حرمت رضاعت کے معاملہ میں بھی دودھ کی کسی خاص مقدار کو پینے کی قید نہیں رکھی گئی، بلکہ ایک قطرہ دودھ کو بھی حرمت رضاعت کا باعث قرار دیا گیا۔

یسر وسہولت کا لحاظ

فقہ حنفی میں انسانی ضروریات اور مجبوریوں کا خیال اور شریعت کے اصل مزاج یسر اور رفع حرج کی رعایت قدم قدم پر نظر آتی ہے، مثلاً اکثر فقہاء نے نجاست کو مطلقاً نماز کے منافی قرار دیا ہے اور ادنی درجہ کی نجاست کو بھی قابل عفو نہیں مانا، لیکن امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اول تو نصوص کے لب ولہجہ، فقہاء کے اتفاق واختلاف اور ان کے حالات ومجبوریوں کو سامنے رکھتے ہوئے نجاست کی تقسیم کی اور غلیظہ وخفیفہ دو قسمیں قرار

دیں، دوسرے نجاست غلیظہ میں ایک درہم اور نجاست خفیفہ میں ایک چوتھائی تک معاف قرار دیا، پانی کثیر وقلیل مقدار کے لیے کوئی تحدید نہ کی اور اس کو لوگوں کی رائے پر رکھا، جو خود پا کی یا ناپا کی کے مسائل سے دو چار ہوں، حقیقت یہ ہے کہ یہ امام ابوحنیفہ کے کمال ذہانت اور غایت درجہ فراست کی بات ہے جو انہوں نے اس سلسلہ میں اختیار کی ہے، ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک ہی مقدار کسی علاقہ کے لیے کثیر اور کسی علاقہ کے لیے قلیل قرار پائے، مثلاً: ہندوستان کے نشیبی خطہ میں جہاں جگہ جگہ پانی کے بڑے بڑے تالاب ہیں اور پانی کی سطح ۵۰، ۶۰ فٹ پر ہے اور راجستھان کے صحراء جہاں پانی کی شدید قلت اور پانی کی سطح نہایت نیچے ہے، کو قلیل وکثیر مقدار کے معاملہ میں ایک ہی پیمانہ کے تحت رکھنا لوگوں کے لیے نہایت تنگی اور دشواری کا باعث ہوگا، احناف کی اس رائے کی روشنی میں ایسے مختلف حالات میں تنگی ودشواری سے بچا جا سکے گا، گرما کے موسم میں تاخیر اور نسبتاً ٹھنڈا ہونے کے بعد نمازِ ظہر کا مستحب ہونا، اور اچھی طرح صبح کھلنے کے بعد نماز فجر کی ادائیگی کو ترجیح دینا، فقہ حنفی کے اسی مزاج کا عکاس ہے، زکوٰۃ کی ادائیگی میں شوافع کے یہاں ضروری ہے کہ قرآن میں بیان کردہ آٹھوں مصارف اور ہر مصرف کے کم سے کم تین حقدار کو دیا جائے، گویا ہر کم وبیش زکوٰۃ کم سے کم ۲۴ حقداروں پر تقسیم کی جائے، تب زکوٰۃ ادا ہوگی، اس میں جس قدر دقت ہے وہ محتاج اظہار نہیں، احناف نے کہا کہ کسی ایک مصرف اور اس کے ایک فرد کو بھی زکوٰۃ کی ادائیگی کا حق ہے، اس میں جس قدر سہولت ہے وہ ظاہر ہے، تاہم ایسا نہ سمجھنا چاہئے کہ احناف یسر وسہولت کے لیے اور حرج ومشقت کے ازالہ کی غرض سے نصوص اور حدیث کی صراحتوں کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں، علامہ ابن نجیم مصری رحمہ اللہ کا بیان ہے:

"اَلمَشَقَّة وَالحَرَج اِنَّمَا يعتَبَرَانِ فِي مَوضَعٍ لَاَنَصَّ فِيهِ"(۷۲)

مشقت وحرج کا اعتبار ایسی جگہ ہوتا ہے جہاں نص موجود نہ ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ احناف نے اس باب میں جس درجہ توازن برتا ہے اور شریعت الٰہی اور ضرورت انسانی کو جس طرح دوش بدوش رکھا ہے وہ شریعت کے اوامر ونواہی اور شریعت کے مقاصد ومصالح دونوں میں گہری

بصیرت اور عمیق فہم کا ثبوت ہے۔

عقل و اصول سے مطابقت

فقہائے احناف نے دین کے اصول مسلمہ اور قواعد متفقہ نیز عقل سے ہم آہنگی کا خاص خیال رکھا ہے، مثلاً: شریعت کی ایک تسلیم شدہ اصل یہ ہے کہ انسانی جسم پاک ہے اور اس کو چھونا موجب نجاست نہیں، یہ عین مطابق عقل و دانش بھی ہے، چنانچہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے شرمگاہ یا عورتوں کے چھونے کو ناقض وضو قرار نہیں دیا، آگ میں پکی ہوئی چیزوں کے استعمال کو بھی ناقضِ وضو نہیں سمجھا، صلوۃ کسوف میں دو، تین، چار اور پانچ رکوع والی روایات کے مقابلہ ہر رکعت میں ایک رکوع والی روایت کو ترجیح دیا کہ یہ نماز کے عام اصول و معمول کے مطابق ہے، جانور کا دودھ روک کر اسے فروخت کیا جائے، ایسی صورت میں بعض روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ جانور اور دودھ سے انتفاع کے بدلے ایک صاع کھجور ادا کی جائے، ظاہر ہے کہ یہ حکم شریعت کے عام قانون مکافات اور اصولِ مجازات سے مطابقت نہیں رکھتے، چنانچہ حنفیہ نے اس روایت کو اخلاقی ہدایت پر محمول کیا ہے اور اس نفع کو قانونی طور پر نا قابل عوض ٹھہرایا ہے، کیونکہ دین اور اصول انصاف کے مسلمہ اصولوں میں سے یہ ہے کہ جو شخص نقصان کا ذمہ دار ہو، وہی نفع کا بھی حقدار ہے، چنانچہ اس صورت میں اگر وہ جانور ہلاک ہو جاتا تو خریدار کو ہی یہ نقصان اٹھانا پڑتا، تو ضروری ہے کہ اس مدت میں جانور کے ذریعہ جو نفع حاصل ہوا ہو، وہی اس کا مالک اور حقدار قرار پائے، فقہائے احناف کی آراء اور دوسرے فقہی مذاہب سے اس کا تقابل کیا جائے تو قدم قدم پر فقہ حنفی کا یہ مذاق نمایاں ہو کر سامنے آئیگا۔

مذہبی رواداری

مذہبی آزادی اور غیر مسلموں کے ساتھ رواداری اور مذہبی و انسانی حقوق کا لحاظ جس درجہ فقہ حنفی میں رکھا گیا ہے وہ غالبا اس کا امتیاز ہے، غیر مسلموں کو اپنے اعتقادات کے بارے میں اور ان اعتقادات پر مبنی معاملات کے بارے میں احناف کے یہاں خاص فراخدلی اور وسیع النظر فی پائی جاتی ہے، قاضی ابو زید دبوسی

نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے اس ذوق و مزاج پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

"اَلاَصل عِندَاَبِی حَنِیفَۃَ اَنَّ مَایَعتَقِدہ اَھل الذِمِّ وَیدِینو نَہ یَتر کونَ عَلَیِہِ"(۷۳)

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اصل یہ ہے کہ اہل ذمہ جو عقیدہ رکھتے ہوں اور جس دین پر چلتے ہوں ان کو اس پر چھوڑ دیا جائے۔

چنانچہ جن غیر مسلموں کے یہاں محرم رشتہ داروں سے نکاح جائز ہو، امام صاحب کے نزدیک ان کے لیے اپنے ایسے رشتہ داروں سے نکاح کرنے پر روک نہیں لگائی جائے گی، اسی طرح غیر مسلم زوجین میں سے ایک فریق مسلمان قاضی کی طرف رجوع کرتا ہو اور شریعتِ اسلامیہ کے مطابق فیصلہ کا طالب ہو تو قاضی اس معاملہ میں دخل نہیں دے گا، جب تک کہ دونوں فریق اس کے خواہش مند نہ ہوں، اسی طرح غور کریں کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک جس طرح مسلم ملک کا غیر مسلم شہری کسی مسلمان کو قتل کرنے کے جرم میں قصاصاً قتل کیا جائے گا اسی طرح مسلمان سے بھی غیر مسلم شہری کے قتل پر قصاص لیا جائیگا، یہی حال دیت اور خون بہا کا بھی ہے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے انسانی خون میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھا ہے، مسلمانوں اور غیر مسلموں کی دیت کی مقدار برابر رکھی ہے، جب کہ عام فقہاء کی رائے اس سے مختلف ہے، یہ چند مثالیں ہیں، ان کے علاوہ بھی بہت سی ایسی جزئیات موجود ہیں جن سے فقہ حنفی کے اس مزاج کی نشاندہی ہوتی ہے۔

مسلمانوں کی طرف گناہ کی نسبت سے احتراز

فقہ حنفی کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ فعل مسلم کو حتی المقدور حرمت کی نسبت سے بچانے اور حلال جہت پر محمول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، امام کرخی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"اِنَّ امورَالمسلِمِینَ مَحمولَ عَلیٰ السِّدَادِ وَالصَّلَاحِ حَتّٰی یظھِرَ غَیرہ، مِثَال مَن بَاعَ دِرھَمًا وَدِینَارًا بِدِرھَمَینِ وَدِینَارَینِ جَازَ البَیع وَصَرف الجِنسِ اِلیٰ خِلَافِ جِنسِہ"(۷۴)

مسلمانوں کے معاملات صلاح و درستگی پر محمول کئے جائیں گے، تا آنکہ اس کے خلاف ظاہر و واضح

ہوجائے، مثلاً: کوئی شخص ایک درہم اور ایک دینار، دو درہم اور دو دینار کے بدلہ فروخت کرے تو معاملہ جائز ہوگا اور ایک درہم کو دو دینار اور ایک دینار کو دو درہم کے مقابل سمجھا جائے گا۔

اسی طرح ثبوت نسب کے معاملہ میں حنفیہ نے ممکن حد تک احتیاط اور زنا کی طرف انتساب سے بچانے کی کوشش کی ہے، قاضی ابو زید دبوسی رحمہ اللہ نے صحیح لکھا ہے:

"اَلاَصل عِندَنَا اَنَّ العِبرَ فِی ثبوتِ النَّسَبِ صِحَّ الفِرَاشِ وَکَونِ الزَّوجِ مِن اَھلِهِ لَا بِالتَّمَکّنِ بِالوَطیِ"(۷۵)

ہمارے یہاں اصل یہ ہے کہ ثبوت نسب کے لیے (نکاح کے ذریعہ) فراش کا صحیح ہونا اور شوہر کا اس کا اہل ہونا کافی ہے، فی الواقع وطی پر قادر ہونا ضروری نہیں ہے۔

چنانچہ وقت نکاح سے ٹھیک چھ ماہ پر ولادت ہو تب بھی حنفیہ کے یہاں نسب ثابت ہوجائے گا، اس طرح زوجین میں مشرق و مغرب کا فرق ہو اور بظاہر زوجین کی ملاقات ثابت نہ ہو اس کے باوجود نسب ثابت ہوجائے گا، تاکہ کسی مسلمان کی طرف فعل زنا کی نسبت سے بچا جاسکے، کسی مسلمان پر کفر کا فتویٰ لگائے جانے اور دائرہ اسلام سے خارج کئے جانے میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کس درجہ محتاط تھے، اس کا اندازہ علامہ ابن نجیم مصری رحمہ اللہ نے جو واقعہ بیان کیا ہے اس سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے، ابن نجیم رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ امام صاحب سے ایک ایسے شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو کہتا تھا کہ مجھے جنت کی امید نہیں، جہنم کا اندیشہ نہیں، خدا سے ڈرتا نہیں ہوں، قرات اور رکوع وسجدہ کے بغیر نماز پڑھ لیتا ہوں اور ایسی چیز کی شہادت دیتا ہوں جسے دیکھا تک نہیں، حق کو ناپسند کرتا ہوں اور فتنہ کو پسند کرتا ہوں، امام صاحب رحمہ اللہ نے ان تمام باتوں کی توجیہ فرمائی، فرمایا کہ جنت کے امیدوار نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی رضا کا امیدوار ہوں اور جہنم سے نہ ڈرنے کا مطلب یہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں، اللہ تعالیٰ سے نہ ڈرنے کا مطلب یہ ہے کہ خدا سے ظلم کا خطرہ نہیں، بغیر رکوع وسجدہ اور قرات کے نماز سے مراد نمازِ جنازہ ہے، بن دیکھی گواہی توحید کی گواہی

ہے، حق سے بغض رکھنے سے مراد موت کو ناپسند کرنا ہے کہ موت بھی سب سے بڑی حقیقت ہے، فتنہ سے محبت کے معنی اولاد سے محبت ہے، کیونکہ کہ اولاد کو قرآن میں فتنہ قرار دیا گیا ہے، چنانچہ استفسار کرنے والا کھڑا ہوا، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی جبین فراست کو بوسہ دیا اور عرض کیا کہ آپ ظرفِ علم ہیں، غور کیا جائے کہ کس طرح ایک مسلمان کی طرف کفر کی نسبت کرنے سے بچایا گیا، البتہ اگر قائل خود ہی کفر کا اعتراف کرلے تو پھر کسی تاویل کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ جاتی۔

قانون تجارت میں دقیقہ سنجی

عبادات کے باب میں نصوص وافر مقدار میں منقول ہیں، نکاح کے متعلق بھی جزئیات اور تفصیلات کا ایک قابل لحاظ حصہ کتاب وسنت میں موجود ہے، لیکن تجارت کے باب میں کتاب وسنت میں صرف ضروری اصول اور بنیادی قواعد کی نشاندہی کردی گئی ہے، جن سے شریعت کے مقاصد کی وضاحت ہو جاتی ہے، جزوی تفصیلات بہت کم مذکور ہیں اور ایسا ہونا مصلحت کے عین مناسب ہے، کیونکہ اگر معاملات میں عبادات کی طرح حد بندی کردی جاتی تو تغیر پذیر حالات اور متعین قدروں میں ان پر عمل مشکل ہو جاتا، اس لیے تجارت کی جزوی تفصیلات قیاس ورائے اور اجتہاد واستنباط ہی کی رہین منت ہیں اور ان تفصیلات کی تنقیح میں شرح وبسط اور دقت نظر مجتہد کی بصیرت اور فہم کا اصل مظہر ہے، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ بڑے تاجروں میں تھے اور کوفہ میں سب سے بڑی دوکان آپ ہی کی تھی، اس لیے طبعی بات ہے کہ تجارت کے احکام جس تفصیل اور وسعت وعمق اور دقت نظری کے ساتھ آپ کے یہاں ملتے ہیں دوسرے فقہاء کے یہاں نہیں ملتے، مثلاً:

ا۔　حدیث میں قبضہ سے پہلے کسی سامان کو فروخت کرنے سے منع کیا گیا ہے، لیکن امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے زمین کو منقولہ جائداد کے حکم سے مستثنیٰ رکھا کہ شریعت کا اصل منشا دھوکہ اور غرر سے تحفظ ہے، منقولہ اشیاء میں اس کا امکان موجود ہے کہ شاید قبضہ میں آنے سے پہلے ہی یہ شی ہلاک وضائع ہو جائے اور غیر منقولہ جائداد میں بظاہر یہ امکان نہیں ہے۔(۷۶)

۲۔　حدیث میں بعض مواقع پر کسی تفصیل کے بغیر ذخیرہ اندوزی (احتکار) کو منع کیا گیا ہے، بعض مواقع پر خصوصیت سے اشیاء خوردنی میں ذخیرہ اندوزی کی مذمت آئی ہے، امام ابو حنیفہ لوگوں کی ضروریات سے بخوبی واقف تھے اور اس بات سے بھی آگاہ تھے کہ بعض اشیاء کہ سال بحران کی رسد برقرار رکھنے کے لیے ایک گونہ ذخیرہ اندوزی ضروری ہے اور اس میں شارع کا اصل منشا فروخت کے ذخیرہ کی ممانعت نہیں ہے، بلکہ گاہکوں کے استحصال سے روکنا اور روزمرہ کی زندگی میں ان دشواریوں سے بچانا ہے، ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے امام صاحب نے یہ رائے قائم کی کہ نہ ہر شی میں احتکار ممنوع ہے اور نہ یہ ممانعت غذائی اشیاء تک محدود ہے، بلکہ عام انسانی ضرورت بھی اس ممانعت میں داخل ہے کہ ان میں احتکار اسی درجہ لوگوں کے لیے مشکلات اور دقتوں کا باعث ہے جتنا کہ اشیاء خوردنی میں۔(۷۷)

۳۔　بیع سلم میں معاملہ کے وقت مبیع موجود نہیں ہوتی، بعد کو ادا کی جاتی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اس کی اچھی طرح تعیین عمل میں آجائے، تاکہ آئندہ نزاع کا کوئی امکان باقی نہ رہ جائے، فقہ حنفی میں اس کی بڑی تفصیل ملتی ہے، چنانچہ امام صاحب رحمہ اللہ نے ضروری قرار دیا کہ اس شی کی جنس، نوعیت، مقدار، صفت، ادائیگی کی مدت، مبیع کی حوالگی کے مقام کے علاوہ کس شہر کی صنعت ہے؟ اور اس کی صراحت بھی کر دی جائے کہ مختلف شہروں اور علاقوں کی صنعتوں اور ان کی قیمتوں میں قابل لحاظ فرق ہوتا ہے، اسی طرح امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے گوشت میں بیع سلم کی اجازت نہیں دی اور وجہ یہ بیان کی کہ گوشت کبھی فربہ ہوتا ہے اور کبھی اس کے برعکس، بہر حال تجارتی قوانین میں اس کی بہت سی جزئیات موجود ہیں جو امام صاحب کی دقت نظر، مقاصد شریعت، فہم صحیح، انسانی ضروریات سے آگہی، تاجروں کے مزاج سے واقفیت اور احتیاطی پیش بندی کا مظہر ہیں۔

حیلہ شرعی

حیلہ کے اصل معنی معاملات کی تدبیر میں مہارت کے ہیں

"اَلحَذَق فِي تَدبِيرِ الامورِ" (۷۸)

شریعت کی اصطلاح میں حرمت و معصیت سے بچنے کے لیے ایسی خلاصی کی راہ اختیار کرنے کا نام ہے جس کی شریعت نے اجازت دی ہو (۷۹)

حیلہ کے تعلق سے احناف کے نقطہ نظر کا انصاف اور حقیقت پسندی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے اور صرف حیلہ کی تعبیر پر توجہ مرکوز نہ رکھی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ فن احناف کے یہاں کمال ذکاوت، امت کو حرام سے بچانے کی سعی اور شریعت کی حدود اربعہ میں رہتے ہوئے انسانیت کو حرج سے بچانے کے محمود جذبات کا عکاس ہے، علامہ سرخسی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"فَالحَاصِل اَنَّ مَايَختَلِص بِه الرَّجل مِنَ الحَرَامِ اَويَتَوَصَّل بِه اِلىٰ الحَلَالِ مِنَ الحِيَلِ فَهوَ حَسَن وَاِنَّمَا يَكرَه ذٰلِكَ اَن يَحتَالَ فِي حَقِّ لِرَجلِ حَتّٰى يبطِلَه اَوفِي بَاطِلِ حَتّٰى يَموهَه ... فَمَاكَانَ عَلىٰ هَذَا السَّبِيلِ فَهوَ مَكروه وَمَاكَانَ عَلىٰ السَّبِيلِ الَّذِى قلنَا اَوَّلا فَلا بَاسَ بِه".(۸۰)

حاصل یہ ہے کہ وہ حیل جن کے ذریعہ انسان حرام سے خلاصی یا حلال تک رسائی کا خواہاں ہو بہتر ہے، ہاں کسی کے حق کا ابطال یا باطل کی ملمع سازی مقصود ہو تو ناپسندیدہ ہے، غرض یہ ہے کہ یہ صورت درست نہیں ہے اور پہلے ذکر کی گئی صورت درست ہے۔

اس وضاحت کے بعد کسی صاحب انصاف کے لیے احناف کے نقطہ نظر سے انکار کی گنجائش باقی نہیں رہتی، اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ہمارے فقہاء کرام نے عام طور پر عبادات میں حیلہ سے گریز کیا ہے، ابو بکر خصاف کی تالیف "کتاب الحیل والمخارج" میں عبادات میں صرف چند حیلہ ذکر کئے گئے ہیں، اگر کسی شخص پر زکوٰۃ واجب ہوگئی ہو اور کوئی مستحق زکوٰۃ اس مقروض کو اپنی زکوٰۃ دے دے اور پھر اس سے وہی رقم بطور ادائے قرض کے وصول کر لے۔

اسی طرح اگر میت کی تدفین میں زکوٰۃ خرچ کرنے پر مجبور ہو تو یوں کرے کہ متوفی کے ولی جو صاحبِ

نصاب کو زکوٰۃ دے دے اور وہ اسے کفن میں خرچ کر دے، مسجد کی تعمیر کرنی ہو تو اس علاقہ کے فقراء کو زکوٰۃ دے دے کہ بطورِ خود مسجد تعمیر کر لیں، نیز یہ احتیاط بھی برتے کہ خاص تعمیر کے لیے نہ دے، بلکہ کہے کہ یہ تمہارے لیے صدقہ ہے۔

غور کیجیے کہ حیلہ کی ان صورتوں میں کہیں تحریم حلال اور فرائض وواجبات سے پہلو تہی کا کوئی جذبہ نظر آتا ہے؟ خود امام ابوحنیفہ سے طلاق وغیرہ کے مسائل میں جو حیلے منقول ہیں اور جو ان کی حیرت انگیز اور تعجب خیز ذکاوت کا ثبوت ہیں وہ بالکل اسی نوع کے ہیں اور حیلہ کے ناقدین جیسے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی اس کی داد دی ہے۔ (۸۱)

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ جو حیلہ کے زبردست ناقد ہیں، انہوں نے اعلام الموقعین میں حیلہ کی تین قسمیں بیان کی ہیں، ایک وہ جس کا مقصد ظلم کو قبل از وقت روکنا ہو، دوسرے یہ کہ جو ظلم ہو چکا ہو اس کو دفع کیا جائے، تیسرے جس ظلم کو دفع کرنا ممکن نہ ہو اس کے مقابلہ میں اس طرح عمل کیا جائے، خود ابن قیم کا بیان ہے کہ پہلی دونوں صورتیں جائز ہیں اور تیسری صورت میں تفصیل ہے، پس حیلہ کا اگر صحیح مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے تو یہ عین رحمت ہے اور دین کے مزاج "یسر" اور "رفع حرج" کے عین مطابق ہے اور اس باب میں فقہائے احناف کی ذکاوت وفطانت ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔

فقہ تقدیری

فقہ حنفی کا ایک امتیاز فقہ تقدیری بھی ہے، فقہ تقدیری کا مطلب یہ ہے کہ مسائل کے پیش آنے سے پہلے ہی ممکن الوقوع مسائل کے حل کی طرف توجہ دی جائے، فقہاء حجاز جو عقلی امکانات کے تفحص اور قیل وقال سے دور اور سادہ طور پر مسائل کو سمجھنے اور رائے قائم کرنے کے خوگر تھے، وہ اس طرح کے مسائل کے احکام بتانے سے گریز کرتے تھے، لیکن فقہاء عراق جن کے یہاں دقیقہ سنجی، دور بینی، طلب وتفحص اور شریعت کی روح اور مقاصد میں غواصی کا رنگ غالب تھا "فقہ تقدیری" ان کے مزاج میں داخل تھی اور وہ اس پر مجبور بھی

تھے کہ مشرق کے علاقہ میں نئی نئی قوموں اور علاقوں کے مملکت اسلامی میں شمولیت کی وجہ سے وہ نو پید مسائل سے بمقابلہ فقہاء حجاز کے زیادہ دوچار تھے، اسی لیے فقہاء احناف کے یہاں فقہ تقدیری کا حصہ زیادہ ہے اور افسوس کہ نصوص کے ظاہر پر جمود اور اس کے دقیق مطالعہ اور روح و مقصد تک رسائی سے مناسبت نہ ہونے کی وجہ سے بعض محدثین رحمہ اللہ نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے اس ہنر کو عیب سمجھ لیا، حالانکہ خود حدیث میں موجود ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتنہ دجال کے ظہور اور اس زمانہ میں دن اور رات کے اوقات کی غیر معمولی وسعت کا ذکر فرمایا تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے استفسار کیا کہ اس وقت نماز پنجگانہ کیوں کر ادا کی جاسکے گی، غور کیجئے کہ یہ مسئلہ قبل از وقوع حل کرنا نہیں ہے تو اور کیا ہے؟۔

فقہ تقدیری کے بارے میں فقہاء عراق اور فقہاء حجاز کے نقطہ نظر کا فرق اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے جسے خطیب بغدادی نے نقل کیا ہے کہ حضرت قتادہ جب کوفہ تشریف لائے تو غائب شخص کی بیوی اور اس کے مہر کے بارے میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور قتادہ کے درمیان گفتگو ہوئی، قتادہ نے دریافت کیا کہ کیا کوئی ایسا واقعہ پیش آیا ہے؟ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے نفی میں جواب دیا، قتادہ نے کہا جب یہ واقعہ پیش نہیں آیا تو اس کے بارے میں دریافت کرنے کی کیا ضرورت ہے، امام صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ہم مسائل کے پیش آنے سے پہلے اس کی تیاری کرتے ہیں تاکہ مسائل جب پیش آجائیں تو ہم بآسانی اس سے عہدہ برآ ہوسکیں۔

"اِنَّا نَستَعِدّ لِلبَلَاءِ فَاِذَا مَاوَقَعَ عَرَفنَا الدّخولَ فِيهِ وَالخروجَ مِنه". (۸۲)

ان تفصیلات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ فقہ حنفی کی مقبولیت اور اس کے شیوع کی اصل وجہ اس کی یہی خصوصیات ہیں یعنی توازن واعتدال، ضرورت انسانی کی رعایت، نصوص و مصالح کی باہم تطبیق، شریعت کی روح اور مقصد کی رعایت اور ظاہر پر جمود بے جا سے گریز، اقلیت کے ساتھ منصفانہ رویہ، شخصی آزادی کا احترام اور تقاضائے تمدن سے زیادہ مطابقت اور ہم آہنگی ہے اور بالخصوص ایک ترقی یافتہ تمدن کا ساتھ دینے کی صلاحیت ایسی بات ہے جس نے بجا طور پر خطہ مشرق کو جو بمقابلہ دوسرے علاقوں کے زیادہ متمدن اور تہذیب

آشنا تھا، فقہ حنفی پر فریفتہ کر دیا۔

اسلام ایک ابدی مذہب ہے، اس میں قیامت تک آنے والے مسائل کا حل ہے، یہ دین خدا کی طرف سے آیا ہوا آخری دین ہے ارشاد خداوندی ہے:" اِنَّ الدِّینَ عِندَ اللہِ الاِسلَام"(۸۳) اس دین کا امتیاز جہاں ابدیت ودوام اور ہر عہد میں قیادت ورہبری کی صلاحیت ہے وہیں اسکا بڑا وصف جامعیت، مسائل زندگی میں تنوع کے باوجود رہنمائی اور توازن واعتدال کے ساتھ ان کا حل بھی ہے، خلوت ہو یا جلوت، ایوان سلطنت ہو یا فقیر محتاج کا، خانہ بے چراغ حاکم ہو یا محکوم، دیوان قضاء کی میزان عدل ہو یا ادب وسخن کی بزم ہو، حق وباطل کا رزم ہو یا خدا کی بندگی اور اس کے حضور آہ سحر گاہی ہو، حیات انسانی کا کونسا ایسا شعبہ ہے جس کو اس نے اپنے نور ہدایت سے محروم رکھا ہے، اور زندگی کا کونسا عمل ہے جس کا سلیقہ اس دین نے نہیں سکھایا۔

اجتہاد کی ضرورت

لیکن انسانی زندگی سمندر کی طرح رواں دواں ہے وہ مسلسل حرکت میں ہے کبھی وہ سکون سے آشنا نہیں ہوتی۔

ایسی تغیر پذیر انسانی زندگی کی رہنمائی ہمیشہ اور ہر مسئلہ میں آسان نہیں، اس کے لیے ضروری ہے کہ مختلف شعبہائے زندگی میں مقاصد طے کر دئے جائیں، لیکن وسائل وذرائع کا حکم متعین کرنے میں لچک رکھی جائے، اسلام کے بنیادی مآخذ قرآن وحدیث نے یہی کیا ہے، تجارت کا پورا نظام اسی اصل پر مبنی ہے، نکاح عفت وعصمت اور محبت وسکون کا سامان ہو، انفاق کی تمام صورتوں کا منشاء غرباء کی بہرصورت مدد ہے، عدل وقضاء کے تمام احکام کی روح بے قصور کا بری ہونا اور ظالم کا ماخوذ ہونا ہے، امارت وحکومت کا مقصد عدل کا قیام ظلم کا سد باب اور مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی کی حفاظت ہے۔

شریعت اسلامی کی یہی جامعیت اور وسائل وذرائع سے متعلق لچکدار رہبری اجتہاد کی ضرورت

پیدا کرتی ہے، اجتہاد کے ذریعہ بدلے ہوئے حالات وادوار میں شریعت کے اصل منشاء ومقصد کو سامنے رکھ کر نو پیدا اور تغیر پذیر جزئیات ومسائل اور ذرائع ووسائل کی بابت رہنمائی کا فریضہ انجام دیا جاتا ہے، اجتہاد اس کا نام نہیں ہے کہ شارع کے نصوص کو محدود کر دیا جائے اور اپنی رائے وخواہش کے دائرہ کو وسیع کیا جائے، بلکہ اجتہاد کے ذریعہ درحقیقت نصوص اور شارع کی ہدایات وتعلیمات کے اطلاق کو وسیع کیا جاتا ہے، اوران صورتوں کو بھی آیات وروایات کے ذیل میں لایا جاتا ہے جن کا نصوص میں صراحت کے ساتھ ذکر نہ آیا ہو، مثلاً حدیث میں ہے کہ:

ایک شخص نے روزہ کی حالت میں بیوی سے جماع کر لیا تو اس کو کفارہ ادا کرنے کا حکم دیا گیا۔(۸۴)

اس حدیث سے صراحتاً روزہ میں صرف جماع ہی کی وجہ سے کفارہ واجب ہونا معلوم ہوتا ہے، لیکن فقہاء نے اپنے اجتہاد کے ذریعہ اس حکم کے دائرہ کو ان لوگوں تک بھی وسیع کیا ہے جو قصداً خوردونوش کے ذریعہ روزہ توڑ دیں، اجتہاد کی روح اور اس کی اصل اسپرٹ یہی ہے کہ اس کے ذریعہ نصوص کی صریح واضح ہدایات کے دائرہ عمل کو ان مسائل تک بڑھایا جائے جن کی بابت صریح احکام موجود نہیں ہیں۔

اجتہاد کے شرائط

ظاہر ہے کہ اتنی اہم اور نازک ذمہ داری ہر کس وناکس کو نہیں سونپی جاسکتی، اس کے لیے اخلاص وللّٰہیت، تقوی، خداترسی شرط ہے اور حزم واحتیاط کا وصف بھی مطلوب ہے، اس کے ساتھ عمیق علم، ذکاوت وفراست، وسیع نظر نیز زمانہ سے بھرپور آگہی کی بھی ضرورت ہے، چنانچہ اہل علم نے اس طرف خصوصی توجہ دی ہے اور یہ متعین کرنے کی کوشش کی ہے کہ مجتہد کو کن اوصاف کا حامل ہونا چاہیے، امام غزالی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ وہ عملی اعتبار سے احکام شریعت کے مراجع: قرآن، حدیث، اجماع، اور قیاس کا احاطہ رکھتا ہو، اور امام بغوی نے ان چار کے علاوہ عربی زبان کا بھی ذکر کیا ہے، مناسب ہوگا کہ ان میں سے ہر ایک کا علیحدہ ذکر کیا جائے اور ان سے متعلق ضروری وضاحت کی جائے۔

قرآن کا علم

قرآن کی ان آیات سے واقفیت ضروری ہے جو احکام سے متعلق ہوں، عام طور پر علماء نے لکھا ہے کہ ایسی آیات کی تعداد پانچ سو ہے، مگر محققین کا خیال ہے کہ یہ تحدید صحیح نہیں ہے، کیونکہ قرآن میں احکام صرف اوامر و نواہی میں منحصر نہیں ہیں، قصص و واقعات اور مواعظ میں بھی فقہی احکام نکل آتے ہیں، علامہ شعرانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر فہم صحیح میسر ہو، اور تدبیر سے کام لیا جائے تو اس سے کئی اور احکام نکل آئیں گے اور محض قصص و امثال کے مضامین بھی احکام سے خالی نہ ہوں گے، چونکہ قرآن مجید کے بعض احکام منسوخ ہیں، اس لیے ناسخ و منسوخ کے علم سے بھی واقف ہونا ضروری ہے تا کہ متروک احکام کو قابل عمل نہ ٹھہرایا جائے، مگر اس کے لیے تمام منسوخ اور ناسخ آیات و روایات کا احاطہ ضروری نہیں ہے، اتنی سی بات کافی ہے کہ جس آیت یا حدیث سے وہ استدلال کر رہا ہے وہ منسوخ نہ ہو، اسی طرح مجتہد کے لیے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ وہ حافظ قرآن ہو، یا ان آیات کا حافظ ہو جن سے احکام متعلق نہیں ہیں۔

احادیث کا علم

مجتہد کے لیے ان احادیث سے واقف ہونا ضروری ہے جن سے فقہی احکام مستنبط ہوتے ہیں، مواعظ اور آخرت وغیرہ سے متعلق روایات پر عبور ضروری نہیں، ایسی احادیث گو ہزاروں کی تعداد میں ہیں لیکن بقول علامہ رازی و غزالی وہ غیر محدود بھی نہیں ہیں، بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ ایسی احادیث کی تعداد تین ہزار، اور بعض کی رائے بارہ سو ہے لیکن اس تحدید سے اتفاق مشکل ہے۔

حدیث سے واقفیت کا مطلب یہ ہے کہ حدیث کے صحیح و معتبر ہونے سے واقف ہو، خواہ یہ واقفیت براہ راست اپنی تحقیق پر مبنی ہو یا کسی ایسے مجموعہ احادیث سے روایت نقل کی گئی ہو جس کی روایت کو ائمہ فن نے قبول کیا ہو، یہ بھی معلوم ہو کہ حدیث متواتر ہے یا مشہور یا خبر واحد، نیز راوی کے احوال سے بھی آگہی ہو، اب چونکہ روایات میں وسائط بہت بڑھ گئے ہیں، راویوں پر طویل مدت بھی گذر چکی ہے اور ان کے بارے میں تحقیق

دشوار ہے اس لیے بخاری و مسلم جیسے ائمہ فن نے جن راویوں کی توثیق کی ہے ان پر ہی اکتفاء کیا جائے گا، اس طرح جن روایات کو بعض اہل علم نے قبول نہیں کیا ہے ان کے راویوں کی تو تحقیق کی جائے گی لیکن جن احادیث کو امت میں مقبولیت مل چکی ہے ان کی اسناد پر غور وفکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

البتہ مجتہد کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ تمام احادیث احکام کا حافظ ہو، اگر اس کے پاس احکام سے متعلق احادیث کا کوئی مجموعہ ہو اور اس سے استفادہ کرے تو یہ بھی کافی ہے اہل علم نے خاص طور پر اس سلسلہ میں سنن ابی داؤد کا ذکر کیا ہے۔(۸۵)

اجماعی مسائل کا علم

جن مسائل پر امت کے مجتہدین کا اتفاق ہو جائے تو اس سے اختلاف درست نہیں ہے، اس لیے مجتہد کے لیے یہ ضروری ہے کہ اجماعی مسائل سے بھی واقف ہو، البتہ تمام اجماعی اور اختلافی مسائل کا احاطہ ضروری نہیں ہے، بلکہ جس مسئلہ میں اپنی رائے دے رہا ہو اس کے بارے میں اسے واقف ہونا چاہئے، یہ جاننا بھی اس کے لیے ضروری نہیں ہے کہ اس پر اجماع کیوں ہے؟ بلکہ اس قدر معلوم ہو کہ اس مسئلہ میں اتفاق ہے یا نہیں؟ یا غالب گمان ہو کہ یہ مسئلہ اس دور کا پیدا شدہ ہے، کیونکہ اجماع انہی مسائل میں ممکن ہے جو پہلے واقع ہو چکے ہیں۔

قیاس کے اصول و شرائط کا علم

چونکہ احکام شریعت کا بہت بڑا حصہ قیاس پر مبنی ہے اور مجتہد کی صلاحیتِ اجتہاد کا بھی اصل مظہر یہی ہے، بلکہ حدیث میں اجتہاد ہی کا لفظ آیا ہے، جس سے فقہاء نے قیاس پر استدلال کیا ہے، اس لیے قیاس کے اصول وقواعد اور شرائط وطریق کار سے واقفیت بھی ضروری ہے، اس لیے کہ قیاس اجتہاد کے لیے نہایت اہم اور ضروری شرط ہے، امام غزالی رحمہ اللہ نے قیاس کے بجائے عقل کا لفظ استعمال کیا ہے جس میں مزید عموم ہے اور قیاس بھی اس میں داخل ہے۔(۸۶)

عربی زبان کا علم

احکام شریعت کے دو اہم مصادر قرآن اور حدیث کی زبان عربی ہے اس لیے ظاہر ہے کہ عربی زبان سے واقفیت نہایت ضروری ہے اور کار اجتہاد کے لیے بنیاد و اساس کا درجہ رکھتی ہے، عربی زبان کے لیے عربی لغت اور قواعد سے واقف ہونا چاہئے، اتنی واقفیت ہو کہ محلِ استعمال کے اعتبار سے معنی متعین کر سکے، صریح اور مبہم میں فرق کر سکے، حقیقی اور مجازی استعمال کو سمجھ سکے، فن لغت اور نحو و صرف میں کمال ضروری نہیں ہے، اس سے اسقدر واقفیت ہونی چاہئے کہ قرآن و حدیث کے متعلقات کو سمجھنے میں دشواری نہ ہو، اور بقول امام رازی اس کا لغت میں اصمعی اور نحو میں سیبویہ و خلیل ہونا مطلوب نہیں ہے۔(۸۷)

مقاصد شریعت سے آگہی

اجتہاد کے لیے ایک اہم اور ضروری شرط مقاصدِ شریعت سے واقفیت ہے اور یہ واقفیت بدرجہ کمال وتمام مطلوب ہے، عام طور پر اہل علم نے اس کا مستقل طور پر ذکر نہیں کیا ہے، لیکن امام ابو اسحاق شاطبی نے اس کی طرف خصوصی توجہ دی ہے وہ اجتہاد کے لیے دو بنیادی وصف کو ضروری قرار دیتے ہیں، مقاصد شریعت سے مکمل آگہی اور استنباط کی صلاحیت، اور یہ واقعہ ہے کہ مقاصد شریعت سے پوری پوری آگہی نہایت اہم شرط ہے، کیونکہ فقہاء کو احکام شریعت کے عمومی مقاصد سے ہم آہنگ رکھا جائے، اور مجتہد کا اصل کام یہی ہے کہ وہ مقاصد شریعت کو ہمیشہ سامنے رکھے اور ان کو پورا کرنے والے وسائل و ذرائع کو اس نقطہ نظر سے دیکھے کہ وہ موجودہ حالات میں شریعت کے بنیادی مقاصد و مصالح کو پورا کرتے ہیں یا نہیں؟۔

زمانہ آگہی

اجتہاد کے لیے ایک نہایت اہم اور ضروری شرط جس کا عام طور پر صراحۃً ذکر نہیں کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ مجتہد اپنے زمانہ کے حالات سے بخوبی واقف ہو، عرف و عادت، معاملات کی مروجہ صورتوں اور لوگوں کی اخلاقی کیفیات سے آگاہ ہو کہ اس کے بغیر اس کے لیے احکام شریعت کا انطباق ممکن نہیں، اس لیے محققین نے

لکھا ہے کہ جو شخص اپنے زمانہ اور عہد کے لوگوں سے یعنی ان کے رواجات معمولات اور طور طریق سے باخبر نہ ہو وہ جاہل کے درجہ میں ہے۔(۸۸)

مجتہد کے لیے زمانہ آگہی کی ضرورت کیوں؟

مجتہد کے لیے زمانہ آگہی دو وجوہ سے ضروری ہے، اول ان مسائل کی تحقیق کے لیے جو پہلے نہیں تھے اب پیدا ہوئے ہیں، کیونکہ کسی نو ایجاد شئی یا نو مروج طریقہ پر محض اس کی ظاہری صورت کو دیکھ کر کوئی حکم لگا دینا صحیح نہیں ہوگا، جب تک اس کی ایجاد اور رواج کا پس منظر معلوم نہ ہو، وہ مقاصد معلوم نہ ہوں جو اس کا اصل محرک ہیں، معاشرہ پر اس کے اثرات ونتائج کا علم نہ ہو اور یہ معلوم نہ ہو کہ سماج کس حد تک ان کا ضرورت مند ہے؟ اس سب امور کے جانے بغیر کوئی بھی مجتہد اپنی رائے میں صحیح نتیجہ تک نہیں پہونچ سکتا۔

دوسرے بعض ایسے مسائل میں بھی جو گو اپنی نوعیت کے اعتبار سے نو پید نہیں ہیں، لیکن بدلے ہوئے نظام وحالات میں ان کے نتائج میں فرق واقع ہو گیا ہے، دوبارہ غور وفکر کی ضرورت ہوتی ہے، یہ ایک نہایت اہم پہلو ہے جو فقہ اسلامی کو زمانہ اور اس کے تقاضوں سے ہم آہنگ رکھتا ہے، اکثر اہل علم نے اس نکتہ پر روشنی ڈالی ہے۔

علامہ قرافی نے لکھا ہے کہ منقولات پر جمود دین میں گمراہی اور علماء سلف صالحین کے مقصد سے ناواقفیت ہے۔ حافظ ابن قیم نے اپنی مایہ ناز تالیف اعلام الموقعین میں اس موضوع پر مستقل باب باندھا ہے۔

علامہ شامی نے عرف وعادت میں تغیر پر ایک مستقل رسالہ تالیف کیا ہے، اس رسالہ سے علامہ موصوف رحمہ اللہ کی ایک چشم کشا عبارت نقل کی جاتی ہے:

"بہت سے احکام ہیں جو زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ بدل جاتے ہیں، اس لیے کہ اہل زمانہ کا عرف بدل جاتا ہے، نئی ضرورتیں پیدا ہو جاتی ہیں، اہل زمانہ میں فساد (اخلاق) پیدا ہو جاتا ہے، اب اگر شرعی حکم پہلے کی طرح باقی رکھا جائے تو یہ مشقت اور لوگوں کے لیے ضرر کا باعث ہو جائیگا اور ان شرعی اصول وقواعد کے خلاف

ہو جائے گا جو سہولت و آسانی پیدا کرنے اور نظام کائنات کو بہتر اور عمدہ طریقہ پر رکھنے کے لیے ضرر و فساد کے ازالہ پر مبنی ہے۔(۸۹)

ایمان وعدل

اجتہاد کیلئے ایک نہایت اہم شرط شریعت اسلامی پر پختہ ایمان وایقان اور اپنی عملی زندگی میں فسق و فجور سے گریز واجتناب ہے، علامہ آمدی رحمہ اللہ نے اس کو شرط اولین قرار دیا ہے کہ وہ خدا کے وجود، اس کی ذات وصفات اور کمالات پر ایمان رکھتا ہو، رسول کی تصدیق کرتا ہو، شریعت میں جو بھی احکام آئے ہیں ان کی تصدیق کرتا ہو۔(۹۰)

موجودہ زمانہ میں تجدد پسند اور بزعم خود روشن خیالوں کو اجتہاد کا شوق جس طرح بے چین و مضطرب کئے ہوا ہے، علاوہ علم میں ناپختگی کے ان کی سب سے بڑی کمزوری ذہنی مرعوبیت، فکری استقامت سے محرومی اور مغربی عقیدہ وثقافت کی کورانہ تقلید کا مرض ہے، ان کے یہاں اجتہاد کا منشاء زندگی کی اسلامی بنیادوں پر تشکیل نہیں ہے، بلکہ اسلام کو خواہشات اور مغرب کی عرضیات کے سانچہ میں ڈھالنا ہے یہ اسلام پر حقیقی ایمان اور تصدیق سے محرومی کا نتیجہ ہے، ظاہر ہے جو لوگ اس شریعت پر دل سے ایمان نہیں رکھتے ہوں، جن کا ایمان ان لوگوں کے فلسفہ وتہذیب پر ہو جو خدا کے باغی اور اس دین وشریعت کے معاند ہوں ان سے اس دین کے بارے میں اخلاص اور صحیح رہبری کی توقع رکھنا راہزنوں سے جان و مال کی حفاظت کی امید رکھنے کے مترادف ہے۔

ایمان کی تخم سے جو برگ و بار وجود میں آتا ہے وہ عمل صالح ہے، اس لیے مجتہد کو گناہوں سے مجتنب اور شریعت کے اوامر کا متبع ہونا چاہئے، اس کیفیت کا نام اصطلاح میں عدالت ہے، کیونکہ اس کیفیت کے پیدا ہوئے بغیر کسی شخص کی رائے پر اعتماد اور اعتبار نہیں کیا جاسکتا، اور یہ بات قرین قیاس بھی ہے، کیونکہ حدیث کے قبول کئے جانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے راوی دینی اعتبار سے قابل اعتبار ہوں، شریعت کے احکام پر

عمل پیرا ہوں، ممنوعات سے بچتے ہوں، راوی دین کے احکام پہنچانے کا کام کرتے ہیں، اور مجتہدین ان روایات کے معتبر اور نامعتبر ہونے کو پرکھتے اور ان سے احکام کا اخذ و استنباط کرتے ہیں، خدا ناترس راویوں کو روایات میں تحریف کے لیے جو موقع حاصل ہے، خشیت سے عاری مجتہدین کے لیے تحریف معنوی کے اس سے زیادہ مواقع ہیں، اس لیے ظاہر ہے کہ مجتہدین کے لیے عدل و اعتبار کا حامل ہونا زیادہ ضروری ہے۔

مجتہد کو نتیجہ تک پہونچنے کے لیے درکار وسائل

مجتہد کو کسی نتیجہ تک پہونچنے کے لیے جن مراحل سے گذرنا پڑتا ہے ان کو فقہاء نے تحقیق مناط، تخریج مناط اور تنقیح مناط سے تعبیر کیا ہے، مناط اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کوئی چیز لٹکائی جائے۔ "ذات انواط" زمانہ جاہلیت میں ایسے درخت کو کہا جاتا تھا جس سے اسلحہ لٹکائے جائیں، رسی کو ستون سے باندھنے کو کہا جاتا تھا" نطت الحبل بالوتد" اسی لیے مناط علت کو کہتے ہیں، کیونکہ علت ہی سے احکام متعلق ہوتے ہیں، علت کے سلسلہ میں مجتہد کو دو بنیادی کام کرنے پڑتے ہیں، ایک اس بات کی تحقیق کہ شریعت کے کسی حکم کی کیا علت ہے، دوسرے یہ کہ یہ علت کہاں اور کن صورتوں میں پائی جاتی ہے، ان دونوں کاموں کے لیے جو طریق کار اختیار کیا جاتا ہے اس کو تنقیح، تخریج، اور تحقیق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

تنقیح مناط

شریعت میں ایک حکم دیا گیا ہو، اور یہ حکم کس صورت میں ہوگا اس کو بھی بیان کر دیا گیا ہو، لیکن جو صورت ذکر کی گئی ہو اس میں مختلف اوصاف پائے جاتے ہوں، شارع نے اس خاص وصف کی صراحت نہ کی ہو جو اس صورت میں مذکورہ حکم کی وجہ بنائے، اس کو تنقیح مناط کہتے ہیں، اس کو علامہ شاطبی نے لکھا ہے کہ تنقیح مناط میں وصف معتبر کو وصف نامعتبر سے ممتاز کیا جاتا ہے۔(۹۱)

عام طور پر اس سلسلے میں یہ مثال ذکر کی جاتی ہے کہ ایک دیہاتی شخص جس نے رمضان کے روزہ میں اپنی بیوی سے صحبت کر لی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کفارہ ادا کرنے کا حکم فرمایا، اب اس واقعہ میں کئی

باتیں جمع ہیں، اس شخص کا دیہاتی ہونا، بیوی سے صحبت کرنا، خاص اس سال کے رمضان میں اس واقعہ کا پیش آنا، یہ سب ایسی باتیں نہیں ہیں جو کفارہ کا سبب بن سکتی ہیں، بلکہ رمضان المبارک میں قصداً روزہ توڑنا ہی ایسا وصف ہے جو اس حکم کی اساس بن سکتا ہے، یہی تنقیح مناط ہے۔

اسی طرح قرآن مجید نے "خمر" کو حرام قرار دیا ہے، خمر انگوری شراب کو کہتے ہیں، اس میں مختلف خصوصیات موجود ہیں، اس کا انگوری ہونا، میٹھا ہونا، کسی خاص رنگ کا ہونا اور نشہ آور ہونا، مجتہدین ان تمام اوصاف میں نشہ آور ہونے کی کیفیت کو خمر کے حرام ہونے کی علت قرار دیتے ہیں اور باقی دوسرے اوصاف کو اس کے لیے موثر نہیں مانتے، غرض مختلف اوصاف میں سے اس خاص وصف کے ڈھونڈ نکالنے کو تنقیح مناط کہتے ہیں، جو نص میں مذکورہ حکم کیلئے اساس و بنیاد بن سکتے ہیں۔

تخریج مناط

نص نے ایک حکم دیا ہو اور اس کی کوئی علت بیان نہ کی ہو، اب مجتہد علت دریافت کرتا ہے کہ اس حکم کی علت کیا ہے؟ اس عمل کا نام تخریج مناط ہے، مثلاً ارشاد خداوندی ہے کہ دو بہنوں کو نکاح میں جمع نہ کیا جائے، حدیث میں بعض اور رشتہ دار عورتوں کو ایک نکاح میں جمع کرنے کی ممانعت وارد ہوئی ہے، مگر کوئی علت مقرر نہیں کی گئی ہے کہ دونوں بہنوں کو کیوں جمع نہ کیا جائے، فقہاء نے تلاش و تتبع سے کام لیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس کی وجہ سے دو محرم عورتوں کو بیک نکاح میں جمع کرنا ہے، لہٰذا کسی بھی دو محرم رشتہ دار عورتوں کو بیک وقت نکاح میں جمع کرنا حرام قرار دیا، یہی تخریج مناط ہے۔

تنقیح و تخریج میں فرق

تخریج مناط اور تنقیح مناط میں کوئی جوہری فرق نہیں ہے دونوں کا منشاء نصوص میں مذکور حکم کی علت دریافت کرنا ہے، دونوں میں فرق صرف اس قدر ہے کہ تنقیح مناط میں مختلف ممکنہ علتوں میں سے ایک کی تعیین ہوتی ہے، جیسے روزہ کے کفارہ میں علت روزہ کی حالت میں جماع بھی ہوسکتا ہے اور قصداً روزہ توڑنا بھی

ہوسکتا ہے، شوافع نے جماع کو علت مانا ہے جبکہ احناف نے قصداً روزہ توڑنے کو علت قرار دیا ہے، مگر تخریج مناط میں ایسے وصف کو علت بنایا جاتا ہے جس کا اس حکم کے لیے موثر ہونا بالکل بے غبار ہو اور اس میں تنقیح وتہذیب کی ضرورت پیش نہ آئے۔

تحقیق مناط

تحقیق مناط کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ کوئی متفق علیہ یا نص سے صراحتہ ثابت شدہ قاعدہ شرعی موجود ہو، مجتہد کسی خاص واقعہ میں دیکھتا ہے کہ اس میں یہ قاعدہ موجود ہے یا نہیں؟ مثلاً محرم کے لیے قرآن مجید نے یہ قاعدہ مقرر کردیا ہے کہ اگر وہ شکار کرے تو اسی کے مثل بطور جزاء ادا کرے، اب مجتہد متعین کرتا ہے کہ گائے کا مثل کونسا جانور ہے، جنگلی گدھے کا مماثل کس پالتو جانور کو سمجھا جائے، یہ تحقیق مناط کی پہلی صورت ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ نص میں کوئی حکم علت کی صراحت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہو، یا اس حکم کے لیے کسی خاص بات کے علت ہونے پر اجماع ہے، مجتہد کسی غیر منصوص صورت یا اس صورت میں جس کے متعلق صراح فقہاء کا اجماع موجود نہیں ہے، وہ یہ دیکھتا ہے کہ یہ علت یہاں پر پائی جاتی ہے یا نہیں؟ جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلی کے جھوٹے کو فرمایا کہ ناپاک نہیں ہے، اس لیے کہ یہ بلی ان مخلوقات میں سے ہے جن کی تم پر بہت زیادہ آمدورفت ہوتی رہتی ہے۔

اب مجتہد غور کرتا ہے کہ کیا چوہے وغیرہ میں بھی یہی علت پائی جاتی ہے؟ اور کیا کتے بھی اس زمرہ میں آتے ہیں؟ عام فقہاء چوہے اور اس قسم کے بلوں میں رہنے والی مخلوق کو تو اس حکم میں رکھتے ہیں، کتوں کو اس حکم میں داخل نہیں مانتے، مالکیہ کا خیال ہے کہ یہ علت کتوں میں بھی ہے، اس لیے اس کا جھوٹا بھی پاک ہے، اور اس کے جھوٹے برتنوں کو دھونے کا حکم قیاس کے خلاف امر تعبدی (بندگی کے طور پر حکم بجالانا) ہے، چوری کی سزا ہاتھ کا کاٹا جانا ہے، لیکن کیا جیب کترا اور کفن چور پر بھی چور کا اطلاق ہوسکتا ہے؟ گواہ کے لیے عادل ہونا ضروری ہے، لیکن فلاں اور فلاں شخص عادل کے زمرہ میں آتا ہے یا نہیں؟ نشہ حرام ہے، لیکن فلاں فلاں

مشروبات کیا نشہ آور اشیاء کے زمرہ میں داخل ہیں یا نہیں، یہ سب تفصیلات "تحقیق و انطباق تحقیق مناط" سے متعلق ہیں۔(۹۲)

مجتہد کا دائرہ کار

احکام کی علتوں کو دریافت کرنا اور ان کو پیش آمدہ مسائل پر منطبق کرنا اگرچہ مجتہد کا بنیادی کام ہے، لیکن اس سے یہ سمجھنا غلط ہے کہ اس کو صرف اتنا ہی کرنا ہے، بلکہ اس کا کام مجمل نصوص کی مراد کو پہونچنا اور مشترک المعنی الفاظ کے مصداق کی تعیین کرنا بھی ہے، عربوں کے استعمال اور محاورات کے مطابق شارع کی تعبیرات سے معنی اخذ کرنا بھی اس کا فریضہ ہے، حدیثوں کے معتبر یا نامعتبر ہونے کی تحقیق بھی اس کی ذمہ داری ہے، متعارض دلیلوں میں ترجیح و تطبیق سے بھی اس کو عہدہ برآ ہونا ہے، اس کے علاوہ اخذ و استنباط اور بحث و تحقیق کے نہ جانے کتنے دشوار گذار مراحل سے مجتہد کو گذرنا پڑتا ہے۔

شرائط اجتہاد کا خلاصہ

شرائط اجتہاد کے سلسلہ میں اب تک جتنی معروضات پیش کی گئیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ اجتہاد کے مقام پر فائز ہونے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ عملی اعتبار سے شریعت پر کامل یقین رکھتا ہو، اور کردار کے اعتبار سے فاسق و فاجر نہ ہو عملی اعتبار سے ایک طرف اصول فقہ میں عبور و مہارت رکھتا ہو، اور دوسری طرف عربی زبان و لغت اور اسلوب بیان سے پوری طرح آگاہ ہو، زمانہ شناسی عرف و عادت اور مروجہ معاملات و نظام کی واقفیت میں بھی مجتہد کا پایہ بلند ہو۔

اسلام کی عملی تاریخ میں جن علماء نے اجتہاد کا فریضہ انجام دیا ہے اور امت میں جن کے اجتہادات کو قبول عام حاصل ہوا ہے یہ سب وہ تھے جو اپنے زہد و تقویٰ میں بھی اور اپنی ذہانت، دقت نظر، عمیق فکر اور علم و آگہی میں بھی تاریخ کی ایسی ہی نابغہ روزگار ہستیاں تھیں، رحمہم اللہ

عباسی دور اسلامی اور عربی علوم فنون کا سنہرا دور رہا ہے، اسی عہد میں تفسیر قران کے فن کو کمال حاصل

ہوا اور تفسیر طبری جیسی عظیم الشان تفسیر وجود میں آئی، جو آج تک کتب تفسیر کا نہایت اہم مرجع ہے، اسی عہد میں باضابطہ عربی زبان کے قواعد مرتب ہوئے، اسی دور میں یونانی علوم، منطق وفلسفہ وغیرہ عربی زبان میں منتقل کیا گیا اور اس کو بنیاد بنا کر مسلمان محققین نے بڑے بڑے سائنسی کارنامے انجام دیے اور علم وتحقیق کی دنیا میں اپنی فتح مندی کے علم نصب کئے، فقہ اور فقہ سے متعلق علوم کیلئے تو یہ دور نہایت ہی اہم ہے، کیونکہ حدود سلطنت میں بہت پھیلاو ہو گیا تھا، مختلف قوموں، مختلف تہذیبوں، مختلف لسانی گروہ اور مختلف صلاحیتوں کے لوگ عالم اسلام کے سایہ میں آچکے تھے اور ان میں بڑی تعداد نومسلموں کی تھی، اس لئے لوگوں کی طرف سے سوالات کی کثرت تھی اور اس نسبت سے فقہی اجتہادات کا دائرہ بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔

اسی عہد میں بڑے بلند پایہ، عالی ہمت اور اپنی ذہانت وفطانت کے اعتبار سے محیر العقول علماء وفقہاء پیدا ہوئے، کیوں کہ اس عہد کی ضرورت کے لحاظ سے اسی درجہ کے اہل علم کی ضرورت تھی، پھر ان میں سے بعض بلند پایہ فقہاء نے مستقل دبستان فقہ کی بنیاد رکھی اور ان سے علمی وعملی تاثر کی وجہ سے اہل علم کی ایک معتد بہ تعداد ان کے ساتھ ہوگئی اور اس نے ان کے علوم کی اشاعت وتدوین اور تائید وتقویت کے ذریعہ مستقل فقہی مکاتب کو وجود بخشا ان شخصیتوں میں سب سے ممتاز شخصیتیں ائمہ اربعہ کی ہیں یہ وہ خوش قسمت مجتہدین ہیں جن کی فقہ کو منجانب اللہ بقاء حاصل ہوا اور آج تک عملی طور پر قائم اور نافذ ہے ان مکاتب فقہ میں ہر دور میں ماہر فقہاء کا وجود تسلسل کے ساتھ رہا ہے، ہر عہد میں اس کے تقاضوں کے مطابق علم وتحقیق کا کام انجام پاتا رہا ہے اور ان کی مثال ایک سایہ دار اور سدا بہار درخت کی سی ہوگئی ہے جس کی جڑیں گہری ہوں اور شاخیں خوب پھیلی ہوئی ہوں "اَصلھَا ثَابِت وّفَرعھَا فِی السَّمَاءِ"(۹۳)

☆☆☆☆☆

المراجع والمصادر باب سوم

(۱)سورة النساء :۷۸

(۲)عبد العلی محمد بن نظام الدین محمد السهالوی الأنصاری الکهنوی،"فواتح الرحموت بشرح مسلم الثبوت"، دار الکتب العلمیه بیروت ۲۰۰۲ء، صفحه /جلد۱/۱۳

(۳) محمد بن عیسی بن سَوْرة بن موسی بن الضحاك، الترمذی، أبو عیسی ،" سنن الترمذی"،(ترمذی، باب ماجاء فی القاضی کیف یقضی،شركة مكتبة ومطبعة مصطفى البابى الحلبى -مصر، 1395ھ 1975 -م،حدیث نمبر:۹۴۲۱

(٤)عبد الرحمن بن أبی بکر، جلال الدین السیوطی ،"الإتقان فی علوم القرآن"،الهیئة المصریة العامة للکتاب، 1394ھ - 1974 م، صفحه /جلد٤/۲۰۰

(۵)سورة المائده:۳

(٦) سورة النساء:۸۰

(۷)سورة الحشر:۷

(۸)الشافعی أبو عبد الله محمد بن إدريس بن العباس بن عثمان بن شافع بن عبد المطلب بن عبد مناف المطلبی القرشی المکی ،"الرسالة"،مکتبه الحلبی، مصر،1358ھ -1940م،صفحه /جلد۱/۸۵

(۹)حسن بربهاری،"شرح السنة"،مکتبة الغرباء الارثة،۱۹۹۳ء،صفحه /جلد۱/۵۳

(۱۰)سورة الشوریٰ:۱۳

(۱۱)سورة المائده:٤۸

(۱۲) ابو الحسین سید الدین علی بن ابی علی بن محمد بن سالم الآمدی "الاحکام فی اصول الاحکام للآمدی" المکتب الاسلامی بیروت، دمشق، لبنان، صفحه /جلد٤/۲۲۲

(۱۳)أبو محمد عز الدين عبد العزيز بن عبد السلام بن أبى القاسم بن الحسن السلمى الدمشقى، الملقب بسلطان العلماء ،"قواعد الأحكام فى مصالح الأنام"،مكتبة الكليات الأزهرية -القاهرة، 1414هـ 1991 -م،صفحه /جلد۱/۹

(۱٤)سورة البقره:۲۲۸

(۱۵)سورة الحجرات:۱۲

(۱٦)سورة البقرة:۱۸۷

(۱۷)محمد بن إسماعيل أبو عبدالله البخارى الجعفى،"الجامع المسند الصحيح المختصر من أمور رسول الله صلى الله عليه وسلم وسننه وأيامه =صحيح البخارى"، دار طوق النجاة ،1422هـ،حديث نمبر:۳۸۷۱

(۱۸)احمد، احمد بن حنبل، "المسند"، عالم الكتب، بيروت، ط اول، 1998ء. حديث نمبر:۱۳۰۷۱

(۱۹)أبو داود سليمان بن الأشعث بن إسحاق بن بشير بن شداد بن عمرو الأزدى السِّجِسْتانى ، "سنن أبى داود"،المكتبة العصرية، صيدا -بيروت،صفحه /جلد ۵۱۳/۲

(۲۰)محمد بن حسن الحجوى، "الفكر السامى فى تاريخ الفقه الاسلامى" دارالكتب العلمية بيروت لبنان، ۱۹۹۵م، صفحه /جلد٦٤

(۲۱) عبدالرحمن بن محمد بن محمد ابن خلدون ابوزيد ولى الدين الحضرمى "مقدمه ابن خلدون" (ديوان المبتدأ و الخبر فى تاريخ العرب و البربر ومن عاصرهم من ذوى الشأن الأكبر) دارالفكر، بيروت ۱۹۸۸م صفحه /جلد٤٤٦

(۲۲) محمد بن أبى بكر بن أيوب بن سعد شمس الدين ابن قيم الجوزية ،"إعلام الموقعين عن رب العالمين"،دار الكتب العلمية -بيروت، الطبعة :الأولى، 1411هـ 1991 -م،صفحه /جلد۱۲٦/۱

(۲۳) محمد بن حسن الحجوى، "الفكر السامى فى تاريخ الفقه الاسلامى" دارالكتب العلمية بيروت لبنان،

۱۹۹۵م، صفحہ /جلد:۸۳

(۲۴)محمد بن حسن الحجوی، ''الفکر السامی فی تاریخ الفقہ الاسلامی'' دارالکتب العلمیة بیروت لبنان، ۱۹۹۵م، صفحہ /جلد۹٤

(۲۵)مصطفیٰ الزرقاء ''الفقہ الاسلامی فی ثوبہ الجدید'' دار القلم دمشق ۱۹۹۸م صفحہ /جلد۱/۱٦٦،۱۷۰

(۲٦) مصطفیٰ الزرقاء ''الفقہ الاسلامی فی ثوبہ الجدید'' دار القلم دمشق ۱۹۹۸م صفحہ /جلد۱/۱٦٦،۱۷۰

(۲۷) محمد ابو الحسن سیالکوٹی،''فیض الباری''، مکتبة اصحاب الحدیث، صفحہ /جلد۱/۱٤

(۲۸)مصطفیٰ السباعی ''السنة ومکانتها فی التشریع الاسلامی'' دار الوراق المکتب الاسلامی ۲۰۰۰ء صفحہ /جلد۱٦٦

(۲۹)محمد ابو الحسن سیالکوٹی،''فیض الباری''، مکتبة اصحاب الحدیث، صفحہ /جلد۱/۱٤

(۳۰)محمد ظفیر الدین،عزیز الرحمن عثمانی،''مقدمہ فتاویٰ دارالعلوم''،مکتبہ سید احمد شہید،صفحہ /جلد۱/٦۳

(۳۱)ملا علی قاری،''شرح فقہ اکبر''،المطبعة الحنفیة ادیان علوم دین،صفحہ /جلد۱٤٦

(۳۲)علامہ شبلی نعمانی،''سیرة النعمان''،مطبع مفید عام آگرہ، ۱۹۸۲ھجری،صفحہ /جلد۱۲۹،۱۳۰

(۳۳) أبو عبد الله محمد بن محمد بن محمد العبدری الفاسی المالکی الشهیر بابن الحاج ''المدخل لاصول الفقہ'' دارالتراث صفحہ /جلد۱۳۹

(۳٤)مؤفق بن احمد المکی، ''مناقب موفق ''،دائرة المعارف النظامیة، ۱۹۰۳ء، صفحہ /جلد۷۵

(۳۵) أبو عبد الله محمد بن محمد بن محمد العبدری الفاسی المالکی الشهیر بابن الحاج ''المدخل لاصول الفقہ'' دارالتراث صفحہ /جلد۱۵٦

(۳٦)مصطفی بن عبد الله کاتب جلبی القسطنطینی المشهور باسم حاجی خلیفة أو الحاج خلیفة ،''کشف الظنون

عن أسامی الكتب والفنون"، مكتبة المثنى بغداد ،1941م،صفحه /جلد١٢٨٥/٢

(٣٧) أبو عبد الله محمد بن محمد بن محمد العبدری الفاسی المالكی الشهير بابن الحاج "المدخل لاصول الفقه" دارالتراث صفحه /جلد١٤٩

(٣٨)فقه شافعی اور اس کی خصوصیات سه ماهی بحث ونظر شماره١٤:٥

(٣٩) أبو عبد الله محمد بن محمد بن محمد العبدری الفاسی المالكی الشهير بابن الحاج "المدخل لاصول الفقه" دارالتراث صفحه /جلد١٦٦

(٤٠)محمد بن أبی بكر بن أيوب بن سعد شمس الدين ابن قيم الجوزية ،"إعلام الموقعين عن رب العالمين"،دار الكتب العلمية -بيروت، الطبعة :الأولى، 1411هـ 1991 -م،صفحه /جلد١٤٠.١٣٥/١

(٤١) أبو عبد الله محمد بن محمد بن محمد العبدری الفاسی المالكی الشهير بابن الحاج "المدخل لاصول الفقه" دارالتراث صفحه /جلد١٨٢.١٧١

(٤٢)محمد بن حسن الحجوی، "الفكر السامی فی تاريخ الفقه الاسلامی" دارالكتب العلمية بيروت لبنان، ١٩٩٥م، صفحه /جلد١٩٥،١٨٧

(٤٣)سورة الكهف:١١٠

(٤٤)مسلم بن الحجاج أبو الحسن القشيری النيسابوری المتوفی261 :هـ "الصحيح لمسلم"دار إحياء التراث العربی -بيروت حديث نمبر ٨٥٣٤، ،

(٤٥)محمد بن إسماعيل أبو عبدالله البخاری الجعفی،"الجامع المسند الصحيح المختصر من أمور رسول الله صلی الله عليه وسلم وسننه وأيامه =صحيح البخاری"، دار طوق النجاة ،1422هـ،حديث نمبر:٨٤٨٤

(٤٦)أبو بكر أحمد بن علی بن ثابت بن أحمد بن مهدی الخطيب البغدادی ،"الفقيه و المتفقه"،دار ابن الجوزی - السعودية،الطبعة :الثانية، 1421ه، صفحه /جلد٧٨/٢

(٤٧)احمد، احمد بن حنبل، "المسند"، عالم الکتب، بیروت، ط اول، 1998ء.، حدیث نمبر:١٧٧٩١

(٤٨) مسلم بن الحجاج أبو الحسن القشيرى النيسابورى المتوفى261 :هـ "الصحيح لمسلم"دار إحياء التراث العربى -بيروت حديث نمبر٣٤٦٥

(٤٩) سورة الاحزاب:٤

(٥٠)سورة النساء :٤

(٥١) أحمد بن على أبو بكر الرازى الجصاص الحنفى ،"أحكام القرآن"،دار الكتب العلمية بيروت - لبنان،1415هـ-1994م،صفحه /جلد١/٣٧٠،٥١٠

(٥٢)أبو عمر يوسف بن عبد الله بن محمد بن عبد البر بن عاصم النمرى القرطبى المتوفى463 :هجرى "مختصر جامع بيان العلم وفضله" الناشر :دار ابن الجوزى، المملكة العربية السعودية الطبعة :الأولى، 1414هـ 1994-م باب اجتهاد الراى على الاصول من عدم النصوص

(٥٣)محمد بن أبى بكر بن أيوب بن سعد شمس الدين ابن قيم الجوزية ،"إعلام الموقعين عن رب العالمين"،دار الكتب العلمية -بيروت، الطبعة :الأولى، 1411هـ 1991 -م،صفحه /جلد١/٥٤

(٥٤) سورة الفاطر:١٨

(٥٥) مصطفیٰ السباعی "السنة ومكانتها فی التشريع الاسلامی" دار الوراق المكتب الاسلامی ٢٠٠٠ء صفحه /جلد١٧١

(٥٦)محمد بن أبى بكر بن أيوب بن سعد شمس الدين ابن قيم الجوزية ،"إعلام الموقعين عن رب العالمين"،دار الكتب العلمية -بيروت، الطبعة :الأولى، 1411هـ 1991 -م،صفحه /جلد١/١٢،١٤

(٥٧)محمد بن حسن الحجوى، "الفكر السامى فى تاريخ الفقه الاسلامى" دارالكتب العلمية بيروت لبنان، ١٩٩٥م، صفحه /جلد٧٧

(٥٨)أبو عمر يوسف بن عبد الله بن محمد بن عبد البر بن عاصم النمرى القرطبى،"الانتقاء فى فضائل الثلاثة الأئمة الفقهاء مالك والشافعي وأبى حنيفة رضى الله عنهم"دار الكتب العلمية -بيروت،صفحه /جلد٢١٠

(٥٩)أبو عمر يوسف بن عبد الله بن محمد بن عبد البر بن عاصم النمرى القرطبى،"الانتقاء فى فضائل الثلاثة الأئمة الفقهاء مالك والشافعي وأبى حنيفة رضى الله عنهم"دار الكتب العلمية -بيروت،صفحه /جلد٢١٠

(٦٠)احمد بن حجر الهيثمى،"الخيرات الحسان"، مطبع السعادة بجوار محافظة مصر، ١٣٢٤ه، صفحه /جلد٢٨

(٦١)محمد بن محمد بن شهاب بن يوسف الكردرى البريقينى البزازى،"مناقب كردرى "،دائرة المعارف، صفحه /جلد١٣٣/٢

(٦٢)محمد بن محمد بن شهاب بن يوسف الكردرى البريقينى البزازى،"مناقب كردرى "،دائرة المعارف، صفحه /جلد١٣٣/٢

(٦٣)سيد مناظر احسن گيلانى، "امام ابو حنيفه كى سياسى زندگى "، الميزان ٢٠٠٦،صفحه /جلد٣٧٦

(٦٤) شمس الدين أبو عبد الله محمد بن أحمد بن عثمان بن قَايْماز الذهبى ، "تذكرة الحفاظ"،دار الكتب العلمية بيروت-لبنان،1419هـ1998 -م،صفحه /جلد١/١٧٠،١٧٢

(٦٥)مصطفىٰ السباعى "السنة ومكانتها فى التشريع الاسلامى" دار الوراق المكتب الاسلامى ٢٠٠٠ء صفحه /جلد١٨٣

(٦٦)محمد بن حسن الحجوى، "الفكر السامى فى تاريخ الفقه الاسلامى" دارالكتب العلمية بيروت لبنان، ١٩٩٥م، صفحه /جلد١٣٢

(٦٧)علاء الدين، أبو بكر بن مسعود بن أحمد الكاسانى الحنفى ،"بدائع الصنائع فى ترتيب الشرائع"،دار الكتب العلمية،1406هـ 1986 -م،صفحه /جلد٣٠٢/٢

(٦٨)علامه ظفر احمد عثمانى،"قواعد فى علوم الفقه"،مكتبه مطبوعات اسلاميه، ١٩٧٢ئصفحه /جلد٢٤٦

(٦٩)محمد بن عیسی بن سَوْرة بن موسی بن الضحاك، الترمذی، أبو عیسی ،" سنن الترمذی"،(ترمذی، باب ماجاء فی القاضی کیف یقضی،شرکة مکتبة ومطبعة مصطفی البابی الحلبی -مصر، 1395هـ 1975 -م،حدیث نمبر:١٠٦٣

(٧٠)محمد بن عیسی بن سَوْرة بن موسی بن الضحاك، الترمذی، أبو عیسی ،" سنن الترمذی"،(ترمذی، باب ماجاء فی القاضی کیف یقضی،شرکة مکتبة ومطبعة مصطفی البابی الحلبی -مصر، 1395هـ 1975 -م، حدیث نمبر:١١٠٠

(٧١)ابو الحسن عبیدالله بن الحسین بن دلال بن دلهم الکرخی،"اصول الکرخی"،مطبع جاوید پریس کراچی،صفحه /جلد١٤٣

(٧٢)زین الدین بن إبراهیم بن محمد، المعروف بابن نجیم المصری ،"الْأَشْبَاهُ وَالنَّظَائِرُ عَلَى مَذْهَبِ أَبِيْ حَنِيْفَةَ النُّعْمَانِ"،دار الکتب العلمیة، بیروت -لبنان، 1419هـ 1999 -م،صفحه /جلد١٣٨

(٧٣)ابو زید عبید الله عمر بن عیس الدبوسی حنفی،"تاسیس النظر"،دار ابن زیدون،صفحه /جلد١٣

(٧٤)ابو الحسن عبیدالله بن الحسین بن دلال بن دلهم الکرخی،"اصول الکرخی"،مطبع جاوید پریس کراچی،صفحه /جلد١٤٠

(٧٥)ابو زید عبید الله عمر بن عیس الدبوسی حنفی،"تاسیس النظر"،دار ابن زیدون،صفحه /جلد٥٩

(٧٦)زین الدین بن إبراهیم بن محمد، المعروف بابن نجیم المصری ،"البحر الرائق شرح کنز الدقائق"،دار الکتاب الإسلامی،صفحه /جلد ٢٢٨/١٦

(٧٧)علاء الدین، أبو بکر بن مسعود بن أحمد الکاسانی الحنفی ،"بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع"،دار الکتب العلمیة،1406هـ 1986 -م،صفحه /جلد٢٣

(٧٨)زین الدین بن إبراهیم بن محمد، المعروف بابن نجیم المصری ،"الْأَشْبَاهُ وَالنَّظَائِرُ عَلَى مَذْهَبِ أَبِيْ حَنِيْفَةَ

النُّعْمَانِ"،دار الکتب العلمیة، بیروت -لبنان، 1419ھ 1999 -م،صفحه /جلد١/٣٥٠

(٧٩)أبو عبد الله محمد بن الحسن بن فرقد الشیبانی المتوفی189 :ھج،"الأصل المعروف بالمبسوط"،إدارة القرآن والعلوم الإسلامية -کراتشی، صفحه /جلد٣٣/٤٨٦

(٨٠)أبو عبد الله محمد بن الحسن بن فرقد الشیبانی المتوفی189 :ھج،"الأصل المعروف بالمبسوط"،إدارة القرآن والعلوم الإسلامية -کراتشی، صفحه /جلد: ٣٣/٤٨٦

(٨١)محمد بن أبی بکر بن أیوب بن سعد شمس الدین ابن قیم الجوزیة ،"إعلام الموقعین عن رب العالمین"،دار الکتب العلمیة -بیروت، الطبعة :الأولی، 1411ھ 1991 -م،صفحه /جلد ٣/٢٥١

(٨٢)أبو بکر أحمد بن علی بن ثابت بن أحمد بن مهدی الخطیب البغدادی المتوفی463 :ھجری،". تاریخ بغداد"،دار الغرب الإسلامی -بیروت،1422ھ 2002 -م،صفحه /جلد٦/١٠٦

(٨٣)سورة آل عمران:١٩

(٨٤)محمد بن إسماعیل أبو عبدالله البخاری الجعفی،"الجامع المسند الصحیح المختصر من أمور رسول الله صلی الله علیه وسلم وسننه وأیامه =صحیح البخاری"، دار طوق النجاة ،1422ھ، حدیث نمبر:١٨٠٠

(٨٥)أبو حامد محمد بن محمد الغزالی الطوسی ، "المستصفی"دار الکتب العلمیة،1413ھ 1993 -م، صفحه /جلد٢/٣٨٢

(٨٦)أبو عبد الله محمد بن عمر بن الحسن بن الحسین التیمی الرازی الملقب بفخر الدین الرازی خطیب الری ،"المحصول"، مؤسسة الرسالة، 1418ھ 1997 -م، صفحه /جلد٦/٢٣

(٨٧)ابو الحسین سید الدین علی بن ابی علی بن محمد بن سالم الآمدی "الاحکام فی اصول الاحکام للآمدی" المکتب الاسلامی بیروت، دمشق، لبنان، صفحه /جلد ١/٤١٦

(٨٨)محمد امین بن عمرابن عابدین،"رسم المفتی"، زکریا بکڈپو،صفحه /جلد١٨١

(۸۹)محمد امین بن عمر ابن عابدین،"نشر العرف"مکتبة الحرمین ریاض، ۱۸۸۳ء، صفحه /جلد۵۵

(۹۰)ابو الحسین سید الدین علی بن ابی علی بن محمد بن سالم الآمدی "الاحکام فی اصول الاحکام للآمدی" المکتب الاسلامی بیروت، دمشق، لبنان، صفحه /جلد۱/۴۱۵

(۹۱) ابو اسحاق ابراهیم بن موسی الغرناطی الشهیر بالشاطبی، "الموافقات للشاطبی" دار ابن عفان ،۱۹۹۷م، صفحه /جلد: ۳/۲۲۹

(۹۲)أبو حامد محمد بن محمد الغزالی الطوسی ، "المستصفی"دار الکتب العلمیة،1413ھ 1993 -م، صفحه /جلد۱/۲۸۵

(۹۳)سورة ابراهیم:۲٤

☆

باب چہارم

☆☆☆

امام قاضی ابو یوسف کا تفقہ اور انکی علمی خدمات

☆

﴿بسم اللہ الرحمان الرحیم﴾

باب چہارم

امام قاضی ابو یوسف کا تفقہ اور انکی علمی خدمات

عہدہ قضاء

عہد نبوی اور عہد صدیقی میں عہدہ قضا اسلامی حکومت کا کوئی الگ شعبہ نہیں تھا، بلکہ ہر صوبہ یا ضلع کا جو والی ہوتا تھا، وہی انتظامی اور عدالتی دونوں امور انجام دیتا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب اسلامی حدود مملکت میں بہت زیادہ وسعت پیدا ہوئی اور گونا گون مصالح اور ضرورتوں کی بنا پر انتظامیہ اور عدلیہ کو ایک ساتھ رکھنا مشکل ہو گیا اور پھر ولاۃ مملکت کی بے عنوانیوں کی خبریں بھی دربارِ خلافت میں پہنچنے لگیں تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے دونوں شعبوں کو الگ کر دیا اور دونوں کے الگ الگ ذمہ دار اور سربراہ کار مقرر کیے اس کے دونوں شعبے ایک دوسرے سے آزاد ہو گئے، جن کے عہدہ داروں کا تقرر خود خلیفہ وقت کرتا تھا، عہد فاروقی کے بعد بہت دنوں تک اسی پر عمل درآمد تھا، یعنی یہ کہ دونوں شعبے الگ تھے اور ان کے عہدہ داروں کا تقرر وقت کا خلیفہ کرتا تھا، مگر خلفائے بنوامیہ جن کو دین اور دین کے تقاضوں اور کاموں سے وہ شغف اور تعلق خاطر باقی نہیں رہ گیا تھا جو ان کے پیشروں کو تھا اس لیے انہوں نے عہدہ قضا کی اہمیت کم کر دی اور قاضیوں کا انتخاب اور ان کا تقرر اور عزل صوبوں کے والیوں کے ذمہ ہو گیا۔

قاضیوں کا انتخاب

ظاہر ہے کہ جب خود خلفائے بنوامیہ کا دینی تصور کمزور اور ان کی دینی زندگی مضمحل ہو گئی تھی اور دین سے زیادہ ان پر دنیا طلبی غالب آ گئی تھی تو پھر ان کے مقرر کردہ والیوں کی دینی زندگی کا کیا اعتبار ہو سکتا تھا، غرض اس کی وجہ سے بدعنوانیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا، مروان جو سلسلہ بنی امیہ کا تیسرا فرمانروا ہے، اس کے زمانہ کا ایک واقعہ ہے کہ جب وہ مصر پہنچا تو وہاں کے قاضی کو بلوایا، اس وقت وہاں کے قاضی عابس تھے،

اس نے ان سے پوچھا کہ قرآن یاد ہے، بولے نہیں پھر پوچھا فرائض یعنی تقسیم وراثت میں پختگی پیدا کر لی ہے جواب ملا نہیں، مروان کو اس جواب سے حیرت ہوئی، بولا فَبِمَ تَقضِی پھر آپ فیصلہ کیسے کرتے ہیں؟

خلفاء کی اس بے توجہی کا نتیجہ یہ ہوا کہ دن بدن اس میں بے عنوانیاں بڑھتی ہی چلی گئیں، حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں دوسرے شعبوں کی طرح اس کی طرف بھی توجہ کی، مگر اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے سے پہلے ہی انتقال کر گئے، صرف یہی نہیں تھا کہ قاضیوں کے انتخاب میں اہل و نااہل کا بہت کم خیال کیا جاتا تھا، بلکہ حکمران طبقہ قاضیوں کے فیصلوں تک میں بھی دخل اندازی کرتا تھا، چنانچہ اموی اور عباسی دور کا مشکل سے کوئی ایسا قاضی ملے گا جس کے فیصلہ میں ارباب حکومت کی مداخلت کا کوئی نہ کوئی واقعہ نہ پیش آیا ہو، صرف اموی دور کے قاضی خیر بن نعیم اور عباسی دور کے قاضی حفص بن غیاث کے متعلق ان کے تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ ارباب حکومت نے ان کو اپنے فیصلوں کے بدلنے پر مجبور کرنا چاہا تھا، مگر حکومت سے منسلک ہوتے ہوئے بھی ان کے پائے ثبات میں لغزش نہیں پیدا ہوئی اور وہ اپنے فیصلوں پر قائم رہے، یہی وجوہ تھے کہ محتاط فقہا اور محدث حکومت وقت سے کسی قسم کے تعاون کرتے بھی تھے تو اس سے مطمئن نہیں ہوتے تھے، بلکہ ایک اضطرار ہی سمجھ کر اسے انجام دیتے تھے، قاضی حفص بن غیاث فرماتے تھے کہ جب میری حالت یہ ہوگئی کہ مردار کھانا میرے لیے حلال ہو گیا تو اس وقت میں نے عہدہ قضا قبول کیا، قاضی شریک کو مجبوراً عہدہ قضا قبول کرنا پڑا تو انھوں نے اس کو دین کے فروخت کرنے سے تعبیر کیا، ان کے الفاظ یہ ہیں:

بعت دینی.(۱)

ترجمہ: میں نے اپنے دین کو بیچ دیا۔

وہ لوگ مردار اور دین فروشی سے اس لیے اس کو تعبیر کرتے تھے کہ وہ مسند قضا پر پہنچنے کے بعد اس جرات اور آزادی کے ساتھ دینی احکام کی روشنی میں معاملات کا فیصلہ نہیں کر سکتے تھے، جس آزادی سے وہ

عہدہ افتا پر رہ کر کر سکتے تھے، بلکہ جو لوگ حکومت سے اپنا تعلق قائم کرتے تھے ان کو یہ بھی کرنا پڑتا تھا، یافعی نے یزید بن عبدالملک کے زمانہ کا ایک واقعہ بیان کیا ہے:

فاتوه باربعين شيخاً فشهدوا له ان الخلفاء لاحساب عليهم ولاعذاب.(۲)

ترجمہ: ان کے پاس چالیس شیوخ آئے اور کہا کہ خلفا کے لیے نہ حساب ہے اور نہ عذاب۔

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:

نعوذ بالله مماسيلقى الظالمون من شدة العذاب.(۳)

ترجمہ: ہم اللہ کی پناہ اس عذاب اور سزا سے مانگتے ہیں جن میں یہ ظالم مبتلا ہوں۔

لیکن ان میں جو بہت زیادہ غیر معمولی لوگ تھے، انھوں نے کسی قیمت پر اس اضطرار کو اپنے لیے گوارا نہیں کیا، ان ہی لوگوں میں سفیان ثوری، امام مالک، امام ابوحنیفہ اور ان کے بعض تلامذہ ہیں، امام ابوحنیفہ نے بنو امیہ اور بنو عباس دونوں کا عہد دیکھا تھا اور دونوں عہدوں میں ان کے سامنے یہ لقمہ تر پیش کیا گیا، مگر انہوں نے قبول نہیں کیا اور کسی قسم کے تعاون اور اشتراک عمل کو صحیح نہیں سمجھا، ان کے اس عزم سے ان کی پوری زندگی بڑی بے اطمینانی اور بے چینی میں گذری، مگر انہوں نے اپنے اس ارادہ و عزم میں کسی قسم کی تبدیلی گوارا نہیں کی، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وقت کی ان دینی اور اصلاحی تحریکوں کا علانیہ ساتھ دیا جو نظام حکومت کے بدلنے اور اس میں انقلاب و اصلاح پیدا کرنے کے لے اٹھیں، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے، ان کے تلامذہ میں امام زفر بھی اسی عزم و ارادہ کے انسان تھے، ان کے سامنے بھی جب عہدہ قضا پیش ہوا تو اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیا، جب بہت زیادہ اصرار ہوا تو روپوش ہو گئے، حکم ہوا کہ ان کا مکان گرا دیا جائے، جس کی تعمیل کی گئی، لیکن وہ اپنے فیصلہ اور عزم راسخ پر قائم رہے۔

امام محمد کو امام ابو یوسف نے ایک مصلحت کی بنا پر اس عہدہ کے قبول کرنے پر مجبور کیا جس کا رنج ان کو زندگی بھر رہا، انہوں نے حکومت کے خلاف بعض ایسے فیصلے دیئے کہ ان کو اس کے نتیجہ میں جیل جانا پڑا،

تفصیل ان بزرگوں کے حالات میں آئے گی، لیکن امام ابو یوسف نے اپنے استاد اور اپنے اصحاب کی روش کے برخلاف عہدہ قضاء قبول کیا، جس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ ان کو وقت کے اس نظام سے اتنی نفرت اور بے تعلقی نہیں تھی، جو ان کے پیش روں اور دوسرے ہم عصروں کو تھی، اسی بنا پر بعض اہلِ تذکرہ نے ان کے بارے میں کچھ اچھی رائے نہیں دی، لیکن ان کے بارے میں متعدد وجوہ کی بنا پر یہ گمان صحیح نہیں ہے، یہ صحیح ہے کہ جو لوگ حکومت کا کوئی عہدہ قبول کر لیتے تھے، ان کو عام طور پر اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا، خصوصیت سے اہلِ تقویٰ اور اہلِ علم کا گروہ تو اس کو سخت ناپسند اور حقیر سمجھتا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ حکومت سے متعلق ہونے کے بعد آدمی کی دینی حمیت اور ملی غیرت کچھ سرد ضرور پڑ جاتی تھی اور صحیح فیصلہ کے مقابلہ میں حکومت کے مصالح اور مفادات کا لحاظ اس کو زیادہ کرنا پڑتا تھا، ایک شاعر کا قول ہے

إن نصف الناس أعداء لمن　　　ولی الأحکام هذا وان عدل(٤)

چنانچہ اسی بنا پر امام ابو یوسف کے بارے میں یہی عام طور پر یہ غلط فہمی تھی اور ان کو عہدہ قضا کے قبول کر لینے کی وجہ سے مطعون کرتے تھے، مگر ہم آئندہ تفصیل سے بتائیں گے کہ ان کے متعلق لوگوں کا گمان صحیح نہیں تھا، سب سے پہلی بات تو یہ ذہن میں رکھنی چاہیے کہ انہوں نے بہت دنوں تک اس عہدہ کو قبول نہیں کیا، مگر بعد میں کچھ ایسے اسباب پیدا ہوگئے کہ ان کو اپنی رائے بدلنی پڑی اور اس عہدہ کو انہوں نے قبول کر لیا، مگر باوجود اس کے انہوں نے کبھی حق وعدل سے اعراض نہیں کیا، ہمیشہ بے لاگ فیصلے کئے اور ہمیشہ اپنی حمیت اور ملی غیرت کو باقی رکھا، اگر کبھی نادانستہ لغزش بھی ہوگئی تو اس پر سخت افسوس کرتے تھے اوپر ہم نے لکھا ہے کہ امام ابو یوسف بہت غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، جب تک امام صاحب حیات تھے ان کی اور ان کے بال بچوں کی کفالت کا خیال رکھتے تھے اور ان کی مدد کرتے تھے، ان کی وفات کے بعد امام ابو یوسف کی معاشی زندگی کا یہ سہارا بھی ختم ہوگیا، پھر بھی انھوں نے نہ حکومت کا رخ کیا اور نہ کسی کی امداد قبول کی، کئی برس تک خالص لوجہ اللہ درس دیتے رہے، اس درمیان میں گھر کا جو اثاثہ اور اسباب وسامان تھا، اس کو بیچ بیچ کر گذر

اوقات کرتے اور کام چلاتے رہے، خود ہی فرماتے ہیں کہ جب میرے ذاتی اثاثہ کا ایک ایک تنکا بک گیا اور میری حالت بے انتہا خستہ ہوگئی تو میں نے اپنے سسرالی مکان کی ایک کڑی نکلوا کر بازار میں بیچنے کے لیے بھیجی، جس کو میری ساس نے پسند نہیں کیا اور مجھے برا بھلا کہا، جس سے میرے دل پر بہت چوٹ لگی اور میں نے مجبور ہو کر بالآخر عہدہ قضا قبول کر لیا۔(۵)

لیکن صرف اتنی ہی وجہ امام ابو یوسف کے عہدہ قضا قبول کر لینے کے لیئے کافی نہیں ہوسکتی تھی، بلکہ ان کے سوانح حیات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دین کی مصلحت اسی میں سمجھتے تھے کہ اس عہدہ کو قبول کر لیا جائے اور اسکے ذریعہ اسلامی نظام کے ان قوانین کو نافذ کیا جائے، جو امام صاحب اور ان کی وفات کے بعد خود انہوں نے اور ان کے احباب نے کتاب وسنت سے مستنبط کیے تھے، چنانچہ جس زمانہ میں امام محمد کو عہدہ قضا کے قبول کرنے میں عذر ہوا تو ان سے کہا کہ اگر آپ اس عہدہ کو قبول کر لیں گے تو شام میں ہمارے مسلک کی ترویج کا ایک ذریعہ ہاتھ آجائے گا (یہ مسلک جس کی ترویج کے لیے زور دے رہے تھے، وہ وہی ہے جو امام صاحب اور امام ابو یوسف اور خود امام محمد نے کتاب وسنت سے مستنبط کیا تھا، صرف امام محمد نے ایک ہزار مسائل صرف قرآن پاک سے مستنبط کیے تھے)۔

پھر امام صاحب اور دوسرے بزرگوں کی دربارِ خلافت سے بے تعلقی کی وجہ سے حکومت نے بھی اپنے رویہ میں بڑی حد تک تبدیلی پیدا کر لی تھی، اب اس نے اسلامی احکام کے اجراء اور فیصلوں میں پہلے سے کہیں زیادہ مواقع اور آزادی دے رکھی تھی، خاص طور سے قضا کے فیصلوں میں بہت کم دخل دیتی تھی، یہاں تک کہ بعض معاملات میں امام ابو یوسف کے ہم عصر قاضیوں نے ارکان حکومت تو کیا خود خلفا کے فیصلے صادر کیے اور حکومت کو برداشت کرنا پڑا، اس کے علاوہ امام صاحب نے اسلامی احکام کی ترویج کے لیئے ایک جماعت تیار کی تھی اور اس کے افراد میں جو سیرت اور کردار پیدا کیا تھا، اس کی بنا پر ان سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ ارکانِ حکومت یا وزراء یا خلفاء کے سامنے اظہارِ حق کے بجائے ان کی خوشامد کریں گے، ممکن ہے، اسی بناء

پر خود امام صاحب نے ان لوگوں کو عہدہ قضا کے قبول کرنے کی اجازت دیدی ہو تو کوئی تعجب نہیں، جیسا کہ امام صاحب نے ان کے والد کو جواب دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ آئندہ یہ بڑی حیثیت کے مالک ہوں گے۔

وہ خود فرماتے تھے کہ میرے یہ چھتیس اصحاب ہیں، جن میں سے ۲۸ تو عہدہ قضا کے لائق ہیں، ۶/مفتی ہو سکتے ہیں اور ۲/یعنی امام زفر اور امام ابو یوسف یہ صلاحیت رکھتے ہیں کہ قیاضیوں اور مفتیوں کو تیار کریں اور ان کو اس کام کے لائق بنائیں۔(۶)

عاجز کا خیال ہے کہ یہی وجوہ اسباب تھے، جن کی بناپر اب اہلِ علم اور اہلِ تقویٰ اصحاب عہدہ قضا کے قبول کرنے میں اتنے زیادہ سخت نہیں رہ گئے تھے، جتنا کہ اس سے پہلے تھے، ممکن ہے کہ اس کے ساتھ معاشی تنگی و پریشانی نے بھی امام ابو یوسف کو یہ عہدہ قبول کرنے پر مجبور کیا ہو، ورنہ اگر ان کو یہ توقع نہ ہوتی کہ ان کے کیئے ہوئے فیصلوں میں کوئی قوت حارج نہیں ہوگی یا اپنے اندر اس قسم کی کمزوری پاتے کہ وہ ارباب حکومت کی خاطر اور پاسداری میں اظہارِ حق سے باز رہ جائیں گے تو یقیناً استاد کی طرح وہ بھی موت کو پسند کرتے، لیکن اس عہدہ کے قریب نہ جاتے، آگے جو واقعات نقل کیئے جائیں گے ان سے اندازہ ہوگا کہ انہوں نے ہمیشہ بے لاگ فیصلے کیئے کبھی کسی کی ناحق رعایت نہیں کی، وزراء وارکانِ حکومت تک کی شہادتیں رد کردیں، ہارون رشید جیسے بااقتدار اور صاحب جبروت خلیفہ کو معمولی رعایا کی صف میں کھڑا کر دیا اور اس کے سامنے کبھی اظہارِ حق سے باز نہیں آئے اور وہ استاد کی وہ بات کیسے بھول سکتے تھے، جو انہوں نے منصور کے جواب میں کہی تھی، منصور نے جب امام صاحب کو عہدہ قضا قبول کرنے پر مجبور کیا تو آپ نے اس سے کہا تھا کہ قاضی ایسے شخص کو ہونا چاہیے جو آپ کے خلاف، آپ کے بچوں کے خلاف اور آپ کے سپہ سالاروں کے خلاف فیصلہ کر سکے۔(۷)

ہم ذیل میں ان کے زمانہ قضا کے چند واقعات نقل کرتے ہیں:

امام ابو یوسف تین تین عباسی خلفاء کے دور میں قاضی رہے، مہدی، ہادی اور ہارون رشید، مہدی نے

انہیں صرف بغداد کے مشرقی حصہ کا قاضی مقرر کیا تھا، مگر خلیفہ ہادی کے زمانہ میں وہ پورے بغداد کے قاضی بنا دیئے گئے (بغداد کی آبادی اس وقت چھ سات لاکھ تھی) ایک باغ کے معاملہ میں خلیفہ ہادی اور کسی عام آدمی میں اختلاف ہوگیا، ہادی نے حکم دیا کہ معاملہ قاضی کے روبرو پیش کیا جائے، امام ابو یوسف کے سامنے ایسی شہادتیں گذریں جن سے باغ ہادی کا ثابت ہوتا تھا، لیکن امام نے انہی شہادتوں پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ خفیہ تحقیقات کی، جس سے معلوم ہوا کہ باغ خلیفہ کے مخالف فریق ہی کا ہے، جس کے خلاف عدالت میں شہادتیں گذر رہی تھیں، قاضی صاحب نے مقدمہ تو اس وقت ملتوی کر دیا، ہادی سے ملاقات ہوئی تو اس نے پوچھا کہ مقدمہ میں آپ نے کیا فیصلہ کیا، امام ابو یوسف نے فرمایا کہ شہادتیں تو آپ کے موافق ہی گذری ہیں، مگر مدعا علیہ کی طرف سے یہ مطالبہ ہوا ہے کہ مدعی (خلیفہ) سے حلف بھی لے لی جائے، ہادی نے پوچھا تو آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا آپ مدی کا حلف اٹھانا صحیح سمجھتے ہیں (حنفی مسلک کے مطابق قسم مدعی کے ذمہ نہیں، بلکہ مدعا علیہ کے ذمہ ہے، مگر امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک ایک حق دار کے حق کو واپس دلانا اس سے زیادہ ضروری ہے کہ حنفی مسلک کی پیروی کی جائے) امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے فرمایا کہ قاضی ابن ابی لیلیٰ کی تو یہی رائے ہے (جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ امام ابو یوسف وغیرہ امام صاحب کے قول کے خلاف کبھی فتویٰ نہیں دیتے یا فیصلہ نہیں کرتے تھے، صحیح نہیں ہے) اس کے بعد ہادی نے کہا کہ اچھا تو باغ مدعا علیہ کے حوالہ کر دیجئے۔(۸)

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ صحیح فیصلہ تک پہنچنے اور حق کو حق دار تک پہنچانے میں کتنی کدو کاوش کرتے تھے، اسی طرح کا ایک فیصلہ انہوں نے ہارون رشید کے خلاف بھی دیا تھا، مگر اس میں ان سے ذرہ سی غلطی ہوگئی تھی، جس کا ان کو زندگی بھر افسوس رہا، واقعہ یہ ہے کہ سوادعراق کے ایک بوڑھے نے ہارون کے خلاف یہ دعویٰ دائر کیا کہ فلاں باغ میرا ہے، لیکن خلیفہ نے اس پر غاصبانہ قبضہ کر لیا ہے، اتفاق سے یہ مقدمہ اس روز پیش ہوا جس روز خود ہارون رشید فیصلے کے لیے بیٹھا تھا، قاضی ابو یوسف فریقین کے بیانات اور ان کے دعویٰ ہارون کے سامنے پیش کر رہے تھے، جب اس مقدمہ کی باری آئی تو انہوں نے خلیفہ کے

سامنے اس کو پیش کیا اور کہا کہ آپ کے اوپر دعویٰ ہے کہ آپ نے فلاں آدمی کا باغ زبردستی لے لیا ہے، مدعی یہاں موجود ہے، حکم ہو تو حاضر کیا جائے؟ بوڑھا سامنے آیا تو قاضی ابو یوسف نے پوچھا: بڑے میاں آپ کا دعویٰ کیا ہے، اس نے کہا کہ میرے باغ پر امیر المومنین نے ناحق قبضہ کرلیا ہے، جس کے خلاف دادرسی چاہتا ہوں، قاضی نے سوال کیا، اس وقت وہ کس کے قبضہ اور نگرانی میں ہے، بولا امیر المومنین کے ذاتی قبضہ میں ہے، اب قاضی ابو یوسف نے ہارون رشید سے مخاطب ہو کر کہا کہ دعویٰ کے جواب میں کچھ آپ کہنا چاہتے ہیں، ہارون رشید نے کہا: میرے قبضہ میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے، جس میں اس شخص کا حق ہو، نہ خود باغ ہی میں اس کا کوئی حق ہے، قاضی نے فریقین کے بیانات سننے کے بعد مدعی سے پوچھا کہ تمہارے دعویٰ کے ثبوت کے لئے کوئی دلیل بھی ہے، کہا ہاں! خود امیر المومنین سے قسم لے لی جائے، ہارون نے قسم کھا کر کہا کہ یہ باغ میرے والد مہدی نے مجھے عطا کیا تھا، میں اس کا مالک ہوں، بڈھے نے یہ سنا تو اس کو بہت غصہ آیا اور یہ بڑبڑاتا ہوا عدالت سے نکل گیا، جس طرح کوئی شخص آسانی سے ستو گھول کر پی جائے، اسی طرح اس شخص نے آسانی سے قسم کھالی (امام ذہبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ مدعی نصرانی تھا، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ عدل وانصاف کا اس زمانہ میں کیا معیار تھا) ایک معمولی آدمی کی زبان سے یہ الفاظ سن کر ہارون کا چہرہ غصہ سے تمتما اٹھا، یحییٰ برمکی نے ہارون کو خوش کرنے کے لیے امام ابو یوسف سے مخاطب ہو کر کہا کہ آپ نے دیکھا اس عدل وانصاف کی نظیر دنیا میں مل سکتی ہے، امام ابو یوسف نے اس کی تحسین کی، کہا کہ مگر انصاف کے بغیر کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔

ان واقعات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے اپنی جرات، دینی حمیت اور اظہارِ حق سے اس عہدہ کو جس پر علم دین سے ناواقف تک مقرر ہونے لگے تھے، کتنا اونچا اور بلند کر دیا کہ مطلق العنان خلفا تک کو ان کے فیصلہ کے آگے سر جھکا دینا پڑتا تھا، موجودہ زمانہ میں شائد کوئی استعجاب کی بات نہ سمجھی جائے، مگر جس مطلق العنان اور شخصی فرماں روائی کے دور کے واقعات ہیں، اس میں یہ بات حد درجہ تعجب خیز

اور حیرت انگیز ہے، ان واقعات سے ایک اور بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس وقت اسلامی نظام کے چلانے والوں اور خواص کے طبقہ میں گو دین کی وہ روح باقی نہیں رہ گئی تھی، جو قرونِ اولیٰ میں تھی، مگر چونکہ اسلامی نظام کا ڈھانچا کسی نہ کسی شکل میں اب بھی موجود تھا جس کا اثر تھا کہ معاشرہ کے متساہل اور دین سے غافل افراد کے دلوں میں بھی اتنا خوفِ خدا اور احساسِ ذمہ داری باقی تھا کہ جب ان کے سامنے کوئی داعی حق، حق کی دعوت دیتا، یا ان کی کسی ناحق بات پر تنقید کرتا تو چاہے، ان کی مرضی اور خواہش کے خلاف ہی کیوں نہ ہوتا، اس کو قبول ضرور کرتے تھے اور اگر قبول نہ کرتے تو کم از کم ان کو اس پر ندامت ضرور ہوتی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر عام علماء فقہا نے تواصی بالحق ادا کیا ہوتا، تو نہ تو اسلامی نظام ہی کو دھچکا لگتا، نہ اس کے چلانے والے غلط راہ پر پڑ جاتے، چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی مجددانہ عزم و ارادہ کا انسان حکومت کے مقابلہ میں سینہ سپر ہو گیا ہے، تو اس نے بڑی حد تک زمانہ کی رفتار اور حکومت کا رخ موڑ دیا ہے، مذکورہ بالا معاملہ میں امام ابو یوسف نے انصاف کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، مگر پھر بھی آخر وقت تک ان کو جب اس واقعہ کا خیال آجاتا تو فرماتے تھے: میں اپنے اندر سخت کوفت، اذیت، رنج محسوس کرتا ہوں اور ڈرتا ہوں کہ میں نے انصاف میں جو کوتاہی کی ہے، اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا کیا جواب دونگا؟ لوگوں نے پوچھا آپ نے انصاف میں کیا کوتاہی کی؟ اور آپ اس سے زیادہ کیا کر سکتے تھے کہ ایک معمولی کسان کے مقابلہ میں وقت کے سب سے بڑے بادشاہ کو قسم کھانے پر مجبور کر دیا، فرمایا تم لوگوں نے نہیں سمجھا کہ مجھے کس خیال سے تکلیف ہوتی ہے، پھر افسوس کے لہجہ میں فرمایا کہ مجھے تکلیف اور کڑھن اس کی ہے کہ میں ہارون سے یہ نہ کہہ سکا کہ آپ کرسی سے اتر جایئے، جہاں آپ کا فریق کھڑا ہے وہیں ایک فریق کی حیثیت سے آپ بھی کھڑے ہو جایئے یا پھر اجازت دیجئے کہ اس کے لیے بھی کرسی لائی جائے۔(۹)

ان کی جرات وحق گوئی صرف فیصلوں ہی تک محدود نہیں تھی، بلکہ ہر موقع پر وہ اس کا ثبوت دیتے تھے، ہارون نے ان سے کتاب الخراج لکھنے کی فرمائش کی تو اس کی تعمیل کی اور کتاب مرتب کر دی کہ اسلامی قانون کی

تدوین کا ایک اہم اور بہت ضروری کام تھا، لیکن اس کے دیباچہ میں ہارون کو جس صفائی اور جرات کے ساتھ نصیحتیں اور ہدایتیں کی ہیں، وہ ان کی حق گوئی کی ایک زبردست یادگار ہے، بعض اہلِ تذکرہ نے جو امام ابو یوسف صاحب کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ دنیا نے ان کو مشغول کرلیا تھا، اس کی تردید میں دوسرے تذکروں اور تاریخوں سے جو بیانات نقل کیے جاتے ہیں، ان میں تو شبہ کیا جاسکتا ہے اور اس کے متعلق دورائیں ہوسکتی ہیں، لیکن انہوں نے خود اس کتاب میں جو کچھ لکھا ہے، اس میں کون شبہ کرسکتا ہے، یہ نصائح وہدایات کتاب کے صفحہ نمبر: ۱۷، ۱۸ پر پھیلے ہوئے ہیں، ہم اس کا خلاصہ یہاں پیش کرتے ہیں۔

امیر المومنین! خدا کا شکر ہے کہ اس نے ایک بڑی ذمہ داری (حکومت) آپ کے سپرد کی ہے، اس کی ادائیگی کا ثواب بھی تمام ثوابوں سے بڑا اور اعلیٰ ہے اور اس میں کوتاہی کی سزا بھی تمام سزاوں سے بدتر اور سخت تر ہے، آپ کے سپرد اس امت مسلمہ کے تمام معاملات کیے گئے ہیں، آپ دن رات کوشش کریں کہ ان کے حقوق کی بنیادیں مستحکم ہوں اور آپ ان کے جان و مال کے امین ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ پر یہ ذمہ داری ڈال کر آپ کی آزمائش کی ہے، میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ خدا کے خوف اور ڈر پر جس تعمیر کی بنیاد نہیں رکھی جائے گی اس کے لیے ہروقت خطرہ ہے کہ کس وقت خدائے قدوس اوندھے منہ بنانے والے کے اوپر اسے گرادے، تو آپ امت اور عام رعیت کے حقوق کی حفاظت اور ان کے معاملات کی دیکھ بھال میں کوتاہی نہ کریں، عمل میں خدا قوت بخشتا ہے۔

آج کے کام کو کل پر نہ اٹھا رکھیے، اگر آپ نے ایسا کیا تو نقصان ہوگا، وقت کو توقع اور امید کے ساتھ نہ رکھیے، بلکہ وقت کو عمل کے ساتھ رکھیئے، یعنی امید پر کوئی کام اٹھا نہ رکھیئے، بلکہ ہر کام وقت پر کرلیجئے، ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے، وقت کے بعد کام بے کار ہے، پھر بہت سی نصیحتیں کرنے کے بعد فرماتے ہیں: قیامت کے دن وہی حکمران سب سے زیادہ خوش بخت ثابت ہوگا، جس نے اپنی رعیت کو خوش حال رکھنے کی کوشش کی، دیکھئے آپ کسی معاملہ میں جادہ مستقیم سے نہ ہٹیئے گا، ورنہ آپ کی رعیت بھی ہٹ جائیگی، خبردار کسی معاملہ میں

خواہشِ نفس اور اپنے غیظ و غضب کو دخل نہ دیجئے گا، جب دین و دنیا میں کش مکش کی صورت پیش آئے تو چاہیے کہ آپ دین کے پہلو کو اختیار کریں اور دنیا کو چھوڑ دیں، دین باقی رہنے والی چیز ہے اور دنیا فانی ہے، آپ تمام لوگوں کو خدا کے قانون کے لحاظ سے برابر سمجھیں، خواہ وہ آپ کے قریب کے ہوں یا بعید کے ہوں، اللہ کے قانون کے نفاذ میں آپ ملامت کرنے والوں کی بالکل پرواہ نہ کیجئے۔

غرض اسی انداز سے انہوں نے ایک طویل نصیحت کی ہے، اسی کے بعد موضوع کتاب پر بحث کی ہے، اس کے بعد کس کو شبہ ہوسکتا ہے کہ جس بلند مقصد کے لیے انہوں نے یہ عہدہ قبول کیا تھا اس کو انہوں نے پورے طور پر انجام نہیں دیا، ہارون خود رائی کے باوجود بہت سی خوبیوں میں دوسرے عباسی حکمرانوں میں ممتاز تھا، خصوصاً اس کی رعایا پروری کے واقعات تو اب تک زبان زد عام و خاص ہیں اور ان خصوصیات کے پیدا کرنے میں اس کی نیک فطرتی کے ساتھ ساتھ بلاشبہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی معیت کو بھی بہت کچھ دخل تھا۔

امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے جب خلفا کی پروا نہیں کی تو وزراء اور ارکانِ حکومت کی پرواہ کیا کرتے، چنانچہ انہوں نے متعدد وزراء اور خواصِ حکومت کی شہادتیں رد کر دیں، ایک بار علی بن عیسیٰ وزیر مملکت نے کسی معاملہ میں شہادت دی، تو امام ابو یوسف نے قبول نہیں کی، یہ ایک وزیر کی بڑی توہین تھی، اس نے معاملہ ہارون رشید کے سامنے پیش کیا، ہارون رشید نے امام موصوف سے دریافت کیا تو فرمایا کہ میں نے شہادت اس لیے رد کر دی کہ میں نے اپنے کانوں سے ان کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ میں تو خلیفہ کا عبد اور غلام ہوں اور جب یہ غلام ہیں تو غلاموں کی شہادت معتبر نہیں، بعض روایتوں میں ہے کہ انہوں نے کہا کہ یہ جماعت سے نماز نہیں پڑھتے (۱۰)

قاضی القضا کے عہدہ کی ابتداء

امام ابو یوسف خلیفہ مہدی کے عہد خلافت میں بغداد کے مشرقی حصہ کے قاضی مقرر ہوئے تھے، خلیفہ ہادی کے زمانہ میں بھی اسی عہدہ پر تھے، ہارون رشید کے ہاتھوں میں خلافت کی باگ ڈور آئی تو سال بھر تک

تو اس نے ان کو اسی حیثیت میں رکھا، مگر اس کے بعد تمام ممالک محروسہ کا قاضی القضا بنا دیا، مقریزی نے لکھا ہے کہ: عراق، خراسان، شام، مصر میں ان کے حکم کے بغیر قضات کے منصب پر کوئی مقرر نہیں ہوسکتا تھا۔(۱۱)

جواہر مضیہ میں ہے:

كان اليه تولية القضاء في الآفاق من الشرق والغرب(۱۲)

ترجمہ: مشرق سے مغرب تک تمام اسلامی ملکوں میں قاضیوں کا تقرر انہی کے سپرد تھا۔

خود امام ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

فَوَلَّانی قضاء البلاد كلها. (۱۳)

ترجمہ: پھر مجھ کو تمام ممالکِ محروسہ کی قضات کی ذمہ داری سونپ دی۔

اِن بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رسماً اور تبرکاً قاضی نہیں بنائے گئے تھے، بلکہ کہنا چاہیے کہ وہ حکومت کے محکمہ عدلیہ کے پورے انچارج یا بالفاظِ دیگر وزیر عدل و قانون تھے، یہ محکمہ اس سے پہلے کبھی قائم نہیں ہوا تھا، یہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ ہی کی ذات تھی جس نے عہدہ قضا کو جس کی خلافتِ راشدہ کے بعد کوئی قیمت باقی نہیں رہ گئی تھی، اتنا باوقار بلند اور اہم بنا دیا کہ اس کو ایک الگ محکمہ اور عہدہ کی حیثیت حکومت کو دینی پڑی، اس کی تائید ابوالولید الطیالسی کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے، وہ کہتے تھے کہ:

هذا هو الوزير وقاضى القضاة،

ترجمہ: یہی وہ شخص ہے جو وزیر اور قاضی القضاۃ ہے۔

ہارون رشید جیسا باجبروت وخود پرست خلیفہ ان کا اس قدر اعزاز واکرام کرتا تھا کہ ان کو ہمہ وقت اس کے دربار میں بازیابی کی اجازت تھی، ان کے لیئے کوئی روک ٹوک نہیں تھی، یہاں تک کہ باب خلافت تک پہنچ جانے کے باوجود بھی سواری سے نہیں اترتے تھے، حریم خلافت کا پردہ اٹھا دیا جاتا اور ان کی سواری اندر چلی جاتی تھی، جب ہارون کا سامنا ہوتا تو وہ خود سلام میں سبقت کرتا اور یہ مصرع دہراتا تھا جاء ت به محتبرا

ببر دہ بعض روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ اعزاز واکرام اور بے پایاں اختیار اقتدار خلیفہ کے بعض حواریوں اور حاشیہ نشینوں کو برا لگا، ممکن ہے، ان میں وہ وزیر اور عہدہ دار بھی رہے ہوں، جن کی شہادتیں امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے ان کے عہدہ ومنصب اور اقتدار واجلال کے علی الرغم رد کر دی تھیں اور ان لوگوں نے ہارون رشید سے شکایت کے طور پر کہا:

وكان فقيها عالماً انك رفعت ابايوسف فوق المقدار وانزلته المنزلة الجليل الرفيعةبای وجه نال ذٰلك منك.(١٤)

ترجمہ: وہ محض ایک عالم اور فقیہ تھے، آپ نے ان کی حیثیت سے کہیں زیادہ ان کو بلند کر دیا اور غیر معمولی اعزاز واکرام بخش دیا، تو یہ مرتبہ آپ کے یہاں انہوں نے کس وجہ سے حاصل کر لیا ہے۔

ہارون نے ان حاسدوں کو جواب دیا کہ میں نے جو کچھ کیا ہے، بہت سوچ سمجھ کر اور کافی تجربہ کے بعد کیا ہے، خدا کی قسم علم کے جس باب میں بھی میں نے ان کو جانچا کامل پایا، پھر کہا کہ ان کی علمی قابلیت کو ان کی طالب علمی کے زمانہ سے جانتا ہوں، پھر ان علمی امتیازات کے علاوہ میں نے مذہب میں ان کے قدم کو استوار اور ان کے دین کو تمام آلودگیوں سے محفوظ پایا، اگر کوئی قاضی ابو یوسف جیسا ہو تو پیش کرو۔(۱۵)

مذکورہ واقعات سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ امام ابو یوسف نے جس مقصد کی خاطر یہ عہدہ قضا قبول کیا تھا، اس میں وہ کتنے کامیاب تھے اور انہوں نے اپنے ذاتی کردار اور علم وتفقہ سے اس عہدہ کو کتنا بلند اور خود حکومت میں کتنا اثر اور رسوخ پیدا کر لیا تھا کہ وزراء اور ارکانِ حکومت تک کے دل میں رشک وحسد پیدا ہونے لگا تھا اور یہ ہارون کے عہد کا واقعہ ہے جس میں برامکہ جیسے بیدار مغز وزراء اور ارکان دولت تھے، امام ابو یوسف کے بعد اسی عہدہ پر جب وہب بن وہب المعروف بابی البختری کا تقرر ہوتا ہے تو وہ ہارون کے ہر کام کے جواز کے لیئے حدیثیں وضع کرنے لگتے ہیں، مشہور ہے کہ انہوں نے کئی بار اسی طرح کا اقدام کیا، دو ایک بار تو ہارون کچھ نہیں بولا، مگر وہ بھی صاحب علم ونظر تھا اور پھر امام ابو یوسف جیسے متدین اور محتاط قاضی کی رفاقت

میں رہ چکا تھا، کب تک خاموش رہتا، چنانچہ ایک روز وہ کبوتر اڑا رہا تھا کہ وہب آگئے، پوچھا کہ کبوتر بازی کے لیئے بھی کوئی حدیث آئی ہے، بے محابا شیخ نے یہ روایت سنادی:

مجھ سے ہشام بن عروہ نے یہ روایت کی ہے کہ ان کے والد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے واسطہ سے بیان کرتے تھے کہ وہ فرماتی تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبوتر بازی کی ہے اور اس سے شغف فرمایا ہے۔

یہ سن کر ہارون آپے سے باہر ہوگیا اور نہایت خشم گیں آواز میں بولا نکل جاو میرے سامنے سے، اگر تمہارا تعلق قریش سے نہ ہوتا تو میں تمھیں ابھی معزول کر دیتا اور یہی ہوا کہ کچھ دنوں کے بعد معزول کر دیئے گئے۔(۱۶)

عہدہ قضا کی مدت

امام ابو یوسف عہدہ قضا پر کتنے دنوں مامور رہے، اس میں اختلاف ہے، ایک مرتبہ خود انہوں نے اپنے شاگرد سے بیان کیا کہ میں ۱۷برس امام صاحب کی حدمت میں رہا اور ۱۷برس دنیا کے کاموں میں (یعنی عہدہ قضا پر) اوپر ذکر آچکا ہے کہ سب سے پہلے مہدی کے وقت قاضی مقرر ہوئے اور ان کی وفات سنہ۱۸۲ہجری میں عہدہ قضاء کی حالت میں ہوئی تو اگر ان کے تقرر کا سنہ۱۵۹ھ مانا جائے تو قضا کی مدت ۲۲،۲۳ برس ہوتی ہے اور اگر یہ مانا جائے کہ وہ ۱۷برس عہدہ قضا پر رہے تو اس اعتبار سے ان کا تقرر سنہ۱۶۶ھجری میں ہونا چاہیے، غرض پہلی صورت میں امام صاحب کی وفات کے ۹ برس کے بعد عہدہ قضاء قبول کیا اور دوسری صورت میں پندرہ برس کے بعد۔

علم وفضل

امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے صحیفہ زندگی کا سب سے جلی عنوان یہی ہے، امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ ائمہ تابعین اور تبع تابعین کے اس دور میں تھے، جس میں علم وفن کا چرچا گھر گھر تھا، دینی علوم تفسیر وحدیث وفقہ،

وسیرت، رجال وطبقات اور مذاہب اربعہ کے ائمہ اوراعاظم رجال علماء اسی دور میں تھے مثلاً امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، امام مالک رحمہ اللہ، سفیان ثوری رحمہ اللہ، امام اوزاعی رحمہ اللہ، عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ، سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ، محمد بن اسحاق رحمہ اللہ، یحییٰ بن معین رحمہ اللہ، وکیع بن جراح رحمہ اللہ وغیرہ ان ائمہ کبار کی موجودگی میں کسی دوسرے کے علم وفضل کا چراغ اس وقت تک نہیں جل سکتا تھا، جب تک وہ غیر معمولی حیثیت کا مالک نہ ہو، ان میں سے متعدد ائمہ امام ابو یوسف کے استاذ تھے اور متعدد شاگرد تھے اوران میں سے ہر ایک نے ان کے علم وفضل کا جن الفاظ میں اعتراف کیا ہے، ان سے امام ابو یوسف کی علمی عظمت اور بلند پائیگی کا اندازہ ہوتا ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ جوآسمانِ علم کے مہر درخشاں تھے اور جن کے فیض صحبت سے ابو یوسف، امام ابو یوسف ہوئے تھے، وہ بھی ان کے مداح تھے، ایک بار امام ابو یوسف رحمہ اللہ بیمار پڑے، امام صاحب رحمہ اللہ عیادت کے لیے گئے، جب وہ باہر نکلے تو بہت متفکر نظر آئے، کسی نے سبب پوچھا تو فرمایا: یہ جوان مرگیا تو زمین کا سب سے بڑا عالم اٹھ جائے گا۔(۱۷)

علی بن صالح جوامام شعبہ اور ابن ابی ذئب جیسے ائمہ کی صحبت میں رہ چکے تھے، جب امام ابو یوسف سے روایت کرتے تھے تو فرماتے تھے، سید العلماء فقہ الفقہاء علما کے سردار سب سے بڑے فقیہ یعنی ابو یوسف نے یہ روایت کی ہے۔(۱۸)

علی بن جعد درس دے رہے تھے، اثنائے درس میں امام ابو یوسف کا تذکرہ آگیا، کسی نے کہا کہ آپ جیسا آدمی بھی درس میں امام ابو یوسف کا تذکرہ کرتا ہے؟ ان کو بڑا رنج ہوا اور اس شخص سے مخاطب ہو کر کہا کہ امام ابو یوسف کا نام لینے سے پہلے چاہیے تھا کہ تم اپنا منہ اشنان (ایک گھاس) اور گرم پانی سے صاف کر لیتے، پھر فرمایا کہ مارایت مثلہ میں نے ان کے جیسا کوئی صاحب علم نہیں دیکھا، یہ علی بن جعد، امام مالک، سفیان ثوری، لیث بن سعد، شعبہ بن حجاج وغیرہ ائمہ فقہ وحدیث کے فیض یافتہ تھے، اس لیے ان کی یہ رائے بہت ہی

اہمیت رکھتی ہے۔(۱۹)

بشر بن ولید نے ایک شخص سے کہا کہ تم امام ابو یوسف کی تعظیم نہیں کرتے میں نے ان کے مثل کسی کو نہیں پایا۔(۲۰)

ہلال الرائے کہتے تھے کہ امام ابو یوسف تمام علوم کے جامع تھے، فقہ ان کے علوم میں اقل العلوم تھی۔

طلحہ بن جعفر فرماتے تھے کہ امام ابو یوسف مشہور و معروف تھے، ان کا علم وفضل بلند درجہ کا تھا، ان سے بڑھ کر ان کے زمانے میں کوئی نہیں تھا، علم و حکمت اور ریاست وقدر میں انتہا کو پہنچے ہوئے تھے، وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے امام ابوحنیفہ کا علم تمام عالم میں پھیلایا (مقصد یہ ہے کہ عملاً امام صاحب کے مستنبط مسائل کو سب سے زیادہ اشاعت انہی کے ذریعہ ہوئی)۔

امام صاحب کے پوتے اسماعیل بن حماد فرماتے ہیں کہ میرے دادا (ابوحنیفہ) کے خاص اصحاب دس تھے، لیکن ان میں امام ابو یوسف سے بڑھ کر کوئی نہیں تھا، احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، علی بن المدینی جیسے ائمہ جرح وتعدیل نے بھی ان کے علوم وفضل کا اعتراف کیا ہے اور ان کی توثیق کی ہے۔

اِن اقوال سے ان کے علم وفضل کا بخوبی اندازہ ہو گیا ہوگا، اس لیے کہ معاصرین اور ائمہ رجال کے اقوال وآراء کے آئینہ میں بھی اسلاف کی زندگی کے حسن وقبح اور خدوخال بڑی حد تک نظر آجاتے ہیں، لیکن یہ ان کے علم وفضل کا بہرحال ایک اجمالی ہی خاکہ کہا جائے گا، تفصیل کے لیے ضرورت ہے کہ ان تمام فنون پر بحث کی جائے جن میں انہوں نے اپنے اجتہاد کے نقوش چھوڑے ہیں، خصوصیت سے قرآن اور حدیث وآثار کے سلسلہ میں۔

قرآن

وہ قرآن کے حافظ تھے، قرآن سے ان کو اتنا انس وشغف تھا کہ بغیر خشوع وخضوع اور توجہ الی اللہ کے کسی کو پڑھتے ہوئے دیکھتے تھے تو اس کو سخت تنبیہ کرتے تھے، امام صاحب کے عام درس میں تو نہیں مگر ان کا

جو خاص شورائی درس ہوتا تھا اس کی شرکت کے لیے حفظِ قرآن پہلی شرط تھی، چنانچہ ان کے مخصوص تلامذہ میں امام محمد، امام زفر، حسن بن زیاد، داود طائی، فضیل بن عیاض سب حافظِ قرآن تھے۔

امام صاحب نے یہ شرط ایک بڑے مقصد کی خاطر لگائی تھی، وہ یہ کہ امام صاحب کا طریقہ استنباط یہ تھا کہ ہر معاملہ میں وہ پہلے کتاب اللہ کی طرف رجوع کرتے تھے، اس کے بعد آثار واحادیث کی طرف اور اسی طریقہ پر وہ اپنے تلامذہ کی بھی تربیت کرتے تھے، پھر وہ اپنے اجتہاد واستنباط کو اپنے تلامذہ پر تھوپتے یا ان کی صرف املا نہیں کراتے تھے، بلکہ وہ ہر مجتہد فیہ اور مستنبط مسئلہ کو اپنی مجلس علمی میں پیش کرتے تھے اس کے بعد سب کو قرآن وسنت میں غور کر کے رائے دینے کا اختیار دیتے تھے، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں کسی ایسے شاگرد کا اس مجلس میں گذر نہیں ہوسکتا تھا جو حافظِ قرآن نہ ہو اور پھر اسی کے ساتھ اس میں قرآن سے اجتہاد اور استنباطِ مسائل کی پوری پوری صلاحیت موجود نہ ہو۔

امام صاحب کی اس مجلسِ درس میں امام ابو یوسف کی جو حیثیت تھی، اس کا ذکر خود امام کی زبانی اوپر آچکا ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کو قرآن میں غور وخوض اور اس سے تخریج مسائل کا کتنا ملکہ رہا ہوگا، فرماتے تھے کہ میں نے جن مسائل میں فتوے دیئے تھے، ان میں جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق تھے، انہیں تو باقی رکھا اور جو خلاف تھے ان سب سے رجوع کر لیا، یعنی امام صاحب کی مجلسِ درس میں جو کچھ حاصل کیا تھا اس کو دوبارہ کتاب وسنت کے معیار پر پرکھا، پھر اس کو اختیار کیا یا چھوڑا، قرآن پر غور وخوض اور اس سے نتائج اخذ کرنے کے لیے حدیث وآثار کے علاوہ لغت عرب اور بعض دوسرے علوم سے واقفیت بھی ضروری ہے، چنانچہ امام ابو یوسف ان تمام علوم کے جامع تھے، جن کی ضرورت ایک مجتہد کے لیئے ضروری ہے، قرآن سے ان کے استدلال اور استنباط کی دو چار مثالیں یہاں پیش کی جاتی ہیں، مصارفِ زکاۃ کے سلسلہ میں قرآن کی یہ آیت:

''إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلفُقَرَاء وَالمَسَاكِينِ وَالعَامِلِينَ عَلَيهَا وَالمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُم وَفِي الرِّقَابِ

وَالغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَابنِ السَّبِيلِ"(۲۱)

ترجمہ: زکوٰۃ فقراء مساکین اوران کے وصول کرنے والوں کا حق ہے۔

کوآخر تک نقل کرنے کے بعد اس کی مجتہدانہ تفسیر وتفصیل کرتے ہیں۔

انہوں نے تفسیر میں آیت کی ترتیب بدل دی ہے، یعنی پہلے انہوں نے مولف القلوب کو لیا ہے، ان کے بارے میں عام ائمہ کی طرح ان کی بھی رائے یہی ہے کہ اب یہ مصرف باقی نہیں رہا (امام شافعی رحمہ اللہ، امام داود رحمہ اللہ اور دوسرے ائمہ کی رائے ہے کہ یہ اب بھی باقی ہے) پھر عاملینِ زکاۃ کا تذکرہ کرتے ہیں، اس میں انہوں نے ایک خاص بات یہ لکھی ہے، ان کو اتنا معاوضہ دینا چاہیے کہ ان کی ضروریاتِ زندگی پوری ہوسکیں، اس میں نہ تو اسراف کیا جائے اور نہ بخل سے کام لیا جائے، اگر چہ معاوضہ اس کے اصل حصہ سے زیادہ ہی کیوں نہ ہوجائے (یعنی صدقہ میں ۸ مصارف ہیں، ان میں مولف القلوب کو نکال دیا جائے تو عاملین کا حصہ ۱/۷ ہوا، اس کے بارے میں فرماتے ہیں کہ خواہ ان کو اصل حصہ یعنی ۱/۷ سے زیادہ ہی کیوں نہ مل جائے، مگر بہر حال ان کی ضروریات پوری کی جائیں)۔(۲۲)

پھر فقرا، مساکین اور غارمین کا ذکر کرنے کے بعد ابن السبیل (مسافر) کی تشریح کی ہے، انہوں نے یہ اجتہاد کیا ہے کہ اس میں مسافروں کی ذاتی مدد کے علاوہ ان کی راحت رسانی کے سامان کی تیاری، مثلاً راستوں کی درستی، پلوں اور مسافر خانوں کی تعمیر وغیرہ بھی داخل ہوسکتی ہے، ان کی اصل عبارت یہ ہے:

وفی ابناء السبیل المنقطع بھم سھم یحملون به ویعانون.(۲۳)

ترجمہ: ایک حصہ مسافروں کا ہے جس کے ذریعہ ان کے لیے سواری اور راحت رسانی کا سامان کیا جائے۔

اس کے بعد رقاب (گردن چھڑانا) کا تذکرہ کیا ہے، پھر فی سبیل اللہ کے مصرف کی تفصیل کی ہے، اس سلسلہ میں ان کا رجحان فی سبیل اللہ میں وسعت کی طرف معلوم ہوتا ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں:

وسهم في اصلاح طرق المسلمين. (٢٤)

ترجمہ: ایک حصہ مسلمانوں کے عام اصلاح وترقی کے لیے مخصوص ہونا چاہیے۔

انھوں نے لکھا ہے کہ فقراء ومساکین کا حصہ تو خود اس بستی یا شہر کے مستحقین میں تقسیم کردیا جائے، مگر دوسرے مصارف میں امام وقت کو اختیار ہے، خواہ اسی جگہ صرف کردے یا دوسری جگہ بھیج دے، اسی طرح غنیمت وفی کا جہاں تذکرہ کیا ہے، وہاں قرآن کی تمام آیات کو جمع کرکے بہت سے لطیف نکتے پیدا کئے ہیں، ہم یہاں ان کی پوری عبارت نقل کرتے ہیں، تاکہ ان کی وسعت نظر کا اندازہ کیا جاسکے:

وَاعلَمُوا أَنَّمَا غَنِمتُم مِّن شَیءٍ فَأَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهُ (٢٥)

ترجمہ: جان لو کہ بیشک جو تم مالِ غنیمت حاصل کرو اس میں پانچواں حصہ اللہ اور رسول اور ذوالقربیٰ کا ہے۔

یہ آیت غنیمت نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اس میں ۵/ ا تو ان کا حصہ ہے جن کا ذکر قرآن میں موجود ہے اور ۵/۴ فوج کا ہے اور فوج میں صرف وہی لوگ شامل نہیں ہیں جو باقاعدہ حکومت کے ملازم ہیں یا ان کو حکومت نے مقرر کیا ہو، بلکہ اس میں وہ لوگ بھی حصہ دار ہوں گے جو رضا کارانہ شریک جہاد ہوئے ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک بحث یہ ہے کہ جن لوگوں کے پاس مختلف قسم کی سواریاں ہیں ان میں سے کس کو کتنا حصہ ملنا چاہیے، مثلاً کسی کے پاس اچھے قسم کا گھوڑا ہے، دوسرے کے پاس ذرا گھٹیا قسم کا، اسی طرح دوسری سواریاں ہیں تو کیا ان سب کو برابر حصہ ملے گا، یا سب کو ان کی سواری کی حیثیت کے مطابق ملے گا، بعض لوگ اس میں حیثیت کا لحاظ کرتے ہیں مگر امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی رائے ہے کہ:

ولا يفضل الخيل بعضها علىَ بعض. (٢٦)

ترجمہ: اور بعض گھوڑوں کو بعض پر ترجیح نہیں ہوگی۔

استدلال میں وہ قرآن کی یہ آیت پیش کرتے ہیں:

وَالخَيلَ وَالبِغَالَ وَالحَمِيرَ لِتَركَبُوهَا(۲۷)

دوسری جگہ قرآن میں ہے:

وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا استَطَعتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الخَيلِ تُرهِبُونَ بِهِ عَدوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُم (۲۸)

ترجمہ: اپنی طاقت بھر تیار کرو اسلحہ اور پہلے ہوئے گھوڑوں، تاکہ ان کے ذریعہ رعب ڈال سکو خدا کے اور اپنے دشمنوں پر۔

مقصد یہ ہے کہ ان آیات میں کوئی تخصیص نہیں ہے، بلکہ فائدہ کے لحاظ سے سب کو ایک ہی صف میں رکھا گیا ہے، مزید استدلال کے لیئے وہ عربوں کے استعمالات سے بحث کرتے ہیں:

والعرب تقول هذه الخيل، وفعلت الخيل، ولايعنون بذلك الفرس دون البرذون.(۲۹)

ترجمہ: عرب بولتے ہیں کہ یہ گھوڑے ہیں یا گھوڑوں نے یہ کیا ہے تو اس سے صرف اعلیٰ درجہ کے گھوڑے ہی مراد نہیں لیتے ہیں بلکہ کم تر درجہ کے گھوڑے بھی مراد لیتے ہیں۔

اس استدلال کے بعد اس پر دیگر مسائل کو قیاس کرتے ہیں:

ولايفضل الفرس القوی عَلیَ الفرس الضعيف ولايفضل الرجل الشجاع التام السلاح عَلیَ الرجل الجبان الذی لاسلاح معه إلاسيفه.(۳۰)

ترجمہ: اس سلسلہ میں کسی تندرست گھوڑے کو کمزور پر ترجیح نہیں ہوگی اور نہ کسی بہادر آدمی کو جو اسلحہ سے پورے طور پر لیس ہو اس شخص پر ترجیح ہوگی جس کے پاس ایک تلوار کے علاوہ کچھ نہ ہو۔

ان مثالوں سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ قرآن میں کس قدر غور وخوض کرتے تھے اور اس سے نتائج کے اخذ کرنے میں کتنی وسعتِ نظر سے کام لیتے تھے اور اجتہاد واستنباط میں شریعت کی روح کو کس قدر سمجھنے کی کوشش

کرتے تھے۔

ان کے ان اجتہادات سے دو باتیں خاص طور پر واضح ہوتی ہیں (۱) ایک یہ کہ حکومت کی فوج کے افراد اور وہ مجاہدین جو رضا کارانہ طور پر شریکِ جہاد ہوں دونوں کے ساتھ یکساں معاملہ کیا جائے گا (۲) دوسرے یہ کہ صرف سامان کی فراوانی کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ اصل چیز نیت اور وہ جذبہ ہے جو اسے اس خدمت پر کھینچ کر لایا ہے، ممکن ہے ایک ہوائی جہاز سوار کے دل کے اندر کوئی جذبہ خیر موجود نہ ہو اور ایک خالی ہاتھ مجاہد جو مجاہدین کی معمولی خدمت میں لگایا ہو اس میں طیارہ سوار سے زیادہ جذبہ موجود ہو اس کا اندازہ تو بہر حال لگایا نہیں جاسکتا، اس لیے صرف سامان کی زیادتی کی بنا پر کسی کو زیادہ سے حصہ دینا اور کسی کو کم دینا مناسب نہیں ہے، بلکہ جب باطن کا حال معلوم نہیں ہے تو حکم ظاہری پر ہونا چاہیے، یعنی جو بھی ایک طرح کے کام میں لگا ہوا ہے اس کو برابر حصہ ملنا چاہیے اور پھر جن کی مصلحت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ایک ہی طرح کے کام کرنے والوں کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے، ورنہ معمولی کاموں کو لوگ دلچسپی کے ساتھ انجام نہ دیں گے۔

حدیث و آثار

حدیث و آثار میں ان کی حیثیت امام کی تھی اوپر ذکر آچکا ہے کہ سماعِ حدیث کا اتنا شوق تھا کہ ایک طرف امام صاحب کی مجلس درس میں فقہ کی تحصیل کرتے تھے پھر وہاں سے فرصت پانے کے بعد ان شیوخ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، جن کے یہاں صرف حدیث کا املا و سماع کرایا جاتا تھا، بعض روایتوں میں ہے کہ یہ جس وقت امام صاحب کے درس میں شرکت کے لیے گئے تھے اس وقت ان کا شمار حفاظِ حدیث میں ہوتا تھا، یہ بات تعجب خیز اس لیے نہیں ہے کہ ان کے حافظہ کا حال یہ تھا کہ وہ ایک مجلس میں جتنی حدیثیں سنتے تھے وہ ان کو مع سند زبانی یاد ہو جاتی تھیں (یعنی راویوں کے ساتھ حدیث کا حفظ بہت غیر معمولی بات ہے)۔

ابو معاویہ ایک محدث ہیں، جو بغداد میں درس حدیث دیتے تھے، ان کے پاس مشہور محدث حجاج بن

آرطا کی مرویات کا ذخیرہ بہت تھا، انہوں نے اپنے تلامذہ سے فرمایا کہ امام ابو یوسف کی موجودگی میں میرے پاس آنے کی کیا ضرورت ہے، حجاج کی روایت کا ذخیرہ ان کے پاس ہم سے زیادہ ہے، ان کا حال تو یہ تھا کہ ہم درس حدیث میں جو حدیثیں سنتے تھے، انھیں لکھ لیتے تھے اور ان کو بغیر لکھے ہوئے زبانی یاد ہو جاتی تھیں اور یاد بھی اس صحت کے ساتھ ہو جاتی تھیں کہ ہم اپنی مکتوبہ احادیث کی ان سے صحت کرتے تھے (۳۱)

اسی طرح ہارون اور دوسرے ائمہ حدیث نے بھی ان کے حفظ حدیث کی توثیق کی ہے۔

امام ذہبی رحمہ اللہ نے ان کو حفاظِ حدیث کے چھٹے طبقہ میں شمار کیا ہے، جس میں یحییٰ بن معین، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، عبداللہ بن مبارک، سفیان بن عیینہ رحمہم اللہ وغیرہ ہیں، امام ذہبی رحمہ اللہ نے امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے حالات پر ایک الگ رسالہ لکھا ہے، جو اب احیاء المعارف النعمانیہ، حیدر آباد کی طرف سے شائع ہو گیا ہے۔

امام مزنی رحمہ اللہ سے کسی نے ائمہ عراق کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے امام صاحب کے بارے میں کہا: سید ہم، سب کے سردار، امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے متعلق کہا: اتبعھم للحدیث، ترجمہ ان میں سب سے زیادہ حدیث کی پیروی کرنیوالے۔ (۳۲)

امام محمد کی بابت کہا: سب سے زیادہ مسائل اخذ کرنے والے اور امام زفر رحمہ اللہ کے بارے میں کہا: قیاس میں سب سے زیادہ بہتر

یحییٰ بن معین فرماتے تھے میں نے ائمہ مجتہدین میں ان سے زیادہ ثبوت اور حفظ فی الحدیث اور صحیح روایت کرنے والا نہیں پایا، انہی کا قول ہے کہ امام ابو یوسف، صاحب حدیث اور صاحب سنت تھے، وہ اصحاب حدیث کی طرف مائل تھے۔

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ اوّل جب مجھ کو حدیث کی تحصیل کا خیال پیدا ہوا تو امام ابو یوسف کی خدمت میں گیا (امام احمد بن حنبل کا یہ جملہ بڑا معنی خیز ہے، اس دور میں بیشمار محدثین تھے، مگر حدیث کے

سلسلہ میں منصفانہ مزاج رکھنے والے بہت کم تھے، ایک طرف کچھ لوگ محض روایت پرستی میں مبتلا تھے، دوسری طرف کچھ اس سے بے نیاز ہوگئے تھے) اور ان ہی کا قول ہے کان منصفانی الحدیث، ترجمہ: حدیث میں انصاف پسند تھے۔

علی المدینی فرماتے تھے کہ ابو یوسف صدوق حذ درجہ سچے تھے۔

حدیث و آثار کے بارے میں یحیٰی بن معین، احمد بن حنبل اور ابن المدینی کی رائے بہت قیمتی سمجھی جاتی ہے، ان تینوں بزرگوں کی متفقہ رائے ہے کہ امام ابو یوسف حدیث میں غیر معمولی مہارت رکھتے تھے، لیکن اگر ان ائمہ میں کسی کی رائے ہم کو نہ بھی معلوم ہوتی تب بھی حدیث و آثار میں ان کا جو کارنامہ اور ان کی جو قلمی یادگاریں ہیں وہ خود حدیث میں ان کی مہارت اور غیر معمولی درک کا پتہ دیتی ہیں، حدیث و آثار کے سلسلہ میں ان کی دو کتابیں ہیں ایک کتاب الآثار جس کے راوی ان کے صاجزادے یوسف ہیں، دوسری کتاب الخراج جس کو خود انہوں نے مرتب کیا ہے، کتاب الآثار میں احادیث و آثار کی تعداد ایک ہزار سے زائد ہے، کتاب الخراج کا موضوع گو خالص فقہی ہے، مگر اس میں مشکل سے کوئی مسئلہ ایسا ہوگا جس کے لیے قرآن یا حدیث یا آثار نبوی یا آثار صحابہ سے دلیل نہ لائی گئی ہو۔

امام ابو یوسف کے زمانہ میں عام طور پر درس کا طریقہ یہ تھا کہ شیوخ حدیث اپنے تلامذہ کو حدیث کا املا کرادیتے تھے اور ائمہ فقہ صرف فقہ کا درس دیدیتے تھے، لیکن امام ابو یوسف کے درس کی یہ خاص خصوصیت تھی کہ وہ دونوں کا مجمع البحرین ہوتا تھا وہ درس میں نہ تو صرف اخبرنا وحدثنا ہی پر اکتفا کرتے تھے اور نہ قال اقول ہی پر بلکہ اگر ایک حدیث سناتے تھے تو اسی کے ساتھ اس سے اخذ کیے ہوئے نتائج و مجتہدات کو بھی طلبہ کے سامنے رکھتے جاتے تھے۔

علی مدینی فرماتے ہیں کہ جب امام ابو یوسف رحمہ اللہ سنہ ۱۸۰ھ میں بصرہ آئے تو ہم لوگ ان کی خدمت میں استفادہ کے لیے پہنچے ان کا طریقہ درس یہ تھا کہ اگر وہ دس حدیثیں بیان کرتے تو دس فقہی رائیں

بھی ان کے ساتھ پیش کرتے تھے۔(۳۳)

حدیث صرف اس کا نام نہیں ہے کہ جو روایت اپنے شیخ سے سنی اس کو طلبہ کے سامنے رکھ دیا یا املا کرادیا بلکہ اس کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ اس سے مسائل اخذ کئے جائیں اس سے اجتہاد واستنباط کیا جائے، تاکہ احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے زندگی کے ہمہ گیر نظام کے لیے زائد سے زائد روشنی حاصل کی جاسکے، چنانچہ حدیث کے سلسلہ میں انہوں نے بھی دونوں طرح کی خدمتیں انجام دیں، مگر ان کا اصلی کارنامہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استخراج مسائل ہے، اعمش مشہور امام حدیث (اِن کے شیوخ میں ہیں) نے ایک مرتبہ امام ابو یوسف سے کوئی مسئلہ پوچھا: جواب سن کر فرمایا: کہ یہ کہاں سے اخذ کیا؟ کہا کہ فلاں حدیث سے اعمش نے ہنس کر کہا کہ یہ حدیث مجھ کو اس وقت سے یاد ہے، جب تمہارے والد کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی، مگر میں اس سے یہ مسئلہ مستنبط نہ کرسکا تھا۔

خراج کے موضوع پر خود ان کے زمانہ میں اور اس کے بعد بھی بہت سی کتابیں لکھی گئیں، مگر سب کی سب بغیر استثنا نقل وروایت کا مجموعہ ہیں، اجتہاد واستنباط کی کوئی علامت ان میں نہیں پائی جاتی، یہاں صرف ان کا ایک قول نقل کردیا جاتا ہے، فرماتے تھے کہ بارِالٰہا! میں نے کتاب اللہ سے اس کے بعد سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ مسائل کیا ہے، لیکن جہاں مجھے سنتِ نبوی نہیں ملی، وہاں میں نے امام صاحب کے قول پر عمل کیا۔

مختصر طور سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ امام ابو یوسف، امام صاحب کے اصحاب میں سب سے زیادہ حدیث والے تھے، لیکن ان کا یہ اصول تھا کہ وہ تحدیث روایت کو بغیر روایت کے صحیح نہیں سمجھتے تھے، فرماتے تھے کہ جو محض کثرتِ روایت کے ساتھ جو حدیث طلب کریگا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کچھ نہ کچھ ضرور جھوٹی تہمت لگادے گا ان کا دوسرا بیان ہے کہ جو مشہور ومعروف احادیث کو چھوڑ کر شواذہ کے پیچھے دوڑے گا وہ آپ پر جھوٹ باندھے گا۔(۳۴)

فقہ

ان کے علم وفضل کا سب سے وسیع میدان یہی ہے کہ اس میں انہوں نے تمام علوم سے زیادہ اپنی جودت طبع اور جولانی فکر کا ثبوت دیا ہے اور فقیہ ہی کی حیثیت سے دنیا ان کو جانتی ہے، امام صاحب ان کو افقہ اصحابی (میرے اصحاب میں سب سے زیادہ فقیہ) فرماتے تھے، علی بن صالح ان کو افقہ الفقہاء اور سید الفقہاء کہتے تھے، یحییٰ بن معین فرماتے تھے: افقہم، اہلِ عراق میں سب سے زیادہ افقہ تھے، فقہ میں ان کی متعدد یادگاریں ہیں، جن کا تذکرہ آگے آئے گا، ان کی صرف ایک کتاب اختلاف ابن ابی لیلیٰ وابی حنیفہ ان کے تفقہ کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔

ان کا دوسرا بڑا کارنامہ اصولِ فقہ کی تدوین ہے، باقاعدہ (باقاعدہ کی قید اس لیے لگائی گئی ہے کہ یہ فن امام ابو یوسف کا ایجاد کردہ نہیں ہے، بلکہ قرآن وسنت کے کلیات کو سامنے رکھ کر صحابہ اور تابعین نے بہت سے مسائل مستنبط کئے تھے، انہی اصول وکلیات اور صحابہ کے مستنبط مسائل کی روشنی میں انہوں نے اصولِ فقہ مرتب کیا، امام ابو یوسف سے پہلے اس موضوع پر ایک کتاب خود امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے بھی لکھی تھی، جو کتاب الرائے کے نام سے مشہور ہے) اصولِ فقہ کی تدوین اس سے پہلے نہیں ہوئی تھی، امام ابو یوسف پہلے شخص تھے، جنہوں نے اس فن کو باقاعدہ مدون کیا، افسوس ہے کہ یہ کتاب ناپید ہے، تذکروں میں صرف اس کا تذکرہ ملتا ہے، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں بھی منقول ہے کہ وہ اصولِ فقہ کے سب سے پہلے مولف ہیں، یہ دونوں باتیں اپنی جگہ پر صحیح ہیں، اس لیے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فقہ کی طرح اصولِ فقہ کی بھی تجدید کی اور ان کی تجدید صرف فروع تک نہیں بلکہ اصول میں بھی تھی، اس لحاظ سے ان کو اس فن کا پہلا مولف قرار دے سکتے ہیں، مگر حقیقتاً تقدم، امام صاحب اور ان کے تلامذہ ہی کو حاصل ہے، فقہ حنفی کی جس کتاب کو بھی اٹھا کر دیکھئے اس میں امام ابو یوسف کے اقوال، مجتہدات اور استنباطات ملیں گے، لیکن پھر بھی ان کا فقہی کارنامہ امام محمد کے مقابلہ میں کم ہے، گو امام محمد کی کتابیں ان سے استفادہ کی بہت زیادہ مرہونِ منت ہیں۔

فرائض

فرائض یعنی وہ فن جس میں وصیت اور وراثت کی تقسیم کے مسائل بیان کیے جاتے ہیں، یہ فقہ ہی کا ایک شعبہ ہے، مگر اہمیت کے لحاظ سے یہ مستقل ایک فن ہوگیا ہے، اس فن کے لیے سب سے زیادہ ضرورت حساب ذاتی کی ہے، امام صاحب کے تلامذہ میں امام ابو یوسف اور امام محمد دونوں اس حیثیت سے ممتاز تھے، امام ابو یوسف فرماتے تھے کہ میں نے فرائض کے مسائل ایک مجلس میں امام صاحب سے سیکھ لیے تھے، امام ابو یوسف اس سے صرف واقف ہی نہیں تھے، بلکہ اس میں مجتہدانہ نظر رکھتے تھے، صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین میں اس فن کے جاننے والے متعدد حضرات تھے، مگر ان میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ خاص طور پر ممتاز تھے، چنانچہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ اس میں اکثر انہی کا اتباع کرتے تھے، کہتے تھے کہ جہاں ان دونوں بزرگوں میں اختلاف ہوجاتا ہے وہاں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے کو ترجیح دیتا ہوں (۳۵)

اس کی وجہ یہ بیان کرتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت زید رضی اللہ عنہ سے زیادہ قوتِ فیصلہ رکھتے تھے، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا ہے کہ اقضا کم علی، تم میں سب سے اچھا فیصلہ کرنے والے علی ہیں، ان علوم کے علاوہ دوسرے دینی علوم جو قرآن وسنت کے لیے ذریعہ کی حیثیت رکھتے ہیں مثلاً تاریخ، سیرت، ادب ونحو اور ایام عرب وغیرہ سے بھی واقف تھے، اسی بنا پر امام صاحب فرماتے تھے کہ میرے اصحاب میں یہ سب سے زیادہ جامع العلم ہیں ان کی مہارت کا اندازہ ان کی کتابوں سے ہوتا ہے، خصوصیت سے کتاب الخراج میں اس کی مثالیں بکثرت ملیں گی۔ (۳۶)

اوپر ذکر آچکا ہے کہ سیرت ومغازی میں انہوں نے محمد بن اسحاق سے استفادہ کیا تھا، جو اس وقت اُس فن کے امام تھے، عربی ادب ولغت کا بصرہ کے بعد دوسرا مرکز کوفہ کا تھا وہی ان کا مولد ہے، پھر امام ابو یوسف خالص عرب النسل تھے، اس لیے ان علوم کی تحصیل کی ان کو قطعاً ضرورت نہیں تھی، اسی طرح نحو یعنی قواعد عرب

کے سیکھنے کی بھی ضرورت ان کو نہیں تھی، مگر پھر بھی وہ ایک فن بن گیا تھا، اس لیے اس کو بقدرِ ضرورت حاصل کیا، خود فرماتے ہیں کہ میں نے ایک ماہر نحوی سے نحو کے مسائل کو ایک مجلس میں حاصل کرلیا، ممکن ہے اس سے مراد کسائی یا سیبویہ ہوں۔

علم تاریخ سے ان کی واقفیت کا اندازہ لگانے کے لیے ان کی کتاب الخراج کا مطالعہ کافی ہے، ان کا طریقہ یہ ہے کہ جو باتیں تاریخ سے متعلق ہوتی ہیں ان کی مختصر تاریخی حیثیت واضح کرنے کے بعد پھر شرعی حیثیت بیان کرتے ہیں، مثلاً اہلِ سواد کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے خراسان، مصر، افریقہ اور سندھ وغیرہ پر بڑی جامع گفتگو کی ہے، پھر اسی طرح جزیہ کے بیان کے سلسلہ میں بعض مقامات اور قبائل کی تاریخی حیثیت واضح کی ہے، اگر کسی جگہ کے بارے میں ان کو خود علم نہ ہوتا تھا تو وہ جاننے والوں سے دریافت کر کے لکھتے تھے، چنانچہ جب ہارون نے ان سے اہلِ شام اور اہلِ جزیرہ کے بارے میں دریافت کیا تو امام ابو یوسف کو چونکہ ان کی تاریخی حیثیت معلوم نہیں تھی، اس لیے انہوں نے حیرہ کے کسی صاحب نظر واقف کار کو لکھا، چنانچہ ان کا جو جواب آیا، امام ابو یوسف نے اسی کو کتاب میں نقل کر دیا، اس کے چند ابتدائی الفاظ یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

جزیرہ قبل اسلام دو حصوں میں منقسم تھا، ایک رومی عیسائیوں کے قبضہ میں تھا، دوسرا ایرانیوں کے اور ان میں سے ہر ایک حکومت اپنی فوج رکھتی تھی اور محصل مقرر کرتی تھی، راس العین سے فرات تک کا علاقہ حکومتِ روم کے قبضہ میں تھا اور نصیبین اور اس کی پشت کا علاقہ دجلہ تک حکومت ایران کے ماتحت تھا، اسی طرح سیل ماردین اور دارا سے سنجار تک کا حصہ اہلِ فارس کا مقبوضہ تھا اور جبل ماردین ودارا و طور وعبدین اہلِ روم کا، اِن حکومتوں کی سرحدوں پر ایک سرحدی چوکی کے طور پر ایک قلعہ تھا، جو حصن سرجا کے نام سے مشہور تھا، قبل از اسلام کی تاریخ بیان کرنے کے بعد اسلام کے بعد کی تاریخ بیان کی ہے، خط دو تین صفحہ کا ہے، مگر اس میں پچاسوں صفحے کے مضمون کو انہوں نے سمیٹ لیا ہے۔

بہرنوع امام ابو یوسف کے اندر وہ تمام صلاحیتیں اور علم وفضل کی وہ تمام لیاقتیں موجود تھیں جو ایک مجتہد کے لیے ضروری ہیں، اب ہم ان کے اجتہاد و استنباط پر مفصل بحث کرتے ہیں۔

اجتہاد واستنباط

عموماً مجتہدین کی دو قسم مانی جاتی ہے، ایک مجتہد مطلق غیر منتسب (اگر مجتہد مطلق غیر منتسب کا مطلب یہ ہے کہ ان کا اجتہاد کسی کے فیض ترتیب کا امر ہوں منسب بھی ہے تو پھر اسی لحاظ سے مجتہد مطلق غیر منتسب تو سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا، مجتہد مطلق منتسب کی تعریف میں ائمہ اربعہ داخل ہوسکتے ہیں، مگر عام طور پر ائمہ اربعہ کو پہلی قسم میں شمار کیا گیا ہے، حالانکہ ان ائمہ میں سے ہر ایک کسی نہ کسی صحابی یا تابعی کی طرف منتسب ہے) دوسرے مجتہد منتسب مطلق یا مجتہد مطلق مقید بمذہب، متاخرین علمائے احناف کی کتابوں میں ائمہ مجتہدین اور اصحاب فتاویٰ کے درجات کی جو تقسیم کی گئی ہے اس میں یہ کہا گیا ہے کہ امام ابو یوسف امام محمد وغیرہ مجتہد مطلق نہیں، بلکہ مجتہد فی المذہب تھے، مجتہد مطلق سے مراد یہ ہے کہ جن لوگوں نے کتاب وسنت سے براہِ راست اجتہاد کے اصول مرتب کیے اور اس سے تفریع مسائل کی، جیسے ائمہ اربعہ تھے، مجتہد فی المذہب یا مجتہد منتسب ان کو کہتے ہیں کہ جنہوں نے ان ائمہ کے مرتب کردہ اصول کی روشنی مسائل کی تخریج کی، جیسے امام ابو یوسف رحمہ اللہ، امام محمد اور دوسرے ائمہ کے مشہور تلامذہ، بعض فقہ وتذکرہ کی کتابوں میں یہ بھی درج ہے کہ صاحبین فرماتے تھے کہ ہم نے امام صاحب سے جہاں اختلاف کیا ہے اور ان کے قول کو مرجوع قرار دیا ہے، وہ بھی امام صاحب ہی کا قدیم قول تھا، جسے انہوں نے مرجوح سمجھ کر ترک کر دیا تھا، اِسی طرح کے اور بھی اقوال منقول ہیں، جن سے ان کا مجتہد مقید بہ مذہب ہونا معلوم ہوتا ہے، مگر یہ کہنا بڑا ظلم ہے کہ صاحبین امام صاحب کے مقلد محض تھے، حالانکہ وہ خود امام اور مجتہد مطلق تھے، یہ ان کی احسان شناسی ہے کہ انہوں نے اپنی ذات کو اپنے اساتذہ سے بے نیاز کر کے دنیا کے سامنے پیش نہیں کیا، حالانکہ وہ کر سکتے تھے، پھر امام ابو یوسف کو اور امام محمد کو اجتہاد واستنباط میں ائمہ ثلاثہ امام

مالک، امام شافعی اور امام احمد سے گھٹانا اور کم رتبہ قرار دینا بھی بڑی زیادتی ہے، جب کہ خود ان ائمہ اور ان کے مشہور تلامذہ نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ یہ لوگ اجتہاد و استنباط میں ان سے کسی طرح کم نہ تھے، ہم پہلے مختصراً اجتہاد و استنباط کی تعریف اس کے اصول و شرائط پر بحث کرتے ہیں، تاکہ اندازہ ہو جائے کہ یہ ائمہ فقہ خصوصیت سے امام ابو یوسف مجتہد مطلق تھے یا مجتہد منتسب، اجتہاد کی تعریف علماء نے یہ کی ہے:

هو استفراغ المجهود فی استنباط الحکم الفرعی عن دلیله.

ترجمہ: اصل سے کسی فروعی سلسلہ کے استنباط میں اپنی وسعت بھر کوشش کرنے کا نام اجتہاد ہے۔

اجتہاد کے اصول و شرائط کیا ہونے چاہیں، اس میں مختلف رائیں ہیں، جو چیزیں سب میں مشترک ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) کتاب اللہ کا عالم ہو، یعنی قرآن کے لغوی اور شرعی معانی سے واقف ہو، اس کے طرزِ کلام کو جانتا ہو، افراد و ترکیب اور ناسخ و منسوخ پر اس کی نظر ہو۔

(۲) سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اسے درک ہو، یعنی روایات کی سند اور ان کی متون سے واقف ہو، بعض لوگوں نے قرآن کی آیات اور احادیث کی تعداد پر بھی بحث کی ہے، یعنی یہ کہ مجتہد کے لیے کتنی آیتوں اور حدیثوں میں بصیرت پیدا کرنا ضروری ہے، مگر یہ بحث فضول ہے، مجتہد کے لیے پورے قرآن اور احادیث کے تمام متداول ذخیروں پر نظر رکھنی ضروری ہے۔

(۳) اجماع کے موارد اور مواقع سے واقف ہو۔

(۴) قیاس کے شرعی طریقوں سے واقف ہو۔

ان شرائط کو سامنے رکھیے اور پھر امام ابو یوسف کے علم و فضل اور کتاب و سنت آثار صحابہ اور تعدیل صحابہ سے ان کی واقفیت کا جو ذکر اوپر کیا گیا ہے، اس پر ایک نظر ڈالیے اور دیکھئے کہ کیا ان کے مجتہد مطلق قرار دینے کے لیے وہ کافی نہیں ہے، پھر امام صاحب کا طریقہ درس اس قدر مجتہدانہ ہوتا تھا کہ اس میں موارد اجماع

اور وجوہ قیاس کی ہر روز مشق ہوتی تھی، اوپر امام صاحب کے طریقہ درس کا مختصراً تذکرہ آچکا ہے، اس سلسلہ میں چند اور باتیں پیش کی جاتی ہیں:

امام صاحب کے سامنے جب کوئی نیا مسئلہ پیش ہوتا وہ اپنے ممتاز تلامذہ سے پوچھتے کہ تم لوگوں کے پاس اس بارے میں کوئی حدیث نبوی یا اثر صحابہ موجود ہے، تلامذہ اپنی اپنی معلومات کے بقدر آثار واحادیث پیش کرتے اس کے بعد امام صاحب کو جو معلومات ہوتیں وہ سب کے سامنے رکھتے، پھر وہ اس میں غور کرتے، اگر آثار مختلف ہوتے تو جس قول کی تائید میں نقلی دلائل ان کو زیادہ ملجاتے تو اسی کے مطابق فیصلہ کر دیتے، اگر آثار تقریباً برابر ہوتے تو پھر غور وخوص کر کے کوئی رائے قائم کرتے، ظاہر ہے کہ یہ مشق وتمرین اسی لیے تو کرائی جاتی تھی کہ ان میں شانِ اجتہاد پیدا ہو، اسی بنا پر امام صاحب کے مسلک کو شورائی مسلک کہا جاتا ہے، کردری کا بیان ہے:

مذهبه شوریٰ بينهم ولم يستبد فيه بنفسه دونهم اجتهادا منه في الدين.

ترجمہ: ان کا مسلک شورائی تھا، یعنی وہ اپنے تلامذہ سے ہر مسئلہ میں مشورہ کرتے تھے اور کسی دینی مسئلہ ہی اجتہاد کرتے وقت وہ نہ تو خود رائی سے کام لیتے تھے اور نہ اپنی رائے کو تلامذہ پر تھوپتے تھے۔

پھر ان کے طریقہ درس کے بارے میں لکھتے تھے:

فكان يطرح مسئله مسئله لهم ثم يسئال مَاعندهم ويقول ماعنده وهم يناظرهم في كل مسئله شهرا اوكثر وياتي بدلائل ثم يثبتها الامام ابويوسف في الاصول.(۳۷)

ترجمہ: وہ ایک ایک مسئلہ کو باری باری تلامذہ کے سامنے رکھتے تھے، پھر اس کے بارے میں ان سے سوال کرتے تھے اور اس بارے میں ان کی رائے اور دلائل سننے کے بعد اپنی رائے اور اپنی دلیل پیش کرتے تھے اور پھر ان سے مباحثہ کرتے تھے، یہاں تک کہ ایک ایک مسئلہ میں بحث ومباحثہ کرتے ایک مہینہ یا اس سے بھی زیادہ دن لگ جاتے تھے، پھر اسکے بعد امام ابو یوسف اس مسئلہ کو اصولِ مذہب میں داخل کر لیتے تھے۔

اور نہ صرف ان کا طریقہ درس ہی ایسا تھا کہ اس سے اجتہاد و استنباط کی صلاحیت پیدا ہو جاتی تھی، بلکہ تلامذہ کو یہ عام ہدایت تھی کہ:

لایحل لاحد ان یقول بقولی مالم یعلم من این قلت.(۳۸)

ترجمہ: کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ میری کسی رائے کے مطابق کوئی فتویٰ دے جب تک کہ اس کو یہ نہ معلوم ہو جائے کہ میں نے یہ رائے کسی دلیل کی بنا پر قائم کی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ امام صاحب کے جن مجتہدات کو ان کے تلامذہ نے اپنی تحقیق میں کتاب وسنت کے مطابق نہیں پایا ان سے اختلاف کیا اور ان کے مقابلہ میں اپنے مجتہدات پیش کیے اور یہ اختلاف صرف دو چار مسائل میں نہیں ہے بلکہ بعض فقہاء کے قول کے مطابق امام صاحب سے دو ثلث مسائل میں صرف صاحبین یعنی امام ابو یوسف اور امام محمد نے اختلاف کیا ہے، امام زفر کے اختلافات اس کے علاوہ ہیں، ان تصریحات سے آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ مجتہد مطلق تھے یا مجتہد فی المذہب؟۔

عام فقہائے احناف نے اجتہاد و استنباط کے لحاظ سے مجتہدین کے درجات کی جو تقسیم کی ہے، اس موقع پر اس کو مختصراً پیش کرنے کے بعد اس کی تردید میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا پیش کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مجتہدین کے درجات کی تفصیل ابن حجر مکی نے شن الغارہ میں جو کی ہے اسی کو شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ اور مولانا عبدالحئی صاحب رحمہ اللہ وغیرہ نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے، ابن کمال بارہویں صدی کے مشہور علمائے دولت عثمانیہ میں گذرے ہیں، انہوں نے مجتہدین اور فقہائے کے طبقات پر ایک رسالہ لکھا، متاخرین فقہاء نے عام طور پر اسی کو اختیار کیا ہے۔

اسی طرح انہوں نے سات درجات میں تمام فقہائے احناف کو تقسیم کیا ہے، ابن کمال کے اس رسالہ کا بیشتر حصہ قابل تقلید ہے، چنانچہ خدا جزائے خیر دے علامہ مرجانی متوفی سنہ ۱۳۰۶ھ کو کہ انہوں نے بڑی

تفصیل سے اس پر بحث کی ہے، اس کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔ ابنِ کمال کا پورا رسالہ نقل کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں:

هذاماذكره وقداورده التيمي في طبقاته بحروفه ثم قال وهوتقسيم حسن جداواقول بل هوبعيد عن الصحة بمراحل فضلاً عن حسنه جدا فانه تحكمات بارادة وخيالات فارعة وكلمات لاروح لها والفاظ غير محصلة المعنى...... فليت شعري مامعنى قوله ان ابايوسف ومحمداوزفر وان خالفوا اباحنيفة في الاحكام لكنهم يقلدونه في قواعد الاصول ماالذي يريد من الاصول؟ فان ارادمنه الاحكام الاجمالي التي يبحث عنها في كتب اصول الفقه فهي قواعد عقيل وضوابط برهاني يعرفها المرء من حيث انه ذوعقل وصاحب فكرونظر سواء كان مجتهدا ولاتعلق لها بالاجتهاد قط وشان الائمة الثلاث ارفع واجل وحالهم في الفقه ان لم يكن ارفع من مالك والشافعي وامثالهما فليسوا بدونهما وجرىٰ مجرى الامثال قولهم (ابوحنيفة ابويوسف) بمعنى ان البالغ الى درجة القصوىٰ في الفقاهة هوابويوسف وقولهم (ابويوسف ابوحنيفة) بمعنى ان ابايوسف بلغ الدرج القصوىٰ من الفقاهة.

ترجمہ: ابن کمال نے جو کچھ لکھا ہے اس کا یہ خلاص ہے، اس تقسیم کو تیمی نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے اور اس کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ بہترین تقسیم ہے، لیکن میں کہتا ہوں کہ صحت اور حقیقت سے اس کو انتہائی بعد ہے، اسی تقسیم میں بے دلیل دعوے، بے کار خیالات آرائی، بے روح اور بے مغز باتیں ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے اس قول کے کیا معنی ہیں کہ امام ابو یوسف، امام محمد اور امام زفر نے اگر چہ بعض احکام میں امام ابوحنیفہ کی مخالفت کی ہے مگر اصولی باتوں میں ان کی تقلید کرتے ہیں، اصول سے ان کی کیا مراد ہے؟ اگر اس سے مراد وہ اجمالی احکام ہیں جن سے اصول فقہ میں بحث کی جاتی ہے تو یہ قواعد تو عقل اور دلائل کی مدد سے

مرتب کئے گئے ہیں جن کو ہر صاحب عقل اور صاحب فکر و نظر جانتا ہے خواہ وہ مجتہد ہو یا غیر مجتہد، اجتہاد سے اس کا قطعی تعلق نہیں ہے اور ان ائمہ ثلاثہ کی شان بہر حال اس سے بلند ہے کہ ان کو اس درجہ میں رکھا جائے، حالانکہ فقہ و اجتہاد میں امام ابو یوسف اور امام محمد وغیرہ کا مرتبہ امام مالک اور امام شافعی سے بلند نہیں ہے تو ان سے کم تر بھی نہیں ہے اور یہ بات تو ضرب المثل بن گئی ہے کہ ابوحنیفہ تو ابو یوسف ہیں یعنی فقاہت میں امام ابو یوسف، امام صاحب کے رتبہ تک پہنچ گئے ہیں اور بعض لوگوں کا یہ قول بھی ہے کہ ابو یوسف، ابوحنیفہ ہیں یعنی مرتبہ اجتہاد میں، امام صاحب اور ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اس کے بعد انہوں نے تمام ممتاز فقہاء اور ائمہ کے وہ اقوال نقل کئے ہیں جن سے ان کے مجتہد مطلق ہونے کا ثبوت ملتا ہے، پھر لکھتے ہیں:

وكفى بذالك شهادة له ولكل واحد منهم اصول مختص به تفردوا بها عن ابى حنيفة وخالفوا فيها ومن ذٰلك ان الاصل فى تخفيف النجاس تعارض الادلة عندهما عندابى حنيفة رحمه الله واختلاف الائمة.

ترجمہ: ان ائمہ کی یہ شہادتیں ان کے مجتہد مطلق ہونے کے لی کافی ہیں، ان میں سے ہر ایک کے کچھ مخصوص اصول تھے جن میں انہوں نے امام صاحب سے تفرد اخیار کیا تھا اور ان ہی میں ان سے اختلاف کرتے تھے، انہی اصول میں سے ایک یہ ہے کہ تخفیف نجاست میں اصول یہ ہے کہ اس کے دلائل میں تعارض ہے اور صاحبین کے نزدیک ائمہ کے اختلاف کی وجہ سے اس میں تخفیف سے کام لیا گیا ہے۔

اس کے بعد یہ امام غزالی اور امام الحرمین کے اقوال نقل کرتے ہیں:

قال الغزالى انهما خالفا اباحنيفة فى ثلثى مذهبه ونقل النووى فى كتابه تهذيب الاسماء واللغات عن ابى المعالى الجوينى ان كل مااختار المزنى ارى انه تخريج ملتحق بالمذهب فانه لايخالف اقوال الشافعى لاكابى يوسف ومحمد فانهما يخالفان اصول

صاحبهما.

ترجمہ: امام غزالی نے لکھا ہے کہ صاحبین نے دو تہائی مسائل میں امام صاحب سے اختلاف کیا ہے اور امام نووی نے تہذیب الاسماء میں امام جوینی سے نقل کیا ہے کہ امام مزنی نے جن مسائل کو ترجیح دی ہے وہ امام شافعی کے کسی قول ہی سے ماخوذ ہے، کیونکہ وہ امام شافعی کے اقوال کی اس طرح مخالفت نہیں کرتے جس طرح امام ابو یوسف اور امام محمد، امام ابوحنیفہ سے اصول و فروع میں اختلاف کرتے ہیں۔

پھر انہوں نے امام ابوجعفر طبری کی یہ رائے نقل کی ہے کہ وہ امام احمد بن حنبل کو مجتہدین میں شمار نہیں کرتے تھے، بلکہ ان کو وہ صرف حفاظِ حدیث میں شمار کرتے تھے، اسی طرح ابنِ خلدون نے لکھا ہے کہ:

فأما حمد بن حنبل، فمقلدوه قليل لبعد مذهبه عن الاجتاد.(۳۹)

ترجمہ: اور امام احمد بن حنبل تو ان کے مقلدین اس لیے بہت کم ہیں ان کے مسلک میں اجتہادی خصوصیت کم ہے۔

حدیث میں سب سے پہلے امام احمد نے ابو یوسف سے استفادہ کیا، کسی نے فقہی مسائل کے بارے میں پوچھا کہ یہ مسائل آپ نے کہاں سے معلوم کیے تو انہوں نے فرمایا کہ امام محمد کی کتابوں سے، انہوں نے یہ نہیں کہا کہ فقہی مسائل میں انہوں نے خود اجتہاد کیا ہے۔

تو امام احمد کو مجتہدین مطلق میں شمار کیا جائے اور امام ابو یوسف اور امام محمد جن کے اجتہادات سے امام احمد نے استفادہ کیا ہو ان کو مقلد قرار دیا جائے یہ ایک طرح کا ظلم ہے، اس کے بعد انہوں نے اجتہاد کے مآخذ و شرائط یعنی کتاب و سنت، اجماع، قیاس اور آثار صحابہ پر بحث کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ ان میں سے کسی چیز میں بھی وہ امام صاحب کے مقلد نہیں تھے، بلکہ وہ براہِ راست ان مآخذ سے استنباط مسائل کرتے ہیں، یہ اتنی مفصل بحث ہے کہ اس کے بعد کسی اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، اب ہم ان کی کتابوں سے چند ایسے مسائل کا جو ان کے اور امام صاحب کے درمیان مختلف فیہ ہیں تذکرہ کرتے ہیں، جن سے اندازہ ہوگا کہ وہ

محض فروع میں نہیں بلکہ اصول میں بھی مخالفت کرتے ہیں، اس وقت امام ابو یوسف کی تین کتابیں ہمارے پیشِ نظر ہیں، کتاب الآثار، کتاب الخراج اور اختلاف ابی الیلی وابی حنیفہ، ان ہی سے انتخاب کر کے چند مسائل کا ذکر کیا جاتا ہے:

(۱) دریا سے اگر زیورات اور بڑی مچھلیاں برآمد ہوں تو ان کا خمس لیا جائیگا یا نہیں؟ اس بارے میں ان ائمہ کی رائیں ملاحظہ ہوں، امام صاحب کی رائے ہے کہ اس میں خمس نہیں لیا جائے گا اور اس کی اصولی دلیل یہ ہے کہ جس طرح چھوٹی مچھلیوں پر کوئی ٹیکس نہیں لیا جاتا، اس میں بھی نہیں لیا جائے گا، امام ابو یوسف نے ان سے اختلاف کیا ہے، ان کی رائے ہے کہ ۱/۵ تو حکومت لے گی اور ۴/۵ اس شخص کا حصہ ہے، جس نے ان کو نکالا ہے، امام صاحب سے ان کا اختلاف اس اصول پر ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایسا ہی کیا ہے، ظاہر ہے کہ یہ اختلاف فروعی نہیں، بالکل اصولی ہے وہ یہ ہے کہ دریا کے حاصلات میں حکومت کو ٹیکس لینے کا حق ہے یا نہیں اور ہے تو کس حد تک اور نہیں ہے تو کس حد تک۔

(۲) حدود کے سلسلہ میں بحث ہے کہ مشرکین جو دارالاسلام میں موجود ہوں ان پر حدود جاری کیے جائیں گے یا نہیں؟ امام صاحب کی رائے ہے کہ اہلِ شرک پر حدود جاری نہیں کیے جائیں گے، امام ابو یوسف کی رائے ہے کہ ان پر بھی حدود جاری کیئے جائیں گے، سرخسی نے مبسوط میں تفصیل سے اس مسئلہ پر بحث کی ہے اور دونوں کے اصولی دلائل نقل کیے ہیں، اس مسئلہ میں امام محمد کی رائے دونوں بزرگوں سے مختلف ہے، کیا یہ اختلاف صرف فروع کا ہے یا اصول کا؟ ہم زیادہ تفصیل میں جانا نہیں چاہتے، اگر ان ائمہ کے اصولی اور فروعی اختلافات دیکھنا ہوں تو اختلاف ابی لیلی وابی حنیفہ کا مطالعہ کر لینا چاہیے، اس بحث کو صرف اس لیے طول دیا گیا ہے، تا کہ یہ واضح طور پر دکھایا جائے کہ امام صاحب کے کم از کم تین تلامذہ کے بارے میں یہ کہنا کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ وہ مجتہد مطلق نہیں تھے یا اپنے اجتہاد میں وہ ان اصولوں کے پابند تھے، جو امام صاحب نے مقرر کر دیئے ہیں، جیسا کہ علامہ مرجانی نے لکھا ہے کہ یہ تو معلوم نہیں کہ وہ اصول ہیں کیا جن سے یہ ائمہ

باہر نہیں گئے، اگر ان سے مراد وہ چار اصول کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اجماع اور قیاس ہیں تو پھر اس حیثیت سے تو امام صاحب بھی مجتہد مطلق نہیں ہیں کہ وہ خود اہلِ عراق کے متبع ہیں، پھر یہ بھی ایک بڑی زیادتی ہے کہ بعض ان بزرگوں کو جن میں اجتہاد و استنباط کی اتنی بھی صلاحیت نہیں تھی، جتنی کہ ان بزرگوں میں تھی ان کو تو مستقل مجتہد تسلیم کیا جائے اور صاحبین کو مقلد فی الاجتہاد کا رتبہ دیا جائے۔

علم کلام

امام ابو یوسف کے زمانہ میں علم کلام کے مسائل کا چرچا اور اس میں بحث و مباحثہ ایک عام چیز بن گئی تھی، اس بحث سے نہ تو خلفاء و امراء کے دربار خالی تھے نہ فقہا و محدثین کی مجالس درس اور نہ عوام اور بازاری لوگوں کے حلقے، خصوصیت سے ایمان کی کمی و زیادتی، قرآن کے مخلوق و غیر مخلوق کے مباحث کا تقریباً ذکر ہر مجلس اور ہر گھر میں تھا، یہی مسائل اس وقت کی ثقاہت و عدم ثقاہت، اس سے بھی بڑھ کر فسق و فجور، صلاح و تقویٰ بلکہ ایمان و کفر کا معیار بنے ہوئے تھے، جس نے کسی گروہ کے خیالات سے اختلاف کیا جھٹ دوسرے فریق نے اس کو زندیق، فاسق بلکہ کافر تک بنا دیا۔

فقہاء و محدثین میں جو حضرات محتاط تھے، انہوں نے ہمیشہ ان مسائل پر گفتگو کرنے اور ان پر رائے دینے سے احتراز کیا اور اپنی حد تک دوسروں کو بھی وہ اس سے روکتے رہے، مگر پھر بھی بسا اوقات انہیں اپنی رائے ظاہر ہی کرنی پڑتی تھی اب وہ رائے جن لوگوں کے خلاف پڑتی تھی وہ ان کو مطعون کرتے تھے اور ان کے اثر سے بعض اوقات ہمارے فقہاء محدثین بھی اس شخص کے بارے میں رائے قائم کر لیتے تھے اور اس کو مطعون کرتے تھے، اسی اثر سے بعض خلفاء نے بڑے بڑے ائمہ سے وہ سلوک کیا، جو ایک معمولی آدمی کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا، امام احمد اسی طرح کے ابتلاء میں پڑے تھے، مثال کے طور پر ارجاء کے مسئلہ کو لیجئے یعنی یہ کہ آدمی کی نجات کے لیے عمل ضروری نہیں ہے، بلکہ اس کا ایمان کافی ہے، یہ مسئلہ اس خیال کا ردعمل ہے کہ آدمی اگر گناہِ کبیرہ کر لے تو وہ مومن نہیں رہتا، ظاہر ہے کہ یہ کتاب و سنت کے خلاف بات تھی، اس لیے اس

پر بعض ائمہ نے اپنی زبان کھولی، خصوصیت سے امام صاحب نے، انہوں نے کہا کہ ایمان ایسی سیال چیز نہیں ہے جو کسی معمولی اشارہ سے بہ جائے، بلکہ وہ ٹھوس حقیقت ہے، اس کو بے عملی یا ارتکاب معاصی زائل نہیں کر سکتا، لیکن اس سے ان کا یہ مقصد بالکل نہیں تھا کہ آدمی عمل کرنا چھوڑ دے، مگر بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی یا پھیلائی گئی کہ امام صاحب اس معنی میں مرجئہ ہیں کہ وہ عمل کو کوئی ضروری چیز نہیں سمجھتے جس سے ہمارے سیدھے سادھے محدثین بھی متاثر ہو گئے، حالانکہ اگر کوئی امام صاحب کی زندگی ہی پر ایک سرسری نظر ڈال لے تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ وہ تمام ائمہ بلکہ اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ عامل بالسنۃ صالح اور متقی تھے، کیا ان کے قول اور عمل میں کوئی تضاد تھا؟ نہیں بلکہ لوگوں نے ان کی بات سمجھنے میں سخت غلطی کی، امام صاحب سے چونکہ لوگوں نے یہ سوء ظن قائم کر لیا تھا، اس لیے اس جرم میں ان کے تلامذہ بھی شریک کر لیے گئے، اگر آپ صرف تاریخِ بغداد ہی کو اٹھا کر دیکھ لیجئے تو آپ کو نظر آئے گا کہ خطیب تمام مناقب اور فضائل کے ذکر کے بعد ان ائمہ کے بارے میں یہ رائے دیتے ہیں کہ یہ مرجئہ تھے، خلقِ قرآن کے قائل تھے، جہمیہ تھے، اسی طرح بعض دوسرے تذکرہ نگار بھی ان اقوال کو نقل کرتے ہیں، چنانچہ امام ابو یوسف کی طرف بھی یہ تمام جرائم منسوب کئے گئے ہیں، مگر ہم خود امام ابو یوسف کے اقوال نقل کر دیتے ہیں، جس سے ان تمام الزامات کی تردید ہو جائے گی، جو ان پر اس سلسلہ میں لگائے گئے ہیں۔

خلقِ قرآن

امام ابو یوسف کے زمانہ میں اس مسئلہ کو بڑی اہمیت حاصل تھی (اس کی کچھ تفصیل امام احمد کے حالات میں ملے گی) ان سے بھی اس بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ:

قرآن اللہ کا کلام ہے اور جو شخص کیوں اور کیسے کی شق نکالتا ہے اور اس کے بارے میں ردو کد کرتا ہے وہ قید و بند اور سخت تعزیز کا مستحق ہے۔ (۴۰)

یہ کہنے کے بعد وہ اپنے تلامذہ سے کہتے تھے کہ اس بات کو اچھی طرح گرہ دے لو۔

ایک بار ایک شخص نے لوگوں میں یہ مشہور کیا کہ امام ابو یوسف خلقِ قرآن کے قائل ہیں، ان کے تلامذہ نے سنا: تو ان کو بڑی تشویش ہوئی، وہ ان کے پاس آئے اور کہا کہ آپ کے بارے میں یہ بات معلوم ہوئی ہے، آپ تو اس سے پہلے برابر ہم لوگوں کو اس مسئلہ میں پڑنے سے روکا کرتے تھے، انہوں نے سنا تو بڑے غصہ میں فرمایا:

اے کم عقلو! یہ لوگ جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھ سکتے ہیں، ان کو میرے اوپر کوئی بہتان تراش لینے میں کیا باک ہوسکتا ہے، پھر فرمایا:

اهل بدعة يحكون كلامهم ويكذبون على الناس.(۴۱)

ترجمہ: اہلِ بدعت بات اپنی طرف سے کہتے ہیں اور لوگوں پر جھوٹ باندھتے ہیں۔

جہمیت

یہ فرقہ جہم بن صفوان کی طرف منسوب ہے، نفی صفات کے سلسلہ میں ان کا اور معتزلہ کا ایک ہی عقیدہ ہے، ان کے پانچ اصول ہیں، ایک یہ کہ جن صفات سے بندہ متصف ہے اس سے خدا کو متصف نہ ہونا چاہیے، مثلاً انسان میں علم وقدرت ہے تو خدا تعالیٰ کو ان صفات سے خالی ہونا چاہیے، نعوذ باللہ، دوسرے یہ کہ خدا تعالیٰ کو کسی چیز کے پیدا کرنے سے پہلے اس کا علم نہیں ہوتا، یعنی اس کا علم حادث ہے، جو خلق کے ساتھ پیدا ہوتا ہے، تیسرے یہ کہ انسان اور علم مخلوقات مجبورِ محض ہیں، چوتھے یہ کہ خلود کو وہ ہمیشگی پر محمول نہیں کرتے ہیں، پانچویں یہ کہ جس شخص کو خدا کی معرفت حاصل ہوجاتی ہے، اگر وہ زبان سے کفر کا اظہار کرے جب بھی کافر نہیں ہوتا، ان اصولوں کی تمام اہلِ سنت نے تردید کی ہے،

ان کے خاص خاندان کے ایک نوجوان نے ایک بار جہمیت کا اظہار کیا، تو انہوں نے ۳۵ کوڑے کی سزادی، ایک شخص نے ان سے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ اس کی شہادت قبول کرتے ہیں جو اس بات کا قائل ہے کہ اللہ کسی چیز کو اس کے وقوع سے پہلے نہیں جانتا، فرمایا ایسا شخص اگر توبہ نہ کرے تو میں قتل کردونگا نہ کہ

اس کی شہادت قبول کرونگا، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ قصداً ان ائمہ کے بارے میں بعض معاندین کیسی کیسی بے سروپا باتیں اڑاتے رہتے تھے۔

ایمان

ایمان کے سلسلہ میں بھی امام ابو یوسف کے بارے میں عجیب عجیب باتیں کہی جاتی تھیں، یہاں تک کہ بعض لوگوں نے کہا کہ وہ اپنا اور حضرت جبریل کا ایمان برابر سمجھتے ہیں، جب ان کو معلوم ہوا تو اس کی تردید کی:

من قال ایمانی کایمان جبریل فھو صاحب بدعة.(٤٢)

ترجمہ: جو یہ کہتا ہے کہ میرا ایمان حضرت جبریل کے ایمان کی طرح ہے وہ بدعتی ہے۔

وہ فرماتے تھے کہ خراسان میں دو گروہ ہیں، جن سے برا دنیا میں کوئی نہیں ہے، ایک مجسمہ (یعنی وہ لوگ جو خدا کے لیے جسم واعضا ثابت کرتے ہیں، (جبریہ جو انسان کو مجبورِ محض رکھتے ہیں، گناہ ثواب کا اس کو ذمہ دار نہیں سمجھتے) دوسرے جبریہ۔

انہوں نے ایک بہت جامع نصیحت تمام تلامذہ کو کی تھی جس کا خلاصہ یہاں نقل کر دیتے ہیں:

ذروا الخصومة فی الدين والمراء فيه والجدال، فان الدين واضح بين قد فرض الله عزوجل فرائضه وشرع سننه وحدوده واحل حلاله وحرم حرامه فقال أكمَلت لكُم دِينكُم وأَتمَمت عَليكُم نِعمَتي وَرَضِيت لكُم الإِسلاَمَ دِيناًفاحلوا حلال القرآن وحرموا حرامه واعملوا بحكمه وآمنوا بالمتشابه منه واعتبروا بالامثال فيه.

ترجمہ: دین کے بارے میں شک، لڑائی، کج بحثی اور جدال چھوڑ دو، اس لیے کہ دین بالکل واضح ہے، خدا نے اس کے فرائض بھی مقرر کر دیئے ہیں اور اس کی سنتیں بھی اور اس کے تمام حدود مقرر کر دیئے ہیں اور حلال کو حلال اور حرام کو حرام کر دیا ہے، جیسا کہ اس نے خود فرمایا میں نے تمہارے لیے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی

نعمت کو تمہارے او پر تمام کر دیا اور تمہارے لیے دینِ اسلام کو پسند کر لیا، تو اس کے حلال کو حلال سمجھو اور اس کے حرام کو حرام سمجھو، قرآن کی محکم یعنی واضح آیات پر عمل کرو اور متشابہ آیات ہیں ان پر ایمان و یقین رکھو اور اس کے اندر جو امثال ہیں یعنی مثالیں ان سے عبرت حاصل کرو۔

فلو كانت الخصومة فى الدين تقوىٰ عندالله بسق اليها رسول الله صلى الله عليه وسلم واصحابه بعده فهل اختصموا فى الدين تنازعو فيه وقد اختصموا فى الفقه وتكلموا فيه واختصموا فى الفرائض والصلاة والحج والطلاق والحلال والحرام ولم يختصموا فى الدين ولم يتنازعوا فيه فاقتصروا على تقوىٰ الله وطاعته والزموا ماجرت السنة ودعوا مااحدث المحدثون من التنازع فى الدين.

ترجمہ: اگر دین کے مسائل میں کج بحثی کوئی تقویٰ کی بات ہوتی تو اس کی طرف سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے بعد آپ کے اصحاب اس کی طرف سبقت کرتے، تو کیا انہوں نے کبھی عقائد کے مسائل میں بھی کج بحثی کی؟ انہوں نے اگر اختلاف اور بحث و مباحثہ کیا تو فقہی مسائل میں جن کا تعلق عمل سے ہے، انہوں نے اگر گفتگو کی تو فرائض، نماز، حج، طلاق جیسے مسائل میں اور حلال و حرام میں انہوں نے ایمانیات میں کبھی قیل و قال نہیں کیا، انہوں نے خدا کے تقویٰ اور اس کی اطاعت پر بس کیا اور انہوں نے سنتِ متواترہ کو مضبوط پکڑ لیا تھا اور جو ان مبتدعین نے نئے نئے مسائل پیدا کر دیئے ہیں ان کو انہوں نے کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔

وقد انزل الله عزوجل فى كتابه إِذَا رأيتَ الَّذِينَ يَخوضونَ فِي آيَاتِنَا فأَعرِض عَنهم ولوشاء انزل فى ذالك جدالاً وحجاجًا ولكنه ابى ذالك وقال فَلاتَقعدوا مَعَم وقال فَن حَآجّوكَ فَقل اَسلَمت وَجهيَ لِلهِّ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ولم يقل وحاجهم.

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کہا ہے کہ جب دیکھو کہ وہ ہماری آیات میں کرید کر رہے ہیں

تو ان سے الگ ہو جاو، اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو اپنی کتاب میں جدال اور قیل وقال کا طریقہ بھی نازل فرما سکتا تھا، مگر اس سے اس نے گریز کیا اور یہ حکم دیا کہ ان کے ساتھ نہ بیٹھو اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اگر وہ تم سے حجت کریں تو کہہ دو کہ میں نے اور جن لوگوں نے میری اتباع کی ہے اپنی پوری توجہ خدا کی طرف مبذول کر لی ہے، آپ سے یہ نہیں کہا گیا کہ آپ بھی ان سے بحث مباحثہ اور قیل وقال کیجئے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ امام ابو یوسف کا دامن ان الزامات سے پاک ہے، جو ان پر بعض لوگوں نے عائد کرنے کی کوشش کی ہے ان کا یہ قول آج تک زبان زد خاص و عام ہے کہ جس نے دین علم (مقصود وہ مباحث ہیں جن میں خصوصیت سے خدا کی ذات وصفات کی بحث ہوتی ہے، چونکہ انسانی دسترس سے باہر ہیں اس لیے انسان ان کے بارے میں اٹکل پچو تیر چلاتا ہے) کلام کے ذریعہ حاصل کرنے کی کوشش کی اس نے بے دینی کو راہ دی۔

جرح وتعدیل

وہ ائمہ اور بزرگانِ دین جو صدیوں سے کروڑوں آدمیوں کے متبوع چلے آرہے ہیں اور جن کی جلالت اور امامت پر سب کا اتفاق ہے، ان کی عدالت وثقاہت پر کسی بحث کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ان کے بارے میں کوئی جرح قابل اعتنا ہے، مگر پھر بھی ایک سوانح نگار کا کام ہے کہ وہ جس کی سوانح عمری لکھ رہا ہے، اس کی زندگی کے ہر گوشہ کو اجاگر کرے اور اس کے بارے میں اگلوں نے جو رائے دی ہے، اسے بھی من وعن نقل کر دے، اس لیے یہاں اگلوں نے جو رائے دی ہے، اسے بھی من وعن نقل کر دے، اس لیے یہاں مختصراً اس سے بحث کی جاتی ہے۔

امام احمد، یحییٰ بن معین، ابن مدینی اور امام مزی جو جرح وتعدیل کے امام ہیں ان سب نے ان کی توثیق کی ہے، اوپر ذکر آچکا ہے کہ امام ذہبی رحمہ اللہ نے تذکرالحفاظ میں ان کا مختصر تذکرہ لکھا ہے اور اس کے بعد الگ ایک رسالہ ان کے حالات میں لکھا ہے، جواب چھپ کر بازار میں آ گیا ہے، اس میں لکھتے ہیں:

ان کے علم وفضل میں کسی کو شبہ کرنے کی گنجائش نہیں ہے، جن لوگوں نے ان پر جرح کی ہے وہ نا قابل اعتبار ہے۔(۴۳)

ابن جوزی رحمہ اللہ نے ان کو ان سو حفاظ میں شمار کیا ہے جو پوری امت میں ممتاز ہیں، اسی طرح ابن حبان، ابن عبدالبر نے بھی ان کی ثقاہت وعدالت کی توثیق کی ہے، ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ حفظ حدیث میں مشہور ومعروف ہیں۔

ابنِ ابی حاتم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب الجرح والتعدیل میں امام بخاری سے نقل کیا ہے کہ ابوزرعہ اور ابوحاتم ان سے حدیث کی روایت نہیں کرتے تھے، لیکن ابوزرعہ اور ابن ابی حاتم کی رائے یحیٰی بن معین، ابن مدینی کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی، پھر ابن حاتم نے تو امام بخاری رحمہ اللہ پر بھی جرح کی ہے، ظاہر ہے کہ ان کی رائے زیادہ محتاط نہیں کہی جاسکتی۔

خطیب نے عقیلی اور ابن ثابت کی جرح بھی نقل کی ہے، امام ذہبی رحمہ اللہ اس جرح کے بارے میں لکھتے ہیں:

واخبار فی الخط علیه بعضها لیس بصحیح اوردهاالعقیلی وابن ثابت فی تاریخ بغداد وغیرها.

ترجمہ: ابو یوسف کو گرانے کے لیے جو باتیں عقیلی اور ابن ثابت کے ذریعہ تاریخ بغداد وغیرہ میں منقول ہیں ان میں بعض بالکل صحیح ہیں۔

ایک جرح خطیب نے نقل کی ہے اس میں ہے کہ عبداللہ بن مبارک ان کا ذکر اچھے الفاظ سے نہیں کرتے تھے، ان کی وفات کے بعد کسی نے ان کے موت کی اطلاع دی تو انہوں نے مسکین یعقوب (یعنی دنیا سے خالی گئے) کے الفاظ فرمائے۔

ظاہر ہے کہ اس روایت کی غلطی دو وجہوں سے ثابت ہے، ایک تو یہ کہ عبداللہ مبارک، امام ابو یوسف

سے دوسال پہلے وفات پا چکے تھے، مگر یہاں ان کو زندہ اور امام ابو یوسف کو مردہ دکھایا جا رہا ہے، دوسری یہ کہ اس روایت میں کئی راوی غیر ثقہ ہیں، اسی طرح دارِ قطنی کی جرح بھی نقل کی گئی ہے، مگر دارِ قطنی نے اپنی کتاب غرائب مالک میں امام محمد کو ثقہ قرار دیا ہے، پھر خطیب نے ان سے یہ نقل کیا ہے کہ امام ابو یوسف کے بارے میں وہ کہتے تھے کہ:

هو اقوىٰ من محمد بن حسن.

ترجمہ: وہ محمد بن حسن سے زیادہ قابل اعتماد تھے۔

ظاہر ہے کہ امام محمد سے زیادہ ثقہ قرار دینے کے معنی تو ان کی تعدیل ہوتی، اب اگر کوئی جرح ان سے ثابت بھی ہو جائے تو تعدیل کو جرح پر ترجیح ہونی چاہیے، ایک جرح یہ نقل کی ہ کہ اس حدیث میں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کا ذکر ہے، یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غابہ سے ثنی الوداع تک گئے، خطیب نے لکھا ہے کہ امام ابو یوسف کو غابہ کا تلفظ تک معلوم نہیں تھا اور وہ غابہ (ب) کے بجائے غایہ (ی) کہتے تھے، ظاہر ہے کہ جس نے بارہا حج کیا ہو اور ان مقامات کو خود دیکھا ہو اور مغازی و سیر محمد بن اسحاق سے پڑھی ہو، امام اوزاعی کی سیرت پر نقد کیا ہو، اس کے بارے میں اس قسم کی باتیں کس طرح قابل اعتبار ہو سکتی ہیں، غرض یہ ہے کہ امام ابو یوسف پر جتنی جرحیں کی گئی ہیں، وہ زیادہ تر یا تو سوءظنی کی بنا پر ہیں، یا امام صاحب کے تلمذ کی وجہ سے، اس لیے کہ اس وقت امام صاحب اور ان کے تلامذہ کے بارے میں عام طور پر یہ غلط فہمی اور سوءظنی قائم تھی کہ یہ لوگ حدیث و آثار کے مقابلہ میں قیاس و رائے کو ترجیح دیتے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ یہ صرف سوءظنی اور غلط فہمی ہے، ممکن ہے اس وقت سوءظنی کسی حد تک صحیح رہی ہو، مگر اس وقت جب کہ امام صاحب کی مجلس مشاورت اور ان کے تلامذہ کے اجتہادات سے جو بنا بنایا مسلک ہمارے سامنے موجود ہے، اس کے بارے میں کیا یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے کوئی نسبت نہیں ہے اور وہ صرف رائے واجتہاد کا مجموعہ ہے؟ پھر اس میں امام صاحب اور ان کے تلامذہ کو جو قبول عام حاصل ہوا وہ بھی بہت

سے معاصرین کے لیے وجہ خلش تھی۔

حیل

امام ابو یوسف اور امام محمد کی طرف تذکرہ میں بہت سے حیلے منقول ہیں، ان کی کوئی اصلیت نہیں ہے، لیکن اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ کوئی ایسی لطیف تدبیر کرنا جس سے نہ تو شریعت کا حکم بدلتا ہو نہ وہ کسی نص صریح سے ٹکراتی ہو نہ اس سے کسی کا حق مارا جا تا ہو اور نہ اس سے کسی باطل کو ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہو، کوئی ممنوع چیز نہیں ہے، بلکہ وہ مباح ہے، مثال کے طور پر ہجرت کے واقعہ کو سامنے رکھیے جب کسی نے راستہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ:

رجل يهديني السبيل.

ترجمہ: ایک شخص ہیں جو مجھے راستہ بتا رہے ہیں۔

غور کیجئے کہ آپ نے کتنے لطیف انداز سے سائل کا جواب بھی دیدیا اور خطرہ سے آپ کو بچا بھی لیا اور واقعیت میں بھی کوئی فرق نہیں آنے دیا، جن ائمہ نے حیلوں سے کام لیا ہے یا ان کو مباح قرار دیا ہے، ان کے سامنے بھی یہی مثال تھی نہ کہ مکر و فریب کو حیلہ سمجھتے تھے، حاشا و کلا۔

امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے ایک بار ایک شخص کو اس کا مال بچانے کی ایک جائز تدبیر بتائی جس پر ان کے شاگرد ابو یقظان نے ان سے کہا کہ یہ تو وہی بات ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے لیے چربی حرام کردی تھی، تو انہوں نے یہ کیا کہ اس کو پگھلا کر فروخت کر دیتے اور اس کی قیمت اپنے مصرف میں لاتے، امام ابو یوسف نے فرمایا کہ انہوں نے ایک حرام کو حلال کرنے کے لیے ایسا کیا تھا، مگر ہم کوئی تدبیر اگر کرتے ہیں تو اس لیے کہ حلال کو حرام نہ ہونے دیں۔ (۴۴)

مثال کے لیے ایک اور واقعہ نقل کیا جاتا ہے ایک بار امام ابو یوسف کے یہاں خلیفہ ہادی کے خلاف

ایک باغ کا مقدمہ پیش ہوا، ظاہری طور پر حق خلیفہ کا معلوم ہوتا تھا، شہادت وغیرہ بھی اسی کی طرف سے گذری تھی، مگر امام ابو یوسف نے تحقیق کی تو حق اس غریب دعویٰ کرنے والے ہی کا معلوم ہوا، جس کے خلاف شہادت گذر چکی تھی، امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے مقدمہ اس وقت ملتوی کر دیا، ھادی سے ملاقات ہوئی تو اسنے پوچھا کہ میرے معاملہ میں کیا فیصلہ ہوا، فرمایا مدعی آپ سے قسم لینا چاہتا ہے، پوچھا: کیا آپ اس کو صحیح سمجھتے ہیں؟ امام ابو یوسف کا اپنا ذاتی مسلک یہ نہیں تھا، اس لیے انہوں نے اپنی کوئی رائے نہیں دی، بلکہ یوں کہا کہ ابن ابی لیلی اس کو صحیح سمجھتے تھے، ہادی نے کہا: اچھا تو پھر آپ باغ اس کو واپس کر دیجئے، ظاہر ہے کہ یہ تدبیر شرعی نقطہ نظر سے کوئی قابل اعتراض نہیں ہے، اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان ائمہ کو بہت سے مظلوموں کی جان بچانے اور کتنے لوگوں کے حق واپس کرنے کے لیئے بھی اس قسم کی تدبیریں کرنی پڑتی تھی، اگر اسی کا نام حیلہ ہے تو پھر شرعی نقطہ نظر سے اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔

خطیب بغدادی اور دوسرے بعض سوانح نگاروں نے امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی طرف بہت سے ایسے حیلے منسوب کیے ہیں جو انہوں نے ہارون رشید کے لیئے کئے تھے، مگر وہ اس لیے نا قابل اعتبار ہیں کہ ان کی پوری زندگی جس کا نقشہ اوپر کھینچا گیا ہے اس سے ان کی تردید ہوتی ہے، امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی طرف منسوب کتاب المخارج والحیل کے نام سے ایک مستقل کتاب مصر کے متعدد کتب خانوں میں موجود ہے، ایک جرمن مستشرق جوزف شخت نے طبع کرا دیا ہے، مگر اس پر نام امام محمد رحمہ اللہ کا درج ہے۔

زریں اقوال

امام ابو یوسف کے بہت سے حکیمانہ مقولے اور زرین اقوال کتابوں میں درج ہیں، ان میں سے چند کا ترجمہ یہاں نقل کیا جاتا ہے، فرماتے تھے کہ:

بارِالٰہا! میرے سامنے جب کوئی مسئلہ پیش آیا تو پہلے میں نے کتاب اللہ میں غور کر کے اس کا جواب معلوم کرنے کی کوشش کی، اگر کتاب اللہ میں اس کا جواب نہیں ملا تو پھر سنت رسول اللہ کی طرف رجوع کیا،

اگر اس میں بھی جواب نہ ملا تو آثارِ صحابہ اور ان کے تعامل پر غور کیا، اگر اس میں بھی جواب نہ ملا تو میں نے امام صاحب کو اور اپنے آپ کے درمیان واسطہ بنایا۔ (یعنی ان کے قول پر عمل کیا)

اے اللہ تو جانتا ہے کہ جب میرے پاس دو فریق آئے اور ان میں سے ایک ضعیف اور دوسرا اقوی تھا تو میں نے دونوں میں ہمیشہ مساوات رکھی، میں نے اس بارے میں خلیفہ اور ایک بازاری آدمی کو یکساں سمجھا، میرا قلب کبھی کسی کی وجاہت وقوت کی طرف مائل نہیں ہوا، اے اللہ! اگر میں نے ایسا کیا ہے تو میری مغفرت کر دے۔

فرماتے تھے کہ بسا اوقات مجھ سے کسی مسئلہ کے بارے میں سوال کیا گیا اور اس کی علت بھی میری سمجھ میں آ گئی مگر زبان سے اس کے اظہار پر قادر نہیں تھا، اس وقت میری مثال اس شخص کی سی ہوتی تھی، جس کے سامنے ایک درہم رکھا جائے اور اس سے پوچھا جائے کہ یہ کھرا ہے یا کھوٹا، تو جواب میں کھرا یا کھوٹا کہے، مگر جب اس سے اس کی علت اور وجہ دریافت کی جائے تو وہ کوئی جواب نہ دے سکے، حالانکہ وہ اس کا کھرا کھوٹا ہونا جانتا ہے اور اس کا قلب اس پر مطمئن ہے، مگر زبان سے اس کا اظہار نہیں کر سکتا، فرماتے تھے کہ بعض اوقات میں نے دو مسئلوں میں بال برابر فرق کیا ہے اور بعض اوقات پہاڑ کے برابر اور بعض وقت فرق کو دل میں محسوس کر لیا، مگر زبان سے یارائے اظہار نہیں تھا۔

تلامذہ سے فرماتے تھے کہ اے لوگو! صرف رضائے الٰہی کے لیے علم حاصل کرو، اس میں کوئی دوسری غرض شامل نہ ہو، میرا خود اپنا حال یہ تھا کہ جس مجلس میں متواضع ہو کر شریک ہوا، اس سے بلند ہو کر اٹھا اور جس مجلس میں علم کے غرور و پندار کے ساتھ گیا، اس میں میری ذلت و فضیحت ہوئی، پس خبردار اللہ ہی کے لیے علم حاصل کرو، فرمایا اس شخص کی صحبت سے بچو! جو قیامت کی ذلت اور رسوائی سے نہیں ڈرتا، فرماتے تھے کہ تین نعمتیں اصل ہیں، ایک اسلام کہ دنیا کی کوئی نعمت اس کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی، دوسری صحت کہ اس کے بغیر کوئی راحت خوشگوار نہیں ہو سکتی، تیسری فارغ البالی کہ اس کے بغیر زندگی پرسکون نہیں ہوتی۔

فرماتے تھے کہ علم ایسی چیز ہے کہ جب تم اپنی پوری زندگی اس کو دیدو گے تب جا کر اس کا کچھ حصہ تم کو ملے گا، جب تم کو اس کا بعض حصہ ملے تو اس پر تکیہ نہ کرو، بلکہ برابر اس میں لگے رہو، فرماتے تھے کہ حکومت کے ذمہ داروں کا پھٹے حال رہنا اور جھوٹی موٹی زندگی اختیار کرنا ذلت کا باعث ہے اور قضا اور علماء کے لیے سادہ زندگی قابل فخر ہے۔

فرماتے تھے کہ جو شاذ و نادر حدیث کے پیچھے پڑے گا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بہتان تراشی میں ضرور مبتلا ہو جائے گا اور جو علم کلام کے ذریعہ دین حاصل کرنے کی کوشش کریگا وہ گمراہی میں پڑ جائے گا اور جو کیمیا سازی کے ذریعہ مال و دولت کمانے کی کوشش کرے گا وہ مفلس ہی رہے گا۔

تصانیف

امام ابو یوسف رحمہ اللہ ان بزرگوں میں ہیں جنہوں نے ابتدائی صدیوں میں علوم دینیہ کی تدوین میں حصہ لیا تھا، بلکہ بعض فنون کی تدوین میں انہیں اولیت حاصل ہے اس کا شمار کثیر التصانیف علماء میں ہوتا ہے، کشف الظنون میں ہے کہ:

ان الامالی لابی یوسف فی ثلثمائة مجلد.

ترجمہ: امام ابو یوسف کی امالی تین سو جلدوں میں تھیں۔

ابن ندیم نے متداول کتابوں کے علاوہ ان کی ایک امالی کا ذکر کیا ہے، جو ۳۶ مباحث پر مشتمل تھی اور دوسری کتاب، کتاب الجوامع کا ذکر بھی کیا ہے، جس کے ۴۰ حصے تھے اس کے اندر علماء کے فقہی اختلافات و آراء کا مفصل تذکرہ ہے، یہ کتاب انہوں نے یحیٰی بن برمکی کی فرمائش پر لکھی تھی۔

ابنِ ندیم نے ایک کتاب اختلاف (علماء) الامصار کے نام سے بھی ان کی تصانیف میں شمار کی ہے، لیکن یہ تمام کتابیں زمانہ کی دستبرد کی نذر ہو گئیں، ایک کتاب انہوں نے امام مالک رحمہ اللہ کے رد میں لکھی تھی، جس میں ان کے بعض فقہی مسائل پر تنقید تھی، ان کی سب سے اہم کتاب اصولِ فقہ پر تھی، جس کی تدوین میں

ان کو اوّلیت کا شرف حاصل ہے، اس کتاب کے بارے میں محمد بن جعفر کہتے ہیں:

واوّل من وضع الكتاب في اصول الفقه على مذهب ابي حنيفة.(۴۵)

ترجمہ: وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے مسلک کے مطابق اصول فقہ کی تدوین کی۔

لیکن تا تاریوں کے حملوں اور مصر کے آئے دن کے انقلابات میں نہ جانے اس طرح کے کتنے گنجہائے گرانمایہ خاک کی نذر ہو گئے، انہیں میں یہ کتاب بھی تلف ہو گئیں۔

امام شافعی رحمہ اللہ کے بارے میں بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ سب سے پہلے اصولِ فقہ پر انہوں نے الرسالہ کے نام سے ایک کتاب لکھی جو اہلِ علم کے ہاتھوں میں موجود ہے، مگر ان دونوں رایوں میں کوئی تعارض نہیں ہے، امام ابو یوسف نے حنفی مسلک پر اصول فقہ کی تدوین کی تھی اور امام شافعی نے خود اپنے مسلک کے اصول متعین کئے تھے، اس لیے دونوں کی اوّلیت کی حیثیت جداگانہ ہے، پھر امام شافعی کی اوّلیت اس لحاظ سے بھی ہو سکتی ہے کہ ان کی کتاب آج بھی موجود ہے اور امام ابو یوسف کی کتاب کا سراغ نہیں ملتا، لیکن اس کے باوجود زمانہ کے اعتبار سے امام ابو یوسف متقدم ہیں۔

امام ابو یوسف کی جو کتابیں اس وقت مطبوعہ یا مخطوطہ موجود ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

(ا) کتاب الآثار اس میں وہ آحادیث وآثار جمع کر دیئے ہیں جو حنفی مسلک کے مآخذ ہیں، اس میں انہوں نے زیادہ تر امام ابو حنیفہ ہی سے روایتیں کی ہیں اور دوسرے شیوخ کی بہت کم روایتیں اس میں ہیں، بعض جگہ اپنی مرویات کا اضافہ بھی کر دیا ہے، اس کو مسند ابو یوسف بھی کہا جاتا ہے، اس میں ایک ہزار سے زیادہ احادیث وآثار ہیں، کتاب کے راوی امام ابو یوسف کے صاحبزادے یوسف ہیں، جن کا تذکرہ اوپر آچکا ہے، اس کتاب کو لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ حیدر آباد نے شائع کیا ہے، اس پر مولانا ابوالوفا افغانی مدظلہ صدر مجلس کے بہت سے مفید حواشی بھی ہیں۔

(۲) اختلاف ابی حنیفہ و ابن ابی لیلی کا ذکر آچکا ہے کہ امام ابو یوسف پہلے ابن ابی لیلی کے یہاں تحصیلِ علم کرتے تھے (ابن ابی لیلیٰ کا خانوادہ علم اور دین کے لحاظ سے ممتاز تھا، ان کے والد ممتاز تابعین میں سے تھے، یہ خود اپنے وقت کے امام تھے، کوفہ میں امام صاحب کا اگر کوئی ہمسر تھا تو یہی تھے) اس کے بعد امام صاحب کی خدمت میں گئے، امام صاحب اور ابن ابی لیلیٰ میں بہت سے فقہی مسائل میں اختلاف تھا، امام ابو یوسف نے اپنے ان دونوں اساتذہ کے اختلافات کو کتابی شکل میں جمع کر دیا ہے، اس کتاب میں ایک دو جگہ نہیں بلکہ بیسیوں جگہ امام ابو یوسف نے امام صاحب کی رائے سے اختلاف کیا ہے اور ابن ابی لیلی کی رائے کو ترجیح دی ہے اور بعض جگہ اپنے دونوں اساتذہ سے اختلافِ رائے کیا ہے، یہ کتاب ان دونوں اماموں کے مجتہدات کے ساتھ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے مجتہدات اور استنباطات کا بھی بہترین نمونہ ہے، کتاب کے راوی یا مولف امام محمد ہیں، اس کا کچھ حصہ امام سرخسی نے مبسوط میں بھی نقل کیا ہے (۴۶)

اس کتاب کو بھی لجنۃ المعارف نے شائع کیا ہے، کتاب کی افادیت کو علامہ ابولوفاء کے حواشی نے کئی گونہ زیادہ کر دیا ہے، بلکہ وہ حواشی خود ایک کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔

(۳) الرد علی سیر الاوزاعی امام ابوحنیفہ نے سیر و مغازی پر اپنے تلامذہ کو جو کچھ املا کرایا تھا اس کو انہوں نے مدون کر دیا تھا، چنانچہ امام محمد نے خاص طور پر اس کے لیے السیر الصغیر مرتب کی، جب یہ کتاب امام اوزاعی کے سامنے جو اس وقت اہلِ شام کے مرجع و ماویٰ تھے، آئی تو انہوں نے کہا کہ اہلِ عراق سیر و مغازی کیا جانیں اور اسکی تردید میں اس موضوع پر ایک کتاب لکھی، امام محمد کو جب معلوم ہوا تو انہوں نے اس کتاب کے جواب میں السیر الکبیر لکھی اور امام ابو یوسف نے بھی اس کا جواب دیا، امام ابو یوسف کی کتاب الرد علی السیر الاوزاعی کے نام سے حیدرآباد میں چھپ گئی ہے، اس کے دیکھنے سے حدیث و آثار پر امام ابو یوسف کی دقت نظری اور امام صاحب کی سیر و مغازی سے پوری واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

(۴) کتاب الخراج، امام ابو یوسف کی سب سے اہم کتاب یہی ہے، خراج اسلامی ریاست کا ایک

شعبہ آمدنی ہے، مگر یہ لفظ امام ابو یوسف نے تقریباً اسلامی مالیات کے ان تمام مداخل ومخارج کے لیے استعمال کیا ہے، جن کا تعلق حکومت یا مسلمانوں کی اجتماعی زندگی سے ہے، امام ابو یوسف کے معاصرین اور ان کے بعد کے بہت سے علماء نے اس موضوع پر کتابیں لکھی ہیں، خصوصیت سے یحییٰ بن آدم کی کتاب الخراج، ابن عبید کی کتاب الاموال، ابن رجب کی استخراج احکام الخراج وغیرہ بہت مشہور ہیں، مگر ان میں سے کوئی کتاب ان خصوصیات کی حامل نہیں ہے، جن کی امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی کتاب حامل ہے، ابن عبید کی کتاب اس موضوع پر سب سے زیادہ مفصل اور ضخیم ہے، مگر کیفیت کے لحاظ سے وہ امام ابو یوسف کی کتاب سے کم درجہ کی ہے، اس موضوع کے دوسرے مصنفین خصوصیت سے ابن عبید نے یہ کیا ہے کہ اس موضوع پر جو قرآن کی جو آیات، احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، آثار صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین اور اقوال تابعین ملے ہیں، وہ سب جمع کردیئے ہیں، استخراج احکام انہوں نے بہت کم کیا ہے، لیکن امام ابو یوسف صرف نقل، روایات ہی پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ جہاں تاریخی مباحث آجاتے ہیں ان پر بھی روشنی ڈالتے ہیں، قرآن وحدیث کے معانی کی تشریح اور تعیین میں لغتِ عرب اور استعمالاتِ ادیار سے بھی بحث کرتے ہیں، پھر سب سے زیادہ اس کی افادیت اس حیثیت سے ہے کہ وہ حکومت اور عام مسلمین کی نئی نئی ضروریات ومشکلات کا قرآن وحدیث اور آثار صحابہ سے یا ان کی روشنی میں اجتہاد کر کے حل پیش کرتے ہیں۔

اس کتاب کا طریقہ بیان یہ ہے کہ جب کوئی بحث شروع کرتے ہیں، تو پہلے قرآن کی آیت پیش کرتے ہیں، پھر حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہ کے بعد ضرورت ہوتی ہے تو امام صاحب یا دیگر ائمہ کے اقوال سے استدلال کرتے ہیں، اس کے بعد بھی اگر ضرورت مقتضی ہوتی ہے تو وہ خود اجتہاد کرتے ہیں، یہ کتاب ہارون رشید کی فرمائش سے انہوں نے لکھی تھی، عموماً امراء وسلاطین کی فرمایش پر جو کتابیں علماء نے لکھی ہیں، ان میں بہت کم ایسی کتابیں ملیں گی، جن میں موقع کے لحاظ سے جرات وحق گوئی کے ساتھ کی ہیں، اس کی اہمیت کا اندازہ اسی وقت ہوسکتا ہے، جب عباسی خلفاء اور خصوصیت سے ہارون رشید

کی خودرائی اور اس کے استبداد کی تاریخ کو بھی سامنے رکھا جائے او پر اس کا کچھ حصہ ہم نقل کر آئے ہیں، تطویل کا خیال نہ ہوتا تو اس کا پورا خلاصہ یہاں نقل کیا جاتا۔

یہ کتاب کئی بار چھپی ہے، سب سے پہلے مطبوعہ بولاق سے سنہ ۱۳۰۲ھ م سنہ ۱۸۹۱ء میں شائع ہوئی، اس کتاب کو ایک فرانسیسی مستشرق نے فرنچ میں بھی ترجمہ کیا ہے جو سنہ ۱۹۴۹ء میں پیرس سے شائع ہو چکا ہے۔

(۵) کتاب المخارج والحیل، امام ابو یوسف کی طرف یہ کتاب بھی منسوب ہے، یہ کتاب آستانہ سے شائع ہو چکی ہے، جس کو ایک جرمن عالم نے ایڈٹ کیا ہے اور اس نے اس کو امام محمد کی تصنیف بتایا ہے، مگر اس کے بارے میں علامہ زاہد الکوثری نے لکھا ہے کہ مصر کے متعدد کتب خانوں میں اس کتاب کے قلمی نسخے موجود ہیں اور یہ امام ابو یوسف کی تصنیف ہے۔

مرجوع مسائل

اجتہاد واستنباط کا تعلق اس دینی بصیرت سے ہے، جو علومِ دینیہ میں غور کرتے رہے اور اس سے غیر معمولی شغف وانہماک رکھنے کی وجہ سے حاصل ہو جاتی ہے، ظاہر ہے کہ یہ بصیرت علم وتجربہ کی زیادتی کے لحاظ سے روز بروز بڑھتی رہتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ائمہ کرام کے بہت سے مجتہدات جن پر ابتداء میں ان کو پورا وثوق اور اعتماد تھا، علم دین اور فہم وبصیرت کی زیادتی کے بعد ان میں ان کو تبدیلی کرنی پڑی، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے سیکڑوں مسائل اور استنباطات ایسے ملیں گے جن کو انہوں نے ترک کر دیا، یا ان میں ترمیم کر دی، اسی طرح امام مالک اور امام شافعی وغیرہ کا حال بھی ہے، خصوصیت سے امام شافعی نے تو امام محمد کے تلمذ کے بعد تقریباً اپنے تمام مسائل پر نظر ثانی کر کے انہیں بدل ڈالا، چنانچہ شافعی فقیہ کے لیے ان کے قدیم وجدید اقوال میں فرق کرنے میں بڑی دقت پیش آتی ہے۔

امام ابو یوسف بھی مجتہد تھے، اس لیے انہوں نے بھی اپنے بہت سے استنباطات میں جزوی ترمیم کی

ہے اور بہت سے مسائل سے بالکلیہ رجوع کرلیا ہے، ائمہ کے مرجوع مسائل کو ذہن میں نہ رکھنے کی وجہ سے بسا اوقات ان کے اوران کے مسلک کے بارے میں بہت شدید غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے، غالبًا اسی ضرورت کو پیشِ نظر رکھ کر مفتی مہدی حسن صاحب (دیوبند) نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، امام محمد رحمہ اللہ اور امام ابویوسف رحمہ اللہ کے جتنے مرجوع مسائل ہیں، ان کو ایک کتابی شکل میں جمع کر دیا ہے، یہ رسالہ عربی میں ہے، اس لیے اردو داں اصحاب کے لیے تو بیکار ہے، مگر عربی خواں اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

امام صاحب کی وصیت

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کی وہ مشہور وصیت جس میں انہوں نے اہلِ سنت والجماعت کے تمام عقائد تفصیل سے بیان کر دیئے ہیں، اس سے اہلِ علم تو عام طور پر واقف ہیں، مگر اس کے علاوہ ایک اور وصیت بھی ہے جو انہوں نے خاص طور سے امام ابویوسف کو لکھ کر دی تھی، جس میں اخلاق، معاملات، معاشرت، سیاست کے متعلق بہت سی قیمتی ہدایتیں اور زریں اقوال ہیں، جن سے ہر خاص وعام فائدہ اٹھا سکتا ہے، اس لیے ہم اس کا خلاصہ ذیلی عنوانات کے تحت یہاں نقل کرتے ہیں۔

امام اعظمؒ کی نصیحتیں امام ابویوسف رحمہ اللہ کے نام

امام ابویوسف رحمہ اللہ کے نام امام اعظم رحمہ اللہ کی وصیت جبکہ امام ابویوسف رحمہ ا کی ذات سے رشد و ہدایت اور حسنِ سیرت وکردار کے آثار ظاہر ہوئے اور وہ لوگوں سے معاملات کی جانب متوجہ ہوئے۔ امام اعظم رحمہ اللہ نے انھیں یہ وصیت فرمائی کہ اے یعقوب!

حاکم کے ساتھ محتاط طرزِ عمل:

سلطانِ وقت کی عزت کرو اور اس کے مقام کا خیال رکھو۔ اور اس کے سامنے دروغ گوئی سے خاص طور سے پرہیز کرو۔ اور ہر وقت اس کے پاس حاضر نہ رہو جب تک کہ تمھیں کوئی علمی ضرورت مجبور نہ کرے۔ کیونکہ جب تم اس سے کثرت سے ملو گے تو وہ تمھیں حقارت کی نظر سے دیکھے گا اور تمھارا مقام اس کی نظروں سے گر

جائے گا۔ پس تم اسکے ساتھ ایسا معاملہ رکھو جیسا کہ آگ کے ساتھ رکھتے ہو کہ تم اس سے نفع بھی اٹھاتے ہو اور دور بھی رہتے ہو، اس کے قریب تک نہیں جاتے کیونکہ اکثر حاکم اپنی ذات اور اپنے مفادات کے علاوہ کچھ اور دیکھنا پسند نہیں کرتے۔

تم حاکم کے قریب کثرتِ کلام سے بچو کہ وہ تمہاری گرفت کرے گا تا کہ اپنے حاشیہ نشینوں کو یہ دکھلا سکے کہ وہ تم سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ اور تمھارا محاسبہ کرے گا تا کہ تم اس کے حواریوں کی نظروں میں حقیر ہو جاؤ۔ بلکہ ایسا طرز عمل اختیار کرو جب اس کے دربار میں جاؤ تو وہ دوسروں کے مقابلے میں تمہارے رتبہ کا خیال رکھے۔ اور سلطان کے دربار میں کسی ایسے وقت نہ جاؤ جب وہاں دیگر ایسے اہل علم موجود ہوں جن کو تم جانتے نہ ہو۔ اس لئے کہ اگر تمھارا علمی رتبہ ان سے کم ہوگا تو ممکن ہے کہ تم ان پر برتری ثابت کرنے کی کوشش کرو مگر یہ جذبہ تمھارے لئے نقصان دہ ہوگا۔ اگر تم ان سے زیادہ صاحبِ علم ہو تو شاید تم ان کو کسی بات پر جھڑک دو اور اس وجہ سے تم حاکمِ وقت کی نظروں سے گر جاؤ۔

جب سلطانِ وقت تمھیں کوئی منصب عطا کرے تو اس وقت تک قبول نہ کرنا جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ وہ تم سے یا تمھارے مسلک سے علم و قضایا کے بارے میں مطمئن ہے تا کہ فیصلوں میں کسی دوسرے مسلک پر عمل کی حاجت نہ ہو۔ اور سلطان کے مقربین اور اس کے حاشیہ نشینوں سے میل جول مت رکھنا، صرف سلطانِ وقت سے رابطہ رکھنا اور اس کے حاشیہ برداروں سے الگ رہنا تا کہ تمھارا وقار اور عزت برقرار رہے۔

عوام کے ساتھ محتاط طرزِ عمل:

عوام کے پوچھے گئے مسائل کے علاوہ ان سے بلاضرورت بات چیت نہ کیا کرو۔ عوام الناس اور تاجروں سے علمی باتوں کے علاوہ دوسری باتیں نہ کیا کرو تا کہ ان کو تمھاری محبت و رغبت میں مال کا لالچ نظر نہ آئے ورنہ لوگ تم سے بدظن ہوں گے اور یقین کر لیں گے کہ تم ان سے رشوت لینے کا میلان رکھتے ہو۔ عام لوگوں کے سامنے ہنسنے اور زیادہ مسکرانے سے باز رہو اور بازار میں بکثرت جایا نہ کرو۔ بیریش لڑکوں سے زیادہ بات چیت

نہ کیا کرو کہ وہ فتنہ ہیں البتہ چھوٹے بچوں سے بات کرنے میں کوئی حرج نہیں بلکہ ان کے سروں پر شفقت سے ہاتھ پھیرا کرو۔

عام لوگوں اور بوڑھے لوگوں کے ساتھ شاہراہ پر نہ چلو، اس لئے کہ اگر تم ان کو آگے بڑھنے دو گے تو اس سے علم دین کی بے توقیری ظاہر ہوگی اور اگر تم ان سے آگے چلو گے تو یہ بات بھی معیوب ہوگی کہ وہ عمر میں تم سے بڑے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ "جو شخص چھوٹوں پر شفقت نہیں کرتا اور بزرگوں کی عزت نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں ہے"۔

کسی راہگذر پر نہ بیٹھا کرو اور اگر بیٹھنے کا دل چاہے تو مسجد میں بیٹھا کرو۔ بازاروں اور مساجد میں کوئی چیز نہ کھایا کرو۔ پانی کی سبیل اور وہاں پانی پلانے والوں کے ہاتھ سے پانی نہ پیو۔ مخمل، زیور اور انواع و اقسام کے ریشمی ملبوسات نہ پہنو کہ اس سے غرور پیدا ہوتا ہے اور رعونت جھلکتی ہے۔

ازدواجی آداب:

اپنی فطری حاجت کے وقت بقدرِ ضرورت گفتگو کے سوا بستر پر اپنی بیوی سے زیادہ بات نہ کرو۔ اور اس کے ساتھ کثرت سے لمس و مَس اختیار نہ کرو، اور جب بھی اسکے پاس جاؤ تو اللہ کے ذکر کے ساتھ جاؤ۔ اور اپنی بیوی سے دوسروں کی عورتوں کے بارے میں بات نہ کیا کرو کہ وہ تم سے بے تکلف ہو جائیں گی اور بہت ممکن ہے کہ جب تم دوسری عورتوں کا ذکر کرو گے تو وہ تم سے دوسرے مردوں کے متعلق بات کریں گی۔

اگر تمارے لئے ممکن ہو تو کسی ایسی عورت سے نکاح نہ کرو جس کے شوہر نے اس کو طلاق دی ہو اور باپ، ماں یا سابقہ خاوند سے لڑکی موجود ہو۔ لیکن صرف اس شرط پر کہ تمھارے گھر اس کا کوئی رشتہ دار نہیں آئے گا۔ اس لئے کہ جب عورت مال دار ہو جاتی ہے تو اس کا باپ دعویٰ کرتا ہے کہ اس عورت کے پاس جو بھی مال ہے وہ سب اس کا ہے اور اس عورت کے پاس امانت کے طور پر رکھا ہے۔ اور دوسری شرط یہ رکھے کہ جہاں تک ممکن ہو گا وہ بھی اپنے والد کے گھر نہیں جائے گی۔

اور نکاح کے بعد تم اس بات پر راضی نہ ہو جانا کہ تم شبِ زفاف سسرال میں گزارو گے ورنہ وہ لوگ تمھارا مال لے لیں گے اور اپنی بیٹی کے سلسلہ میں انتہائی لالچ سے کام لیں گے۔ اور صاحبِ اولاد خاتون سے شادی نہ کرنا کہ وہ تمام مال اپنی اولاد کے لئے جمع کرے گی اور ان پر ہی خرچ کرے گی اس لئے کہ اس کو اپنی اولاد تمھاری اولاد سے زیادہ پیاری ہوگی۔ تم اپنی دو بیویوں کو ایک ہی مکان میں نہ رکھنا، اور جب تک دو بیویوں کی تمام ضروریات کو پورا کرنے کی قدرت نہ ہو، دوسرا نکاح نہ کرنا۔

امورِ زندگی کی ترتیب:

(امورِ زندگی کی بہترین ترتیب یہ ہے کہ) پہلے علم حاصل کرو پھر حلال ذرائع سے مال جمع کرو اور پھر ازدواجی رشتہ اختیار کرو۔ علم حاصل کرنے کے زمانے میں اگر تم مال کمانے کی جد و جہد کرو گے تو تم حصولِ علم سے قاصر رہو گے۔ اور یہ مال تمہیں باندیوں اور غلاموں کی خریداری پر اکسائے گا اور تحصیلِ علم سے قبل ہی تمہیں دنیا کی لذتوں اور عورتوں کے ساتھ مشغول کردے گا، اس طرح تمھارا وقت ضائع ہو جائے گا۔ اور جب تمہارے اہل و عیال کی کثرت ہو جائے گی تو تمھیں ان کی ضروریات پوری کرنے کی فکر ہو جائے گی اور تم علم سیکھنا چھوڑ دو گے۔

اس لیے علم حاصل کرو آغازِ شباب میں جب کہ تمھارے دل و دماغ دنیا کے بکھیڑوں سے فارغ ہوں پھر مال کمانے کا مشغلہ اختیار کرو تاکہ شادی سے قبل تمہارے پاس بقدرِ ضرورت مال ہو کہ اسکے بغیر اہل و عیال کی ضروریات دل کو تشویش میں مبتلا کر دیتی ہیں لہٰذا کچھ مال جمع کرنے کے بعد ہی ازدواجی تعلق قائم کرنا چاہیے۔

سیرت و کردار کی تعمیر:

اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، ادائے امانت اور ہر خاص و عام کی خیر خواہی کا خصوصی خیال رکھو اور لوگوں کو عزّت دو تاکہ وہ تمھاری عزّت کریں۔ ان کی ملنساری سے پہلے ان سے زیادہ میل جول نہ رکھو اور ان سے میل جول میں مسائل کا تذکرہ بھی کرو کہ اگر مخاطب اس کا اہل ہوگا تو جواب دے گا۔ اور عام لوگوں سے دینی امور

کے ضمن میں علم کلام (عقائد کے عقلی دلائل) پر گفتگو سے پرہیز کرو کہ وہ لوگ تمھاری تقلید کریں گے اور علم کلام میں مشغول ہو جائیں گے۔

جو شخص تمھارے پاس استفتاء کے لئے آئے اس کو صرف اس کے سوال کا جواب دو اور دوسری کسی بات کا اضافہ نہ کرو ورنہ اس کے سوال کا غیر محتاط جواب تمھیں تشویش میں مبتلا کر سکتا ہے۔ علم سکھانے سے کسی حالت میں اعراض نہ کرنا اگرچہ تم دس سال تک اس طرح رہو کہ تمھارا نہ کوئی ذریع معاش ہو، نہ کوئی اکتسابی طاقت، کیونکہ اگر تم علم سے اعراض کرو گے تو تمھاری معیشت (گزربسر) تنگ ہو جائے گی۔

تم اپنے ہر فقہ سیکھنے والے طالب علم پر ایسی توجہ رکھو کہ گویا تم نے ان کو اپنا بیٹا اور اولاد بنالیا ہے تا کہ تم ان میں علم کی رغبت کے فروغ کا باعث بنو۔ اگر کوئی عام شخص اور بازاری آدمی تم سے جھگڑا کرے تو اس سے جھگڑا نہ کرنا ورنہ تمھاری عزت چلی جائے گی۔ اور اظہارِ حق کے موقع پر کسی شخص کی جاہ و حشمت کا خیال نہ کرو اگرچہ وہ سلطانِ وقت ہو۔

جتنی عبادت دوسرے لوگ کرتے ہیں اس سے زیادہ عبادت کرو، ان سے کمتر عبادت کو اپنے لئے پسند نہ کرو بلکہ عبادت میں سبقت اختیار کرو۔ کیونکہ عوام جب کسی عبادت کو بکثرت کر رہے ہوں اور پھر وہ دیکھیں کہ تمھاری توجہ اس عبادت پر نہیں ہے تو وہ تمھارے متعلق عبادت میں کم رغبت ہونے کا گمان کریں گے اور یہ سمجھیں گے کہ تمھارے علم نے تمھیں کوئی نفع نہیں پہنچایا سوائے اسی نفع کے جو ان کو انکی جہالت نے بخشا ہے جس میں وہ مبتلا ہیں۔

معاشرتی آداب:

جب تم کسی ایسے شہر میں قیام کرو جس میں اہلِ علم بھی ہوں تو وہاں اپنی ذات کے لئے کسی امتیازی حیثیت کو اختیار نہ کرو، بلکہ اس طرح رہو کہ گویا تم بھی ایک عام سے شہری ہو، تا کہ ان کو یقین ہو جائے کہ تمھیں ان کی جاہ و منزلت سے کوئی سروکار نہیں ہے ورنہ اگر انہوں نے تم سے اپنی عزت کو خطرے میں محسوس کیا تو وہ سب

تمھارے خلاف کام کریں گے اور تمھارے مسلک پر کیچڑ اچھالیں گے اور (ان کی شہ پر) عوام بھی تمھارے خلاف ہو جائیں گے اور تمھیں بری نظر سے دیکھیں گے جس کی وجہ سے تم ان کی نظروں میں کسی قصور کے بغیر مجرم بن جاؤ گے۔

اگر وہ تم سے مسائل دریافت کریں تو ان سے مناظرہ یا جلسہ گاہوں میں بحث و تکرار سے باز رہو اور جو بات ان سے کرو، واضح دلیل کے ساتھ کرو۔ اور ان کے اساتذہ کو طعنہ نہ دو، ورنہ تمھارے اندر بھی کیڑے نکالیں گے۔ تمہیں چاہیے کہ لوگوں سے ہوشیار رہو اور اپنے باطنی احوال کو اللہ تعالیٰ کے لیے ایسا خالص بنالو جیسا کہ تمھارے ظاہری احوال ہیں۔ اور علم کا معاملہ اصلاح پذیر نہیں ہوتا تاوقتیکہ تم اس کے باطن کو اس کے ظاہر کے مطابق نہ بنالو۔

آدابِ زندگی:

جب سلطانِ وقت تمھیں کوئی ایسا منصب دینا چاہے جو تمھارے لیے مناسب نہیں ہے تو اسے اس وقت تک قبول نہ کرو جب تک کہ تمھیں یہ معلوم نہ ہو جائے کہ اس نے جو منصب تمھیں سونپا ہے وہ محض تمھارے علم کی وجہ سے سونپا ہے۔ اور مجلس فکر و نظر میں ڈرتے ہوئے کلام مت کرو کیونکہ یہ خوفزدگی کلام میں اثر انداز ہوگی اور زبان کو ناکارہ بنادے گی۔

زیادہ ہنسنے سے پرہیز کرو کیونکہ زیادہ ہنسنا دل کو مردہ بنا دیتا ہے۔ چلنے کے دوران سکون و اطمینان سے چلو اور امورِ زندگی میں زیادہ عجلت پسند نہ بنو اور جو تمھیں پیچھے سے آواز دے اس کی آواز کا جواب مت دو کہ پیچھے سے آواز چوپایوں کو دی جاتی ہے۔ اور گفتگو کے وقت نہ چیخو اور نہ ہی اپنی آواز کو زیادہ بلند کرو۔ سکون اور قلتِ حرکت کو اپنی عادات میں شامل کرو تا کہ لوگوں کو تمھاری ثابت قدمی کا یقین ہو جائے۔

لوگوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کرو تا کہ لوگ تم سے اس خوبی کو حاصل کر لیں۔ اور اپنے لئے نماز کے بعد ایک وظیفہ مقرر کر لو جس میں تم قرآن کریم کی تلاوت کرو اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو۔ اور صبر و

استقامت کی دولت جو رب کریم نے تم کو بخشی ہے اور دیگر جو نعمتیں عطا کی ہیں، ان پر اس کا شکر ادا کرو اور اپنے لئے ہر ماہ کے چند ایام روزہ کے لئے مقرر کرلو تا کہ دوسرے لوگ اس میں بھی تمھاری پیروی کریں۔

اپنے نفس کی دیکھ بھال رکھو اور دوسروں کے رویہّ پر بھی نظر رکھو تا کہ تم اپنے علم کے ذریعہ سے دنیا اور آخرت میں نفع اٹھاؤ۔ تمہیں چاہیے کہ بذاتِ خود خرید و فروخت مت کرو بلکہ اس کے لئے ایک ایسا خدمت گار رکھو جو تمھاری ایسی حاجتوں کو بحسن وخوبی پورا کرے اور تم اس پر اپنے دنیاوی معاملات میں اعتماد کرو۔ اپنے دنیاوی معاملات اور خود کو در پیش صورت حال کے بارے میں بے فکر مت رہو کیونکہ اللہ تعالیٰ تم سے ان تمام چیزوں کے بارے میں سوال کرے گا۔

سلطانِ وقت سے اپنے خصوصی تعلق کو لوگوں پر ظاہر نہ ہونے دو اگر چہ تمھیں اس کا قرب حاصل ہو ورنہ لوگ تمھارے سامنے اپنی حاجتیں پیش کریں گے اور اگر تم نے لوگوں کی حاجتوں کو اس کے دربار میں پیش کرنا شروع کر دیا تو وہ تمھیں تمھارے مقام سے گرا دے گا اور اگر تم نے ان کی حاجتوں کی تکمیل کے لیے کوشش نہ کی تو حاجت مند تمھیں الزام دیں گے۔

آدابِ وعظ و نصیحت:

غلط باتوں میں لوگوں کی پیروی نہ کرو بلکہ صحیح باتوں میں ان کی پیروی کرو۔ جب تم کسی شخص میں برائی دیکھو تو اس شخص کا تذکرہ اس برائی کے ساتھ نہ کرو بلکہ اس سے بھلائی کی امید رکھو۔ اور جب وہ بھلائی کرے تو اس کی اس بھلائی کا ذکر کرو۔ البتہ اگر تمہیں اس کے دین میں خرابی معلوم ہو تو لوگوں کو اس سے ضرور آگاہ کر دو تا کہ لوگ اس کی اتباع نہ کریں اور اس سے دور رہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی ہے کہ فاسق و فاجر آدمی جس برائی میں مبتلا ہے اسے بیان کرو تا کہ لوگ اس سے بچیں اگر چہ وہ شخص صاحبِ جاہ و منزلت ہو۔ اس طرح جس شخص کے دین میں تم خلل دیکھو اسے بھی بیان کرو، اور اس کے عزت و مرتبہ کی پرواہ نہ کرو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمھارا اور اپنے دین کا معین اور مددگار ہے۔ اگر تم ایک مرتبہ ایسا کر دو گے تو وہ لوگ تم سے ڈریں

گے اور کوئی شخص دین میں نئے گمراہ کن افکار و اعمال کے اظہار کی جسارت نہیں کر سکے گا۔

جب تم سلطانِ وقت سے خلافِ دین کوئی بات دیکھو تو اس کو اپنی اطاعت اور وفاداری کا یقین دلاتے ہوئے آگاہ کر دو۔ یہ اظہارِ وفاداری اس وجہ سے ہے کہ اس کا ہاتھ تمھارے ہاتھ سے زیادہ قوی ہے۔ چنانچہ تم اس طرح اظہارِ خیال کرو کہ جہاں تک آپ کے اقتدار اور غلبہ کا تعلق ہے میں آپ کا فرماں بردار ہوں بجز اس کے کہ میں آپ کی فلاں عادت کے سلسلہ میں جو دین کے مطابق نہیں ہے آپ کی توجہ مبذول کراتا ہوں۔ اگر تم نے ایک بار سلطان و حاکم کے ساتھ اس جرات سے کام لیا تو وہ تمھارے لئے کافی ہوگی، اس لئے کہ تم اگر اس سے بار بار کہو گے تو وہ شاید تم پر سختی کرے اور اس میں دین کی ذلت ہوگی۔

اگر وہ ایک بار یا دو بار سختی سے پیش آئے اور تمھاری دینی جد و جہد کا اور امر بالمعروف میں تمھاری رغبت کا اندازہ کرے اور اس وجہ سے وہ دوسری مرتبہ خلافِ دین حرکت کرے تو اس سے اس کے گھر پر تنہائی میں ملاقات کرو اور دین کی رو سے نصیحت کا فریضہ ادا کرو۔ اگر حاکمِ وقت مبتدع ہے تو اس سے دو بدو بحث کرو اگرچہ وہ سلطان ہے اور اس سلسلہ میں کتاب و سنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں سے جو تمھیں یاد ہو اسے یاد دلاؤ۔ اگر وہ ان باتوں کو قبول کر لے تو ٹھیک ہے ورنہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ اس سے تمھاری حفاظت فرمائے۔

تم موت کو یاد رکھو اور اپنے ان اساتذہ کے لئے جن سے تم نے علم حاصل کیا ہے، استغفار کیا کرو اور قرآن مجید کی تلاوت کرتے رہو۔ قبرستان، مشائخ اور بابرکت مقامات کی کثرت سے زیارت کیا کرو اور عام مسلمانوں کے ان خوابوں کو جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صالحین سے متعلق تمھیں سنائے جائیں، خواہ مسجد ہو یا قبرستان یعنی ہر جگہ توجہ سے سنو اور نفس پرستوں میں سے کسی کے پاس نہ بیٹھو۔ سوائے اسکے کہ کسی کو دین کی طرف بلانا ہو۔ کھیل کود اور گالم گلوچ سے اجتناب کرو اور جب مؤذن اذان دے تو عوام سے قبل مسجد میں داخل ہونے کی تیاری کرو تا کہ عام لوگ اس بات میں تم سے آگے نہ نکل جائیں۔

سلطانِ وقت کے قرب جوار میں رہائش اختیار نہ کرو۔ اگر اپنے ہمسائے میں کوئی بری بات دیکھو تو پوشیدہ رکھو کہ یہ بھی امانت داری ہے اور لوگوں کے بھید ظاہر نہ کرو اور جو شخص تم سے کسی معاملہ میں مشورہ لے تو اس کو اپنے علم کے مطابق صحیح مشورہ دو کہ یہ بات تم کو اللہ کے قریب کرنے والی ہے اور میری اس وصیّت کو اچھی طرح یاد رکھنا کہ یہ وصیّت تمھیں اِنشاءاللہ، دنیا اور آخرت میں نفع دے گی۔

اخلاقِ حسنہ:

بخل سے اجتناب کرو کہ اس کی وجہ سے انسان دوسروں کی نظروں میں گر جاتا ہے۔ لالچی اور دروغ گو نہ بنو۔ حق و باطل (یا مذاق و سنجیدگی) کو آپس میں خلط ملط نہ کیا کرو بلکہ تمام امور میں اپنی غیرت وحمیّت کی حفاظت کرو۔ اور ہر حال میں سفید لباس زیب تن کرو۔ اپنی طرف سے حرص سے دوری اور دنیا سے بے رغبتی ظاہر کرتے ہوئے دل کا غنی ہونا ظاہر کرو۔ اور اپنے آپ کو مال دار ظاہر کرو اور تنگ دستی ظاہر نہ ہونے دو اگرچہ فی الواقع تم تنگ دست ہو۔

باہمت بنو اور جس شخص کی ہمت کم ہو گی اس کا درجہ بھی کم ہو گا اور راہ چلتے دائیں بائیں توجہ نہ کرو بلکہ ہمیشہ زمین کی جانب نظر رکھو اور جب تم حمام میں داخل ہو تو حمام اور نشست گاہ کی اجرت دوسرے لوگوں سے زیادہ دو تاکہ ان پر تمھاری اعلیٰ ہمتی ظاہر ہو اور وہ تمھیں باعظمت انسان خیال کریں۔ اور اپنا سامانِ تجارت کاریگروں کے پاس جا کر خود ان کے حوالے نہ کیا کرو بلکہ اسکے لیے ایک بااعتماد ملازم رکھو جو یہ امور انجام دیا کرے اور درہم و دینار کی خرید وفروخت میں ذہانت سے کام لو یعنی لین دین میں چوکس رہو اور اپنے حق کے لئے کوشش کرو۔

نیز درہموں کا وزن خود نہ کیا کرو بلکہ اس معاملہ میں بھی کسی بااعتماد شخص سے کام لو۔ اور متاعِ دنیا جس کی اہل علم کے نزدیک کوئی قدر نہیں ہے، اسے حقیر جانو کہ اللہ کے پاس جو نعمتیں ہیں وہ دنیا سے بہتر ہیں۔ غرضیکہ اپنے دنیاوی معاملات کسی دوسرے شخص کے سپرد کر دو تاکہ تمھاری توجہ علم دین پر پوری طرح مرکوز رہے۔ یہ طرزِ عمل

تمھاری ضروریات کی تکمیل کا زیادہ محافظ ہے۔

پاگلوں سے اور ان اہل علم سے جو حجت اور مناظرہ کے اسلوب سے بے بہرہ ہیں کلام نہ کرو۔ اور وہ لوگ جو جاہ پرست ہیں اور لوگوں کے معاملات میں عجیب و غریب مسائل کا ذکر کرتے رہتے ہیں، وہ تمھیں کسی طرح نیچا دکھانے کے خواہش مند ہوں گے اور اپنی انا کے مقابلہ میں وہ تمھاری کوئی پرواہ نہیں کریں گے اگرچہ وہ سمجھ لیں گے کہ تم حق پر ہو۔

اور جب بھی کسی بڑے رتبہ والے کے پاس جاؤ تو ان پر برتری حاصل کرنے کی کوشش نہ کرنا جب تک کہ وہ خود تمھیں بلند جگہ نہ عطا کر دیں تا کہ ان کی طرف سے تم کو کوئی اذیت نہ پہنچے۔ کسی قوم میں نماز کی امامت کے لئے پیش قدمی نہ کرو جب تک کہ وہ خود تمھیں ازراہِ تعظیم مقدم نہ کریں۔ اور حمام میں دوپہر یا صبح کے وقت داخل نہ ہو اور سیر گاہوں میں بھی نہ جایا کرو (کہ وہ عوام کی جگہیں ہیں)۔

آدابِ مجلس:

سلاطین کے مظالم کے وقت وہاں حاضر نہ رہا کرو سوائے اس کے کہ تمہیں یقین ہو کہ اگر تم ان کو ٹوکو گے تو وہ انصاف کریں گے۔ بصورتِ دیگر وہ تمھاری موجودگی میں کوئی ناجائز کام کریں گے اور بسا اوقات انھیں ٹوکنے کی تمھیں قدرت و ہمت نہ ہو گی تو لوگ تمھاری خاموشی کی بناء پر گمان کریں گے کہ سلاطین کا وہ ناجائز کام برحق ہے۔

علمی مجلس میں غصہ سے اجتناب کرو۔ اور عام لوگوں کو قصّہ کہانیاں سنانے کا مشغلہ اختیار نہ کرو کہ قصّہ گو کو جھوٹ بولے بغیر چارہ نہیں۔ جب تم کسی اہل علم کے ساتھ علمی نشست کا ارادہ کرو اور وہ فقہی مجلس ہے تو اس میں بیٹھو اور وہاں ان باتوں کو بیان کرو جو مخاطب کے لئے تعلیم کا حکم رکھتی ہوں تا کہ تمھاری حاضری سے لوگوں کو یہ دھوکہ نہ ہو کہ تمھارا ہم نشیں کوئی عالم ہے جب کہ وہ درحقیقت عالم نہ ہو۔ اور اگر وہ شخص فتویٰ سمجھنے کا اہل ہے تو فتویٰ بیان کرو ورنہ ضرورت نہیں ہے۔ اور اس مقصد کے لئے کہیں نہ بیٹھو کہ کوئی دوسرا شخص تمھاری

موجودگی میں درس دیا کرے بلکہ اس کے پاس اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو بٹھا دو تا کہ وہ تمھیں اس کی گفتگو کی کیفیت اور اور اس کے علم کے بارے میں بتا دے۔

ذکر کی مجالس میں یا اس شخص کی مجلسِ وعظ میں حاضری نہ دو جو تمھاری جاہ و منزلت یا تمھاری جانب سے اپنے تزکیہ نفس کی نسبت سے مجلس قائم کرے بلکہ ان کی جانب اپنے شاگردوں میں سے کسی ایک شخص کی معیت میں اپنے اہل محلّہ اور اپنے عوام کو جن پر تمھیں اعتماد ہے متوجہ کرو (کہ وہ وہاں جایا کریں)۔اور نکاح خوانی کا کام کسی خطیب کے حوالے کر دو اسی طرح نماز جنازہ اور عیدین کی امامت بھی کسی اور شخص کے حوالے کر دو۔

(آخری بات یہ کہ) ہمیں اپنی نیک دعاؤں میں فراموش نہ کرنا اور ان نصیحتوں کو میری جانب سے قبول کرو کہ یہ تمھارے اور دوسرے مسلمانوں کے فائدے کے لئے ہیں۔

امام صاحب کے درس کی خصوصیات امام ابو یوسف کے درس میں

امام صاحب رحمہ اللہ اپنے معاصرین سے جہاں بہت سی چیزوں میں ممتاز تھے، وہاں ایک امتیاز یہ بھی تھا کہ وہ طلبہ کے ساتھ نہایت خیر خواہی اور حسنِ سلوک کے ساتھ پیش آتے تھے، ان کی تعلیم میں نہ بخل سے کام لیتے تھے، نہ تضیع اوقات کرتے تھے، بلکہ کوشش کرتے تھے کہ وہ اپنے فن میں بڑی سے بڑی شان امتیاز حاصل کرلیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے ایسے صاحب علم و فضل، ذہین و طباع تلامذہ دوسرے ائمہ کو نہیں ملے، امام صاحب نے اپنے تلامذہ سے کہہ دیا تھا کہ استاد و مربی ہونے کے باوجود میری کسی بات کو بغیر دلیل اور حجت کے نہ ماننا، استاد کے یہ اوصاف بڑی حد تک شاگردوں میں بھی موجود تھے اور وہ بھی اپنے تلامذہ کے ساتھ نہایت فیاضانہ برتاو کرتے تھے، امام محمد بن حسن کے حالات میں مذکور ہے کہ وہ امام شافعی اور امام مالک کے مشہور افریقی شاگرد اسد بن فرات کو مجلس درس کے مقررہ اوقات کے علاوہ رات کو گھر پر پڑھاتے تھے اور ان کو کوئی ناگواری نہیں ہوتی تھی، اسد کو مالی امداد کی ضرورت ہوتی تھی تو اس سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے، امام

شافعی کہتے تھے:

امام محمد سے زیادہ میرے اوپر کسی نے احسان نہیں کیا۔

امام ابو یوسف رحمہ اللہ پر بھی استاد کا پرتو پڑا تھا، وہ بھی طلبہ کے ساتھ نہایت لطف و مہربانی سے پیش آتے تھے ان کے سوالات کا نہایت خندہ پیشانی اور کمال حلم و صبر کے ساتھ جواب دیتے تھے اور ان کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے تھے، حسن بن زیاد جو امام صاحب کی شاگردی میں رہ چکے تھے، ان کی وفات کے بعد امام ابو یوسف اور امام زفر کے پاس استفادہ کے لیے آتے تھے، امام ابو یوسف کے بارے میں فرماتے ہیں کہ:

كَانَ ابو يوسف اوسع صدرً ابالتعليم من زفر .(٤٧)

ترجمہ: ابو یوسف تعلیم کے بارے میں زفر سے زیادہ کشادہ دل اور وسیع الظرف تھے۔

انہی کا بیان ہے کہ میرے سامنے جب کوئی مشکل مسئلہ آتا تو پہلے امام زفر کے پاس جاتا، ان سے دریافت کرتا، وہ جواب دیتے، میری سمجھ میں نہ آتا تو دوبارہ پوچھتا، یہاں تک کہ جب وہ تکرارِ سوال سے زچ ہو جاتے تو فرماتے کہ تمہارے لیے یہ فن نہیں ہے، وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ ہے، تمہارے ذہن و دماغ کا یہی حال ہے، تو مجھے امید نہیں ہے کہ تم حصولِ علم میں کامیاب ہو گئے، میں وہاں سے بہت غمگین واپس ہوتا اور پھر امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی خدمت میں جا کر مسئلہ دریافت کرتا، جب ان کا حل بھی میری سمجھ میں نہ آتا تو فرماتے اچھا گھبراو نہیں کیا تم کو اس مسئلہ کے مبادیؔ سے بھی واقفیت نہیں ہے، کہتا کہ اس کے بہت سے گوشوں سے واقف تو ضرور ہوں، لیکن جو واقفیت اور جو اطمینان چاہتا ہوں وہ حاصل نہیں ہوتا اور دل میں خلش باقی رہتی ہے، فرماتے کہ ہر ناقص چیز بتدریج اتمام و اکمال کو پہنچتی ہے، صبر سے کام لو، ذہن و دماغ پر زور ڈالو، امید ہے کہ تم رفتہ رفتہ اپنے گوہر مقصود کو پالو گے، حسن کہتے ہیں کہ میں ان کے اس صبر و حلم پر متعجب رہتا، شاگردوں سے فرماتے تھے کہ:

لو استطعت ان اشاطركم مافي قلبي لفعلت .(٤٨)

میرے قطب ودماغ میں جو کچھ علم (فضل) ہے اگر اسے تم لوگوں (تلامذہ) میں تقسیم کر سکتا تو تقسیم کر دیتا۔

اس سے تلامذہ کے ساتھ ان کی غیر معمولی دلسوزی، ہمدردی اور تعلقِ خاطر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، جب تک عہدہ قضا پر مامور نہیں ہوئے تھے، درس وافادہ کا کام یکسوئی سے انجام دیتے رہے، مگر جب قضاء کی ذمہ داری سنبھال لی اور اس کے کاموں میں مشغول ہو گئے تو ظاہر ہے کہ وہ یکسوئی اور انہماک باقی نہیں رہ سکتا تھا، لیکن پھر بھی اس سے جو وقت بچتا تھا، وہ افادہ وتعلیم ہی میں صرف ہوتا تھا، یہاں تک کہ حالت سفر میں بھی یہ فیض جاری رہتا تھا، ایک بار بصرہ تشریف لے گئے تو بڑا ہجوم ہوا، اصحاب حدیث چاہتے تھے کہ پہلے وہ استفادہ کریں اور اصحاب فقہ چاہتے تھے کہ پہلے ان کو خطاب کیا جائے، فرمایا میں دونوں گروہوں سے تعلق رکھتا ہوں، کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دے سکتا، اس کے بعد انہوں نے ایک سوال کیا، جن لوگوں نے جواب دیا ان کو اندر لے گئے اور دیر تک یہ مجلس درس وافادہ جاری رہی (۴۹)

حج کے لیے تشریف لے گئے تو وہاں بھی درس وافادہ کا سلسلہ جاری تھا، امام مالک سے اسی سفر میں انہوں نے ملاقات کی اور دونوں میں علمی باتیں ہوئیں، غرض یہ کہ انہوں نے کوئی مخصوص مجلس درس تو قائم نہیں کی مگر تعلیم وافادہ اور درس وتدریس کا مشغلہ پوری زندگی جاری رہا، حتی کہ موت سے چند لمحے پہلے تک یہ چشمہ فیض جاری تھا، ان کے خاص شاگرد قاضی ابراہیم بن الجراح کا بیان ہے کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ جب آخری بار بیمار پڑے تو میں برابر ان کی عیادت کے لیے جایا کرتا، ایک روز گیا تو وہ بے ہوش پڑے تھے، ذرا ہوش ہوا تو فرمایا: ابراہیم! پیدل رمی جمار کرنا بہتر ہے یا سوار ہو کر، عرض کیا پیدل، فرمایا: غلط ہے، میں نے پھر عرض کیا، سوار ہو کر، ارشاد ہوا یہ بھی غلط ہے، پھر انہوں نے مسئلہ کی پوری تفصیل بیان کی، ان کی خدمت سے اٹھ کر ابھی دروازہ سے باہر نکلا بھی نہیں تھا کہ اندر سے آواز آئی کہ امام کی وفات ہو گئی۔

ظاہر ہے کہ جس کا چشمہ علم تقریباً ۳۲ برس تک مسلسل جاری رہا ہو، اس سے پوری مملکتِ اسلامیہ کے

نہ معلوم کتنے تشنگانِ علم نے اپنی پیاس رفع کی ہوگی، ان سب کے ناموں کا معلوم اور جمع کرنا بڑا مشکل اور دشوار کام ہے، مگر جو نام تذکروں میں ملتے ہیں، ان کی تفصیل بھی طوالت سے خالی نہیں، چند ممتاز اور مشہور تلامذہ و طالبانِ علم کے نام درجِ ذیل ہیں:

قاضی ابراہیم بن جراح مازنی، ابراہیم بن سلم الطیالسی، ابراہیم بن یوسف بن میمون البلخی، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ میں نے تین الماریوں کے بقدر کتابوں کا علم ان سے حاصل کیا ہے، اسد بن فرات امام مالک رحمہ اللہ کے مشہور شاگرد اسماعیل بن حماد، امام صاحب رحمہ اللہ کے پوتے، اشرف بن سعید نیشاپوری، بشار بن موسیٰ بصری، بشر بن یزید نیشاپوری، نویرن سعد مروزی، جعفر بن یحییٰ برمکی (ہارون کا مشہور وزیر)، حسن بن زیاد الحسین بن ابراہیم بغدادی، حسین ابن حفص اصفہانی، ابوالخطاب (امام ابو یوسف کے کاتب یعنی پرائیوٹ سکریٹری)، خلف بن ایوب بلخی، داود بن رشید خوارزمی، سعید بن الربیع ہروی، شجاع بن مخلد، ابوالعباس طوسی، عبدالرحمٰن بن مہر، عبدالرحمٰن بن عبدی، عبدوس بن بشر الرازی، عثمان بن بحر الجاحظ، عرزم ابن فروہ، حافظ علی جعد الجوہری، علی بن حرملہ کوفی، علی بن صالح جرجانی، علی بن المدینی (مشہور حافظِ حدیث)، علی بن مسلم طوسی، عمرو بن ابی عمرو حرانی، فضیل بن عیاض، امام محمد بن حسن شیبانی، محمد بن ابی رجاء خراسانی، موسیٰ بن سلیمان جوزجانی، وکیع بن الجراح، ہلال بن یحییٰ بصری (صاحب احکام الوقف)، یحییٰ بن آدم (صاحب کتاب الخراج)، یحییٰ بن معین (امام جرح وتعدیل)، یوسف (امام کے صاحبزادے جو کتاب الآثار کے راوی ہیں)۔

امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کی دو ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے، ایک مدینہ منورہ میں اور دوسری بغداد میں، بغداد میں امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کی ملاقات بالکل افسانہ ہے، اس لیے کہ امام شافعی رحمہ اللہ عراق میں پہلی بار سنہ ۱۸۴ھ میں گئے ہیں، جب کہ دو سال پہلے سنہ ۱۸۲ھ میں امام ابو یوسف کا انتقال ہو چکا تھا، پھر وہ امام فن کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک معمولی طالب علم کی حیثیت سے امام محمد

کی خدمت میں گئے تھے، خود فرماتے ہیں کہ میں نے محمد بن حسن سے ایک اونٹ کے برابر علم حاصل کیا، میری آنکھوں نے ان کے جیسا کسی کو نہیں پایا، ظاہر ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ جو امام محمد کی شاگردی کے لیے گئے تھے، ان کا امام ابو یوسف بفرض محال وہ زندہ بھی ہوتے تو مناظرہ کرنا اور پھر ان کو ساکت کر دینا کس طرح سمجھ میں آسکتا ہے، جب کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ ان کے استاد امام محمد رحمہ اللہ کے بھی استاد تھے، اس روایت کی تردید کرتے ہوئے حافظ ابنِ کثیر اور حافظ ابن حجر نے جو کچھ لکھا ہے، اس کو ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

ومن زعم من الرواة أن الشافعي اجتمع بأبي يوسف كما يقول عبد الله بن محمد البلوى الكذاب في الرحلة التي ساقها الشافعي فقد أخطأ في ذلك، أنما ورد الشافعي بغداد في أول قدمة قدمها أليهافي سنة أربع وثمانين.(٥٠)

ترجمہ: جن راویوں نے یہ گمان کیا ہے کہ امام شافعی اور امام ابو یوسف میں ملاقات ہوئی جیسا کہ عبداللہ بن محمد البلوی کذاب (عبداللہ بن محمد بلوی کے متعلق حافظ ابن کثیر کی اس رائے کی تائید میں امام ذہبی نے میزان میں دارِقطنی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ حدیث وضع کرتا تھا، ابن حجر نے جو لکھا ہے وہ آگے منقول ہے) نے ایک فرضی سفر امام شافعی کی طرف منسوب کیا ہے، اس نے اس میں ایک فاش غلطی کی ہے، بغیر کسی شبہ کے یہ بات مسلم ہے کہ امام شافعی پہلی بار بغداد میں سنہ ۱۸۴ھ میں گئے، اس سے دو برس پہلے امام ابو یوسف کا انتقال ہو چکا تھا۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ جو خود شافعی المسلک ہیں انہوں نے امام شافعی کی سوانح عمری میں جو مستقل کتاب توالی التاسیس کے نام سے لکھی ہے، اس میں اس واقعہ کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وأماالرحلة المنسوبة ألى الشافعي المروية من طريق عبد الله بن محمد البلوى فقد أخرجها الآبرى والبيهقي، وغيرهما، مطولة ومختصرة، وساقها الفخر الرازى في مناقب الشافعي بغير أسناد معتمدا عليها، وهي مكذوبة، وغالب مافيها موضوع، وبعضها

ملفق من روايات ملفقة، وأوضح مافيها من الكذب قوله فيها: أن أبايوسف ومحمد بن الحسن حرضا الرشيد عل قتل الشافعي، وهذا باطل من وجهين: أحدهما: أن أبايوسف لمادخل الشافعي ببغداد كان مات ولم يجتمع به الشافعي، والثاني: إنهما كانا أتقى لله من أن يسعيا في قتل رجل مسلم، لاسيما وقد اشتهر بالعلم وليس له إليهما ذنب إلاالحسد له على ماآتاه الله من العلم، هذا مالايظن بهما، وإن منصبهما وجلالتهما وماشتهر من دينهما ليصد عن ذلك والذى تحرر لنا بالطرق الصحيحة أن قدوم الشافعي بغداد أول ماقدم كان سنة أربع وثمانين، وكان أبويوسف قد مات قبل ذلك بسنتين. (۵۱)

ترجمہ: اور عبداللہ بن محمد البلوی کے واسطہ سے جو سفر نامہ امام شافعی کی طرف منسوب ہے اس کو آبری اور بیہقی وغیرہ نے مفصل اور مختصر طور پر نقل کیا ہے اور امام رازی نے اپنی کتاب مناقب الشافعی میں بغیر کسی سند کے اس کو صحیح سمجھ کر نقل کر دیا ہے، وہ بالکل افسانہ ہے، سب سے بڑا جھوٹ جو اس میں بولا گیا ہے وہ یہ ہے کہ امام ابو یوسف اور امام محمد نے ہارون رشید کو امام شافعی کے قتل پر اکسایا، یہ بات دو وجوہ کی بنا پر بالکل رد کر دینے کے قابل ہے، ایک تو یہ کہ جس وقت امام شافعی بغداد پہنچے تھے اس وقت امام ابو یوسف کا انتقال ہو چکا تھا اور ان سے ملاقات نہیں ہوئی، دوسری یہ کہ ان دونوں بزرگوں کے دلوں میں جو خدا کا خوف اور تقویٰ تھا اس سے بالکل مستبعد تھا کہ وہ ان کے قتل کی کوشش کرتے اور پھر ایک ایسے مسلمان کے قتل کی کوشش کرتے جس کا کوئی گناہ نہیں تھا، ان کے بارے میں اس کا گمان ہی نہیں کیا جا سکتا، ان کا منصب، ان کی جلالت اور ان کی انسانیت دوستی کی جو شہرت ہے یہ تمام چیزیں قطعی اس کی تردید کرتی ہیں اور یہ بات صحیح طریقوں سے ہمارے نزدیک ثابت ہے کہ امام شافعی سنہ ۱۸۴ھ میں پہلی بار بغداد گئے اور امام ابو یوسف اس سے دو سال پہلے انتقال کر چکے تھے (ان تصریحات کے باوجود ابتک اہلِ علم اپنی کتابوں میں اسے نقل کرتے ہیں اور بعض جگہ طلبہ کو پڑھاتے ہیں)۔

رجال کے سلسلہ میں حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ کی رائے کا جو وزن ہے اس سے اہلِ علم واقف ہیں، پھر ان کے ساتھ امام سخاوی جو رجال وحدیث کے دوسرے نقاد ہیں وہ اپنی کتاب مقاصد حسنہ میں اس روایت کی تکذیب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وَهِيَ مَوضوعةٌ مكذوبة ترجمہ: یہ موضوع اور سراسر جھوٹ ہے۔

امام ابن تیمیہ نے بھی منہاج السنہ میں اس کی تردید کی ہے۔

مدینہ منورہ میں ان کی ملاقات کی جو روایت ہے، اس میں یہ الفاظ ہیں کہ امام مالک کی موجودگی میں امام ابو یوسف اور امام شافعی سے صاع، وقف اور اقامت کے بارے میں مباحثہ ہوا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امام ابو یوسف نے امام شافعی کے مسلک کی طرف رجوع کر لیا۔(۵۲)

اوپر بار بار ذکر آ چکا ہے کہ امام شافعی پہلی بار سنہ ۱۸۴ھ میں جب بغداد گئے ہیں، تو اس وقت وہ طالب علم تھے اور امام ابو یوسف اس سے دو برس پہلے انتقال فرما چکے تھے، ظاہر ہے کہ مدینہ منورہ میں ان حضرات کی ملاقات اس سے پہلے ہی ہوئی ہوگی، کیونکہ اس روایت میں امام مالک کی موجودگی کا بھی ذکر ہے اور وہ سنہ ۱۷۹ھ میں وفات پا چکے تھے، پھر تمام اہلِ تذکرہ لکھتے ہیں کہ امام شافعی جب امام مالک کی خدمت میں گئے ہیں تو بہت کم سن تھے، اس لیے یہ کسی طرح قرین قیاس نہیں ہ کہ امام شافعی اس وقت کسی خاص مسلک کے حامل رہے ہوں گے، جس کو امام ابو یوسف نے اختیار کر لیا ہوگا، جب کہ اس کے کئی برس کے بعد جب امام محمد کے حلقہ درس میں گئے تو اس وقت بھی وہ ایک طالب علم ہی تھے، پھر امام مالک کی مجلس درس اور ان کی عام مجالس کے آداب سے جو لوگ واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ امام مالک کی مجلس میں کسی کو بلند آواز سے بولنے کی بھی اجازت نہیں تھی، ایسی صورت میں کسی شاگرد کو مناظرہ ومباحثہ کی اجازت کس طرح مل سکتی تھی، یہ امکان ضرور ہے کہ امام ابو یوسف اور امام شافعی کی ملاقات، مدینہ منورہ میں امام مالک کی خدمت میں ہوئی ہو، اس لیے کہ ان کی خدمت میں دونوں بزرگوں کا جانا اور کسب فیض کرنا بہر حال ثابت ہے، مگر اس روایت میں جو ہارون

رشید کی موجودگی کا ذکر ہے اس کے بارے میں امام بخاری لکھتے ہیں:

وكذلك ماذكر من أن الشافعي اجتمع بأبي يوسف عند الرشيد باطل، فلم يجتمع الشافعي بالرشيد لابعد موت أبي يوسف.(۵۳)

ترجمہ: اس طرح ذکر کیا جاتا ہے ہارون الرشید کی موجودگی میں امام شافعی اور امام ابو یوسف کی ملاقات ہوئی، یہ بالکل باطل ہے، ہارون الرشید سے امام شافعی کی ملاقات، امام ابو یوسف کے انتقال کے بعد ہوئی۔

اس بیان سے مدینہ کی ملاقات کا امکان بھی ختم ہو جاتا ہے۔

ان تاریخی بیانات کی روشنی میں یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچ جاتی ہے کہ ان دونوں اماموں میں ملاقات نہیں ہوئی، اس سلسلہ میں ایک اور چیز قابل ذکر ہے، وہ یہ کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الام، باب بیع الولاء اور مسند میں امام ابو یوسف سے امام محمد کے واسطہ سے روایت کی ہے، یعنی اگر وہ براہِ راست ان سے استفادہ کرتے تو پھر امام محمد کے واسطہ سے کیوں روایت کرتے۔

امام ابو حنیفہ کے بعض مسانید میں امام شافعی کی براہِ راست امام ابو یوسف سے روایت مذکور ہے، اس کے بارے میں علامہ زاہد الکوثری نے لکھا ہے کہ غالباً یہ سبقت قلم ہے۔

امام شافعی کے ایک شیخ یوسف بن خالد ہیں، ممکن ہے کہ بعض رواۃ نے غلط فہمی سے یوسف کے بجائے ابو یوسف کا نام روایت کر دیا ہو اور وہی زبان زد ہو گیا ہو۔

امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی تضعیف و جرح کا مفصل جواب

ان کی بابت "میزان الاعتدال" میں ہے "قال الفلاس كثير الغلط و قال البخاری تركوه" اور "لسان المیزان" میں ہے "قال ابن المبارك ابو يوسف ضعيف الرواية "

چو قاضی بفکرت نویسد سجل　　　　نہ گردد ز دستار بنداں خجل

یہ وہی امام ابو یوسف رحمہ اللہ ہیں جن کے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ وغیرہ شاگرد ہیں، یہ وہی امام ابو یوسف رحمہ اللہ ہیں جن کے بارے میں امام نسائی نے "کتاب الضعفاء والمتروکین" میں کہا ہے کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ ثقہ ہیں، یہ وہی امام ابو یوسف رحمہ اللہ ہیں جن کو حافظ ذھبی نے "تذکرالحفاظ" میں حافظین حدیث میں شمار کیا ہے:

"سمع هشام بن عروة وابا اسحق الشيباني و عطاء بن السائب و طبقتهم و عن محمد بن الحسن الفقيه و احمد بن حنبل و بشر بن الوليد و يحيى بن معين و على بن الجعد و على بن مسلم الطوسى و خلق سواهم نشاء فى طلب العلم و كان ابوه فقيرا فكان ابو حنيفة يتعاهده قال المذنى ابو يوسف اتبع القوم للحديث و روى ابراهيم بن ابى داؤد عن يحيى بن معين قال ليس فى اهل الراى احد اكثر حديثا و لا اثبت منه و روى عباس عنه قال ابو يوسف صاحب حديث و صاحب سنة و قال ابن سماعة كان منصفافى الحديث مات سنة اثنتين و ثمانين و مائة وله اخبار فى العلم و السيادة وقد افردته و افردت صاحبه محمد بن الحسن فى جزء"(٥٤)

ابو یوسف نے فن حدیث کو ہشام بن عروہ، ابواسحاق شیبانی، عطاء بن سائب اوران کے طبقے والوں سے حاصل کیا ہے اورفن حدیث میں امام ابو یوسف کے شاگرد امام محمد، امام احمد، یحیی بن معین، بشر بن ولید، علی بن جعد، علی مسلم طوسی اور ایک مخلوق محدثین کی ہے، طلب علم ہی میں ان کی نشو ونما ہوئی ہے، ان کے والد ماجد کی افلاس کی حالت تھی اس لئے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ ان کی خبر گیری رکھتے اورضروریات کو پورا کرتے تھے۔ امام مزنی کا قول ہے کہ امام ابو یوسف جماعت بھر میں خدیث کے متبع زیادہ تھے، ابراہیم بن ابی داؤد یحیی بن معین سے نقل کرتے ہیں کہ اہل رائے میں امام ابو یوسف اثبت اور اکثر حدیث ہیں۔عباس دوری نے ابن معین سے نقل کیا ہے کہ امام ابو یوسف صاحب حدیث، صاحب سنت ہیں۔ ابن سماعہ کہتے ہیں کہ قاضی

ہو جانے کے بعد امام ابو یوسف رحمہ اللہ ہر روز دوسو "200" رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ حدیث میں منصف تھے "182ھ 798ء" ایک سو بیاسی ھجری میں ان کا انتقال ہوا ہے۔ امام ذہبی صاحب کتاب کہتے ہیں کہ ان کے واقعات علم و سیادت کے بہت سے ہیں۔ میں نے ان کے اور امام محمد کے مناقب کو ایک مستقل کتاب میں جمع کیا ہے۔

یہ ائمہ کے اقوال ملاحظہ فرمائیں کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے بارے میں کتنے زبردست الفاظ میں مدحیہ ہیں، اس پر بھی معاندین اور حساد آنکھیں نکال رہے ہیں، کیا آپ کے خیال میں یہ بات آتی ہے کہ جو شخص بقول امام بخاری متروک ہو، بقول فلاس کثیر الغلط ہو وہ ان الفاظ کا ایسے ائمہ سے جن کا اوپر ذکر ہوا ہے مستحق ہو سکتا ہے، ہرگز نہیں، کیا ایسے شخص کے بارے میں کوئی ناقد رجال ہو کر اس کے مناقب میں کتاب تصنیف کر سکتا ہے، کبھی نہیں امام بخاری نے محض اس رنجش کی وجہ سے جو ان کو بعض حنفیوں سے ہوگئی تھی امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے بارے میں کلام کر دیا، حالانکہ یہ محض تعصب پر مبنی ہے، جو قابل قبول نہیں ہے، متروک اور کثیر الغلط ہونے کی تہمت ہی تہمت ہے جس کا کچھ وجود نہیں ورنہ امام احمد رحمہ اللہ جیسا شخص اور ابن معین جیسا ناقد کبھی بھی امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا شاگرد نہ ہوتا بلکہ سب سے پہلے یہی لوگ ان کی تضعیف کرتے لیکن یہ حضرات جب ان کو صاحب الحدیث، صاحب سنت، منصف فی الحدیث، اثبت و اکثر حدیث، اتبع الحدیث، حافظ حدیث فرماتے ہیں تو پھر ترکوہ اور کثیر الغلط کی بنیاد محض عداوت اور تعصب پر ثابت ہو جاتی ہے۔ جس کا گرا دینا کچھ مشکل نہیں۔ نواب صدیق حسن خان فرماتے ہیں:

"كان القاضى ابو يوسف من اهل الكوفة وهو صاحب ابى حنيفة و كان فقيها عالما حافظا"(۵۵)

کہ قاضی ابو یوسف کوفہ کے باشندے اور امام ابو حنیفہ کے شاگرد ہیں۔ فقیہ، عالم، حافظ حدیث تھے۔ سلیمان تیمی، یحیی بن سعید انصاری، اعمش، محمد بن یسار وغیرہ سے فن حدیث کو حاصل کیا ہے۔ نواب صدیق

حسن خان صاحب نے ان چار "4" ناموں کو زیادہ لکھا ہے، اس لئے نقل کر دیا- آگے چل کر نواب صاحب لکھتے ہیں:

"ولم يختلف يحيى بن معين و احمد بن حنبل و على المدينى فى ثقته فى النقل"(٥٦)

کہ یحیی بن معین اور احمد بن حنبل اور علی بن مدینی تینوں اماموں کا امام ابو یوسف کے ثقہ فی الحدیث ہونے پر اتفاق ہے، یہ ابن مدینی وہی شخص ہیں جن کے لئے امام بخاری کو اقرار کرنا پڑا کہ میں اپنے آپ کو انہی سے چھوٹا سمجھتا ہوں۔

حافظ ابن حجر "تقریب" میں ابن مدینی کے بارے میں فرماتے ہیں:

"ثقة ثبت امام اعلم اهل عصره بالحديث وعلله حتى قال البخارى ما استصغرت نفسى الا عنده" (٥٧)

کہ ابن مدینی ثقہ، ثبت، امام اعلم، اہل زمانہ بالحدیث وعلل ہیں حتی کہ امام بخاری بھی کہہ اٹھے کہ ان کے سامنے میری کوئی حقیقت نہیں- جب علی مدینی امام ابو یوسف رحمہ اللہ کو ثقہ کہتے ہیں تو امام بخاری کا قول ان کے مقابلہ میں کچھ وقعت نہیں رکھتا۔

"ولم يختلف يحيى بن معين و احمد و ابن المدينى فى كوفه ثقة فى الحديث"(٥٨)

امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے ثقہ فی الحدیث ہونے میں ابن معین، احمد بن حنبل، علی بن المدینی مختلف نہیں ہیں-

"وذكر ابن عبد البر فى كتاب الانتهاءِ فى فضائل الثلاثة الفقهاء ان ابا يوسف كان حافظا وانه كان يحضر المحدث و يحفظ خمسين ستين حديثا ثم يقول فيمليها على

الناس و کان کثیر الحدیث"(۵۹)

حافظ ابن عبد البر مالکی مغربی" کتاب الانتہاء" میں فرماتے ہیں جس میں فقہائے ثلاثہ کے مناقب بیان کئے ہیں کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ حافظ تھے ان کے حافظہ کی یہ حالت تھی کہ محدث کی مجلس میں تشریف لاتے اور پچاس ساٹھ حدیثیں وہیں یاد کر لیتے اور جب اس مجلس میں سے اٹھتے تو فوراً لوگوں کو جوں کی توں حدیثیں لکھا دیا کرتے تھے۔ان میں کسی قسم کا تغیر نہ ہوتا تھا اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ کثیر الحدیث تھے،اس قول سے فلاس کے قول کی تردید ہوگئی۔اگر کثیر الغلط ہوتے تو حافظ ابن عبد البر کبھی بھی ان کے حافظہ کی تعریف بالفاظ مذکورہ نہ کرتے:

"قال طلحة بن محمد جعفر ابو یوسف مشهور الامر ظاهر الفضل افق اهل عصره ولم یتقدم احد فی زمانه و کان النهایة فی العلم و الحکم و الریاسة و القدر وهو اول من وضع الکتب فی اصول الفقه علی مذهب ابی حنیفة و املی المسائل و نشرها وبث علم ابی حنیفة فی اقطار الارض"(٦٠)

طلحہ بن محمد کہتے ہیں کہ امام ابو یوسف مشہور الامر،ظاہر الفضل،افقہ اہل زمانہ ہیں،ان کے زمانہ میں ان سے کوئی فضل میں متقدم نہ تھا۔علم،فیصلہ جات،ریاست،قدر ومنزلت کی منتہا تھے۔مذہب امام ابوحنیفہ کے موافق اصول میں اول انہی نے کتابیں تصنیف کی ہیں،مسائل کا املا اور ان کی شیوع انہی نے کیا۔اطراف عالم میں امام ابوحنیفہ کے علم کو انہی نے پھیلایا۔

"قال عمار بن ابنی مالك ما کان فی اصحاب ابی حنیفة مثل ابی یوسف لولا ابو یوسف ماذکر ابو حنیفة ولا محمد بن ابی لیلی ولکن هو الذی نشر قولهما وبث علمهما" (٦١)

عمار بن ابی مالک کہتے ہیں کہ اصحاب ابی حنیفہ میں امام ابو یوسف جیسا کوئی شخص نہیں ہے اگر امام ابو

یوسف نہ ہوتے تو محمد بن ابی لیلی اور امام ابو حنیفہ کا کوئی ذکر نہ کرتا، انہی نے دونوں کے قول وعلم کو عالم میں پھیلایا

"وقال ابو یوسف سلنی الاعمش عن مسئلة فاجبت عنها فقال لی من این لك هذا فقلت من حدیثك الذی حدثتناه انت ثم ذکرت له الحدیث فقال لی یا یعقوب انی لاحفظ هذا الحدیث قبل ان یجتمع ابواك وما عرفت تاویله حتی الآن"(٦٢)

امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ مجھ سے اعمش نے ایک مرتبہ ایک مسئلہ پوچھا میں نے اس کا جواب دے دیا تو وہ فرمانے لگے تم کو یہ جواب کہاں سے معلوم ہوا تو میں نے کہا کہ اسی حدیث سے جو آپ نے مجھ سے بیان کی تھی اور پھر وہ حدیث میں نے ان کو سنا دی تو اعمش کہنے لگے اے یعقوب ''یہ امام ابو یوسف کا نام ہے'' میں بھی اس حدیث کا حافظ ہوں لیکن اب تک اس کے معنی میری سمجھ میں نہ آئے تھے، اس وقت سمجھا ہوں اس کو ملاحظہ فرمائیں اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے حافظہ اور فہم کی داد دیں جس کا اعمش نے بھی اقرار کرلیا-اس پر فلاس اور امام بخاری کثیر الغلط اور ترکوہ کہتے ہیں، سبحان اللہ:

"واخبار ابی یوسف کثیرة واکثر الناس من العلماء علی فضله و تعظیمه"(٦٣)

امام ابو یوسف کے اخبار بہت ہیں اور اکثر علماء ان کی فضیلت اور تعظیم کے قائل ہیں، یہ نواب صاحب کا قول ہے جو فیصلہ کے طور پر ہے- ماقبل میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ جس کی مدح کرنے والے زیادہ ہوں اس کے بارے میں جارحین کی جرح مقبول نہیں- نیز ہم عصر کی جرح بھی دوسرے ہم عصر کے بارے میں مقبول نہیں-عبداللہ بن مبارک، وکیع بن الجراح ہم عصر ہیں، امام بخاری، دار قطنی، ابن عدی وغیرہ متعصب ہیں، لہذا ان کی جرح بھی مقبول نہیں۔

اب "میزان الاعتدال" کی عبارت کے متعلق سنیئے، مؤلف رسالہ ''الجرح علی ابی حنیفة'' نے جو فلاس کا قول نقل کیا ہے اس کا ایک لفظ ترک کر دیا، کیونکہ وہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی مدح میں تھا، اصل عبارت یوں

ہے "قال الفلاس صدوق كثير الغلط" فلاس کہتے ہیں امام ابو یوسف صدوق کثیر الغلط تھے، پہلا جملہ الفاظ تعدیل وتوثیق میں سے ہے، لہذا افلاس کے نزدیک بھی ان کا صدوق ہونا مسلم ہے۔

ع ادھر لا ہاتھ مٹھی کھول یہ چوری یہیں نکلی

"وقال عمرو الناقد كان صاحب سنة"

عمرو کہتے ہیں امام ابو یوسف صاحب سنت تھے، یہ بھی توثیق ہے۔

"وقال ابو حاتم يكتب حديثه"

ابوحاتم کہتے ہیں امام ابو یوسف کی حدیث لکھی جاتی ہے یہ بھی تعدیل کے الفاظ ہیں۔

"وقال المزنى هو اتبع القوم للحديث اه"

امام مزنی کا قول ہے کہ وہ اتبع الحدیث دوسروں کے اعتبار سے ہیں یہ بھی مدح ہے:

"واما الطحاوى فقال سمعت ابراهيم بن ابى داؤد البراسى سمعت يحيى بن معين يقول ليس فى اصحاب الراى اكثر حديثا ولا اثبت من ابى يوسف" (٦٤)

لیکن امام طحاوی نے یہ بیان کیا ہے کہ میں نے ابراہیم بن ابی داؤد سے سنا وہ کہتے تھے میں نے ابن معین کو کہتے ہوئے سنا امام ابو یوسف اکثر حدیث اور اثبت فی الحدیث باعتبار دوسرے اصحاب رائے کے ہیں

"وقال ابن عدى ليس فى اصحاب الراى اكثر حديثا منه الا انه يروى عن الضعفاء الكثير مثل الحسن بن عمار وغيره و كثيرا مايخالف اصحابه و يتبع الاثر فاذا روى عنه ثقة و روى هو عن ثقة فلاباس به" (٦٥)

ابن عدی کہتے ہیں اصحاب رائے میں ان سے زیادہ حدیث والا کوئی دوسرا نہیں ہے مگر اتنی بات ہے کہ ضعیفوں سے زیادہ روایت کرتے ہیں جیسے حسن بن عمار وغیرہ ہیں اور بسا اوقات اپنے اصحاب کی مخالفت اور حدیث کی اتباع کرتے ہیں۔جس وقت ان سے کوئی ثقہ روایت کرے اور وہ بھی ثقہ سے روایت کریں تو

لاباس بہ ہیں۔

"میزان" کی یہ سب عبارتیں جن میں امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی ائمہ نے توثیق کی ہے مؤلف رسالہ "الجرح علی ابی حنیفۃ" نے اپنی حقانیت اور دیانت داری ظاہر کرنے کے واسطے حذف کر دیں اور صرف "فلاس" اور "امام بخاری" کے قول کو نقل کر دیا تاکہ عوام کو دھوکہ میں ڈال دیں۔

امام صاحب کی بابت تو سیر اعلام النبلاء میں مذکور ہے کہ:

القاضی أبو یوسف

حَدَّثَ عَنْ :هِشَامِ بنِ عُرْوَةَ، وَيَحْيَى بنِ سَعِيْدٍ الأَنْصَارِيِّ، وَعَطَاءِ بنِ السَّائِبِ، وَيَزِيْدَ بنِ أَبِي زِيَادٍ، وَأَبِي إِسْحَاقَ الشَّيْبَانِيِّ، وَعُبَيْدِ اللهِ بنِ عُمَرَ، وَالأَعْمَشِ، وَحَجَّاجِ بنِ أَرْطَاةَ، وَأَبِي حَنِيْفَةَ، وَلَزِمَه، وَتَفَقَّهَ بِهِ، وَهُوَ أَنبَلُ تَلاَمِذَتِه، وَأَعْلَمُهُم، تَخَرَّجَ بِهِ أَئِمَّةٌ :كَمُحَمَّدِ بنِ الحَسَنِ، وَمُعَلَّى بنِ مَنْصُوْرٍ، وَهِلاَلٍ الرَّأْيِ، وَابْنِ سَمَاعَةَ، وَعِدَّةٍ.

وَحَدَّثَ عَنْهُ :يَحْيَى بنُ مَعِيْنٍ، وَأَحْمَدُ بنُ حَنْبَلٍ، وَعَلِيُّ بنُ الجَعْدِ، وَأَسَدُ بنُ الفُرَاتِ، وَأَحْمَدُ بنُ مَنِيْعٍ، وَعَلِيُّ بنُ مُسْلِمٍ الطُّوْسِيُّ، وَعَمْرُو بنُ أَبِي عَمْرٍو الحَرَّانِيُّ، وَعَمْرٌو النَّاقِدُ، وَعَدَدٌ كَثِيْرٌ.

وَكَانَ أَبُوْهُ فَقِيْراً، لَهُ حَانُوتٌ ضَعِيْفٌ، فَكَانَ أَبُو حَنِيْفَةَ يَتَعَاهَدُ أَبَا يُوْسُفَ بِالدَّرَاهِمِ، مائَةً بَعْدَ مائَةٍ.

فَرَوَى :عَلِيُّ بنُ حَرْمَلَةَ التَّيْمِيُّ، عَنْهُ، قَالَ:

كُنْتُ أَطْلُبُ العِلْمَ وَأَنَا مُقِلٌّ، فَجَاءَ أَبِي، فَقَالَ :يَا بُنَيَّ !لاَ تَمُدَّنَّ رِجْلَكَ مَعَ أَبِي حَنِيْفَةَ، فَأَنْتَ مُحْتَاجٌ.

فَآثَرْتُ طَاعَةَ أَبِي، فَأَعْطَانِي أَبُو حَنِيْفَةَ مائَةَ دِرْهَمٍ، وَقَالَ :الْزَمِ الحَلْقَةَ، فَإِذَا نَفَذَتْ هَذِهِ،

فَأَعْلِمْنِي.

ثُمَّ بَعْدَ أَيَّامٍ أَعْطَانِي مائَةً.

وَيُقَالُ :إِنَّهُ رُبِّيَ يَتِيْماً، فَأَسلَمَتْه أُمُّهُ قَصَّاراً.

وَعَنْ مُحَمَّدِ بنِ الحَسَنِ، قَالَ :مَرِضَ أَبُو يُوْسُفَ، فَعَادَهُ أَبُو حَنِيْفَةَ، فَلَمَّا خَرَجَ، قَالَ :إِنْ يَمُتْ هَذَا الفَتَى، فَهُوَ أَعْلَمُ مَنْ عَلَيْهَا.

قَالَ أَحْمَدُ بنُ حَنْبَلٍ :أَوَّلُ مَا كَتَبتُ الحَدِيْثَ، اخْتَلَفتُ إِلَى أَبِي يُوْسُفَ،

وَرَوَى :عَبَّاسٌ، عَنِ ابْنِ مَعِيْنٍ :أَبُو يُوْسُفَ صَاحِبُ حَدِيْثٍ، صَاحِبُ سُنَّةٍ.

وَعَنْ يَحْيَى البَرْمَكِيِّ، قَالَ :قَدِمَ أَبُو يُوْسُفَ، وَأَقَلُّ مَا فِيْهِ الفِقْهُ، وَقَدْ مَلأَ بِفِقْهِهِ الخَافِقَيْنِ.

قَالَ أَحْمَدُ :كَانَ أَبُو يُوْسُفَ مُنصِفاً فِي الحَدِيْثِ.

وَعَنْ أَبِي يُوْسُفَ، قَالَ :صَحِبتُ أَبَا حَنِيْفَةَ سَبْعَ عَشْرَةَ سَنَةً.

وَعَنْ هِلاَلِ الرَّأْيِ، قَالَ :كَانَ أَبُو يُوْسُفَ يَحفَظُ التَّفْسِيْرَ، وَيَحفَظُ المَغَازِي، وَأَيَّامَ العَرَبِ، كَانَ أَحَدَ عُلُوْمِهِ الفِقْهُ.

وَعَنِ ابْنِ سَمَاعَةَ، قَالَ :كَانَ وِرْدُ أَبِي يُوْسُفَ فِي اليَوْمِ مائَتَيْ رَكْعَةٍ.

قَالَ ابْنُ المَدِيْنِيِّ :مَا أُخِذَ عَلَى أَبِي يُوْسُفَ إِلاَّ حَدِيْثُهُ فِي الحجْرِ، وَكَانَ صَدُوقاً.(٦٦)

امام ابو یوسف اور حدیث وسنت سے استدلال

عراقی فقہاء بالخصوص امام ابوحنیفہ اور ان کے اَصحاب وتلامذہ کے بارے میں ایک عمومی تاثر یہ پایا جاتا ہے کہ یہ اَصحاب فقہی مباحث میں حدیث وسنت سے استدلال بہت کم کرتے تھے، لیکن ان کی جو تصنیفات ہم تک پہنچ پائی ہیں، ان کا مطالعہ اس تاثر کی نفی کرتا ہے۔ یہاں امام ابو یوسف کی کتاب الخراج کی روشنی میں اسی نکتے پر بحث کی گئی ہے اور یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ امام ابو یوسف اور ان کے شیخ ابوحنیفہ کے

نزدیک فقہی احکام و مسائل میں استدلال کرنے کی وہی بنیاد ہے جو ائمہ حدیث کے ہاں ہے، یعنی کتاب و سنت کو ماخذ سمجھنا۔ نہ صرف یہ بلکہ فقہ حنفی میں آثار صحابہ سے بھی بھرپور رہنمائی لی جاتی ہے۔ حنفی مکتبہ فکر احادیث و آثار ہی کی روشنی میں فقہی استنباطات کرتے ہوئے دینی مسائل میں اپنی آراء کا اظہار کرتے ہیں۔ دوسرے اہل علم کے ساتھ فقہی اختلافات میں بھی وہ احادیث و آثار کو مرکزی حیثیت دیتے رہے ہیں۔

کتاب الخراج 'حدیث' کی کتاب نہیں

یہاں یہ بات واضح کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دوسری صدی ہجری میں اہل علم کے ہاں جس طرح اَحادیث کے مجموعے تیار کرنے کا رجحان پیدا ہوا، جس کی مثال امام مالک کی موطا اور بعد کے محدثین کی سنن و جوامع و مسانید میں ملتی ہے، فقہاء بالخصوص فقہاء عراق کے ہاں کتابوں کی تدوین میں یہ اسلوب پیش نظر نہیں تھا۔ اس لیے بے خوفِ تردید ہم یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ کتاب الخراج فنی طور پر حدیث یا علوم الحدیث کی کتاب نہیں بلکہ یہ دراصل خلیفہ ہارون الرشید کے خواہش پر لکھی گئی ایک ایسی کتاب ہے جس میں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں نظم الدول بالخصوص مالیاتی نظام اور اس سے متعلقہ بعض ضروری امور کو قرآن و حدیث اور آثار صحابہ کی روشنی میں زیر بحث لایا گیا ہے۔ خلیفہ ہارون الرشید کی خواہش تھی کہ انہیں اس سلسلہ میں بعض ضروری چیزوں کی تفصیلات مہیا کی جائیں، چنانچہ انہوں نے امام ابو یوسف سے اپنی خواہش کا اظہار کیا اور آپ نے یہ کتاب مرتب فرمائی۔ امام ابو یوسف نے اس کتاب کا آغاز جس عبارت سے کیا ہے، اس سے ہمیں یہی اندازہ ہوتا ہے۔ (٦٧)

کتاب الخراج میں روایات کی تعداد

کتاب الخراج اگرچہ فنی طور پر حدیث کی کتاب نہیں ہے لیکن اس کے باوجود اس میں اَحادیث و آثار بڑی کثرت کے ساتھ روایت کیے گئے ہیں اور ان سے بے شمار مسائل پر استدلال و استشہاد کیا گیا ہے۔ راقم نے جو اعداد و شمار جمع کیے ہیں تو اس جائزے کے مطابق کتاب الخراج میں مرفوع روایات کی تعداد 223 ہے

اور آثارِ صحابہ (موقوف روایات) کی تعداد 299 ہے۔ جب کہ تابعین سے مروی آثار واقوال اس کے علاوہ ہیں اور محتاط اندازے کے مطابق ان کی تعداد 200 سے زائد ہے۔

کتاب الخراج میں امام ابو یوسف کے فقہی مصادر

کتاب الخراج میں مختلف مسائل کے استدلال و استنباط کے لیے امام ابو یوسف کے پیش نظر درج ذیل فقہی مصادر رہے ہیں:

1۔قرآن

2۔حدیث وسنت

3۔آثارِ صحابہ

4۔قیاس

5۔اِستحسان۔

واضح رہے کہ مذکورہ بالا آخری دو مصادر بھی اصل میں پہلے تین مصادر ہی پر بنا کرتے ہیں۔اسی لیے بعض اہل علم نے مذکورہ کتاب میں ابو یوسف کے فقہی مصادر میں صرف پہلے تین مصادر کو شمار کیا ہے، جیسا کہ معروف محقق ابوزہرہ کتاب الخراج کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ کتاب قاضی ابو یوسف کی ایک مراسلت ہے جو انہوں نے خلیفہ ہارون الرشید کے نام لکھی تھی۔ اس میں انہوں نے حکومت کے مالی وسائل اور ذرائع آمدن کی تفصیلات پر بڑی دقیق اور عمدہ بحث کی ہے۔ آپ نے اس میں قرآن مجید، اَحادیث اور صحابہ کے فتاویٰ پر اعتماد کیا ہے''۔(٦٨)

1۔امام ابو یوسف کے ہاں 'حدیث'، 'اَثر'، 'سنت' اور 'خبر' کی اصطلاحات

واضح رہے کہ محدثین اور فقہاء کے ہاں 'حدیث'، 'سنت'، 'اَثر' اور 'خبر' وغیرہ کی اصطلاحات جن معانی و مفاہیم میں استعمال ہوتی ہیں، امام ابو یوسف اور ان کے معاصرین کے ہاں یہ اصطلاحات بالکل انہی مفاہیم

میں استعمال نہیں ہوتی تھیں، جیسا کہ آئندہ تفصیلات سے واضح ہوگا۔

1۔امام ابو یوسف کے ہاں 'حدیث' اور 'اَثر' کی اصطلاح

محدثین کے ہاں حدیث ہر اس قول، فعل، تقریر اور صفت کو کہتے ہیں جس کی نسبت حضور کی طرف کی جاتی ہو۔ یہی تعریف 'اَثر' کے لیے بھی محدثین کے ہاں معروف ہے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ 'اَثر' صحابہ اور تابعین کے اقوال کے ساتھ، 'حدیث' رسول اللہ کے اقوال کے ساتھ اور 'خبر' تاریخی واقعات کے ساتھ مخصوص ہے۔(۶۹)

امام ابو یوسف کے ہاں 'حدیث' اور 'اَثر' کے الفاظ ان اصطلاحات کے طور پر استعمال نہیں ہوئے جو بعد میں محدثین کے ہاں خاص مفاہیم میں رواج پا گئیں۔ امام ابو یوسف نے ان دونوں لفظوں کو زیادہ تر ہم معنی اور ایک وسیع مفہوم میں استعمال کیا ہے یعنی آپ کے نزدیک حدیث کا لفظ بولا جائے تو اس سے مراد بعض اوقات مرفوع روایت ہوتی ہے اور بعض دفعہ موقوف اور بعض دفعہ بیک وقت دونوں ہی مراد ہوتی ہیں۔ اسی طرح 'اَثر' سے مراد آپ کے نزدیک وہ تمام روایات ہیں جو نبی کریم سے منقول ہوں یا آپ کے صحابہ سے، یعنی خواہ وہ مرفوع ہوں یا موقوف۔

اسی طرح اَثر اور حدیث کو آپ نے تابعین کے قول و فعل کے لیے بھی استعمال کیا ہے لیکن یہ استعمال آپ کے ہاں بہت نادر ہے۔ ان دونوں کی صرف ایک ایک مثال ہی پوری کتاب میں مل سکی ہے۔

اسی طرح اَثر اور حدیث کے الفاظ کو آپ نے 'سنت' کے مترادف کے طور پر بھی استعمال کیا ہے۔ اس کی تفصیل آگے سنت کے تحت ملاحظہ کریں۔

حدیث اور اَثر کے ہم معنی اور وسیع تر مفہوم میں استعمال کی مثالیں

امام ابو یوسف نے اپنی اس کتاب میں حدیث اور اَثر کو بہت سی جگہ پر ہم معنی و مترادف کے طور پر استعمال کیا ہے، اب ذیل میں اس سلسلہ کی کچھ مثالیں ذکر کی جاتی ہیں۔

1۔ مالِ غنیمت میں گھوڑے اور گھڑ سوار کا حصہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"یضرب للفارس منهم ثلاث اسهم: سهمان للفرس و سهم له وللرجل سهم على ما جاء في الاحاديث والآثار". (۷۰)

"گھڑ سوار کو (پیادہ کے مقابلہ میں) تین حصے ملیں گے: دو اس کے گھوڑے کے لیے اور ایک خود اس کے لیے۔ گھڑ سوار کو ایک حصہ اس لیے ملے گا کیونکہ احادیث وآثار میں اسی طرح بیان ہوا ہے"۔(۷۱)

اس کے بعد آپ نے مرفوع، موقوف اور مقطوع تینوں طرح کی روایات ذکر کی ہیں۔

2۔ کسی کو جاگیر دینے کے حوالے سے مسئلہ ذکر کرتے ہوئے نبی کریم اور صحابہ کرام سے بالترتیب مرفوع وموقوف دونوں طرح کی کئی ایک روایات نقل کرنے کے بعد آپ ان سب کے لیے 'آثار' کی اصطلاح بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فقد جاء ت هذه الآثار بان النبى اقطع اقواما وان الخلفائمن بعده اقطعوا، ورای رسول الله الصلاح فيما فعل من ذلك إذ كان فيه تالف على الإسلام وعمار الارض، وكذلك الخلفاء إنما اقطعوا من راوا ان له غناء في الإسلام ونكاية للعدو وراوا ان الافضل ما فعلوا، ولولا ذلك لم ياتوه ولم يقطعوا حق مسلم ولا معاهد". (۷۲)

(حاصل ترجمہ یہ ہے کہ) ان آثار سے معلوم ہوا کہ نبی کریم اور آپ کے خلفاء نے جاگیریں دی ہیں۔

3۔ سمندر سے حاصل ہونے والی اشیاء کے محاصل کے حوالے سے مسئلہ ذکر کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں:

"وسالت يا امير المؤمنين عما يخرج من البحر من حلى وعنبر، فإن فيما يخرج من البحر من الحلى والعنبر الخمس، فاما غيرهما فلا شيء فيه وقد كان ابو حنيفة وابن ابى ليلى رحمهما الله يقولان: ليس فيه شيء من ذلك شيء لانه بمنزلة السمك، واما انا فإني

اری فی ذلك الخمس واربع اخماسه لمن اخرجه لانا قد روینا فیه حدیثا عن عمر رضی الله عنه ووافقه علیه عبد الله بن عباس فاتبعنا الاثر ولم نر خلافه"

"امیر المؤمنین! آپ نے سمندر سے نکالے جانے والے عنبر اور زیور بنانے کے لائق چیزوں کے بارے میں دریافت فرمایا ہے۔ اس سلسلہ میں یاد رکھیے کہ سمندر سے زیور بنانے کے لائق جو اشیا یا عنبر برآمد ہو، ان میں خمس (1/5) واجب ہے۔ ان دو کے سوا اور چیزوں میں کچھ نہیں (واجب ہے)۔

ابو حنیفہ اور ابن ابی لیلیٰ کہتے تھے کہ 'ان میں سے کسی چیز پر کچھ بھی واجب نہیں'۔ کیونکہ ان کی نوعیت مچھلی جیسی ہے مگر جہاں تک میرا تعلق ہے، میرا خیال یہ ہے کہ ان میں خمس لیا جائے گا اور باقی 4/5 حصہ اس کے لیے ہے جس نے اسے نکالا ہو (یہ رائے رکھنے کی) وجہ یہ ہے کہ اس باب میں ہم سے عمر سے مروی ایک حدیث بیان کی گئی ہے اور اس پر عبد اللہ بن عباس نے عمر سے اتفاقِ رائے ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ ہم نے اس اثر کا اتباع کیا ہے اور اس کے خلاف جانا مناسب نہیں سمجھا"۔ (۷۳)

یہاں آپ نے حضرت عمر کے قول کے لیے پہلے حدیث کا اور بعد میں اثر کا لفظ استعمال کیا ہے جس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ آپ کے نزدیک یہ دونوں لفظ مترادف کی طرح ایک ہی مفہوم رکھتے ہیں۔

'اثر' اور 'حدیث' کا اطلاق مقطوع روایات کے لیے

امام ابو یوسف نے بعض جگہ 'اثر' اور 'حدیث' کا اطلاق مقطوع روایات (یعنی آثارِ تابعین) پر بھی کیا ہے، لیکن ایسا بہت کم ہے مثلاً حدود کو شبہ کی بنا پر معطل کیا جانا چاہیے، اس مسئلہ کو بیان کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں:

"ولا یحل للامام ان یحابی فی الحد احدا ولا تزیله عنه شفاعة، ولا ینبغی له ان یخاف فی ذلك لومة لائم، اِلا ان یکون حد فیه شبهة، فاِذا کان فی الحد شبه درأه، لما جاء فی ذلك من الآثار عن اصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم والتابعین". (۷٤)

یہاں بالکل واضح طور پر آپ نے 'آثار' کا لفظ بول کر اَقوال تابعین کو بھی اس میں شمار کیا ہے۔

اسی طرح ایک مسئلہ (کہ مرتد سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے گا یا نہیں؟) کے بارے میں مرفوع، موقوف اور مقطوع تینوں طرح کی روایات ذکر کرنے کے بعد آپ لکھتے ہیں:

"فبهذه الاحاديث يحتج من راى من الفقهاء وهم كثير الاستتابه"

معلوم ہوا کہ یہاں آپ نے 'حدیث' کا اطلاق مرفوع، موقوف اور مقطوع تینوں طرح کی روایات پر کیا ہے۔(۷۵)

2۔امام ابو یوسف کے ہاں 'سنت' کی اصطلاح

محدثین کی اصطلاح میں 'سنت' سے مراد تقریباً وہی مفہوم ہے جو 'حدیث' کا ہے یعنی:

"ما اثر عن النبي من قول او فعل او تقرير او صف خلقي او خلقي او سير سواء كان قبل البعث او بعدها وهي بهذا ترادف الحديث عند بعضهم". (٧٦)

اصولیوں کی اصطلاح میں بھی 'سنت' سے قریب قریب یہی مفہوم مراد ہے یعنی:

"ما نقل عن النبي من قول او فعل او تقرير". (٧٧)

سنت کا اطلاق کبھی کبھار ان اصولیوں کے نزدیک اس چیز پر بھی ہوتا ہے جس پر کوئی شرعی دلیل دلالت کرتی ہو خواہ اس دلیل کا تعلق قرآن سے ہو، یا حدیث نبوی سے ہو یا اجتہادِ صحابہ سے جیسے جمع قرآن وغیرہ۔اور اسی طرح سنت کو بدعت کے مقابلہ میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔(۷۸)

فقہاء کی اصطلاح میں 'سنت' کا اطلاق اس فعل کے لیے ہوتا ہے جو فرض اور واجب نہ ہو (بلکہ مستحب ومندوب ہو)۔(۷۹)

امام ابو یوسف نے سنت کو حدیث اور اَثر کی طرح ایک وسیع مفہوم میں (یعنی مرفوع، موقوف اور مقطوع تینوں طرح کی روایات کے لیے) بھی استعمال کیا ہے اور اس کے علاوہ اکثر و بیشتر آپ نے نبی کریم

اور صحابہ کرام کے اس عمومی و مجموعی طرزِ عمل کے لیے بھی 'سنت' کا لفظ استعمال کیا ہے جو بعد میں مسلمانوں کے مابین محکم و قطعی حیثیت کے ساتھ مشہور و معروف ہو چکا ہو۔ اسی طرح آپ نے یہ لفظ کسی ایسے قول اور فعل کے لیے بھی استعمال کیا ہے جو مسلمان معاشرے میں دینی بنیادوں پر معروف اور رواج پذیر ہو چکا ہو۔ آئندہ صفحات میں ان سب کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

'سنت' کا استعمال حدیث کے معنی میں

1۔ عاملِ زکاۃ کس قسم کے جانور زکاۃ میں وصول کرے، اس حوالے سے امام ابو یوسف فرماتے ہیں:

"ولیس لصاحب الغنم ان یتخیر الغنم فیاخذ من خیارها ولا یاخذ من شرارها ولا من دونها ولکن یاخذ الوسط من ذلك علی السن وما جاء فیها". (۸۰)

"بکریوں کی زکاۃ پر مامور شخص کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ ان میں سے اچھے جانوروں کو زکاۃ کے لیے منتخب کرے اور نہ ہی وہ ان میں سے ردی یا درمیانہ درجہ سے کم تر جانور وصول کرے، البتہ اسے چاہیے کہ وہ سنت کے مطابق اور اس سلسلہ میں جو آثار منقول ہیں، ان کی روشنی میں درمیانے درجہ کا جانور وصول کرے"۔

2۔ کسی کنویں وغیرہ کے مالک کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کو اپنے زیر ملکیت پانی سے روکے اور پانی دینے کی قیمت وصول کرے جو اس پانی سے اپنے کھیت اور باغات سیراب کرنا چاہتا ہو لیکن اگر کوئی مسافر ہو تو اسے یا اس کے جانور کو پانی لینے سے روکنا اس کے لیے جائز نہیں۔ اس مسئلہ کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد آخر میں ان دونوں صورتوں کے فرق کی وجہ بیان کرتے ہوئے امام ابو یوسف لکھتے ہیں کہ

"وفصل ما بین هذین الاحادیث التی جاء ت فی ذلك والسنن".

"ان دونوں صورتوں میں فرق کی بنیاد وہ اَحادیث اور سنت ہے جو اس سلسلہ میں وارد ہوئی ہے"۔ (۸۱)

3۔اسی طرح آپ نے قرآن مجید کے لیے 'کتاب' کی اور اس کے ساتھ حدیث کے لیے 'سنت' کی اصطلاح استعمال کی ہے، چنانچہ یہ مسئلہ کہ وہ شخص جس سے بدلہ لیا جا رہا ہے، اگر وہ بدلہ لینے والے کے ہاتھوں مر جائے تو بدلہ لینے والے پر دیت عائد ہوگی یا نہیں، اس سلسلہ میں امام ابو یوسف کی رائے یہ ہے کہ اس پر دیت عائد نہیں ہوگی، کیونکہ ان کے بقول اس سلسلہ میں آثار سے یہی بات معلوم ہوتی ہے اور یہ کہ ایسے شخص کو کتاب وسنت نے قتل کرنے کا حکم دیا ہے، چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

"ولو ان رجلا قطع يد رجل بحديد عمدا وبرئت فامره الإمام ان يقتص منه فاقتص منه فمات فإن ابا حنيفة كان يقول: على عاقله المقتص دية المقتص منه. وكان ابن ابى ليلى يقول نحوا من ذلك وقال ابو يوسف لا شيء على المقتص للآثار التى جاء ت فى ذلك ، إنما هذا رجل اخذ له بحق واخذ من الميت بحق ولم يتعد عليه، إنما قتله الكتاب والسنة"(۸۲)

'سنت' کا استعمال مشہور و معروف طرزِ عمل کے لیے

اللہ کے رسول اور صحابہ کرام سے دین کے معاملہ میں جو چیز ان کے عام طرزِ عمل کی صورت اختیار کر کے لوگوں میں خوب معروف ہو جائے، اس کے لیے بھی آپ نے سنت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ چنانچہ زکاۃ کی وصولی اور تقسیم کے سلسلہ میں آپ خلیفہ وقت کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فمر يا امير المؤمنين العاملين عليها باخذ الحق و إعطائه من وجب له وعليه والعمل فى ذلك بما سنه رسول الله صلى الله عليه وسلم ثم الخلفاء من بعده"

"امیر المومنین! آپ زکاۃ کی تحصیل و تقسیم کے ذمہ دار افسران کو یہ حکم دیجیے کہ جن لوگوں پر یہ واجب ہوں، ان سے حق کے مطابق وصول کر کے اسے ان لوگوں میں تقسیم کیا جائے جن کا یہ حق ہے۔ اس باب میں اسی طریقہ پر عمل کیا جائے گا جس کی سنت رسول اللہ نے قائم فرما دی ہے اور جسے آپ کے بعد آپ کے خلفاء

نے اختیار کیا ہے''۔(۸۳)

3۔صحابہ کے جاری کردہ طریقوں کے لیے

صحابہ کرام کے فیصلوں اور ان کے جاری کردہ خیر ومعروف کے طریقوں کے لیے بھی آپ نے سنت کا لفظ استعمال کیا ہے، جیسا کہ بصرہ اور خراسان کی زمینوں کو صحابہ نے خراجی زمینیں شمار کیا یا عشری، اس کی وضاحت کرتے ہوئے اور صحابہ کرام کے اس سلسلہ میں طرزِ عمل کو سنت کے عنوان سے تعبیر کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں:

''واما ارض البصر وخراسان فإنهما عندى بمنزل السواد ما افتتح من ذلك عنوة فهو ارض خراج وما صولح عليه اهله فعلى ما صولحوا عليه ولا يزاد عليهم وما اسلم عليه اهله فهو عشر ولست افرق بين السواد وبين هذه فى شىء من امرها ولكن قد جرت عليها سن وامضى ذلك من كان من الخلفاء فرايت ان تقرها على حالها، وذلك الامر وعليه العمل''.

اسی طرح شراب کی 'حد' کے سلسلہ میں صحابہ کرام کے طرزِ عمل اور مختلف فیصلوں کو نقل کرتے ہوئے حضرت علی کے حوالے سے آپ نے ان مختلف طریقوں کے لیے سنت کا لفظ ذکر کیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں آپ لکھتے ہیں:

''والسكر من كل شراب حرام يجب فيه الحد حدثنا الحجاج عن حصين عن الشعبى عن الحارث عن على قال: فى قليل الخمر وكثيرها ثمانون قال: وحدثنا الحجاج عن عطاء قال: ليس فى شىء من الشراب حد حتى يسكر إلا الخمر قال: وحدثنا ابن ابى عروب عن عبد الله الداناج عن حصين عن على قال: جلد رسول الله اربعين وابوبكر الصديق اربعين وكملها عمر بن الخطاب رضى الله عنه ثمانين، وكل سن، يعنى فى

الخمر "(٨٤)

4۔اخبار (خبر) کی اصطلاح

واضح رہے کہ کتاب الخراج میں ایک جگہ پر امام ابو یوسف نے خبر اور اخبار کو بھی 'اَحادیث' اور 'آثار' کے مفہوم میں استعمال کیا ہے، چنانچہ ایک مسئلہ کی دلیل ذکر کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں:

"فان الصحیح عندنا من الاخبار عن علی بن ابی طالب "(٨٥)

"اس سلسلہ میں اَخبار (یعنی روایات) میں سے جو صحیح خبر ہم تک پہنچی ہے، وہ حضرت علی سے مروی ہے"۔

2۔امام ابو یوسف اور حجیتِ حدیث

تمام علماء اسلام کے ہاں 'حدیث' حجتِ شرعیہ اور مصدرِ قانونِ اسلامی ہے

اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ علماء اہل سنت کے ہاں نبی کریم کی حدیث وسنت کا وہ پہلو جو اَحکامی وشرعی مسائل سے تعلق رکھتا ہے، بالاتفاق حجتِ شرعیہ تسلیم کیا جاتا ہے۔البتہ یہ الگ بات ہے کہ کسی حدیث کے اَحکامی وشرعی ہونے یا نہ ہونے میں، یا اس کے ثبوت کے طریقوں، یا متعارض روایات میں سے کسی حدیث کے ترجیح کے اصولوں یا حدیث سے فہم واستنباط کے ضابطوں میں ہمیشہ اختلافِ رائے رہا ہے۔ لیکن اس اختلاف کی بنیاد پر کسی فقیہ نے کبھی بھی عمومی وکلی طور پر حدیث کے مصدرِ شرع نہ ہونے کی رائے اختیار نہیں کی۔یہی وجہ ہے کہ امام ابو یوسف اور آپ کے معاصر کبار علماء وفقہاء خواہ ان کا تعلق عراق سے تھا، یا حجاز سے، یا شام سے، سبھی نے فقہی آراء قائم کرتے وقت حدیث کو بنیادی اہمیت دی ہے اور اسے قرآن مجید کی طرح 'حجت' اور 'مصدرِ شرع' تسلیم کیا ہے۔

کتاب الخراج میں کئی ایک ایسے مقامات جہاں فقہاء کے مابین فقہی اختلافِ رائے ہے، امام ابو یوسف فقہاء کے اس اختلاف کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کے اَدلہ کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں اور

بتاتے ہیں کہ یہ اختلاف کس آیت یا کس حدیث کی بنیاد پر ہے اور ایک فقیہ نے جو رائے اختیار کی ہے، وہ کس بنیاد پر کی ہے اور اختلاف کرنے والے فقیہ کے پاس کیا دلیل ہے۔ اس طرح کے مقامات پر قرآنِ مجید سے استدلال کی مثال تو ایک ہی ہے(۸۶)۔ مگر اَحادیث و آثار سے متعلقہ مثالیں بہت زیادہ ہیں۔ ذیل میں اس سلسلہ کی ایک واضح ترین مثال ملاحظہ فرمائیں:

مرتد سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے گا یا بغیر مطالبہ کیے اسے قتل کی سزا دی جائے گی؟ اس مسئلہ میں اہل علم کا اختلاف ہے اور یہ اختلاف روایات کی بنیاد پر ہے یعنی دونوں طرف کے اہل علم کے پاس اپنے اپنے موقف پر روایات موجود ہیں جیسا کہ امام ابو یوسف لکھتے ہیں:

"وکل قد روی فی ذلك آثارا واحتج بها". (۸۷)

"ہر فریق نے اس سلسلہ میں کچھ آثار (یعنی مرفوع وموقوف دونوں طرح کی روایات) کو روایت کیا ہے اور ان سے استدلال کیا ہے"۔

اس کے بعد آپ نے دونوں طرف سے اہل علم کی ان مستدل روایات کو نقل کیا ہے جن کی بنیاد پر یہ اختلاف رائے پیدا ہوا ہے اور پھر ان میں سے ایک فریق کی طرف اپنا رجحان ظاہر کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں:

"فبهذه الاحاديث يحتج من راى من الفقهاء، وهم كثير، الاستتاب، واحسن ما سمعنا فى ذلك والله اعلم ان يستتابوا فان تابوا والا ضربت اعناقهم على ما جاء من الاحاديث المشهورة وما كان عليه من ادركناه من الفقهاء". (۸۸)

"جن فقہاء نے یہ رائے اختیار کی ہے کہ "مرتد سے" توبہ کا مطالبہ کیا جائے گا، ان کی تعداد زیادہ ہے اور انہوں نے ان اَحادیث "جو ابو یوسف نے اس سلسلہ میں پہلے ذکر کر دی ہیں" سے استدلال کیا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے عمدہ بات جو ہم نے سنی ہے وہ یہ ہے کہ توبہ کا مطالبہ کیا جائے گا۔ اگر تو وہ توبہ کر لے تو ٹھیک

ورنہ مرتد ہونے والوں کی گردن ماری جائے گی، جیسا کہ احادیث مشہورہ میں وارد ہوا ہے اور یہی وہ رائے ہے جس پر ہم نے فقہاء کو پایا ہے''۔

امام ابوحنیفہ 'حدیث' کو حجت مانتے تھے

امام ابویوسف نے کئی ایک فقہی مسائل کے استنباط واستشہاد کے لیے اپنے شیخ امام ابوحنیفہ سے بھی حدیثیں روایت کی ہیں جو اس کا بات کا بین ثبوت ہے کہ امام ابوحنیفہ فقہی مسائل میں حدیث سے رہنمائی لیتے تھے اور حدیث کو حجت مانتے تھے۔ بلکہ بعض جگہ تو امام ابویوسف نے صاف لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ کی اس مسئلہ میں یہ رائے ہے اور ان کے پاس اس کی دلیل فلاں حدیث ہے مثلاً زمین اور باغات کو بٹائی (یعنی تہائی، چوتھائی وغیرہ) پر دیا جا سکتا ہے یا نہیں، اس مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے ابویوسف لکھتے ہیں کہ اس میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ اور بعض اور فقہاء تو اسے کسی صورت بھی درست نہیں سمجھتے۔ پھر آپ ان فقہاء کے دلائل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''فکان ابو حنیفة ومن کره المساقة یحتج بهذا الحدیث ویقول: هذه إجارة فاسدة مجهولة، وکانوا یحتجون ایضا فی المزارعة بالثلث والربع بحدیث جابر عن رسول الله انه کره المزارع بالثلث والربع''.

''امام ابوحنیفہ اور ان کے علاوہ وہ فقہاء جو بٹائی پر باغ ''اور کھیت وغیرہ'' دینے کو ناپسند کرتے ہیں، وہ اس ''یعنی رافع بن خدیج کی'' حدیث سے حجت پکڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اجار فاسدہ مجہولہ ہے۔ اسی طرح یہ تہائی اور چوتھائی پر مزارعت کے عدمِ جواز پر حضرت جابر سے مروی حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں جس میں ہے کہ اللہ کے رسول نے تہائی اور چوتھائی پر مزارعت کو ناپسند فرمایا ہے''۔(۸۹)

اسی طرح مردہ زمین کی آبادکاری کے حوالے سے ایک حدیث میں مطلق طور پر یہ مذکور ہے:

''من احیا ارضا میتة فهی له''.

''جس نے مردہ زمین کو آباد کیا، وہی اس کا مالک ہو جائے گا''۔(۹۰)

لیکن امام ابو حنیفہ اس مسئلہ میں ایک قید اور شرط کا اضافہ کرتے ہیں، وہ یہ کہ مردہ زمین کو امام وقت کی اجازت کے ساتھ آباد کیا جائے تو تب آباد کار اس کا مالک قرار پائے گا، ورنہ نہیں، جیسا کہ امام ابو یوسف امام ابو حنیفہ کی اس رائے کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

''امام ابو حنیفہ فرماتے تھے: اگر امام کی اجازت حاصل ہو جائے تو جو کوئی بھی کسی افتادہ زمین کو آباد کر لے وہ زمین اس کی ملک بن جائے گی۔ مگر کوئی فرد کسی افتادہ زمین کی آباد کاری امام کی اجازت کے بغیر کر لے تو وہ زمین اس کی ملکیت نہیں بن جائے گی اور امام کو یہ اختیار حاصل رہے گا کہ اسے اس فرد کے قبضہ سے نکال لے اور اِسے کرایہ پر دینے یا بطور جاگیر کسی کے حوالے کر دینے وغیرہ دوسرے طریقوں میں سے جو طریقہ مناسب سمجھے، اختیار کرے''۔(۹۱)

اس پر بعض لوگوں کو شبہ ہوا کہ شاید یہ رائے اوپر مذکور حدیث کے خلاف ہے تو انہوں نے امام ابو یوسف سے اس سلسلہ میں استفسار کیا جس کا اظہار امام ابو یوسف نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''مجھ سے کہا گیا ہے کہ ابو حنیفہ کی شان سے بعید ہے کہ انہوں نے یہ بات بغیر کسی دلیل کے کہہ دی ہو کیونکہ نبی سے ایک حدیث منقول ہے کہ آپ نے فرمایا ہے: ''جس نے کوئی مردہ زمین آباد کی تو وہ اس کے لیے ہے''۔ لہٰذا تم ان کی وہ دلیل ہم پر واضح کرو۔ ہمارا خیال ہے کہ تم نے ضرور ان سے کوئی ایسی بات سنی ہو گی جسے وہ اس سلسلہ میں دلیل بناتے رہے ہوں گے''۔(۹۲)

چنانچہ ابو یوسف اس استفسار کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس سلسلہ میں وہ ''یعنی شیخ ابو حنیفہ'' دلیل کے طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ 'زمین کی آباد کاری امام کی اجازت کے بغیر نہیں ہو سکتی، اگر دو آدمی ہوں اور ان میں سے ہر ایک، ایک ہی جگہ کو'' آباد کاری کے لیے'' منتخب کرنا چاہے، اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کو ایسا کرنے سے روکے تو تمہارا کیا خیال ہے، ان دونوں

میں سے کون اس جگہ کا زیادہ حق دار ہوگا۔ کوئی شخص اگر کسی دوسرے آدمی کے گھر کے سامنے واقع افتادہ زمین کی آبادکاری عمل میں لانا چاہے، اور اس آدمی کو اس کا اقرار بھی ہو کہ وہ اس زمین پر کوئی حق نہیں رکھتا، مگر وہ اِس شخص سے کہے کہ اس کو نہ آباد کریں کیوں کہ یہ میرے گھر کے سامنے واقع ہے اور اس کی آبادکاری مجھ کو نقصان پہنچائے گی تو اس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟'

حقیقت یہ ہے کہ ابوحنیفہ نے اس بات میں امام کی اجازت لوگوں کے درمیان نزاع ختم کرنے کے خیال سے ضروری قرار دی ہے۔ جب امام اس بارے میں کسی آدمی کو اجازت دے دے تو اسے آبادکاری کا اختیار مل جائے گا۔ یہ اجازت دینا مناسب اور جائز بات ہے۔ اگر امام کسی فرد کو ایسا کرنے سے روک دے تو یہ روکنا بھی درست ہوگا۔ امام کی اجازت یا ممانعت کی صورت میں لوگوں کے درمیان ایک ہی جگہ کے سلسلہ میں نہ کشمکش کی نوبت آئے گی اور نہ ایک دوسرے کو ضرر رسانی کی۔

شیخ ابوحنیفہ نے جو بات کہی ہے وہ اس باب میں مروی آثار کو رد نہیں کرتی۔ حدیث کا رد جب ہوتا جب کہ وہ یہ کہتے کہ: 'اگر وہ اس زمین کو امام کی اجازت سے آباد کرے تو بھی وہ اس کی ملکیت نہیں بنے گی'۔ اب جو یہ کہتا ہے کہ ''اس صورت میں'' زمین اس فرد کی ملکیت ہو جائے گی تو یہ کہنا اس اثر ''حدیث'' کا اتباع ہوا۔ اضافہ صرف امام کی اجازت ضروری قرار دینے کا کیا گیا ہے تا کہ لوگوں کے باہمی نزاعات کا سد باب ہو اور ایک دوسرے کو ضرر رسانی کی نوبت نہ آئے''۔ (۹۳)

امام ابوحنیفہ کی زیرِ نظر مسئلہ میں رائے اور اتباعِ حدیث کی نوعیت واضح کر دینے کے باوجود امام ابو یوسف نے اس مسئلہ میں تھوڑی سی مختلف رائے اختیار کی ہے، جیسا کہ ابو یوسف فرماتے ہیں:

''باوجود اس کے میری رائے یہی ہے کہ ایسی شکل میں جب کہ احیاء سے کسی کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچ رہا ہو اور نہ کوئی اس کے خلاف عذر دار ہو، رسول اللہ کی (دی ہوئی) اجازت قیامت تک کام آتی رہے گی۔ لیکن اگر ضرر رسانی کی صورت پیدا ہو جائے تو اس کا علاج اس حدیث کی روشنی میں کیا جائے گا: ''ظلم کرنے

والے کا کوئی حق نہیں''۔(۹۴)

خلاصہ کلام یہ کہ امام ابوحنیفہ کی رائے میں مردہ زمین کی آبادکاری سے پہلے حکومتِ وقت کی اجازت ضروری ہے جبکہ امام ابو یوسف کی رائے میں خود نبی کریم کی اس سلسلہ میں اجازت کافی ہے، حکومتِ وقت کی اجازت کی کوئی ضرورت نہیں، البتہ نزاع کی صورت میں دیگر اَحادیث کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا۔

امام ابو یوسف 'حدیث' کو حجت مانتے ہیں

کتاب الخراج کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ امام ابو یوسف کے نزدیک حدیثِ نبوی بھی قرآن مجید کی طرح حجتِ شرعیہ اور مصدرِ قانونِ اسلامی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے کتاب الخراج میں 223 مرفوع روایات نقل کی ہیں اور ان سے بیسیوں اَحکامی مسائل پر استدلال کیا ہے۔ یہ روایات پوری کتاب میں بکھری ہوئی ہیں اور ہر ہر صفحے پر اس بات کی مثالیں موجود ہیں کہ امام ابو یوسف حدیث کو حجت شرعیہ مانتے ہیں۔ یہاں ہم ایک بڑی واضح مثال اس سلسلہ میں نقل کرنا مناسب سمجھیں گے۔

کسی چشمے یا کنویں وغیرہ کے مالک کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کو اپنے زیرِ ملکیت پانی سے روکے اور پانی دینے کی قیمت وصول کرے جو اس پانی سے اپنے کھیت اور باغات سیراب کرنا چاہتا ہو لیکن اگر کوئی مسافر ہو تو اسے یا اس کے جانور کو پانی لینے سے روکنا اس کے لیے جائز نہیں۔ اس مسئلہ کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے امام ابو یوسف لکھتے ہیں کہ

"وليس لصاحب العين والقنة والبئر والنهر ان يمنع الماء من ابن السبيل لما جاء في ذلك من الحديث والآثار وله ان يمنع سقي الزرع والنخل والشجر والكرم من قبل ان هذا لم يجيء فيه حديث وهو يضر بصاحبه فاما الحيوان المواشي والابل والدواب فليس له ان يمنع من ذلك"

''جو شخص کسی چشمے، کنویں، نہر وغیرہ کا مالک ہو اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی مسافر کو اس سے پانی

پینے سے منع کرے، کیونکہ اس سلسلہ میں احادیث و آثار موجود ہیں۔ البتہ وہ شخص لوگوں کو اپنے کھیت، درخت اور کھجور اور انگور کو سیراب کرنے سے روک سکتا ہے، اس لیے کہ ایک تو اس سلسلہ میں ممانعت کی کوئی حدیث نہیں ہے اور دوسرا یہ کہ یہ چیز اصل مالک کو ضرر پہنچاتی ہے۔ اور جہاں تک جانوروں مویشیوں کو پانی پلانے سے روکنے کا مسئلہ ہے، تو اس سلسلہ میں واضح رہے کہ اصل مالک کو جانوروں کو پانی سے روکنے کا کوئی حق نہیں ہے"۔(۹۵)

یہاں آپ نے عام پینے کے لیے پانی لینے اور کھیت کھلیان کی سیرابی کے لیے پانی لینے میں فرق کیا ہے اور اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ

"وفصل ما بين هذين الاحاديث التى جاء ت فى ذلك والسنة"

"ان دونوں چیزوں میں فرق کرنے کی وجہ وہ سنت اور احادیث ہیں جو اس سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں"۔(۹۶)

اس کے بعد آپ نے کئی ایسی احادیث کا ذکر کیا ہے جن میں (مسافروں وغیرہ کو) پانی پینے سے روکنے کی سخت مذمت کی گئی ہے مثلاً آپ کی روایت کردہ ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم نے فرمایا:

"مسلمان تین چیزوں میں شریک ہیں، پانی، چارہ اور آگ"۔(۹۷)

امام ابو یوسف نے حدیث کی بنیاد پر ابو حنیفہ اور دیگر ائمہ سے اختلاف بھی کیا ہے

کتاب الخراج کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ امام ابو یوسف نے کئی ایک مسائل میں اَحادیث و آثار کی بنیاد پر امام ابو حنیفہ اور دیگر ائمہ سے اختلاف بھی کیا ہے۔ بعض اوقات اس اختلاف کی وجہ آپ نے ذکر کر دی ہے اور بعض اوقات وجہ ذکر نہیں کی۔ اسی طرح بعض اوقات اپنی رائے ہی کو بہتر قرار دیا ہے اور بعض اوقات اپنی اور دیگر اہل علم دونوں کی رائے کو جائز قرار دیتے ہوئے فقہی توسع کی بات کی ہے۔ ذیل میں اس سلسلہ کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

1۔ مال غنیمت میں سے گھڑ سوار کو پیادہ کے مقابلہ میں کتنا حصہ ملے گا؟ اس مسئلہ میں امام ابو یوسف اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یضرب للفارس منهم ثلاث اسهم: سهمان للفرس، وسهم له، وللرجل سهم علی ما جاء فی الاحادیث والآثار". (۹۸)

"گھڑ سوار کو تین حصے ملیں گے: دو اس کے گھوڑے کے لیے اور ایک اس کے لیے، جبکہ پیادہ کو ایک حصہ ملے گا، اس لیے کہ اَحادیث و آثار میں اسی طرح مذکور ہے"۔

پھر آپ نے ان اَحادیث و آثار کو ذکر بھی کیا ہے۔ ان میں سے ایک روایت یہ بھی ہے:

"قال ابو یوسف: حدثنا الحسن بن علی بن عمار عن الحکم بن عتیبة عن مقسم عن عبد الله بن عباس رضی الله عنهما ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قسم غنائم بدر للفارس سهمان وللرجل سهم". (۹۹)

پھر امام ابو حنیفہ کی رائے ذکر کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں کہ

"کان الفقیه المقدم ابو حنیف یقول: للرجل سهم وللفرس سهم. وقال لا افضل بهیم علی رجل مسلم.

ویحتج بما حدثنا عن زکریا بن الحارث عن المنذر بن ابی خمیص الهمدانی ان عاملا لعمر بن الخطاب رضی الله عنه قسم فی بعض الشام للفارس سهم وللرجل سهم، فرفع ذلك اِلی عمر رضی الله عنه فسلمه واجازه. فکان ابو حنیفة یاخذ بهذا الحدیث ویجعل للفرس سهما وللرجل سهما وما جاء من الاحادیث والآثار ان للفرس سهمین وللرجل سهما اکثر من ذلك واوثق والعام علیه لیس هذا علی وجه التفضیل ولو کان علی وجه التفضیل ما کان ینبغی ان یکون للفرس سهم وللرجل سهم لانه قد سوی بهیم

برجل مسلم إنما هذا على ان يكون عدة الرجل اكثر من عدة الآخر , وليرغب الناس فی ارتباط الخیل فی سبیل الله الا تری ان سهم الفرس إنما يرد على صاحب الفرس فلا يكون للفرس دونه والمتطوع وصاحب الديوان في القسم سواء فخذ يا امير المؤمنين بای القولين رايت واعمل بما ترى إنه افضل واخير للمسلمين فإن ذلك موسع عليك إن شاء الله تعالى ولست ارى ان تقسم للرجل اكثر من فرسين "(١٠٠)

''فقیہ اعظم ابو حنیفہ فرمایا کرتے تھے: 'آدمی کے لیے ایک حصہ ہے اور گھوڑے کے لیے بھی ایک حصہ'۔ نیز وہ کہتے تھے کہ 'میں ایک جانور کو ایک مسلمان آدمی سے افضل قرار نہیں دے سکتا'۔ اپنی دلیل کے طور پر وہ یہ حدیث بیان کرتے تھے جو بروایت زکریا بن حارث، بروایت منذر بن ابو خمیصہ ہمدانی ہم سے بیان کی گئی ہے کہ 'عمر بن خطاب کے ایک عامل نے شام کے کسی علاقہ میں سوار کو ایک حصہ اور پیادہ کو ایک حصہ دیا۔ یہ بات عمر کے سامنے پیش کی گئی تو آپ نے اسے جائز قرار دیا'۔

ابو حنیفہ اسی روایت کی بنیاد پر گھوڑے کے لیے ایک حصہ اور آدمی کے لئے بھی ایک حصہ دینے کے قائل تھے لیکن جن احادیث و آثار میں گھوڑے کے لیے دو حصے اور آدمی کے لیے ایک حصہ مذکور ہے، ان کی تعداد زیادہ ہے اور وہ اس حدیث سے زیادہ مستند ہیں اور عام طور پر اسی مسلک کو اختیار کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ جانور کو آدمی پر فضیلت دی جائے، اگر فضیلت کا لحاظ ہوتا تو یہ بھی نامناسب ہوتا کہ گھوڑے کے لیے بھی ایک حصہ ہو اور آدمی کے لیے بھی ایک، کیونکہ یہ شکل بھی ایک جانور اور ایک مسلمان آدمی کو مساوی درجہ دیتی ہے۔

دراصل اس مسلک کی بنا اس بات پر ہے کہ ایک آدمی کے پاس سامانِ حرب دوسرے (پیدل) آدمی سے زیادہ ہوتا ہے (تقسیم میں اس تفریق کا) منشاء یہ ہے کہ لوگوں کو راہ خدا کے لیے گھوڑے تیار رکھنے کی طرف رغبت ہو۔ ظاہر ہے کہ گھوڑے کا حصہ بھی اس کے مالک ہی کو ملتا ہے نہ کہ گھوڑے کو'۔

اپنے شیخ سے اختلافِ رائے رکھنے کے باوجود آپ اس مسئلہ میں توسع سمجھتے ہیں، اسی لیے آپ نے یہ مسئلہ ذکر کرنے کے بعد خلیفہ وقت کو لکھا ہے کہ

''امیر المومنین! آپ ان دونوں میں سے جس رائے کو مناسب سمجھیں، اختیار کریں۔ جو پالیسی آپ کو مسلمانوں کے حق میں بہتر اور مفید نظر آئے، اسے اختیار کیجیے کیونکہ اس میں آپ کے لیے کافی گنجائش ہے، ان شاء اللہ!''۔(۱۰۱)

لیکن آپ کا اپنا رجحان یہی ہے کہ گھڑ سوار کو کل تین حصے اور پیادہ کو ایک حصہ ملے گا۔ اسی رائے کو آپ نے اس کتاب میں 'مشرکوں اور باغیوں سے لڑائی' کے ضمن میں واضح طور پر بیان کیا ہے۔(۱۰۲)

2۔ سمندر سے حاصل ہونے والی اشیاء کے محاصل کے حوالے سے مسئلہ ذکر کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں:

''امیر المؤمنین! آپ نے سمندر سے نکالے جانے والے عنبر اور زیور بنانے کے لائق چیزوں کے بارے میں دریافت فرمایا ہے۔ واضح رہے کہ سمندر سے زیور بنانے کے لائق جو اشیا یا عنبر برآمد ہو، ان میں خمس (1/5) واجب ہے۔ ان دو کے سوا اور چیزوں میں کچھ نہیں (واجب ہے)۔

ابو حنیفہ اور ابن ابی لیلیٰ کہتے تھے کہ 'ان میں سے کسی چیز پر کچھ نہیں واجب'۔ کیونکہ ان کی نوعیت مچھلی جیسی ہے مگر جہاں تک میرا تعلق ہے، میرا خیال یہ ہے کہ ان میں خمس لیا جائے گا اور باقی 4/5 حصہ اس کے لیے ہے جس نے اسے نکالا ہو (یہ رائے رکھنے کی) وجہ یہ ہے کہ اس باب میں ہم سے عمر سے مروی ایک حدیث بیان کی گئی ہے اور اس پر حضرت عبداللہ بن عباس نے حضرت عمر سے اتفاقِ رائے ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ ہم نے اس اَثر کا اتباع کیا ہے اور اس کے خلاف جانا مناسب نہیں سمجھا''۔(42)

3۔ جب اونٹوں کی تعداد 120 سے زیادہ ہو جائے تو پھر ان کی زکاۃ کس حساب سے دی جائے گی، اس سلسلہ میں امام ابو یوسف نے ایک حدیث لکھی ہے جس کے مطابق 120 کے بعد زکاۃ کا حساب یہ ہوگا کہ

ہر پچاس پر ایک حقہ (وہ اونٹنی جو عمر کے چوتھے سال میں ہو) اور ہر چالیس پر ایک بنت لبون (وہ اونٹنی جو عمر کے تیسرے سال میں ہو) زکاۃ میں دی جائے گی۔ امام ابو یوسف نے اس مسئلہ میں اسی حدیث کے مطابق موقف اختیار کیا ہے، چنانچہ آپ اس موقف کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ''یہی ہمارے نزدیک متفق علیہ ہے اور اس مسئلہ میں جو (روایات) میں نے سنی ہیں، ان میں سے سب سے زیادہ صحیح بھی یہی روایت ہے''۔ (۱۰۳)

لیکن امام ابو حنیفہ اور امام ابراہیم نخعی کے نزدیک 120 کے بعد زکاۃ پھر اسی اصول کے مطابق دہرائی جائے گی جو پانچ اونٹوں کے حساب سے شروع ہوتا ہے۔ امام ابو یوسف نے ان کی رائے کا ذکر کیا ہے اور ان کی دلیل کے طور پر حضرت علی کا ایک اَثر بھی نقل کیا ہے لیکن اس اَثر کے مقابلہ میں انہوں نے دوسری حدیث کو ترجیح دیتے ہوئے اپنا رجحان ان ائمہ کے خلاف ظاہر کیا ہے، تاہم ان کی رائے کی تردید یا تغلیط نہیں کی۔ (۱۰۴)

4۔ پانی کے اندر مچھلی کی بیع جائز ہے یا نہیں، اس بارے میں ابو یوسف نے فقہاء کا اختلافِ رائے ذکر کیا ہے۔ جو لوگ اسے جائز سمجھتے ہیں ان میں امام ابو حنیفہ کا بھی ذکر کرتے ہوئے آپ نے ان سے حضرت عمر بن عبد العزیز کے حوالے سے اس کے جواز کی ایک روایت بھی نقل کی ہے، لیکن خود آپ نے اس کے برعکس یہ رائے اختیار کی ہے کہ یہ بیع غرر ہے، اس لیے ناجائز ہے۔ اور اپنی اس رائے کی بنیاد آپ نے بعض مرفوع احادیث پر رکھی ہے اور انہیں کتاب الخراج میں روایت بھی کیا ہے۔ (۱۰۵)

5۔ زمین اور باغات کو بٹائی (یعنی تہائی، چوتھائی وغیرہ) پر دیا جا سکتا ہے یا نہیں، اس مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے ابو یوسف لکھتے ہیں کہ اس میں کوئی فقہاء کا آپس میں اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہ تو اسے کسی صورت بھی درست نہیں سمجھتے۔ پھر آپ نے امام ابو حنیفہ کے دلائل کا ذکر کرتے ہوئے ایک حدیث نقل کی ہے جس سے امام ابو حنیفہ اپنے موقف پر استدلال کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد آپ فرماتے ہیں کہ حجازی فقہاء

اسے جائز قرار دیتے ہیں اور اس پر اہل خیبر کے ساتھ مزارعت کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ پھر ابو یوسف اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"فکان احسن ما سمعنا فی ذلک واللہ اعلم ان ذلک جائز مستقیم اتبعنا الاحادیث التی جاء ت عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی مساقۃ خیبر لانھا اوثق عندنا واکثر واعم مما جاء فی خلافھا من احادیث". (۱۰۶)

''اس مسئلہ میں سب سے عمدہ بات جو ہم نے سنی ہے، وہ یہ ہے کہ بٹائی (پر مزارعت) بالکل جائز ہے۔ اس مسئلہ میں ہم نے ان احادیث کی پیروی کی ہے جو خیبر کی مساق (بٹائی پر مزارعت) کے حوالے سے نبی کریم سے منقول ہیں، کیونکہ جو احادیث اس کے خلاف جاتی ہیں، ان کے مقابلہ میں یہ احادیث (جو اس کے جواز کے حق میں ہیں) ہماری نظر میں زیادہ قابل اعتماد، زیادہ عموم کی حامل اور تعداد میں بھی زیادہ ہیں''۔

6۔ کسی سے بدلہ لیتے ہوئے اگر وہ مر جائے تو بدلہ لینے والے پر دیت عائد ہوگی یا نہیں، اس سلسلہ میں امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ اور امام ابن ابی لیلیٰ دونوں کے نزدیک عاقلہ پر دیت عائد ہوگی جب کہ اپنی رائے وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اس پر دیت عائد نہیں ہوگی کیونکہ اس سلسلہ میں آثار سے یہی بات معلوم ہوتی ہے، چنانچہ اس اختلاف کا اظہار اور سبب بیان کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں:

"لا شیء علی المقتص للآثار التی جاء ت فی ذلک". (۱۰۷)

''بدلہ لینے والے پر (ایسی صورت میں) کچھ بھی عائد نہیں ہوگا کیونکہ اس سلسلہ میں آثار موجود ہیں''۔

7۔ گھوڑے پر زکاۃ کا مسئلہ ذکر کرتے ہوئے امام ابو یوسف لکھتے ہیں کہ

''میں نے اس مسئلہ میں اپنے مشائخ کو مختلف الرائے پایا ہے۔ ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ (جنگل میں) چرنے والے گھوڑوں پر زکاۃ واجب ہے اور وہ ہر گھوڑے پر ایک دینار ہے۔ یہی بات انہوں نے ہم سے

بروایت حماد، بروایت ابراہیم بیان کی ہے۔تقریباً یہی بات حضرت علی سے بھی ہم تک روایت کی گئی ہے لیکن حضرت علی سے ایک اور حدیث بھی ہم تک پہنچی ہے جو اس پہلی حدیث کے برعکس بھی ہے اور (اس کے مقابلہ میں) اسے آپ نے نبی کریم تک مرفوعاً بھی بیان کیا ہے اور اس میں ہے کہ (نبی کریم نے فرمایا کہ) میں نے اپنی امت کی خاطر گھوڑوں اور غلام (کی زکا) کو معاف کر دیا ہے''۔(۱۰۸)

پھر اس کے بعد آپ نے اسی مؤخر الذکر رائے کی طرف رجحان ظاہر کرتے ہوئے اس کی تائید میں اور مرفوع احادیث بھی نقل کی ہیں۔

ایسی اور کئی مثالیں بھی اس کتاب میں موجود ہیں۔ہم اختصار کی خاطر اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

3۔امام ابو یوسف اور حجیتِ آثارِ صحابہ

امام ابو یوسف کے ہاں آثارِ صحابہ کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے حتیٰ کہ بعض اوقات واضح ترین قیاس کو بھی امام ابو یوسف اس لیے چھوڑ دیتے ہیں کہ اس کے معارض کوئی اَثر صحابی موجود ہوتا ہے، خواہ یہ اَثر صرف ایک ہی صحابی سے مروی ہو جیسا کہ امام سرخسی نے ابوبکر رازی کے حوالے سے امام ابوالحسن کرخی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

''ابوالحسن کرخی بیان فرماتے ہیں کہ میں نے یہ بات نوٹ کی ہے کہ امام ابو یوسف اپنے بعض مسائل میں اس طرح ذکر کرتے ہیں کہ 'قیاس تو اس طرح ہے مگر میں اس قیاس کو اَثر کی وجہ سے چھوڑتا ہوں'۔اور جس اَثر کی وجہ سے وہ قیاس کو چھوڑ رہے ہوتے ہیں، وہ صحابہ میں سے صرف ایک ہی صحابی سے منقول ہوتا ہے۔لہٰذا یہ ابو یوسف کے اس مسلک کی بالکل واضح دلیل ہے کہ وہ قول صحابی کو قیاس پر ترجیح دیتے ہیں''۔(۱۰۹)

امام سرخسی نے قول صحابی کو مختلف حیثیتوں میں تقسیم کیا ہے اور ان سب کا حکم بھی الگ الگ بیان کیا ہے مثلاً:

1۔ان میں سے ایک یہ ہے کہ قول صحابی میں قیاس و رائے کا دخل نہ ہو۔ایسی صورت میں امام سرخسی

کے بقول حنفی متقدمین ومتاخرین کے ہاں یہ حجت ہے اور یہ مرفوع روایت کے حکم میں ہے۔(۱۱۰)

2۔اگر قولِ صحابی رائے واجتہاد کی قبیل سے ہو تو اس کی ایک صورت یہ ہے کہ قول صحابی کو دیگر صحابہ کی تائید ہو جائے تو وہ چونکہ اجماع کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے، اس لیے یہ صورت بھی حجت ہے۔(۱۱۱)

3۔اگر قول صحابی فتویٰ کی قبیل سے ہو تو ایسی صورت میں ایک احتمال تو یہ ہے کہ صحابی نے اللہ کے رسول سے شاید اس سلسلہ میں کچھ سنا ہو جس کی بنیاد پر اس نے فتویٰ دیا ہے۔لہٰذا یہ احتمال اس بات کا متقاضی ہے کہ اسے 'رائے محض' پر اسی طرح ترجیح دی جائے جیسے خبر واحد کو قیاس پر ترجیح دی جاتی اور مقدم مانا جاتا ہے۔ اور اگر یہ احتمال بالکل نہ ہو بلکہ واضح ہو رہا ہو کہ یہ فتویٰ صحابی نے اپنی رائے سے دیا ہے تو پھر بھی ایسی صورت میں صحابی کی رائے پر مبنی فتویٰ بعد والوں کی رائے سے بہر حال قوی اور افضل ہے کیونکہ انہوں نے اللہ کے رسول کا زمانہ پایا ہے اور نزول وحی کے احوال وظروف سے پوری طرح آگاہ ہیں اور آنحضرت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ آپ پیش آمدہ مسائل میں کس طریق پر فتویٰ دیا کرتے تھے۔(۱۱۲)

4۔اگر صحابی کی رائے صرف رائے ہو (فتویٰ وغیرہ نہ ہو) تو ایسی صورت میں بھی ان کی رائے بعد والوں کی رائے سے افضل قرار دی جانی چاہیے اور یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ بعد والوں کے مقابلہ میں ان کی رائے میں صحت کا امکان زیادہ اور خطا کا امکان کم ہوگا کیونکہ انہیں اللہ کے رسول کی صحبت نصیب ہوئی ہے اور آپ نے ان کے حق میں خیر وبھلائی کی خود گواہی دی ہے۔(۱۱۳)

5۔چوتھی صورت ہی کی ایک ضمنی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ جہاں صحابہ کرام کی آراء بھی مختلف ہوں اور بعد والوں کا بھی اس مسئلہ میں اختلاف ثابت ہو تو وہاں بعد والوں کے مقابلہ میں صحابہ کو ترجیح دی جائے۔اور خود صحابہ کے اختلاف میں سے کس کو ترجیح دیں؟ اس بارے امام سرخسی بیان فرماتے ہیں کہ ایسی صورت میں اس صحابی کی رائے کو ترجیح دی جائے جس کے ساتھ ترجیح کا کوئی پہلو اور نوعیت موجود ہو۔(۱۱۴)

امام ابو یوسف کے ہاں یہ تمام صورتیں ہمیں کثرت کے ساتھ نظر آتی ہیں۔آپ نے آثارِ صحابہ کو کتنی

اہمیت دی ہے، اس کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ آپ نے مختلف مسائل میں آثارِ صحابہ سے استدلال کرتے ہوئے 229 آثار اس کتاب (الخراج) میں روایت کیے ہیں۔ ان میں سے بعض آثار تو مرفوع اَحادیث کی تائید میں نقل کیے گئے ہیں جبکہ اکثر جگہ مرفوع اَحادیث موجود نہ ہونے کی وجہ سے آپ نے ان آثار کی بنیاد پر مختلف فقہی مسائل پر استدلال کیا ہے۔ اس سلسلہ میں آپ نے خلفاء راشدین کے فتاویٰ اور قضا سے متعلقہ آثار کو خاص اہمیت دی ہے۔ (۱۱۵)

بہت سی جگہ پر آپ نے آثار کی موجودگی میں قیاس کو ترک کر کے آثار کے مطابق رائے دی ہے۔ اس کی کچھ مثالیں آگے ''احادیث و آثار اور قیاس'' کے تحت آئیں گی۔ اسی طرح بہت سے مسائل میں آپ نے آثار کی بنیاد پر اپنے اساتذہ اور معاصر و متقدم اہل علم سے اختلاف رائے کا اظہار کیا ہے۔ اس کی کچھ مثالیں پیچھے ''امام ابو یوسف نے حدیث کی بنیاد پر ابوحنیفہ اور دیگر ائمہ سے اختلاف بھی کیا ہے'' کے تحت گذر چکی ہیں۔

جن مسائل میں صحابہ کی رائے اجماع کی صورت اختیار کر جائے تو وہاں اجماعِ صحابہ کو آپ نے واضح طور پر حجت قرار دیا ہے۔ ایسے ہی ایک مسئلہ میں خوارج نے صحابہ کے اجماع کو اہمیت نہ دیتے ہوئے ان کے برعکس رائے اختیار کی تھی، تو خوارج پر سخت تنقید کرتے ہوئے امام ابو یوسف لکھتے ہیں:

''خوارج راہ راست سے بھٹک گئے اور انہوں نے عرب کی بستیوں کو وہی مقام دیا جو عجم کی بستیوں کو حاصل ہے۔ ان لوگوں نے اس بات کو اختیار نہیں کیا جس پر اللہ کے رسول کے صحابہ کا اجماع ہو چکا ہے اور جو کہ حضرت عمر اور حضرت علی کی رائے ہے۔ یہ رسول اللہ کے جن صحابیوں کا اجماع ہے وہ تحقیق کرنے اور توفیق پانے، دونوں اعتبار سے خوارج کی نسبت بہتر تھے''۔

اسی طرح جن غیر منصوص مسائل میں اہل علم کا اختلاف ہوتا ہے، ان میں آپ اس رائے کو اختیار کرتے ہیں جس کی تائید میں کوئی نہ کوئی اثر موجود ہو۔ آئندہ سطور میں اس سلسلہ کی کچھ مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

1۔ اگر چور اپنی چوری کا خود اعتراف کر لے تو ایک ہی مرتبہ اعتراف و اقرار کر لینے پر اسے سزا دے دی جائے گی یا دو مرتبہ اقرار کرنا ضروری ہے۔ امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں ہمارے اصحاب کا اختلاف ہے لیکن مجھے اس مسئلہ میں سب سے بہتر رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ دو مرتبہ اقرار ضروری ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دو مرتبہ اقرار حضرت علی سے مروی ایک اثر سے ثابت ہے۔ پھر آپ نے آگے اس اثر کو اپنی سند سے روایت بھی کیا ہے۔

3۔ میدان جنگ میں دشمن کو امان دینے کے لیے منہ سے کہنا ضروری ہے یا انگلی سے اشارہ کر دینے سے بھی امان کا حکم ثابت ہو جائے گا؟ امام ابو یوسف بیان کرتے ہیں کہ اس مسئلہ میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ بعض اشارے کو بھی کافی سمجھتے ہیں اور بعض کافی نہیں سمجھتے۔ لیکن میرے نزدیک سب سے بہتر بات یہ ہے کہ اشارہ بھی امان کے لیے کافی ہے کیونکہ حضرت عمر سے منقول ہے کہ انہوں نے اشارہ کو امان کے لیے کافی سمجھا ہے۔(۱۱۶)

علاوہ ازیں اگر کسی مسئلہ میں صحابہ کی مختلف آراء منقول ہوں تو وہاں آپ سب کو برابر اہمیت دیتے ہوئے اس مسئلہ میں فقہی توسع کا رجحان ظاہر کر دیتے ہیں، مثلاً:

1۔ قتلِ خطا اور قتلِ شبہ عمد کی دیت میں کس عمر کے اونٹ دیئے جائیں گے؟ اس مسئلہ میں آپ فرماتے ہیں کہ صحابہ کا اختلاف ہے۔ پھر آپ نے اس اختلاف کی تفصیل ذکر کرتے ہوئے صحابہ سے مروی مختلف آثار ذکر کیے ہیں اور آخر میں یہ رائے دی ہے:

"هذه اصول اقاويلهم فى اسنان الابل فى الخطا وشبه العمد وارجو ان لا يضيق عليك الامر فى اختيار قول من هذه الاقاويل ان شاء الله تعالىٰ".(۱۱۷)

"قتلِ شبہ عمد اور قتلِ خطا (کی دیت) میں دیئے جانے والے اونٹوں کی عمروں کے بارے میں ان حضرات صحابہ کے بنیادی اقوال یہی ہیں اور مجھے امید ہے کہ ان میں سے کسی بھی قول کو اختیار کر لینے میں آپ

کے لیے ان شاء اللہ کوئی مضائقہ نہیں ہے"۔

2۔امام ابو یوسف حد سرقہ کے ضمن میں فرماتے ہیں کہ اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ چور کا ہاتھ کلائی کے جوڑ سے کاٹا جائے گا' لیکن وہ صورت جس میں چور کا پاؤں کاٹنے کی نوبت آجاتی ہے، اس کا ذکر کرتے ہوئے ابو یوسف لکھتے ہیں کہ

"فاما موضع القطع من الرجل فان اصحاب محمد اختلفوا فيه فقال بعضهم: يقطع من المفصل، وقال آخرون: يقطع من مقدم الرجل، فخذ بای الاقاویل شئت فانی ارجو ان يكون ذلك موسعا عليك". (۱۱۸)

"پاؤں کس جگہ سے کاٹا جائے گا، اس بارے میں محمد کے صحابہ کا اختلاف ہے۔بعض حضرات نے کہا ہے کہ ٹخنے کے جوڑ سے کاٹا جائے گا۔بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ پنجے سے کاٹا جائے گا۔آپ ان اقوال میں سے جسے چاہیں اختیار کرلیں کیونکہ میرا خیال ہے کہ اس بارے میں آپ کے لیے گنجائش ہے"۔

متفرقات

نہایت ہی پتلے دبلے اور پستہ قد تھے، ان کے ایک شاگرد قاسم بن زریق کہتے تھے کہ جب وہ مسند درس پر بیٹھتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس میں ڈوب جائیں گے، لیکن جب درس دینے لگتے تھے تو حیرت میں ڈال دیتے تھے، ان کا جثہ دیکھ کر یہ کہا کرتے تھے کہ اگر اللہ چاہے تو پرندہ کے پیٹ میں علم بھر دے۔

امام ابو یوسف کثیر الاولاد تھے، مگر ارباب تذکرہ صرف ان کے صاحبزادوں کا تذکرہ کرتے ہیں، ایک تو بچپن ہی میں داغِ مفارقت دے گئے اور ایک یوسف نام کے صاحبزادے تھے، جنہوں نے علمِ دین امام ابو یوسف سے ورثہ میں پایا تھا، امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی زندگی ہی میں قاضی مقرر ہوگئے تھے، امام ابو یوسف پہلے بغداد کے مشرقی حصہ کے قاضی تھے، جب وہ قاضی القضا بنائے گئے تو ان کی جگہ پر ان کے صاحبزادے کا تقرر ہوا، والد کی وفات کے بعد پھر یہ رصافہ کے قاضی بنا دیئے گئے، یہ جامع منصور کے امام بھی

تھے، اِن کے صاحبزادے فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے گھر میں تیس برس سے عہدہ قضا ہے، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے بعد یہ بھی قاضی القضا بنا دیئے گئے تھے، مگر یہ روایت صحیح نہیں ہے، بلکہ امام ابو یوسف کے بعد وہب بن وہب ابو بختری اس عہدہ پر مامور ہوئے، ممکن ہے کہ کچھ دنوں کے لیے انہوں نے نیابت کا کام انجام دیا ہو سنہ ۱۹۳ھ میں ان کی وفات ہوئی۔(۱۱۹)

ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ یہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی کتاب الآثار کے راوی ہیں، کتاب الآثار لجب احیاء المعارف النعمانیہ حیدر آباد نے سنہ ۱۳۵۵ھ میں شائع کی ہے۔

ان کا صحیفہ اخلاق ہر قسم کے محاسن وفضائل سے پر ہے، عہدہ قضا پر رہتے ہوئے انہوں نے جس اخلاق و کردار کا ثبوت دیا، وہ ان کی خصوصیت ہے، اس عہدہ پر پہنچنے کے بعد بڑے بڑے پاکباز لوگوں کا دامن بھی آلودہ ہو جاتا ہے، مگر انہوں نے اپنا دامن کبھی داغ دار نہ ہونے دیا، لوگوں سے ملنا جلنا، تواضع وخاکساری لوگوں کی امداد اور اعانت، علم کی عزت وتوقیر، فیاضی وسیر چشمی یہ سب چیزیں اس زمانہ میں بھی ان کے ساتھ ساتھ سایہ کی طرح رہیں۔

مشہور سیرت نگار واقدی امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے ہم عصر تھے، امام ابو یوسف حج میں گئے تو حجاز میں ان سے ملاقات ہوئی، ان دنوں واقدی کی مالی حالت اچھی نہیں تھی، امام ابو یوسف رحمہ اللہ ان کو اپنے ساتھ بغداد لائے اور ہارون کے دربار میں لے گئے، یحیٰی برمکی بھی موجود تھا، پوچھا کہ قاضی صاحب مکہ سے کیا تحفہ لائے ہیں؟ امام ابو یوسف نے کہا کہ میں ایسا تحفہ تمھیں دونگا کہ اس سے پہلے کبھی نہ ملا ہوگا، یحیٰی نے کہا کہ کیا ہے؟ انہوں نے واقدی کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہی تحفہ ہے، اس کے بعد انہوں نے یحیٰی کے ذریعہ اس کی کافی مالی مدد کرائی۔(۱۲۰)

ہارون ایک بار خطبہ دے رہا تھا، ایک شخص کھڑا ہوا اور اس کو مخاطب کر کے کہا کہ خدا کی قسم! تم نے نہ تو مال کی تقسیم برابر کی اور نہ عدل وانصاف سے کام لیا، بلکہ اس کے بجائے فلاں فلاں برائیاں کیں، ہارون

نے حکم دیا کہ اس کو گرفتار کرلیا جائے، نماز کے بعد وہ پیش کیا گیا، ہارون نے ایک آدمی امام ابو یوسف رحمہ اللہ کو بلانے کے لیے بھیجا، امام ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں آیا تو وہ آدمی دو عقابوں کے بیچ میں کھڑا تھا اور اس کے پیچھے دو جلاد کوڑے لیے کھڑے تھے، ہارون نے کہا کہ اس شخص نے مجھ سے آج ایسی گفتگو کی ہے کہ اس سے پہلے کسی نے نہیں کی، یہ موقع بڑا نازک تھا، لیکن امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے نہایت جرات کے ساتھ ہارون کو اسوہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ کیا، کہا کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غنیمت تقسیم کی، تو آپ سے بھی اسی طرح کی بات چیت کی گئی تھی :غنیمت کی تقسیم مرضی الٰہی کے خلاف ہوئی ہے۔

یہ کتنی سخت بات تھی، مگر آپ نے معاف کر دیا، کسی نے کہا: آپ نے عدل سے کام نہیں لیا، فرمایا: اگر میں عدل نہ کرونگا تو اور کون کریگا؟ پھر کہنے والے سے کوئی باز پرس نہیں کہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور ایک انصاری نے آپ کے سامنے کوئی معاملہ پیش کیا، آپ نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے حق میں فیصلہ کر دیا، انصاری نے غصہ میں کہا کہ اپنے پھوپھی زاد بھائی کے حق میں آپ نے فیصلہ کر دیا، لیکن آپ نے اس گستاخی سے درگذر کیا اور کچھ نہ فرمایا۔

ہارون کے سامنے جب یہ اسوہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آیا تو اس کا غصہ بالکل سرد ہو گیا اور اس شخص کو چھوڑ دینے کا حکم دیدیا۔

بچپن سے فقر و فاقہ کی زندگی تھی، مگر کبھی اس پر ناشکری کے کلمات زبان سے نہیں نکلے، فقر و فاقہ کے ساتھ ان کی شکر گذاری کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے، عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں کہ ایک بار میں ان کے پاس گیا تو انہوں نے مجھ سے معاشی تنگی کی شکایت کی میں نے تسلی دی جب ان کے پاس سے چلنے لگا تو دیکھا کہ مٹی کا ایک میلا سا برتن ان کے پاس رکھا ہوا ہے، وہ اتفاق سے میرے دامن سے لگ کر ٹوٹ گیا اور اس کی وجہ سے ان کے چہرہ پر شکن آ گئی اور رنگ فق ہو گیا، مگر زبان سے کچھ نہیں کہا، میں نے کہا: کیا بات ہے؟ فرمایا: یہی یہی ایک برتن تھا جس سے میں اور میری والدہ وضو کرتے تھے اور اسی سے پانی بھی پیتے تھے، عبداللہ بن

مبارک ان کا یہ حال سن کر بہت متاثر ہوئے اور کچھ رقم ان کو دی۔ (۱۲۱)

قاضی القضاۃ ہوئے تو مال واسباب کی کافی فراوانی ہوئی اور اس منصب کے لحاظ سے بھی کچھ سازوسامان زیادہ ہوگیا، مگراس پر نہ وہ کبھی مغرور ہوئے اور نہ کبھی دروازہ پر دربان بٹھایا، بلکہ آخر تک اپنی زندگی بالکل طالب علمانہ رکھی، پھر بھی اپنے ساتھ دنیاوی سازوسامان رکھنے کا ان کو افسوس رہا، آخروقت میں فرماتے تھے: کاش میں فقروفاقہ ہی کی حالت میں اس دنیا سے رخصت ہوجاتا اور یہ عہدہ قضا قبول نہ کرتا! وہ قاضی القضاہوئے تو ان کو دو ہزار روپے سے زیادہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ (۱۲۲)

(اس وقت کے سکہ کے لحاظ سے دینار اور ایک ہزار درہم تھی) پھر ہارون رشید کے دربار سے سال میں لاکھوں روپے کے انعامات ملتے تھے، اس لیے وفات کے وقت ان کے پاس کافی دولت موجود تھی، لیکن اس دارِفانی سے رخصت ہونے لگے تو سب کو غرباء پر تقسیم کرنے کی وصیت کر گئے، چنانچہ تقریباً چار لاکھ روپے اہلِ مکہ، اہلِ مدینہ، اہلِ کوفہ اور اہلِ بغداد کو تقسیم کیا گیا۔ (۱۲۳)

ہارون نے ان کو کچھ خراجی زمین بھی دیدی تھی، جس پر کوئی ٹیکس نہیں لیا جاتا تھا، اس سے جو آمدنی ہوتی تھی وہ صدقہ کردیتے تھے۔ (۱۲۴)

نہایت نرم خو اور فیاض تھے، مگر ان کی نرم خوئی اور فیاضی احساسِ ذمہ داری سے خالی نہیں تھی، گو یہ دونوں صفتیں بہت کم جمع ہوتی ہیں، مگر ان میں یہ دونوں چیزیں جمع تھیں، ذیل کے واقعہ سے اس کا اندازہ ہوجائیگا:

ایک بار ایک شخص ان کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے فلاں شخص سے آپ کی طرف سے ایک خط لکھ کرا تنے روپیے حاصل کرلیے تھے، اب وہ مجھ سے مانگتا ہے، اس سے مجھ کو چھٹکارا دلائیے، امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے اس کو قید کرنے کا حکم دیا اور کہا کہ جب تک روپیہ واپس نہ کروگے، اس وقت تک قید سے رہائی نہیں مل سکتی، اس نے کہا میں نے ایک بار اسی طرح آپ کے استاد امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی طرف سے بھی

ایک فرضی خط ایک شخص کو لکھ کر روپیے حاصل کیے تھے، مگر جب میں نے ان کو اس کی اطلاع دی تو انہوں نے وہ روپیہ میری طرف سے ادا کر دیا اور فرمایا کہ جس شخص کے بارے میں یہ خیال ہو کہ وہ میرا خط دیکھ کر تمھیں روپیہ دیدے گا تو تم خط لکھ کر منگا لیا کرو، آپ بھی انہی کے اصحاب میں ہیں، آپ سے بھی مجھے یہی توقع تھی، امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں امام ابو حنیفہ نہیں ہوں، وہ ایک جلیل القدر عالم اور فقیہ تھے، لوگ ان کا ان کے علم و فضل کی وجہ سے احترام و اعزاز کرتے تھے اور اسی وجہ سے ان کے نام پر روپیہ دیدیتے تھے اور میں حکومت کا ایک ذمہ دار ہوں اس لیے اس بات کا امکان ہے کہ جس کو تم نے لکھا ہو وہ روپیے دینا نہ چاہتا ہو، مگر میرے خوف سے اس نے دیدیا ہو، ایک دن تک اس کو مایوس رکھا، پھر دوسرے دن اس کو اپنے پاس بلایا اور کہا کہ جس سے تم نے روپیے لیئے تھے، میں نے اس کو واپس کر دیئے اور تم کو رہا کرتا ہوں، اگر وہ دوبارہ وہ رقم بطیّب نفس بھی تمھیں واپس کرے تو نہ لینا، جاو اور آئندہ ایسا نہ کرنا۔ (۱۲۵)

حکومت کے تعلق اور اس کے ذمہ داروں کے نام سے عام طور پر جو فائدے حاصل کیے جاتے ہیں، امام ابو یوسف نے اس کے سد باب کے لیے اس کو قید کر دیا، مگر ان کی طبعی فیاضی اور نرم خوئی کا اثر تھا کہ روپیہ بھی ادا کر دیا۔

نہایت پاک دامن اور عفت مآب تھے، فرماتے تھے، بارالہا تو جانتا ہے کہ میں نے کبھی کوئی حرام فعل نہیں کیا اور نہ حرام کا ایک پیسہ کھایا۔ (۱۲۶)

فرماتے تھے بارالہا! تو جانتا ہے کہ جب دو آدمی میرے پاس کوئی معاملہ لاتے تو میں نے کبھی کوئی جانبداری نہیں کی اور نہ میری یہ کبھی خواہش ہوئی کہ فلاں کے حق میں فیصلہ ہو (۱۲۷)

خواہ وہ خلیفہ وقت ہی کیوں نہ ہو، بارِالہا! اس کے بدلہ تو مجھے معاف کر دے۔

ابو حفص ان روایتوں کے راوی ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ یہ نہ سمجھا جائے کہ انہوں نے آخر وقت میں ایسی بات کہی ہے جس پر زندگی میں ان کا عمل نہیں تھا، بلکہ ان کی ساری زندگی اس کی آئینہ دار تھی۔

علی بن عیسیٰ کہتے ہیں کہ میں ایک بار ایسے وقت میں امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے پاس آیا کہ مجھے گمان تھا کہ وہ آرام گاہ میں ہوں گے اور ملاقات نہ ہو سکے گی، میں نے اطلاع کرائی تو فوراً اندر بلا لیا، دیکھا کہ ایک علیحدہ کمرے میں لنگی باندھے ہوئے بیٹھے ہیں اور ان کے گرد کتابوں کا انبار ہے، میں نے کہا میں تو سمجھتا تھا کہ آپ سے ملاقات نہ ہو سکے گی، امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے فرمایا کہ دیکھو اس کمرے کے چاروں طرف یہ الماریاں ہیں، ان میں کتابیں اور کاغذات کے بہت سے پوٹ رکھے ہوئے ہیں، یہ تمام میرے فیصلوں کی نظیریں ہیں، قیامت کے دن جب مجھ سے باز پرس ہوگی کہ تم نے فیصلے کس طرح کیے تو خدا کے حضور اس کے جواب میں یہی پیش کردونگا۔(۱۲۸)

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے درس کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ حفظِ قرآن کے بغیر اپنے درس میں کسی کو شریک ہونے کی اجازت نہیں دیتے تھے، امام محمد صاحب پہلی بار ان کی خدمت میں آئے تو ان کو پورا قرآن مستحضر نہیں تھا، اس لیے ان کو واپس کر دیا، جب پورا قرآن ان کو مستحضر ہو گیا تو پھر ان کو درس میں شریک ہونے کی اجازت دی، قرآن کے احترام اور اس کی تلاوت میں بھی وہ ضرب المثل تھے، امام ابو یوسف بھی حافظِ قرآن تھے، قرآن کا اعزاز واحترام بھی انہوں نے استاذ سے سیکھا تھا، ایک بار کہیں جا رہے تھے، راستہ میں دو آدمی خرید وفروخت میں جھگڑا کر رہے تھے، ان میں سے ایک شخص نے اپنے ساتھی سے کہا کہ میری اور تمہاری مثال تو قرآن کی اس آیت کے مطابق ہے، اس کے بعد اس نے سورہ ص کی یہ آیت پڑھی:

إِنَّ هَذَا أَخِي لَهُ تِسْعٌ وَتِسْعُونَ نَعْجَةً وَلِيَ نَعْجَةٌ وَاحِدَةٌ فَقَالَ أَكْفِلْنِيهَا.(۱۲۹)

ترجمہ: یہ میرا بھائی ہے جس کے پاس ۹۹/ دنبیاں ہیں اور میرے پاس صرف ایک دنبی ہے، یہ کہتا ہے کہ یہ ایک بھی مجھے دیدو۔

امام ابو یوسف نے یہ سنا تو ان پر غصہ اور افسوس سے ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی، قریب تھا کہ بے ہوش ہو جائیں، جب ذرہ یہ کیفیت دور ہوئی تو اس شخص سے بڑے درشت لہجہ میں کہا کہ: تو اللہ سے ذرا بھی

ڈرتا نہیں، کلام الٰہی کو تو نے معمولی بات چیت بنالی ہے، قرآن کے پڑھنے والے کو چاہیے کہ وہ اس کو نہایت خشوع وخضوع اور خوف وہیبت کے ساتھ پڑھے ایسا نہ ہو کہ وہ ناراضگی کا سبب بن جائے، میں تجھ میں یہ کیفیت بالکل نہیں پاتا، کیا تیری عقل جاتی رہی ہے کہ تو نے کلام الٰہی کو لہو ولعب بنالیا ہے۔(۱۳۰)

اسی طرح ایک بار ایک شخص کو سورہ طٰہٰ کی کوئی آیت پڑھتے ہوئے سنا تو اس کو بھی بہت ڈانٹا، محمد بن فضل فرماتے ہیں کہ میں امام ابو یوسف کو اس لیے ناپسند کرتا تھا کہ یہ حکومت کے ارکان سے اختلاط رکھتے ہیں، لیکن جس روز سے ان کو یہ تنبیہ کرتے ہوئے میں نے دیکھا اس روز سے ان سے محبت کرنے لگا۔

کرردی نے لکھا ہے کہ دین کے تمام کاموں میں وہ بڑا اہتمام کرتے تھے(۱۳۱)

دعا کرتے تھے تو دونوں ہاتھ چادر کے اندر نہیں رکھتے تھے، بلکہ باہر نکال کر دعا کرتے تھے (اس میں سنت کی موافقت بھی مقصود رہی ہوگی اور اس صورت میں تضرع کی کیفیت بھی زیادہ پیدا ہوتی ہے)۔

موفق اور قرشی دونوں حضرات نے لکھا ہے کہ عہدہ قضا کے قبول کر لینے کے بعد وہ سو رکعت روزانہ نماز پڑھتے تھے، روزہ کا بھی بڑا اہتمام کرتے تھے، خصوصیت سے رجب وشعبان میں پورے مہینہ روزہ رکھتے تھے۔(۱۳۲)

امام ابو یوسف، امام ابوحنیفہ اور ابن ابی لیلی دونوں حضرات کے خاص شاگرد تھے، ان دونوں اساتذہ کی احسان شناسی سے وہ پوری زندگی گرانبار رہے، ہمیشہ دونوں کے لیے دعائے مغفرت کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ میں نے جب بھی کوئی نفل یا فرض نماز پڑھی تو ان کے لیے دعا ضرور کی، بعض روایتوں میں ہے کہ وہ اپنے والدین سے پہلے امام صاحب کے لیئے دعا کرتے تھے۔

امام ابو یوسف نہایت ذکی اور ذہین تھے، اس لیے جب کوئی بات یا مسئلہ سامنے آتا تو اس کا وہ فوراً جواب دیتے، ایک بار ہارون کے ساتھ حج کو تشریف لے گئے، ظہر یا عصر کے وقت انہوں نے امامت کی، چونکہ یہ مسافر تھے، اس لیے قصر کیا یعنی دو رکعت کے بعد سلام پھیر کر نمازیوں سے کہا کہ اپنی نمازیں پوری کرلو

میں مسافر ہوں (۱۳۳)

اہلِ مکہ میں سے ایک شخص نے نماز ہی میں کہا: ہم لوگ یہ مسئلہ تم سے اور جس نے تم کو سکھایا ہے، اس سے بہتر جانتے ہیں، امام ابو یوسف نے کہا یہ تو ٹھیک ہے، لیکن اگر تم کو یہ مسئلہ معلوم ہوتا تو نماز میں بات چیت نہ شروع کر دیتے، اس جواب پر ہارون رشید بہت خوش ہوا اور اس نے کہا کہ اگر نصف سلطنت کے بدلہ مجھے یہ جواب مل جاتا تو بھی میں پسند کرتا۔

(یہی مسنون طریقہ ہے)۔

ایک بار ہارون رشید نے ان سے کہا کہ آپ میرے پاس بہت کم آتے ہیں میں آپ کی صحبت وزیارت کا مشتاق رہتا ہوں، امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ اشتیاق اسی وقت تک ہے جب تک کہ میں کم آتا ہوں، جب زیادہ آنے لگوں گا تو یہ اشتیاق واعزاز باقی نہیں رہے گا، ہارون نے اس جواب کی تحسین کی۔(۱۳۴)

ایک صاحب امام ابو یوسف کی خدمت میں ہمیشہ خاموش بیٹھے رہتے تھے، ایک بار ان سے فرمایا کہ تم کچھ بولتے نہیں؟ کہا کہ بہت اچھا، کچھ دیر کے بعد بولے روزہ کب افطار کرنا چاہیے، فرمایا جب آفتاب غروب ہو جائے، بولے اگر آفتاب آدھی رات تک غروب نہ ہو تو؟ یہ سن کر امام ابو یوسف ہنس پڑے اور کہا کہ تمہارا خاموش رہنا ہی اچھا تھا، تمہاری زبان کھلوا کر میں نے خطا کی۔(۱۳۵)

نہایت قوی الحفظ تھے، امام ذہبی رحمہ اللہ نے انہیں حفاظ حدیث میں شمار کیا ہے، ابن جوزی رحمہ اللہ نے ان کو امت کے ان سو قوی الحفاظ لوگوں میں شمار کیا ہے، جو ضرب المثل تھے، انہوں نے لکھا ہے کہ اپنے شیوخ حدیث سے جب وہ سماع حدیث کرتے تھے تو بسا اوقات ایک ہی مجلس میں انہیں پچاس ساٹھ حدیثیں مع سند زبانی یاد ہو جاتی تھیں، ابن عبد البر کے بیان سے بھی اسی کی تائید ہوئی ہے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے حسن بن زیادہ کے واسطہ سے نقل کیا ہے کہ وہ ایک بار بیمار تھے، اسی حالت میں سفیان بن عیینہ نے چالیس

حدیثیں سنائیں اور وہ سب ان کو اسی وقت یاد ہوگئیں اور ان کے جانے کے بعد اپنے رفقاء کو وہ تمام حدیثیں مع سند سنا دیں، رفقاء کو ان کی قوتِ حفظ پر سخت تعجب ہوا۔

ابو معاویہ کہتے ہیں کہ میں اور ابو یوسف دونوں سماعِ حدیث کے لیے جاتے تھے، میں تو شیخ سے سنی ہوئی تمام حدیثیں لکھ لیا کرتا تھا اور انہیں بغیر لکھے زبانی یاد ہو جاتی تھیں، خلیفہ ہارون رشید بھی ان کا ہم سبق رہ چکا تھا، اس سے ایک بار لوگوں نے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ کی شکایت کی تو اس نے کہا میں ان کے علم وفضل کو بچپن سے جانتا ہوں، یہ درس میں حدیثیں لکھتے نہیں تھے، مگر حافظہ ایسا قوی تھا کہ ان کو سب حدیثیں زبانی یاد ہو جاتی تھیں اور درس کے بعد لکھنے والے ان کے حفظ سے اپنی مکتوبہ احادیث کی تصحیح کرتے تھے۔(۱۳۶)

علالت اور وفات

موت سے کچھ دن پہلے بیمار پڑے، ان کو بیمار ہونے سے پہلے ہی اپنی موت کا کچھ اندازہ ہو گیا تھا، وہ برابر کہتے تھے کہ ۱۷ برس امام صاحب کی خدمت میں رہا اور ۱۷ برس دنیا کے کاموں میں، اب میرا وقت قریب ہے، موت سے کچھ پہلے وصیت کی کہ میرے مال میں سے ایک ایک لاکھ درہم اہلِ مکہ، اہلِ مدینہ اور اہلِ کوفہ پر تقسیم کر دیا جائے، اس کے بعد وراثت تقسیم ہو۔(۱۳۷)

علالت کے ایام میں ان پر عجیب رقت طاری رہتی تھی، عہدہ قضا کی ذمہ داریوں کو انہوں نے جس دیانت داری سے انجام دیا اس کی تفصیل اوپر آچکی ہے، لیکن آخر وقت میں وہ کہتے تھے کہ کاش میں فقر و فاقہ کی حالت میں اس دنیا سے چلا جاتا اور عہدہ قضا نہ قبول کرتا، پھر بھی میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں نے قصداً نہ کسی پر ظلم کیا ہے اور نہ کسی فریق کی پاسداری کی ہے اور نہ میری خواہش ہوتی کہ فلاں فریق کامیاب ہو اور فلاں ناکامیاب (۱۳۸)

جس روز انہوں نے اس دارِ فانی کو چھوڑا ان پر عجیب کیفیت تھی اور زبان پر یہ کلمات تھے: بارِ الٰہا تو جانتا ہے کہ میں نے کسی فیصلہ میں جو تیرے بندوں کے درمیان تھا خود رائی سے کام نہیں لیا اور نہ خلاف واقعہ

فیصلہ کیا، ہمیشہ میری کوشش رہی کہ جو فیصلہ ہو وہ تیری کتاب اور تیرے رسول کی سنت کے موافق ہو، جب کسی مسئلہ میں مشکل پیش آتی تھی تو میں امام ابو حنیفہ کو اپنے اور تیرے درمیان واسطہ بناتا تھا اور جہاں تک مجھے معلوم ہے کہ امام ابو حنیفہ تیرے احکام کو خوب سمجھتے تھے اور عمداً وہ کبھی حق کے دائرہ سے باہر نہیں جاتے تھے، یہ بھی زبان پر تھا کہ: اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میں ہمیشہ پاکدامن رہا اور کبھی ایک درہم جان بوجھ کر حرام کا نہیں کھایا۔(۱۳۹)

تعلیم و تعلم آخری سانس تک جاری تھا، ایک شاگرد کو کسی مسئلہ کی تفصیل بتا رہے تھے، ابھی خاموش بھی نہیں ہوئے تھے کہ چند منٹ کے بعد آواز ہمیشہ کے لیئے بند ہوگئی۔

معروف کرخی ایک مشہور بزرگ گذرے ہیں، یہ امام ابو یوسف کے معاصر تھے ان کو جب بیماری کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے اپنے ایک رفیق سے کہا کہ اگر آج ان کی وفات ہو جائے تو مجھے اطلاع دینا میں جنازہ میں شریک ہوں گا، ان رفیق کا بیان ہے کہ جب میں دار الرقیق کے دروازہ پر پہنچا تو امام ابو یوسف کا جنازہ نکل رہا تھا، میں نے خیال کیا کہ اگر میں معروف کرخی کو خبر کرنے جاتا ہوں تو مجھے جنازہ کی نماز نہ ملے گی، چنانچہ جنازہ کی نماز پڑھ کر ان کے پاس گیا اور خبر وفات سنائی تو ان کو سخت صدمہ ہوا اور بار بار اناللہ پڑھا اور پھر یہ فرمایا کہ انشاءاللہ ان کو جنت میں اچھا مقام ملے گا، لوگوں نے پوچھا کہ یہ مقام ان کو کیونکر حاصل ہوگا؟ فرمایا: کہ تعلیم اور تعلم اور لوگوں کی ایذا رسانی پر صبر کی بدولت (۱۴۰)

یہ واقعہ جمعرات کے دن ظہر کیوقت ربیع الاوّل کی پانچویں تاریخ سنہ۱۸۲ھ کو پیش آیا۔

اِن کی وفات کا لوگوں پر بڑا اثر ہوا، خصوصیت سے ہارون رشید بہت غمگین تھا، جنازہ نکلا تو مشایعت کی اور خود نماز جنازہ پڑھائی اور اپنے خاندان کے خاص مقبرہ میں دفن کرایا۔(۱۴۱)

اس سے فارغ ہوا تو لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ تمام اہلِ اسلام کو چاہیے کہ ان کی وفات پر ایک دوسرے کی تعزیت کریں یعنی حادثہ ایک شخص یا ایک خاندان کا نہیں بلکہ پوری ملت کا ہے، شجاع بن مخلد

کا قول ہے کہ ہم امام ابو یوسف کے جنازہ میں شریک تھے، عباد بن عوام بھی ہمارے ساتھ تھے، میں نے ان کو یہ کہتے سنا کہ اہلِ اسلام کو چاہیے کہ ابو یوسف کی وفات پر ایک دوسرے کی تعزیت کریں۔(۱۴۲)

اہلِ تذکرہ کا بیان ہے کہ امام ابو یوسف کے جنازہ میں ابو یعقوب خزیمی شاعر بھی شریک تھا، اس نے لوگوں کو یہ کہتے سنا کہ دوسرے امام کا خاتمہ ہو گیا، فقہ کا خاتمہ ہو گیا تو اس نے برجستہ ایک مرثیہ کہا: جس کے چند اشعار ہیں:

یا ناحی الفقه اِلَیَ اهله　　إن مات یعقوب وما تدری

لم یمت الفقه ولکنه　　حول من صدر اِلَی صدر

القاه یعقوب اِلَی یوسف　　فزال من طیب اِلَی طهر

فهو مقیم فإذا ما نوی　　حل وحل الفقه فی قبر(۱۴۳)

☆☆☆☆☆

المراجع والمصادر باب چہارم

(۱)سید مناظر احسن گیلانی، "امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی"، المیزان ۲۰۰٦،صفحہ /جلد٥۳

(۲)أبو محمد عفيف الدين عبد الله بن أسعد بن علي بن سليمان اليافعي"مرآة الجنان وعبرة اليقظان في معرفة ما يعتبر من حوادث الزمان"، دار الكتب العلمية، بيروت -لبنان، 1417هـ 1997 -م،صفحه /جلد١/١٠٤

(۳)أبو محمد عفيف الدين عبد الله بن أسعد بن علي بن سليمان اليافعي"مرآة الجنان وعبرة اليقظان في معرفة ما يعتبر من حوادث الزمان"، دار الكتب العلمية، بيروت -لبنان، 1417هـ 1997 -م،صفحه /جلد ١/٤٠١

(٤)عبد العزيز بن محمد بن عبد المحسن السلمان،"موارد الظمآن لدروس الزمان، خطب وحكم وأحكام وقواعد ومواعظ وآداب وأخلاق حسان" الطبعة :الثلاثون، 1424هجرى،طبع على نفقة جماعة من المحبين للخير،٢/٤٨٧

(٥)سید مناظر احسن گیلانی، "امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی"، المیزان ۲۰۰٦،صفحہ /جلد٧٥٣

(٦)مؤفق بن احمد المکی، "مناقب موفق"،دائرة المعارف النظامية، ١٩٠٣ء، صفحه /جلد٢/٢٤٦

(٧)مؤفق بن احمد المکی، "مناقب موفق"،دائرة المعارف النظامية، ١٩٠٣ء، صفحه /جلد١/٢١٥

(٨)مؤفق بن احمد المکی، "مناقب موفق"،دائرة المعارف النظامية، ١٩٠٣ء، صفحه /جلد٢/٢١٧

(٩)مؤفق بن احمد المکی، "مناقب موفق"،دائرة المعارف النظامية، ١٩٠٣ء، صفحه /جلد٢/٢٤٤

(١٠) مؤفق بن احمد المکی، "مناقب موفق"،دائرة المعارف النظامية، ١٩٠٣ء، صفحه /جلد٢/٩٣٢

(١١)عبد القادر بن محمد بن نصر الله القرشي، أبو محمد، محيي الدين الحنفي المتوفى775 :هجرى، "الجواهر المضية في طبقات الحنفية"، مير محمد كتب خانه -كراتشي، صفحه /جلد٢/٢٢١

(١٢)عبد القادر بن محمد بن نصر الله القرشي، أبو محمد، محيي الدين الحنفي المتوفى775 :هجرى، "الجواهر المضية في طبقات الحنفية"، مير محمد كتب خانه -كراتشي، صفحه /جلد٢/٢٢١

(۱۳)مؤفق بن احمد المکی، "مناقب موفق "،دائرة المعارف النظامية، ۱۹۰۳ء، صفحه /جلد۲/۹۳۲

(۱٤)مؤفق بن احمد المکی، "مناقب موفق "،دائرة المعارف النظامية، ۱۹۰۳ء، صفحه /جلد۲/۲۳۲

(۱۵)مؤفق بن احمد المکی، "مناقب موفق "،دائرة المعارف النظامية، ۱۹۰۳ء، صفحه /جلد۲/۲۳۲

(۱٦) أبو بكر أحمد بن علي بن ثابت بن أحمد بن مهدي الخطيب البغدادي المتوفى463 :هجرى،". تاريخ بغداد"،دار الغرب الإسلامي -بيروت،1422هـ 2002 -م،صفحه /جلد۸/۴۵۳

(۱۷)مؤفق بن احمد المکی، "مناقب موفق "،دائرة المعارف النظامية، ۱۹۰۳ء، صفحه /جلد۲/۲۳۲

(۱۸) محمد بن محمد بن شهاب بن يوسف الكردرى البريقيني البزازى،"مناقب كردرى "،دائرة المعارف، صفحه /جلد۲/۱۲۷

(۱۹)محمد زاهد الكوثرى، "حسن التقاضى فى سيرة الإمام أبى يوسف القاضى " ، ايچ ايم سعيد كمپنى ادب منزل پاكستان چوك كراچى، طبع ثانى صفحه /جلد۳۰

(۲۰)محمد زاهد الكوثرى، "حسن التقاضى فى سيرة الإمام أبى يوسف القاضى " ، ايچ ايم سعيد كمپنى ادب منزل پاكستان چوك كراچى، طبع ثانى صفحه /جلد۳۰

(۲۱)سورةالتوبه:٦۰

(۲۲)قاضى ابو يوسف يعقوب ابن ابراهيم و محمد نجات الله صديقى ،"اسلام كا نظام محاصل (ترجمه كتاب الخراج)"،اسلامك پبليكيشنز لميٹڈ ،لاهور ،صفحه /جلد٤٦

(۲۳)قاضى ابو يوسف يعقوب ابن ابراهيم و محمد نجات الله صديقى ،"اسلام كا نظام محاصل (ترجمه كتاب الخراج)"،اسلامك پبليكيشنز لميٹڈ ،لاهور ،صفحه /جلد٦٤

(۲٤)قاضى ابو يوسف يعقوب ابن ابراهيم و محمد نجات الله صديقى ،"اسلام كا نظام محاصل (ترجمه كتاب الخراج)"،اسلامك پبليكيشنز لميٹڈ ،لاهور ،صفحه /جلد٦٤

(۲۵)سورۃالانفال:۴۱

(۲٦)قاضی ابو یوسف یعقوب ابن ابراھیم و محمد نجات اللہ صدیقی ،"اسلام کا نظام محاصل (ترجمہ کتاب الخراج)"،اسلامك پبلیکیشنز لمیٹڈ ،لاھور ،صفحه /جلد٦٤

(۲۷)سورۃالنحل:۸

(۲۸)سورۃالانفال:٦٠

(۲۹)قاضی ابو یوسف یعقوب ابن ابراھیم و محمد نجات اللہ صدیقی ،"اسلام کا نظام محاصل (ترجمہ کتاب الخراج)"،اسلامك پبلیکیشنز لمیٹڈ ،لاھور ،صفحه /جلد٦٤

(۳۰)قاضی ابو یوسف یعقوب ابن ابراھیم و محمد نجات اللہ صدیقی ،"اسلام کا نظام محاصل (ترجمہ کتاب الخراج)"،اسلامك پبلیکیشنز لمیٹڈ ،لاھور ،صفحه /جلد١٠

(۳۱) أبو بکر أحمد بن علی بن ثابت بن أحمد بن مهدی الخطيب البغدادی المتوفی463 :هجری،". تاریخ بغداد"،دار الغرب الإسلامی -بیروت،1422هـ 2002 -م،صفحه /جلد٨/٨٥٣

(۳۲)شمس الدین أبو عبد الله محمد بن أحمد بن عثمان بن قَایْماز الذهبی ، "تذكرة الحفاظ"،دار الكتب العلمية بيروت-لبنان،1419هـ1998 -م،صفحه /جلد١/٢١٤

(۳۳)محمد زاهد الكوثری، "حسن التقاضی فی سیرة الإمام أبی یوسف القاضی " ، ایچ ایم سعید کمپنی ادب منزل پاکستان چوك کراچی، طبع ثانی صفحه /جلد٢٩

(٣٤) محمد بن محمد بن شهاب بن يوسف الكردری البريقینی البزازی،"مناقب كردری "،دائرة المعارف، صفحه /جلد٢/٣٣٠

(۳۵) محمد بن محمد بن شهاب بن يوسف الكردری البريقینی البزازی،"مناقب كردری "،دائرة المعارف، صفحه /جلد:٢/٧٣١

(۳۶) محمد بن محمد بن شهاب بن يوسف الكردرى البريقينى البزازى،"مناقب كردرى "،دائرة المعارف، صفحه /جلد:۶۲۱/۲

(۳۷) محمد بن محمد بن شهاب بن يوسف الكردرى البريقينى البزازى،"مناقب كردرى "،دائرة المعارف، صفحه /جلد۵۰/۱

(۳۸)محمد زاهد الكوثرى، "حسن التقاضى فى سيرة الإمام أبى يوسف القاضى " ، ايچ ايم سعيد كمپنى ادب منزل پاكستان چوك كراچى، طبع ثانى صفحه /جلد۶۲

(۳۹)عبدالرحمن بن محمد بن محمد ابن خلدون ابوزيد ولى الدين الحضرمى "مقدمه ابن خلدون" (ديوان المبتدأ و الخبر فى تاريخ العرب و البربر ومن عاصرهم من ذوى الشأن الأكبر) دارالفكر، بيروت ۱۹۸۸م صفحه /جلد ۲۵۷/۱

(۴۰)محمد زاهد الكوثرى، "حسن التقاضى فى سيرة الإمام أبى يوسف القاضى " ، ايچ ايم سعيد كمپنى ادب منزل پاكستان چوك كراچى، طبع ثانى صفحه /جلد۵۳

(۴۱)محمد زاهد الكوثرى، "حسن التقاضى فى سيرة الإمام أبى يوسف القاضى " ، ايچ ايم سعيد كمپنى ادب منزل پاكستان چوك كراچى، طبع ثانى صفحه /جلد۳۶

(۴۲) محمد بن محمد بن شهاب بن يوسف الكردرى البريقينى البزازى،"مناقب كردرى "،دائرة المعارف، صفحه /جلد۱۳۴/۲

(۴۳)شمس الدين أبو عبد الله محمد بن أحمد بن عثمان بن قَايْماز الذهبى ، "تذكرة الحفاظ"،دار الكتب العلمية بيروت-لبنان،1419هـ1998 -م،صفحه /جلد۲۱۴/۱

(۴۴)مؤفق بن احمد المكى، "مناقب موفق "،دائرة المعارف النظامية، ۱۹۰۳ء، صفحه /جلد۲۲۱/۲

(۴۵)على جمعة محمد عبد الوهاب، "المدخل إلى دراسة المذاهب الفقهية"، دار السلام -القاهرة، 1422 -هـ -

2001م،صفحه /جلد١/٩٨

(٤٦) أبو عبد الله محمد بن الحسن بن فرقد الشيباني المتوفى189 :هج،"الأصل المعروف بالمبسوط"،إدارة القرآن والعلوم الإسلامية -كراتشي، صفحه /جلد٣٠/١٢٨

(٤٧)محمد زاهد الكوثري، "حسن التقاضى فى سيرة الإمام أبى يوسف القاضى " ، ایچ ایم سعید کمپنی ادب منزل پاکستان چوك كراچى، طبع ثانى صفحه /جلد١٩

(٤٨)محمد زاهد الكوثري، "حسن التقاضى فى سيرة الإمام أبى يوسف القاضى " ، ایچ ایم سعید کمپنی ادب منزل پاکستان چوك كراچى، طبع ثانى صفحه /جلد١٩

(٤٩) محمد بن محمد بن شهاب بن يوسف الكردرى البريقيني البزازى،"مناقب كردرى "،دائرة المعارف، صفحه /جلد٢/١٣٤

(٥٠)أبو الفداء إسماعيل بن عمر بن كثير القرشي البصرى ثم الدمشقي المتوفى774 :هج، "البداية والنهاية "، دار إحياء التراث العربى، 1408، هـ 1988 -م، صفحه /جلد١٠/١٩٦

(٥١)أحمد بن على بن حجر العسقلاني أبو الفضل شهاب الدين،"توالى التأسيس لمعالى محمد بن إدريس" الناشر: دار الكتب العلمية،1986 - 1406،صفحه /جلد١٧

(٥٢)أبو الفداء إسماعيل بن عمر بن كثير القرشي البصرى ثم الدمشقي المتوفى774 :هج، "البداية والنهاية "، دار إحياء التراث العربى، 1408، هـ 1988 -م، صفحه /جلد١٠/١٩٦

(٥٣)شمس الدين أبو الخير محمد بن عبد الرحمن بن محمد السخاوى، "المقاصد الحسنة فى بيان كثير من الأحاديث المشتهرة على الألسنة"،دار الكتاب العربى -بيروت، 1405هـ 1985 -م، صفحه /جلد١/٧٤٦

(٥٤)شمس الدين أبو عبد الله محمد بن أحمد بن عثمان بن قَايْماز الذهبى ، "تذكرة الحفاظ"،دار الكتب العلمية بيروت-لبنان،1419هـ1998 -م،صفحه /جلد١/٢١٤

(٥٥) نواب صديق حسن خان، "التاج المكلل"،مكتبه دارالسلام رياض،١٤١٦هجرى، صفحه /جلد91

(٥٦) نواب صديق حسن خان، "التاج المكلل"،مكتبه دارالسلام رياض،١٤١٦هجرى، صفحه /جلد92

(٥٧)أبو الفضل أحمد بن على بن محمد بن أحمد بن حجر العسقلانى ، "تقريب التهذيب"،دار الرشيد - سوريا، - 1406،،صفحه /جلد١/٤٠٢

(٥٨) نواب صديق حسن خان، "التاج المكلل"،مكتبه دارالسلام رياض،١٤١٦هجرى، صفحه /جلد92

(٥٩) نواب صديق حسن خان، "التاج المكلل"،مكتبه دارالسلام رياض،١٤١٦هجرى، صفحه /جلد92

(٦٠) نواب صديق حسن خان، "التاج المكلل"،مكتبه دارالسلام رياض،١٤١٦هجرى، صفحه /جلد92

(٦١) نواب صديق حسن خان، "التاج المكلل"،مكتبه دارالسلام رياض،١٤١٦هجرى، صفحه /جلد92

(٦٢) نواب صديق حسن خان، "التاج المكلل"،مكتبه دارالسلام رياض،١٤١٦هجرى، صفحه /جلد92

(٦٣) نواب صديق حسن خان، "التاج المكلل"،مكتبه دارالسلام رياض،١٤١٦هجرى، صفحه /جلد92

(٦٤)شمس الدين أبو عبد الله محمد بن أحمد بن عثمان بن قَايْماز الذهبى ،"ميزان الاعتدال فى نقد الرجال"،دار المعرفة للطباعة والنشر، بيروت -لبنان، 1382هـ 1963 -م،صفحه /جلد٤/٤٧٧

(٦٥)شمس الدين أبو عبد الله محمد بن أحمد بن عثمان بن قَايْماز الذهبى ،"ميزان الاعتدال فى نقد الرجال"،دار المعرفة للطباعة والنشر، بيروت -لبنان، 1382هـ 1963 -م،صفحه /جلد٤/٤٧٧

(٦٦) شمس الدين أبو عبد الله محمد بن أحمد بن عثمان بن قَايْماز الذهبى ،"سير أعلام النبلاء "، مؤسسة الرسالة، 1405هـ - 1985 م، صفحه /جلد٨/٥٣٥

(٦٧)قاضى ابو يوسف يعقوب ابن ابراهيم و محمد نجات الله صديقى ،"اسلام كا نظام محاصل (ترجمه كتاب الخراج)"،اسلامك پبليكيشنز لميٹڈ ،لاهور ،صفحه /جلد١٢

(٦٨) الشيخ محمد ابو زهره "ابو حنيفة : حياته و عصره و آراؤه الفقهية" دار الفكر العربى القاهره الطبعة الثانية

صفحہ /جلد۱۹۷

(٦٩) عتر، نور الدین،" منهج النقد فی علوم الحدیث"، دآرالفكر، دمشق، ۱۹۹۷ء، صفحہ /جلد۲۸

(۷۰)قاضی ابو یوسف یعقوب ابن ابراهیم و محمد نجات الله صدیقی ،"اسلام کا نظام محاصل (ترجمہ کتاب الخراج)"،اسلامك پبلیکیشنز لمیٹڈ ،لاهور ،صفحہ /جلد۱۸

(۷۱).قاضی ابو یوسف یعقوب ابن ابراهیم و محمد نجات الله صدیقی ،"اسلام کا نظام محاصل (ترجمہ کتاب الخراج)"،اسلامك پبلیکیشنز لمیٹڈ ،لاهور ،صفحہ /جلد٦٢

(۷۲)قاضی ابو یوسف یعقوب ابن ابراهیم و محمد نجات الله صدیقی ،"اسلام کا نظام محاصل (ترجمہ کتاب الخراج)"،اسلامك پبلیکیشنز لمیٹڈ ،لاهور ،صفحہ /جلد۷۰

(۷۳)قاضی ابو یوسف یعقوب ابن ابراهیم و محمد نجات الله صدیقی ،"اسلام کا نظام محاصل (ترجمہ کتاب الخراج)"،اسلامك پبلیکیشنز لمیٹڈ ،لاهور ،صفحہ /جلد۱۵۲

(۷٤)قاضی ابو یوسف یعقوب ابن ابراهیم و محمد نجات الله صدیقی ،"اسلام کا نظام محاصل (ترجمہ کتاب الخراج)"،اسلامك پبلیکیشنز لمیٹڈ ،لاهور ،صفحہ /جلد۱۸۰

(۷۵) مصطفیٰ السباعی "السنة ومكانتها فی التشریع الاسلامی" دار الوراق المكتب الاسلامی ۲۰۰۰ء صفحہ /جلد۵۹

(۷٦) مصطفیٰ السباعی "السنة ومكانتها فی التشریع الاسلامی" دار الوراق المكتب الاسلامی ۲۰۰۰ء صفحہ /جلد۵۹

(۷۷)مصطفیٰ السباعی "السنة ومكانتها فی التشریع الاسلامی" دار الوراق المكتب الاسلامی ۲۰۰۰ء صفحہ /جلد٦۰

(۷۸) مصطفیٰ السباعی "السنة ومكانتها فی التشریع الاسلامی" دار الوراق المكتب الاسلامی ۲۰۰۰ء صفحہ

/جلد٦١

(٧٩)قاضي ابو يوسف يعقوب ابن ابراهيم و محمد نجات الله صديقي ،"اسلام كا نظام محاصل (ترجمه كتاب الخراج)"،اسلامك پبليكيشنز لميٹڈ ،لاهور ،صفحه /جلد٧٨

(٨٠)قاضي ابو يوسف يعقوب ابن ابراهيم و محمد نجات الله صديقي ،"اسلام كا نظام محاصل (ترجمه كتاب الخراج)"،اسلامك پبليكيشنز لميٹڈ ،لاهور ،صفحه /جلد٩٦

(٨١)قاضي ابو يوسف يعقوب ابن ابراهيم و محمد نجات الله صديقي ،"اسلام كا نظام محاصل (ترجمه كتاب الخراج)"،اسلامك پبليكيشنز لميٹڈ ،لاهور ،صفحه /جلد١٦٠

(٨٢)قاضي ابو يوسف يعقوب ابن ابراهيم و محمد نجات الله صديقي ،"اسلام كا نظام محاصل (ترجمه كتاب الخراج)"،اسلامك پبليكيشنز لميٹڈ ،لاهور ،صفحه /جلد٧٦

(٨٣)قاضي ابو يوسف يعقوب ابن ابراهيم و محمد نجات الله صديقي ،"اسلام كا نظام محاصل (ترجمه كتاب الخراج)"،اسلامك پبليكيشنز لميٹڈ ،لاهور ،صفحه /جلد٥٩

(٨٤)قاضي ابو يوسف يعقوب ابن ابراهيم و محمد نجات الله صديقي ،"اسلام كا نظام محاصل (ترجمه كتاب الخراج)"،اسلامك پبليكيشنز لميٹڈ ،لاهور ،صفحه /جلد١٦٥

(٨٥)قاضي ابو يوسف يعقوب ابن ابراهيم و محمد نجات الله صديقي ،"اسلام كا نظام محاصل (ترجمه كتاب الخراج)"،اسلامك پبليكيشنز لميٹڈ ،لاهور ،صفحه /جلد٢١٤

(٨٦)قاضي ابو يوسف يعقوب ابن ابراهيم و محمد نجات الله صديقي ،"اسلام كا نظام محاصل (ترجمه كتاب الخراج)"،اسلامك پبليكيشنز لميٹڈ ،لاهور ،صفحه /جلد١٩٤

(٨٧) قاضي ابو يوسف يعقوب ابن ابراهيم و محمد نجات الله صديقي ،"اسلام كا نظام محاصل (ترجمه كتاب الخراج)"،اسلامك پبليكيشنز لميٹڈ ،لاهور ،صفحه /جلد١٧٩

(۸۸)قاضی ابو یوسف یعقوب ابن ابراهیم و محمد نجات الله صدیقی ،"اسلام کا نظام محاصل (ترجمه کتاب الخراج)"،اسلامك پبلیکیشنز لمیٹڈ ،لاهور ،صفحه /جلد۱۸۰

(۸۹)قاضی ابو یوسف یعقوب ابن ابراهیم و محمد نجات الله صدیقی ،"اسلام کا نظام محاصل (ترجمه کتاب الخراج)"،اسلامك پبلیکیشنز لمیٹڈ ،لاهور ،صفحه /جلد۸۸،۸۹

(۹۰) احمد، احمد بن حنبل، المسند، عالم الكتب، بيروت، ط اول، 1998ء.(عن جابر عن النبی مرفوعاً). ج3، ص338،

(۹۱)قاضی ابو یوسف یعقوب ابن ابراهیم و محمد نجات الله صدیقی ،"اسلام کا نظام محاصل (ترجمه کتاب الخراج)"،اسلامك پبلیکیشنز لمیٹڈ ،لاهور ،صفحه /جلد٦٤

(۹۲)قاضی ابو یوسف یعقوب ابن ابراهیم و محمد نجات الله صدیقی ،"اسلام کا نظام محاصل (ترجمه کتاب الخراج)"،اسلامك پبلیکیشنز لمیٹڈ ،لاهور ،صفحه /جلد٦٤

(۹۳) قاضی ابو یوسف یعقوب ابن ابراهیم و محمد نجات الله صدیقی ،"اسلام کا نظام محاصل (ترجمه کتاب الخراج)"،اسلامك پبلیکیشنز لمیٹڈ ،لاهور ،صفحه /جلد٦٤

(٩٤)قاضی ابو یوسف یعقوب ابن ابراهیم و محمد نجات الله صدیقی ،"اسلام کا نظام محاصل (ترجمه کتاب الخراج)"،اسلامك پبلیکیشنز لمیٹڈ ،لاهور ،صفحه /جلد٦٤

(۹۵)قاضی ابو یوسف یعقوب ابن ابراهیم و محمد نجات الله صدیقی ،"اسلام کا نظام محاصل (ترجمه کتاب الخراج)"،اسلامك پبلیکیشنز لمیٹڈ ،لاهور ،صفحه /جلد٩٦

(٩٦) قاضی ابو یوسف یعقوب ابن ابراهیم و محمد نجات الله صدیقی ،"اسلام کا نظام محاصل (ترجمه کتاب الخراج)"،اسلامك پبلیکیشنز لمیٹڈ ،لاهور ،صفحه /جلد٩٦

(۹۷)قاضی ابو یوسف یعقوب ابن ابراهیم و محمد نجات الله صدیقی ،"اسلام کا نظام محاصل (ترجمه کتاب

الخراج)"،اسلامك پبليكيشنز لميٹڈ ،لاهور ،صفحه /جلد٩٦

(٩٨) قاضى ابو يوسف يعقوب ابن ابراهيم و محمد نجات الله صديقى ،"اسلام كا نظام محاصل (ترجمه كتاب الخراج)"،اسلامك پبليكيشنز لميٹڈ ،لاهور ،صفحه /جلد١٨

(٩٩) قاضى ابو يوسف يعقوب ابن ابراهيم و محمد نجات الله صديقى ،"اسلام كا نظام محاصل (ترجمه كتاب الخراج)"،اسلامك پبليكيشنز لميٹڈ ،لاهور ،صفحه /جلد١٨

(١٠٠)قاضى ابو يوسف يعقوب ابن ابراهيم و محمد نجات الله صديقى ،"اسلام كا نظام محاصل (ترجمه كتاب الخراج)"،اسلامك پبليكيشنز لميٹڈ ،لاهور ،صفحه /جلد١٩

(١٠١)قاضى ابو يوسف يعقوب ابن ابراهيم و محمد نجات الله صديقى ،"اسلام كا نظام محاصل (ترجمه كتاب الخراج)"،اسلامك پبليكيشنز لميٹڈ ،لاهور ،صفحه /جلد١٩

(١٠٢)قاضى ابو يوسف يعقوب ابن ابراهيم و محمد نجات الله صديقى ،"اسلام كا نظام محاصل (ترجمه كتاب الخراج)"،اسلامك پبليكيشنز لميٹڈ ،لاهور ،صفحه /جلد٥٩١

(١٠٣)قاضى ابو يوسف يعقوب ابن ابراهيم و محمد نجات الله صديقى ،"اسلام كا نظام محاصل (ترجمه كتاب الخراج)"،اسلامك پبليكيشنز لميٹڈ ،لاهور ،صفحه /جلد٧١

(١٠٤)قاضى ابو يوسف يعقوب ابن ابراهيم و محمد نجات الله صديقى ،"اسلام كا نظام محاصل (ترجمه كتاب الخراج)"،اسلامك پبليكيشنز لميٹڈ ،لاهور ،صفحه /جلد٧٦

(١٠٥)قاضى ابو يوسف يعقوب ابن ابراهيم و محمد نجات الله صديقى ،"اسلام كا نظام محاصل (ترجمه كتاب الخراج)"،اسلامك پبليكيشنز لميٹڈ ،لاهور ،صفحه /جلد٧٧

(١٠٦) قاضى ابو يوسف يعقوب ابن ابراهيم و محمد نجات الله صديقى ،"اسلام كا نظام محاصل (ترجمه كتاب الخراج)"،اسلامك پبليكيشنز لميٹڈ ،لاهور ،صفحه /جلد٨٧

(۱۰۷)قاضی ابو یوسف یعقوب ابن ابراهیم و محمد نجات الله صدیقی ،"اسلام کا نظام محاصل (ترجمه کتاب الخراج)"،اسلامك پبلیکیشنز لمیٹڈ ،لاهور ،صفحه /جلد۸۹

(۱۰۸)قاضی ابو یوسف یعقوب ابن ابراهیم و محمد نجات الله صدیقی ،"اسلام کا نظام محاصل (ترجمه کتاب الخراج)"،اسلامك پبلیکیشنز لمیٹڈ ،لاهور ،صفحه /جلد۱۶۰

(۱۰۹) قاضی ابو یوسف یعقوب ابن ابراهیم و محمد نجات الله صدیقی ،"اسلام کا نظام محاصل (ترجمه کتاب الخراج)"،اسلامك پبلیکیشنز لمیٹڈ ،لاهور ،صفحه /جلد۷۷

(۱۱۰) سرخسي، ابوبکر محمد بن احمد، (م490ه) "اصول السرخسي"، ج2، ص106، بیروت، دار المعرفة، ط اول 1418ه.

(۱۱۱)قاضی ابو یوسف یعقوب ابن ابراهیم و محمد نجات الله صدیقی ،"اسلام کا نظام محاصل (ترجمه کتاب الخراج)"،اسلامك پبلیکیشنز لمیٹڈ ،لاهور ،صفحه /جلد۱۱۰

(۱۱۲)قاضی ابو یوسف یعقوب ابن ابراهیم و محمد نجات الله صدیقی ،"اسلام کا نظام محاصل (ترجمه کتاب الخراج)"،اسلامك پبلیکیشنز لمیٹڈ ،لاهور ،صفحه /جلد۱۰۸

(۱۱۳) قاضی ابو یوسف یعقوب ابن ابراهیم و محمد نجات الله صدیقی ،"اسلام کا نظام محاصل (ترجمه کتاب الخراج)"،اسلامك پبلیکیشنز لمیٹڈ ،لاهور ،صفحه /جلد۱۰۸

(۱۱٤) قاضی ابو یوسف یعقوب ابن ابراهیم و محمد نجات الله صدیقی ،"اسلام کا نظام محاصل (ترجمه کتاب الخراج)"،اسلامك پبلیکیشنز لمیٹڈ ،لاهور ،صفحه /جلد۱۰۹،۱۱۰

(۱۱۵) قاضی ابو یوسف یعقوب ابن ابراهیم و محمد نجات الله صدیقی ،"اسلام کا نظام محاصل (ترجمه کتاب الخراج)"،اسلامك پبلیکیشنز لمیٹڈ ،لاهور ،صفحه /جلد۱۰۸

(۱۱٦)قاضی ابو یوسف یعقوب ابن ابراهیم و محمد نجات الله صدیقی ،"اسلام کا نظام محاصل (ترجمه کتاب

الخراج)"،اسلامك پبليكيشنز لميٹڈ ،لاهور ،صفحه /جلد١٦٤

(١١٧) قاضی ابو یوسف یعقوب ابن ابراهیم و محمد نجات الله صدیقی ،"اسلام کا نظام محاصل (ترجمه کتاب الخراج)"،اسلامك پبليكيشنز لميٹڈ ،لاهور ،صفحه /جلد٢٠٥

(١١٨) قاضی ابو یوسف یعقوب ابن ابراهیم و محمد نجات الله صدیقی ،"اسلام کا نظام محاصل (ترجمه کتاب الخراج)"،اسلامك پبليكيشنز لميٹڈ ،لاهور ،صفحه /جلد١٥٦

(١١٩) قاضی ابو یوسف یعقوب ابن ابراهیم و محمد نجات الله صدیقی ،"اسلام کا نظام محاصل (ترجمه کتاب الخراج)"،اسلامك پبليكيشنز لميٹڈ ،لاهور ،صفحه /جلد١٦٧

(١٢٠)مؤفق بن احمد المکی، "مناقب موفق "،دائرة المعارف النظامية، ١٩٠٣ء، صفحه /جلد١٠/٢

(١٢١)محمد زاهد الکوثری، "حسن التقاضی فی سیرة الإمام أبی یوسف القاضی " ، ایچ ایم سعید کمپنی ادب منزل پاکستان چوك کراچی، طبع ثانی صفحه /جلد٥٠

(١٢٢) محمد بن محمد بن شهاب بن یوسف الکردری البریقینی البزازی،"مناقب کردری "،دائرة المعارف، صفحه /جلد٣٤١/٢

(١٢٣) محمد بن محمد بن شهاب بن یوسف الکردری البریقینی البزازی،"مناقب کردری "،دائرة المعارف، صفحه /جلد٣٤١/٢

(١٢٤)عبد القادر بن محمد بن نصر الله القرشي، أبو محمد، محيي الدين الحنفي المتوفى775 :هجری، "الجواهر المضية فی طبقات الحنفية"، میر محمد کتب خانه -کراتشي، صفحه /جلد٢٥/٢

(١٢٥)عبد القادر بن محمد بن نصر الله القرشي، أبو محمد، محيي الدين الحنفي المتوفى775 :هجری، "الجواهر المضية فی طبقات الحنفية"، میر محمد کتب خانه -کراتشي، صفحه /جلد١٤٠/٢

(١٢٦)مؤفق بن احمد المکی، "مناقب موفق "،دائرة المعارف النظامية، ١٩٠٣ء، صفحه /جلد٥٢٢/٢

(۱۲۷)مؤفق بن احمد المکی، "مناقب موفق "،دائرۃ المعارف النظامیۃ، ۱۹۰۳ء، صفحہ /جلد۲/۲٤۲

(۱۲۸)مؤفق بن احمد المکی، "مناقب موفق "،دائرۃ المعارف النظامیۃ، ۱۹۰۳ء، صفحہ /جلد۲/۲٤۲

(۱۲۹)مؤفق بن احمد المکی، "مناقب موفق "،دائرۃ المعارف النظامیۃ، ۱۹۰۳ء، صفحہ /جلد۲/٤٤۲

(۱۳۰)مؤفق بن احمد المکی، "مناقب موفق "،دائرۃ المعارف النظامیۃ، ۱۹۰۳ء، صفحہ /جلد۲/٤٤۲

(۱۳۱)مؤفق بن احمد المکی، "مناقب موفق "،دائرۃ المعارف النظامیۃ، ۱۹۰۳ء، صفحہ /جلد۲/٤٤۲

(۱۳۲)مؤفق بن احمد المکی، "مناقب موفق "،دائرۃ المعارف النظامیۃ، ۱۹۰۳ء، صفحہ /جلد:۲/۱٤۰

(۱۳۳)مؤفق بن احمد المکی، "مناقب موفق "،دائرۃ المعارف النظامیۃ، ۱۹۰۳ء، صفحہ /جلد۲/۱۳۲

(۱۳٤) محمد زاهد الکوثری، "حسن التقاضی فی سیرۃ الإمام أبی یوسف القاضی " ، ایچ ایم سعید کمپنی ادب منزل پاکستان چوک کراچی، طبع ثانی صفحہ /جلد۱۷

(۱۳۵)مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، "سیر الصحابہ " ، دارالاشاعت اردو بازار کراچی، ۲۰۰٤ء، صفحہ /جلد ۸/۸۵

(۱۳٦)مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، "سیر الصحابہ " ، دارالاشاعت اردو بازار کراچی، ۲۰۰٤ء، صفحہ /جلد ۸/۸۵

(۱۳۷) أبو بکر أحمد بن علی بن ثابت بن أحمد بن مهدی الخطیب البغدادی المتوفی463 :هجری،". تاریخ بغداد"،دار الغرب الإسلامی -بیروت،1422هـ 2002 -م،صفحہ /جلد۸/٤۵۳

(۱۳۸) محمد بن محمد بن شهاب بن یوسف الکردری البریقینی البزازی،"مناقب کردری "،دائرۃ المعارف، صفحہ /جلد۲/۹۱۱

(۱۳۹) مؤفق بن احمد المکی، "مناقب موفق "،دائرۃ المعارف النظامیۃ، ۱۹۰۳ء، صفحہ /جلد۲/۲٤۲

(۱٤۰)مؤفق بن احمد المکی، "مناقب موفق "،دائرۃ المعارف النظامیۃ، ۱۹۰۳ء، صفحہ /جلد۲/۲٤۲

(١٤١) أبو بكر أحمد بن علی بن ثابت بن أحمد بن مهدی الخطيب البغدادی المتوفی463 :هجری،". تاريخ بغداد"،دار الغرب الإسلامی -بيروت،1422هـ 2002 -م،صفحه /جلد٨/٤٥٣

(١٤٢) أبو بكر أحمد بن علی بن ثابت بن أحمد بن مهدی الخطيب البغدادی المتوفی463 :هجری،". تاريخ بغداد"،دار الغرب الإسلامی -بيروت،1422هـ 2002 -م،صفحه /جلد٨/٤٥٤

(١٤٣) أبو بكر أحمد بن علی بن ثابت بن أحمد بن مهدی الخطيب البغدادی المتوفی463 :هجری،". تاريخ بغداد"،دار الغرب الإسلامی -بيروت،1422هـ 2002 -م،صفحه /جلد٨/٤٥٣

☆

خاتمہ

☆☆☆

کتابیات

☆

﴿بسم اللہ الرحمان الرحیم﴾

ماحصل

کوئی تحقیق حرفِ آخر نہیں ہوتی اور نہ ہی کوئی محقق اس کا دعویٰ کر سکتا ہے، تاہم اپنی بساط اور موجود ذرائع کی روشنی میں امام ابو یوسفؒ کے تفقہ سے متعلق مختلف جہات سے کی گئی اپنی تحقیق کو اس مقالہ میں پیش کیا ہے، جس میں قاضی امام ابو یوسف کی دینی و علمی خدمات کا تحقیقی مطالعہ تفصیلاً کیا گیا ہے۔ تاہم مقالہ کے آخر میں اس تحقیق کا ایک خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے۔

قاضی امام ابو یوسف کی دینی و علمی خدمات کا تحقیقی مطالعہ

مذکورہ مقالہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔

باب اول: امام قاضی ابو یوسف سے قبل فقہ کی تاریخ اور کوفے کی سرگرمیوں پر ایک نظر

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصدِ بعثت وحی الٰہی کی تبلیغ ہی نہ تھا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ آپ کی ذمہ داری یہ بھی تھی کہ قرآن کریم کے مبہم مقامات کی توضیح اور مجمل مقامات کی تفصیل بیان کریں اور جو احکام توضیح طلب ہوں ان کی تفسیر و وضاحت کریں۔ آپ کا اجتہاد واجب الاتباع ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اور تقریرات قانون سازی کا حصہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کسی خطا پر آپ کو برقرار نہیں رکھتے۔ رسول ﷺ نے اجتہاد کیا اور صحابہ کرام نے بھی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی اور غیر موجودگی میں اجتہاد کیا البتہ یہ اجتہاد گنے چنے مسائل و معاملات تک محدود تھا۔ اجتہادِ رسول اور اجتہاد صحابہ نہ تو احکام میں اختلاف کا باعث تھا اور نہ آراء میں تعارض کا۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے روم و ایران کے ممالک فتح کرنے کے لیے لشکر روانہ کیے مگر قبل اس کے کہ یہ لشکر اپنے مقدس مقاصد حاصل کرتے، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا۔ سیدنا حضرت عمر کے بعد فتوحات کا یہ سلسلہ جاری رہا، پہلی صدی ہجری ختم ہونے کے قریب تھی کہ اسلامی لشکر نے شمالی افریقہ فتح کرنے کے بعد اندلس کو فتح کرنے کے لیے بحرِ متوسط کو عبور کر لیا تھا، اسی طرح وہ مشرقی جانب سمرقند تک پہنچ چکے تھے۔ اسلامی ممالک کا میل جول [illegible] عناصر ان

میں داخل ہو گئے، تو لازمی طور پر بہت سے نئے مسائل بھی سامنے آئے، جن سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کو دور رسالت مآب میں واسطہ نہ پڑا تھا، صحابہ کرام کی ذمہ داری تھی کہ وہ ہر پیش آنے والے نئے مسئلے اور واقعے کا مناسب حل پیش کریں۔ اس صورت میں صحابہ کرام نے اجتہاد کیا اور اپنے اجتہاد میں رائے کو ذہانت کے ساتھ استعمال کیا، فقہ دور رسالت کی طرح دور صحابہ رضی اللہ عنہم میں بھی واقعی اور عملی رہا، جس میں مسائل کے واقع ہونے کے بعد ان کا حل تلاش کیا جاتا تھا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود کوفے کے سنِ تاسیس سے لے کر خلافت عثمان کے اواخر تک وہاں قیام پذیر رہے، اہل کوفہ کو تعلیم قرآن سے آراستہ کرتے تھے، ان کو دینی سمجھ بوجھ اور فقہ کی تعلیم دیتے رہے اور ان کے سوالات پر فتاویٰ دیتے رہے، اس سلسلے میں انہوں نے اتنا اہتمام کیا اور انتہائی توجہ دی کہ اس سے زیادہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، چنانچہ آپ کی مساعی جمیلہ سے کوفہ قراء اور فقہاء سے بھر گیا، یہاں تک کہ جب حضرت علی کوفہ منتقل ہوئے تو وہاں فقہاء کی کثرت سے بہت خوش ہوئے اور فرمایا ''اللہ ابن ام عبد (ابن مسعود) پر رحم فرمائے، انہوں نے تو اس شہر یعنی کوفے کو علم سے بھر دیا ہے''۔

جہاں تک ابراہیم نخعی کا تعلق ہے تو یہ عبداللہ بن مسعود کے وہ نامور شاگرد ہیں جنہیں کوفہ کا امام اور فقیہ سمجھا جاتا تھا۔ ابراہیم نخعی نے قیاس اور استنباط میں وسعتِ نظر سے کام لیا اور فتویٰ کو خوفناک شکل دے کر ناقابل حل نہیں بنایا۔ قیاس کو اختیار کرنے میں توسع اور نصوص کی تعلیل کی بنیاد قرار دینے کے باوجود فرضی اور من گھڑت مسائل سے دور رہے، وہ بالعموم خاموشی کو ترجیح دیتے تھے اور جب تک ان سے سوال نہیں کیا جاتا تھا علمی گفتگو نہیں کرتے تھے۔ بعض مورخین کا تو یہاں تک خیال ہے کہ فقہ ابوحنیفہ، فقہ ابراہیم سے مختلف نہیں ہے، اور یہ کہ متاخر (ابوحنیفہ) کی شخصیت متقدم (ابراہیم نخعی) کی شخصیت میں فنا نظر آتی ہے۔ ابوحنیفہ نے ابراہیم نخعی کی فقہ ان کے شاگرد رشید اور ان کی فقہ کے راوی حماد بن ابی سلیمان کے واسطے سے حاصل کی، لیکن انہوں نے شعبی سے بھی فقہ حاصل کی تھی، اگرچہ انہوں نے عراق میں زندگی گزاری، اس کے باوجود وہ فقہائے اثر (حدیث) کے زیادہ قریب تھے، بہ نسبت اس کے جتنا وہ فقہائے اہل الرائے کے قریب تھے، اسی طرح انہوں نے مکی فقہ عطا بن ابی رباح سے حاصل کی اور مدنی فقہ نافع مولیٰ ابن عمر سے حاصل کی۔ وہ قیاسی طریقہ جس میں ابراہیم نخعی مشہور ہوئے، امام ابوحنیفہ کی سرپرستی میں بہت زیادہ پروان چڑھا، حتی کہ ان کو قیاس کی وجوہ اور اس کے لیے مقررہ علل کا علم رکھنے کے لحاظ سے مسلمانوں کا سب سے بڑا فقیہ قرار دیا گیا۔ امام ابوحنیفہ

عراقی، مکی اور مدنی تینوں طرز کے فقہ کا مجموعہ تھے۔ چنانچہ ان سے مروی ہے کہ

"میں سب سے پہلے کتاب اللہ کو لیتا ہوں، کتاب اللہ میں حکم نہ ملے تو سنت رسول اللہ کو لیتا ہوں، کتاب اللہ اور سنت رسول دونوں میں نہ ملے تو اصحاب رسول میں سے جس کا قول چاہتا ہوں، لے لیتا ہوں، اور جس کا چاہتا ہوں چھوڑ دیتا ہوں، مگر اقوالِ صحابہ کو چھوڑ کر کسی اور کا قول نہیں لیتا، تاہم جب معاملہ ابراہیم، شعبی، ابن سیرین، حسن، عطاء اور ابن مسیّب تک پہنچ جائے تو وہ بھی انسان تھے جنہوں نے اجتہاد کیا، لہٰذا میں بھی اسی طرح اجتہاد کرتا ہوں، جس طرح انہوں نے اجتہاد کیا۔"

امام ابو حنیفہ کا طریقہ اس استاد کی طرح تھا جو اپنی رائے زبردستی نہیں ٹھونستا اور نہ اپنے شاگرد سے ایسی بات ہی سننے میں کوئی شرمندگی محسوس کرتا ہے جو اس کے قول کی بہ نسبت حق وصواب کے زیادہ قریب ہو، بلکہ وہ اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، اس پر خوشی کا اظہار کرتا ہے اور اس قسم کے اسلوب کی دعوت دیتا ہے، آپ نے اپنے تلامذہ کو اجتہاد کرنے کی نصیحت فرمائی، اس کی انہیں ترغیب دی اور ان کے سامنے اجتہاد کے دروازے کھول دیئے۔

۱۳۲ھ میں عباسیوں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے نسبت رکھتے تھے، امویوں کو گرانے اور ان کی حکومت ختم کرنے کے بعد خود حکومت پر قابض ہو گئے۔ عباسیوں نے امویوں سے ایسا خوفناک اور دردناک انتقام لیا کہ نہ ان کے زندوں کو چھوڑا اور نہ مردوں کو، بڑوں کو معاف کیا گیا نہ چھوٹوں کو، ان کے ظالمانہ انتقام سے نہ مرد بچ سکے اور نہ ہی عورتیں، عباسیوں کی اس مار دھاڑ اور دہشت گردی کی پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے خلاف مختلف شورشیں کھڑی ہوگئیں، ان شورشوں کا برپا ہونا ایک ایسا خطرہ تھا، جو اس نوزائیدہ خلافت کے لیے چیلنج بنتا جا رہا تھا، خلافت عباسیہ کو پیش آنے والے ہر خطرے اور مشکل کو ختم کرنے میں ابو جعفر منصور کا نمایاں کردار رہا، یہی وجہ ہے کہ مؤرخین اسے خلافت عباسیہ کا حقیقی بانی قرار دیتے ہیں۔

لوگوں نے امام مالک سے کہا کہ ہماری گردن میں تو منصور کی بیعت کا قلادہ ہے۔ انہوں نے فرمایا: تمہیں منصور کی بیعت پر مجبور کیا گیا تھا اور کسی مجبوری و بے بس کی بیعت منعقد نہیں ہوتی"۔ عباسیوں کے خلاف اس فتوے کی بناء پر امام مالک کو اذیت دی گئی۔ امام ابو حنیفہ نے تو کھلم کھلا دولتِ عباسیہ کے خلاف خروج کرنے والے علویوں کی مدد کا اعلان کیا، (۱۶) اور اپنے خطبات میں ابو جعفر کی سیاست پر کڑی تنقید کی،

کوفے کی مسجد میں بھی اس پر برملا تنقید کی، جس کی پاداش میں انہیں اس قدر سخت اذیتیں دی گئیں کہ بعض مؤرخین اس جلیل القدر امام کی وفات کو ان پر ڈھائے جانے والے ظلم اور سزا کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ منصور کے بعد اس کا بیٹا مہدی تخت خلافت پر بیٹھا تو اس نے ملکی خزانے کو اموال سے بھرا ہوا پایا۔ چنانچہ اس نے لوگوں کو مال و دولت دینے میں فراخ دستی کا مظاہرہ کیا۔ ظلم سے چھینی ہوئی املاک ان کے اصل مالکوں کو واپس کیں، علویوں کو اپنے قریب کیا، ان پر ظلم وستم کا سلسلہ بند کر دیا اور بہت اندرونی اصلاحات کیں، مسعودی کے قول کے مطابق وہ محبوب عوام وخواص بن گیا۔

عباسی خلافت دین کے نام پر وجود میں آئی تھی اور یہی اس کی کامیابی، لوگوں اور بالخصوص غلاموں اور موالی کے اس کی طرف متوجہ ہونے کے عوامل میں سے ایک اہم عامل تھا، عباسی تحریک کی کامیابی کے بعد ان کی ذمہ داری تھی کہ وہ اپنی حکومت پر دین کی چھاپ کو گہرا کرتے تاکہ اپنی سیاست میں اس بنیادی دعوت میں تضاد کا شکار نہ ہوتے جس کی طرف انہوں نے لوگوں کو دعوت دی تھی اور جس کے قیام کے لیے وہ اٹھے تھے، تاکہ لوگ نہ تو ان سے متنفر ہوتے اور نہ ان کے خلاف شورش برپا کرتے۔ اسی غرض کے پیش نظر خلفاء فقہاء کا قرب حاصل کرتے تھے۔

اولین عباسی دور میں فکر ودانش پروان چڑھی اور پختہ ہوگئی، یہ تحریک تمام اسلامی علوم فقہ حدیث، تفسیر ،ادب اور تاریخ وغیرہ پر مشتمل تھی، عراق نے تمام ممالک سے زیادہ اس فکری تحریک سے فائدہ اٹھایا اور اس کی صورت گری میں اہم کردار ادا کیا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عراق کو تہذیب وثقافت میں گہری جڑیں رکھنے والی تاریخ کے حامل خطے کا اعزاز حاصل ہوگیا، فقہ اولین عباسی دور میں قانون سازی کے انتہائی زرخیز ترین مرحلے سے گزر رہی تھی، جس کی مثال اس کی طویل تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس دور میں اجتہاد نے قابل لحاظ ترقی کی۔ مجتہدین کی حیران کن حد تک ایک بڑی تعداد وجود میں آئی۔ فقہ کا دائرہ انتہائی وسعت اختیار کر گیا۔ پہلی اور دوسری صدی میں مجتہدین کثیر تعداد میں موجود تھے، جس آدمی کو بھی کوئی معاملہ پیش آتا اور اسے فتوے کی ضرورت ہوتی تو اسے جو مجتہد میسر آتا، اس کے سامنے مسئلہ پیش کر دیتا۔ خواہ وہ کوئی بھی ہوتا اور اس کے فتوی پر عمل کرتا تھا، پس جب عباسی دور میں زمانے نے ترقی کی، یا مختصر الفاظ میں تیسری صدی ہجری کا نصف گزر گیا تو مذاہب نے ایک معین شکل اختیار کر لی اور ائمہ کے مناہج بھی متعین اور واضح شکل اختیار کر گئے، ان کے متبعین اور پیروکار بھی پیدا ہوگئے جو ان کا دفاع کرتے اور ان کے حق میں تعصب سے کام لیتے تھے۔ یوں امت

احناف، شافعیہ اور مالکیہ کے مسائل فقہی پر عمل کرنے لگی۔

باب دوم: امام ابو یوسف کے حالات زندگی

حضرت امام ابو یوسفؒ کا نام یعقوب اور کنیت ابو یوسف تھی، ۹۴،۹۳ یا ۱۱۳ ہجری میں پیدا ہوئے، حضرت امام ابو یوسفؒ کا بچپن اور لڑکپن غربت وافلاس میں گزرا، حضرت امام ابو یوسف کے امام ابو حنیفہؒ سے تعلق قائم ہونے کے اور علم حاصل کرنے کے مختلف واقعات ملتے ہیں، طالب علمی کے وقت امام ابو یوسف کے گھر والے ان کے لیے روٹی دودھ میں ڈال کر رکھ دیتے تھے، وہی روٹی صبح کے وقت کھا کر حلقہ درس میں پہنچ جاتے تھے اور پھر واپس آ کر وہی روٹی کھا لیتے تھے۔ کسی عمدہ غذا اور بہترین کھانے کا انتظام کرنے میں وقت ضائع نہیں کرتے تھے جب کہ دوسرے لوگ عمدہ غذائیں اور بہترین کھانے تیار کرنے میں مشغول ہو کر سبق کے ایک حصہ سے محروم رہ جاتے تھے۔

امام ابو یوسف کو اپنے استاذ محترم ابو حنیفہؒ سے ایک گہرا تعلق اور انسیت و محبت ہوگئی تھی۔ ان کی مجلس میں حاضر ہونے کے لیے وہ دنیا کا ہر کام چھوڑ دیتے تھے یہاں تک کہ درس میں حاضری اولیت رکھتی تھی۔ امام ابو یوسف کے ایک استاد قاضی ابن ابی لیلیٰؒ کا معمول تھا کہ جب کوئی پیچیدہ اور نازک مسئلہ درپیش ہوتا تو وہ امام ابو حنیفہؒ سے رجوع کر کے مسئلہ حل کر لیا کرتے تھے۔ امام ابو یوسفؒ یہ دیکھ کر امام ابو حنیفہؒ کی خدمت میں حاضری کے لیے بے تاب رہتے مگر عملاً اس کی نوبت نہ آسکی۔ ابتداء میں وہ اس کی جرأت نہ کر سکے بعد میں بعض وجوہات کی وجہ سے امام ابن ابی لیلیٰ کی مجلس چھوڑ دی۔

محمد بن جریر طبری کہتے ہیں قاضی امام ابو یوسف بہت بڑے عالم بہت بڑے حافظ حدیث تھے۔ حاضر دماغ اور جید الحافظ محدثین سے تھے ساٹھ ستر حدیثیں سنتے ہی یاد کر لیا کرتے تھے۔ پھر کھڑے ہو کر املا کرا دیتے تھے۔ امام ابو یوسفؒ اپنی ذہانت، بصیرت اور قوت حافظ میں اپنی مثال آپ تھے۔ طویل مدت گزارنے کے بعد اپنے ذہن و دماغ میں ابو حنیفہ کا علم فقہ جذب کر لیا کہ مرتبہ اجتہاد پر فائز ہوئے۔ امام موفق

مکیؒ لکھتے ہیں امام اعظم نے اپنی مجلس فقہی کو ایک طرح کی مجلس شوریٰ بنایا تھا جہاں ہر شخص آزادی سے اپنی رائے کا اظہار کرتا تھا اور وہ اپنی رائے کو تھوپنے اور منوانے کی ذرا بھی کوشش نہیں کرتے تھے۔ ان کا معمول یہ تھا کہ وہ ایک ایک مسئلہ لے کر اس پر بحث و گفتگو کرتے، اپنے اصحاب کو بحث و گفتگو کا موقع دیتے کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ صرف ایک مسئلہ پر پورا مہینہ بلکہ کبھی کبھی اس سے زیادہ بحث و مناظرہ میں گزر جاتا یہاں تک کہ کامل بحث و مناظرہ، مباحثہ تنقیح و تمحیص کے بعد کوئی ایک قول قبول کر لیا جاتا تھا پھر امام ابو یوسفؒ اسے مرتب و مدون کر لیتے اور وہ داخل اصول ہو جاتا۔ درحقیقت یہی ادبی و اصوب طریق کار تھا حق سے قرب اور تسکین قلوب کا سبب اور آپس میں بحث و مباحثہ کے بعد کسی شخص کو بھی اپنی رائے کے واپس لے لینے میں اور متفقہ قول کو قبول کر لینے میں تامل یا تردد نہ ہوتا۔

امام ابو حنیفہؒ کا امام ابو یوسف اور دیگر تلامذہ کی تربیت کرنے کا انداز دوسرے اساتذہ سے مختلف تھا جب کوئی مسئلہ زیر غور آتا تو اس کے تمام احتجاجی پہلوؤں پر غور بھی کیا جاتا اور تائید میں جو کچھ کہا جا سکتا وہ کہتے، اس کے بعد اپنے اصحاب سے دریافت کرتے کیا آپ میں کوئی اس کے برخلاف کچھ کہنا چاہتا ہے؟ اس سوال کے بعد ہر شخص مجلس فقہی میں اپنی اپنی رائے کا اظہار کرتا اور امام اعظم اس نئی رائے سے مختلف پہلوؤں پر نکتہ چینی کرتے اور ایک دوسری رائے قائم کر کے پوچھتے اب آپ کی کیا رائے ہے؟ تلامذہ و اصحاب آپس میں بحث و اختلاف کرتے اور جب کسی ایک رائے پر قریب قریب متفق ہو جاتے تو امام صاحبؒ پھر ان دلائل کا توڑ کرتے اور ایک تیسری رائے پیش کرتے اور سوال کرتے اب کیا رائے ہے آپ کی؟ لوگ پھر اس پر نقد و تبصرہ کا سلسلہ شروع کر دیتے پھر امام صاحبؒ معائنہ کر کے کسی ایک رائے کو ترجیح دے دیتے اس طرح بار بار رد و کد کے بعد مسئلہ فقہی اعتبار سے حل ہو جاتا اور اس پر متفق ہو جاتے تو امام ابو یوسف مرتب و مدون کر کے اصل میں لکھ لیتے تھے۔

امام ابو حنیفہؒ کا یہ طرز تفقہ دوسرے تمام ائمہ و مجتہدین کے طرز و اسلوب کے مقابلہ میں ایک خاص

امتیاز کا حامل ہے۔ ایک مرتبہ امام زفرؒ اور امام ابو یوسف کے درمیان کسی مسئلہ میں مباحثہ ہوا اس مجلس میں خود امام ابو حنیفہؒ موجود تھے جب کئی گھنٹے گزر گئے اور بحث جاری رہی اور کسی قطعی نتیجہ پر نہ پہنچا جاسکا تو امام اعظم نے امام زفرؒ سے فرمایا "علمی ریاست اور عملی سیادت ابو یوسفؒ کا حصہ ہے تم اس کو لینے کی کوشش نہ کرو"۔

امام ابو یوسفؒ کے تلامذہ اور مستفدین کی کثرت تعداد سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے علم سے فیض یاب ہونے والوں کی تعداد زیادہ ہی رہی ہے ان کی تدریس کا سلسلہ تقریباً ۱۶ سال ۱۵۰ ہجری سے ۱۶۶ ہجری تک جاری رہا۔ امام ابو یوسف بہت زیادہ وسیع القلب اور متحمل مزاج تھے ان کی پیشانی پر کبھی بھی بل نہ آتا تھا۔ امام ابو یوسف کا تدریس کی خدمت میں تقریباً ۳۲ برس گزرے آپ کے تلامذہ میں خراساں، جوزجان، بلخ، مرو، ہرات، رے، بغداد، کوفہ، بصرہ، مدینہ منورہ اور مغرب اقصیٰ تک کے شائقین علم امام ابو یوسفؒ سے فیض یاب ہوتے رہے۔

حضرت امام ابو یوسفؒ علم اصول فقہ کے مدون اول ہیں۔ امام ابو یوسفؒ اور ان کے علم و فضل کا سب سے وسیع میدان فقہ کی تدوین و اشاعت اور اس کی خدمت و ترویج ہے جس میں انھوں نے باقی تمام علوم سے زیادہ اپنی جودتِ طبع اور جولانی فکر کا ثبوت دیا ہے چنانچہ دنیا انہیں فقیہہ ہی کی حیثیت سے جانتی ہے۔ علم فقہ کے بعد ان کا دوسرا بڑا کارنامہ اصول فقہ کی تدوین ہے جب کہ اس سے پہلے با قاعدہ اصول فقہ کی تدوین نہیں ہوئی تھی اگرچہ قرآن وسنت کے کلیات کو سامنے رکھ کر حضرات صحابہ و تابعین نے بہت سے مسائل مستنبط کیے تھے انھی اصول و کلیات اور حضرات صحابہؓ کے مستنبط و مسائل کی روشنی میں امام ابو یوسف نے علم اصول فقہ مرتب کیا۔ امام ابو یوسف پہلے شخص ہیں جنھوں نے امام ابو حنیفہؒ کے مسلک کے مطابق اصول فقہ کی تدوین کی۔

کتاب الخراج امام ابو یوسفؒ کا لازوال علمی کارنامہ ہے یہ کتاب اپنی جامعیت، افادیت اور اہمیت کے اعتبار سے یگانہ اور منفرد ہے۔ امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ جب مردار کا کھانا مجھ پر حلال ہو گیا تب میں نے قضا کا عہدہ قبول کرلیا۔ امام ابو یوسفؒ اظہار حق کہنے میں کسی کی پرواہ نہ کرتے تھے خواہ وہ سلطان ہی کیوں

نہ ہو وہ کسی بھی صاحب وجاہت اور صاحب حکومت کو دین کے معاملہ میں خاطر میں نہ لائے۔

ایک مرتبہ ہارون رشید نے امام ابو یوسفؒ سے کہا: ''جناب! آپ ہمارے پاس بہت کم آیا کرتے ہیں میں ہر وقت آپ کی صحبت اور زیارت کا مشتاق رہتا ہوں'' امام ابو یوسفؒ نے فرمایا کہ: ''یہ اشتیاق اسی وقت تک ہے جب تک کہ میں کم آتا ہوں، جب زیادہ آنے لگوں گا تو اشتیاق واعزاز باقی نہیں رہے گا۔'' ہارون رشید نے اس جواب کی زبردست تحسین فرمائی۔ حسن بن ابی مالکؒ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ امام ابو یوسفؒ نے فرمایا: ''میں بیمار پڑا اور اس بیماری نے میرے حافظہ پر چھاپا مارا، بیماری کی شدت کی وجہ سے جو کچھ بھی یاد تھا سب بھول گیا سوائے علم فقہ کے۔'' سوال کیا گیا حضرت یہ کیونکر؟ امام ابو یوسفؒ نے فرمایا: علم فقہ کے سوا جو دوسرے علوم میرے پاس تھے ان کی بنیاد صرف قوت حافظہ پر تھی اور وہ شدت مرض کی وجہ سے جواب دے گئی تو وہ علوم بھی جاتے رہے، اور علم فقہ تو میرا جانا پہچانا علم تھا۔ ابتدائے شعور سے آج تک اس کے ساتھ تلبس رہا، علم فقہ میں میری مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص کئی سال تک اپنے وطن سے غیر حاضر رہے، پھر اس کے بعد آئے تو کیا وہ اپنے گھر کا راستہ بھول جائے گا؟ بلکہ قدم خود بخود اس طرف بڑھیں گے۔

امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ دونوں علم و عمل، فقہ و اجتہاد اور استنباط و استخراج مسائل کے بلند ترین مقام پر فائز تھے اور دونوں اجتہاد و استنباط مسائل میں ائمہ ثلاثہ امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ سے کسی طرح بھی کم نہ تھے، امام شافعیؒ اور امام محمدؒ نے تو دونوں سے استفادہ بھی کیا ہے اور اس پر فخر بھی، چنانچہ علامہ مرجانیؒ (م ۱۳۰۶ھ) لکھتے ہیں: امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ کا مرتبہ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ سے بلند نہیں ہے تو ان سے کمتر بھی ہرگز نہیں۔ آپ کے ارشادات و کلمات جو اپنی معنویت، بلاغت، اثر آفرینی اور موقع و محل کے لحاظ سے جاذب فکر و نظر ہیں۔

باب سوم: امام ابو یوسف کا فقہی مقام

عموماً مجتہدین کی دو قسم مانی جاتی ہے، ایک مجتہد مطلق غیر منتسب (اگر مجتہد مطلق غیر منتسب کا مطلب

یہ ہے کہ ان کا اجتہاد کسی کے فیض ترتیب کا امرہوں منسب بھی ہے تو پھر اسی لحاظ سے مجتہد مطلق غیر منتسب تو سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا، مجتہد مطلق منتسب کی تعریف میں ائمہ اربعہ داخل ہوسکتے ہیں، مگر عام طور پر ائمہ اربعہ کو پہلی قسم میں شمار کیا گیا ہے، حالانکہ ان ائمہ میں سے ہر ایک کسی نہ کسی صحابی یا تابعی کی طرف منتسب ہے) دوسرے مجتہد منتسب مطلق یا مجتہد مطلق مقید بمذہب، متاخرین علمائے احناف کی کتابوں میں ائمہ مجتہدین اور اصحاب فتاویٰ کے درجات کی جو تقسیم کی گئی ہے اس میں یہ کہا گیا ہے کہ امام ابو یوسف امام محمد وغیرہ مجتہد مطلق نہیں، بلکہ مجتہد فی المذہب تھے، مجتہد مطلق سے مراد یہ ہے کہ جن لوگوں نے کتاب وسنت سے براہِ راست اجتہاد کے اصول مرتب کیےاور اس سے تفریع مسائل کی، جیسے ائمہ اربعہ تھے،

مجتہد فی المذہب یا مجتہد منتسب ان کو کہتے ہیں کہ جنہوں نے ان ائمہ کے مرتب کردہ اصول کی روشنی مسائل کی تخریج کی، جیسے امام ابو یوسف رحمہ اللہ، امام محمد اور دوسرے ائمہ کے مشہور تلامذہ، بعض فقہ وتذکرہ کی کتابوں میں یہ بھی درج ہے کہ صاحبین فرماتے تھے کہ ہم نے امام صاحب سے جہاں اختلاف کیا ہےاور ان کے قول کو مرجوع قرار دیا ہے، وہ بھی امام صاحب ہی کا قدیم قول تھا، جسے انہوں نے مرجوح سمجھ کر ترک کردیا تھا، اِسی طرح کے اور بھی اقوال منقول ہیں، جن سے ان کا مجتہد مقید بہ مذہب ہونا معلوم ہوتا ہے، مگر یہ کہنا بڑا ظلم ہے کہ صاحبین امام صاحب کے مقلد محض تھے، حالانکہ وہ خود امام اور مجتہد مطلق تھے، یہ ان کی احسان شناسی ہے کہ انہوں نے اپنی ذات کو پنے اساتذہ سے بے نیاز کرکے دنیا کے سامنے پیش نہیں کیا، حالانکہ وہ کرسکتے تھے، پھر امام ابو یوسف کو اور امام محمد کو اجتہاد واستنباط میں ائمہ ثلاثہ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد سے گھٹانا اور کم رتبہ قرار دینا بھی بڑی زیادتی ہے، جب کہ خود ان ائمہ اور ان کے مشہور تلامذہ نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ یہ لوگ اجتہاد واستنباط میں ان سے کسی طرح کم نہ تھے، ہم پہلے مختصراً اجتہاد واستنباط کی تعریف اس کے اصول وشرائط پر بحث کرتے ہیں، تاکہ اندازہ ہوجائے کہ یہ ائمہ فقہ خصوصیت سے امام ابو یوسف مجتہد مطلق

تھے یا مجتہد منتسب۔

اجتہاد کی تعریف علماء نے یہ کی ہے:

ھو استفراغ المجھود فی استنباط الحکم الفرعی عن دلیلہ.

ترجمہ: اصل سے کسی فروعی سلسلہ کے استنباط میں اپنی وسعت بھر کوشش کرنے کا نام اجتہاد ہے۔

اجتہاد کے اصول و شرائط کیا ہونے چاہیں، اس میں مختلف رائیں ہیں، جو چیزیں سب میں مشترک ہیں وہ حسب ذیل ہیں: (۱) کتاب اللہ کا عالم ہو، یعنی قرآن کے لغوی اور شرعی معانی سے واقف ہو، اس کے طرزِ کلام کو جانتا ہو، افراد و ترکیب اور ناسخ و منسوخ پر اس کی نظر ہو۔ (۲) سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اسے درک ہو، یعنی روایات کی سند اور ان کی متون سے واقف ہو، بعض لوگوں نے قرآن کی آیات اور احادیث کی تعداد پر بھی بحث کی ہے، یعنی یہ کہ مجتہد کے لیے کتنی آیتوں اور حدیثوں میں بصیرت پیدا کرنا ضروری ہے، مگر یہ بحث فضول ہے، مجتہد کے لیے پورے قرآن اور احادیث کے تمام متداول ذخیروں پر نظر رکھنی ضروری ہے۔ (۳) اجماع کے موارد اور مواقع سے واقف ہو۔ (۴) قیاس کے شرعی طریقوں سے واقف ہو۔ ان شرائط کو سامنے رکھیے اور پھر امام ابو یوسف کے علم و فضل اور کتاب و سنت آثار صحابہ اور تعدیل صحابہ سے ان کی واقفیت کا جو ذکر اوپر کیا گیا ہے، اس پر ایک نظر ڈالیے اور دیکھئے کہ کیا ان کے مجتہد مطلق قرار دینے کے لیے وہ کافی نہیں ہے؟ اس تفصیل کو سمجھنے کے لئے فقہ و اصول فقہ کی تاریخ و تدوین کا سمجھنا ضروری ہے، للہذا اس کی کچھ تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

فقہ کے لغوی معنی کسی بات کو جاننے اور سمجھنے کے ہیں، اصطلاحاً تفصیلی دلائل سے شرعی احکام کو جاننے کا نام فقہ ہے۔ اجتہاد و استنباط ہر ایک کے بس کی بات نہیں، فقہ اسلامی کے منصوص مصادر چار ہیں: (۱) کتاب اللہ. (۲) سنت رسول اللہ. (۳) شرائع ما قبل. (۴) جن مسائل میں اجتہاد کی گنجائش نہ ہو ان میں صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے آثار۔

کتاب اللہ سے مراد قرآن مجید ہے، قرآن مجید میں فقہی احکام سے متعلق آیات کی تعداد لوگوں نے دو ڈھائی سو سے لیکر پانچ سو تک لکھی ہے، سنت رسول سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات، آپ ﷺ کا عمل نیز وہ قول و فعل ہے جو آپ کے سامنے آیا ہو اور آپ نے اس پر نکیر نہیں فرمائی ہو، صحابہ سب کے سب عادل، معتبر، خدا ترس اور مخلص تھے، لہٰذا ان کے اقوال اور آراء کی خاص اہمیت ہے، بعض مسائل تو ایسے ہیں جن میں رائے اور اجتہاد کی گنجائش ہے اور بعض مسائل وہ ہیں جسے کوئی شخص اپنے اجتہاد سے اخذ نہیں کر سکتا، بلکہ لازماً ان کی بنیاد قرآن وحدیث ہی پر ہوگی، اس قسم کے مسائل میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی رائے حجت اور دلیل ہے، پچھلی کتابوں میں جو احکام آئے ہیں وہ چار طرح کے ہیں، اول وہ احکام جن کا قرآن وحدیث میں کوئی ذکر نہیں ہے، بالاتفاق اس امت میں وہ احکام قابل عمل نہیں ہیں، دوسرے وہ احکام جن کا قرآن وحدیث میں ذکر آیا ہے اور یہ بات بھی واضح کر دی گئی ہے کہ یہ حکم سابقہ امت کے لیے تھا، اس امت میں یہ حکم باقی نہیں بلکہ منسوخ ہو چکا ہے، اس کے بارے میں بھی کوئی اختلاف نہیں کہ امت محمدیہ میں اس حکم پر عمل نہیں کیا جائے گا، تیسرے وہ احکام ہیں جو قرآن وحدیث میں وارد ہوئے ہیں اور یہ بھی بتا دیا گیا کہ یہ احکام اس امت کے لیے بھی ہیں، بالاتفاق اس شریعت میں بھی ان احکام پر عمل کیا جائے گا، چوتھے وہ احکام ہیں جن کو قرآن وحدیث نے پچھلی قوموں کی نسبت سے بیان کیا ہے، لیکن اس بات کی وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ اس امت کے لیے یہ حکم باقی ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں دو نظریہ ہیں، ایک تو یہ ہے کہ اس امت کے لیے بھی یہ حکم باقی ہے، احناف اسی کے قائل ہیں اور دوسرا نظریہ یہ ہے کہ اس امت کے لیے یہ حکم باقی نہیں۔

غیر منصوص مصادر، اجماع سے مراد کسی رائے پر رسول اللہ کی وفات کے بعد امت کے مجتہدین کا متفق ہو جانا ہے۔ کسی مسئلہ کے سلسلے میں قرآن وحدیث کی صراحت موجود نہ ہو لیکن قرآن وحدیث میں اس سے ملتا جلتا کوئی مسئلہ موجود ہو اور اس مسئلہ میں اللہ اور رسول کے حکم کی جو وجہ ہو سکتی ہو وہ اس مسئلہ میں بھی موجود ہو چنانچہ یہاں بھی وہی حکم لگا دیا جائے، اس کو قیاس کہتے ہیں، ان دونوں کے علاوہ کچھ اور غیر منصوص مصادر ہیں جن

سے وقتاً فوقتاً فقہ اسلامی میں مدد لی جاتی ہے، مثلاً: استحسان، مصالح مرسلہ، استصحاب، عرف اور ذریعہ۔

اگر فقہ پر اعتماد نہ کر کے کوئی شخص اپنے ہر عمل کا تعلق بلا واسطہ قرآن یا حدیث سے کریگا تو یہ اجماع کے خلاف ہوگا اور دوسری بات یہ ہے کہ اس کے سامنے مکمل قرآنی علم یا مکمل احادیث کا مجموعہ ہونے کے ساتھ ساتھ دیگر بہت سارے علوم وغیرہ کا ہونا ضروری ہے، اس لیے کہ بعض جگہ قرآنی آیات مجمل ہیں تو بعض جگہ قرآنی آیات اور احادیث میں ابہام بھی ہے اور کچھ احادیث ایک ہی عمل کے مختلف طریقے اور مختلف حکم پیش کرتی ہے اور الفاظ قرآن یا حدیث ایک معنی پیش کرتے ہیں اور مرادی معنی اور ہوتے ہیں۔

ہر علم وفن کی تدوین اور اس کے ارتقاء بتدریج پایہ کمال کو پہونچتا ہے، فقہ اسلامی پر بھی تدوین کے کئی مراحل گذر چکے ہیں۔ دورِ نبوت میں فقہ اسلامی کا تمام تر مدار وحی پر تھا، چاہے وحی متلو قرآن کریم ہو یا غیر متلو احادیث مبارکہ۔

نبی کریم کی وفات کے بعد سنہ ۱۱ھ سے خلفاء راشدین اور دیگر کبار صحابہ کا دور شروع ہوتا ہے اور یہ دور سنہ ۴۰ھ میں اختتام کو پہونچتا ہے۔

فقہ اسلامی کا تیسرا دور یہ دور پہلی صدی کے نصف آخر سے چوتھی صدی کے نصف اوّل تک ہے۔ اس عہد میں قواعد فقہ اور فن اصول فقہ کا بھی وجود ہوا اور اس کی با قاعدہ تدوین وترتیب عمل میں آئی۔ فقہی اصطلاحات کا ظہور بھی اسی دور میں ہوا، یعنی جائز وناجائز، حلال وحرام، مکروہ ومستحب، فرض، واجب وغیرہ کی درجہ بندی گو عملاً یہ درجات پہلے بھی پائے جاتے تھے۔ اس دور میں چار بڑے مکاتب فقہ وجود میں آئے اور ہر مکتب فکر کے لحاظ سے فقہی کتب کی تدوین وترتیب کا سلسلہ شروع ہوا۔ ائمہ اربعہ جن کے مذاہب اس وقت دنیا میں رائج ہیں، ان میں امام ابوحنیفہ اپنے علم وفضل اور سن وصال میں سب سے مقدم تھے اور بالواسطہ یا بلا واسطہ تمام ائمہ آپ کے فیض یافتہ تھے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو ایک طرف تابعی ہونے کا شرف حاصل ہے، جو بقیہ ائمہ میں سے کسی کو حاصل نہیں۔

امام ابوحنیفہ کے نزدیک مصادر فقہ اور اصولِ استنباط سات تھے:(۱) کتاب اللہ (۲) سنتِ رسول (۳) اقوالِ صحابہ (۴) اجماعِ امت (۵) قیاس (٦) استحسان (۷) عرف یعنی تعاملِ ناس۔

فقہ اسلامی کا چوتھا دور، یہ دور تقلید شخصی کا دور ہے اور امت کا سوادِ اعظم تقلید شخصی کا پابند ہے اور امت کے علماء نے ائمہ اربعہ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل میں سے کسی ایک کی تقلید کو امت کے لیے لازم اور ضروری قرار دیا ہے،۔

فقہ اسلامی کا پانچواں دور، چوتھی صدی کے نصف آخر سے عصر حاضر تک ہے۔

امام ابوحنیفہ کی مجلس تدوین میں جو مسائل مرتب ہوئے اور جو زیرِ بحث آئے ان کی تعداد کیا تھی؟ اس سلسلہ میں تذکرہ نگاروں کے مختلف بیانات ملتے ہیں، مسانید امام ابوحنیفہ کے جامع علامہ خوارزمی نے تراسی ہزار کی تعداد لکھی ہے، جس میں اڑتیس ہزار کا تعلق عبادات سے تھا اور باقی کا معاملات سے۔ بعض حضرات نے ٦ لاکھ اور بعضوں نے ۱۲ لاکھ سے بھی زیادہ بتائی ہے، مشہور محقق مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ کا خیال ہے کہ اس تعداد میں ان مسائل کو بھی شامل کرلیا گیا ہے، جو امام کے مقرر کئے ہوئے اصول وکلیات کی روشنی میں مستنبط کئے گئے تھے۔

اسی عہد میں بڑے بلند پایہ، عالی ہمت اور اپنی ذہانت وفطانت کے اعتبار سے محیر العقول علماء وفقہاء پیدا ہوئے، کیوں کہ اس عہد کی ضرورت کے لحاظ سے اسی درجہ کے اہل علم کی ضرورت تھی، پھر ان میں سے بعض بلند پایہ فقہاء نے مستقل دبستان فقہ کی بنیاد رکھی اور ان سے علمی وعملی تاثر کی وجہ سے اہل علم کی ایک معتد بہ تعداد ان کے ساتھ ہوگئی اور اس نے ان کے علوم کی اشاعت وتدوین اور تائید وتقویت کے ذریعہ مستقل فقہی مکاتب کو وجود بخشا ان شخصیتوں میں سب سے ممتاز شخصیتیں ائمہ اربعہ کی ہیں یہ وہ خوش قسمت مجتہدین ہیں جن کی فقہ کو منجانب اللہ بقاء حاصل ہوا اور آج تک عملی طور پر قائم اور نافذ ہے ان مکاتب فقہ میں ہر دور میں ماہر فقہاء کا وجود تسلسل کے ساتھ رہا ہے، ہر عہد میں اس کے تقاضوں کے مطابق علم وتحقیق کا کام انجام پاتا رہا

ہے اور ان کی مثال ایک سایہ دار اور سدا بہار درخت کی سی ہوگئی ہے جس کی جڑیں گہری ہوں اور شاخیں خوب پھیلی ہوئی ہوں "اَصلهَا ثَابِت وَّفَرعهَا فِي السَّمَاء"

باب چہارم: امام قاضی ابو یوسف کا تفقہ اور انکی علمی خدمات

عہد نبوی اور عہد صدیقی میں عہدہ قضا اسلامی حکومت کا کوئی الگ شعبہ نہیں تھا، بلکہ ہر صوبہ یا ضلع کا جو والی ہوتا تھا، وہی انتظامی اور عدالتی دونوں امور انجام دیتا تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے دونوں شعبوں کو الگ کر دیا اور دونوں کے الگ الگ ذمہ دار اور سربراہ کار مقرر کیے اس کے دونوں شعبے ایک دوسرے سے آزاد ہوگئے، جن کے عہدہ داروں کا تقرر خود خلیفہ وقت کرتا تھا، عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں دوسرے شعبوں کی طرح اس کی طرف بھی توجہ کی، مگر اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے سے پہلے ہی انتقال کر گئے، امام محمد کو امام ابو یوسف نے ایک مصلحت کی بنا پر اس عہدہ کے قبول کرنے پر مجبور کیا جس کا رنج ان کو زندگی بھر رہا، انہوں نے حکومت کے خلاف بعض ایسے فیصلے دیئے کہ ان کو اس کے نتیجہ میں جیل جانا پڑا، امام ابو یوسف نے اپنے استاد اور اپنے اصحاب کی روش کے برخلاف عہدہ قضاء قبول کیا، جس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ ان کو وقت کے اس نظام سے اتنی نفرت اور بے تعلقی نہیں تھی، جو ان کے پیش روں اور دوسرے ہم عصروں کو تھی، اسی بنا پر بعض اہلِ تذکرہ نے ان کے بارے میں کچھ اچھی رائے نہیں دی، لیکن ان کے بارے میں متعدد وجوہ کی بنا پر یہ گمان صحیح نہیں ہے، امام ابو یوسف بہت غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، جب تک امام صاحب حیات تھے ان کی اور ان کے بال بچوں کی کفالت کا خیال رکھتے تھے اور ان کی مدد کرتے تھے، ان کی وفات کے بعد امام ابو یوسف کی معاشی زندگی کا یہ سہارا بھی ختم ہوگیا، پھر بھی انھوں نے نہ حکومت کا رخ کیا اور نہ کسی کی امداد قبول کی، کئی برس تک خالص لوجہ اللہ درس دیتے رہے، اس درمیان میں گھر کا جو اثاثہ اور اسباب و سامان تھا، اس کو بیچ بیچ کر گذر اوقات کرتے اور کام چلاتے رہے، خود ہی فرماتے ہیں کہ جب میرے ذاتی اثاثہ کا ایک ایک تنکا بک گیا اور میری حالت بے انتہا خستہ ہوگئی تو میں نے اپنے سسرالی مکان کی ایک کڑی نکلوا کر بازار میں بیچنے کے لیے بھیجی، جس کو میری ساس نے پسند نہیں کیا اور مجھے برا بھلا کہا، جس سے میرے دل پر بہت چوٹ لگی اور میں نے مجبور ہو کر بالآخر عہدہ قضا قبول کر لیا۔ امام ابو یوسف تین تین عباسی خلفاء کے دور میں قاضی رہے، مہدی، ہادی اور ہارون رشید، مہدی نے انہیں صرف بغداد کے مشرقی حصہ کا

قاضی مقرر کیا تھا، مگر خلیفہ ہادی کے زمانہ میں وہ پورے بغداد کے قاضی بنا دیئے گئے۔ ہارون رشید کے ہاتھوں میں خلافت کی باگ ڈور آئی تو سال بھر تک تو اس نے ان کو اسی حیثیت میں رکھا، مگر اس کے بعد تمام ممالک محروسہ کا قاضی القضا بنا دیا، مقریزی نے لکھا ہے کہ: عراق، خراسان، شام، مصر میں ان کے حکم کے بغیر قضات کے منصب پر کوئی مقرر نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ حکومت کے محکمہ عدلیہ کے پورے انچارج یا باالفاظِ دیگر وزیر عدل و قانون تھے، یہ محکمہ اس سے پہلے کبھی قائم نہیں ہوا تھا۔

امام ابو یوسف عہدہ قضا پر کتنے دنوں مامور رہے، اس میں اختلاف ہے، ایک مرتبہ خود انہوں نے اپنے شاگرد سے بیان کیا کہ میں ۱۷برس امام صاحب کی حدمت میں رہا اور ۱۷برس دنیا کے کاموں میں (یعنی عہدہ قضا پر) اوپر ذکر آچکا ہے کہ سب سے پہلے مہدی کے وقت قاضی مقرر ہوئے اور ان کی وفات سنہ۱۸۲ہجری میں عہدہ قضاء کی حالت میں ہوئی تو اگر ان کے تقرر کا سنہ ۱۵۹ھ مانا جائے تو قضا کی مدت ۲۲،۲۳ برس ہوتی ہے اور اگر یہ مانا جائے کہ وہ ۱۷برس عہدہ قضا پر رہے تو اس اعتبار سے ان کا تقرر سنہ۱۶۶ھجر ی میں ہونا چاہیے، غرض پہلی صورت میں امام صاحب کی وفات کے ۹ برس کے بعد عہدہ قضاء قبول کیا اور دوسری صورت میں پندرہ برس کے بعد۔

عراقی فقہاء بالخصوص امام ابوحنیفہ اور ان کے اَصحاب وتلامذہ کے بارے میں ایک عمومی تاثر یہ پایا جاتا ہے کہ یہ اَصحاب فقہی مباحث میں حدیث وسنت سے استدلال بہت کم کرتے تھے، لیکن ان کی جو تصنیفات ہم تک پہنچ پائی ہیں، ان کا مطالعہ اس تاثر کی نفی کرتا ہے۔ امام ابو یوسف اور ان کے شیخ ابوحنیفہ کے نزدیک فقہی احکام و مسائل میں استدلال کرنے کی وہی بنیاد ہے جو ائمہ حدیث کے ہاں ہے، یعنی کتاب وسنت کو ماخذ سمجھنا۔ نہ صرف یہ بلکہ فقہ حنفی میں آثار صحابہ سے بھی بھرپور رہنمائی لی جاتی ہے۔ حنفی مکتبہ فکر احادیث وآثار ہی کی روشنی میں فقہی استنباطات کرتے ہوئے دینی مسائل میں اپنی آراء کا اظہار کرتے ہیں۔ دوسرے اَہل علم کے ساتھ فقہی اختلافات میں بھی وہ احادیث وآثار کو مرکزی حیثیت دیتے رہے ہیں۔

جس روز انہوں نے اس دارِفانی کو چھوڑا ان پر عجیب کیفیت تھی اور زبان پر یہ کلمات تھے: بارِالٰہا تو جانتا ہے کہ میں نے کسی فیصلہ میں جو تیرے بندوں کے درمیان تھا خود رائی سے کام نہیں لیا اور نہ خلاف واقعہ فیصلہ کیا، ہمیشہ میری کوشش رہی کہ جو فیصلہ ہو وہ تیری کتاب اور تیرے رسول کی سنت کے موافق ہو، جب کسی مسئلہ میں مشکل پیش آتی تھی تو میں امام ابوحنیفہ کو اپنے اور تیرے درمیان واسطہ بناتا تھا اور جہاں تک مجھے معلوم

ہے کہ امام ابوحنیفہ تیرے احکام کو خوب سمجھتے تھے اور عمداً وہ کبھی حق کے دائرہ سے باہر نہیں جاتے تھے، یہ بھی زبان پر تھا کہ: اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میں ہمیشہ پاکدامن رہا اور کبھی ایک درہم جان بوجھ کر حرام کا نہیں کھایا۔ تعلیم وتعلم آخری سانس تک جاری تھا، ایک شاگرد کو کسی مسئلہ کی تفصیل بتا رہے تھے، ابھی خاموش بھی نہیں ہوئے تھے کہ چند منٹ کے بعد آواز ہمیشہ کے لیئے بند ہوگئی۔ یہ واقعہ جمعرات کے دن ظہر کیوقت ربیع الاوّل کی پانچویں تاریخ سنہ ۱۸۲ھ کو پیش آیا۔ اِن کی وفات کا لوگوں پر بڑا اثر ہوا، خصوصیت سے ہارون رشید بہت غمگین تھا، جنازہ نکلا تو مشایعت کی اور خود نماز جنازہ پڑھائی اور اپنے خاندان کے خاص مقبرہ میں دفن کرایا۔ اس سے فارغ ہوا تو لوگوں کی طرف مخاطب ہوکر کہا کہ تمام اہلِ اسلام کو چاہیے کہ ان کی وفات پر ایک دوسرے کی تعزیت کریں یعنی حادثہ ایک شخص یا ایک خاندان کا نہیں بلکہ پوری ملت کا ہے، شجاع بن مخلد کا قول ہے کہ ہم امام ابو یوسف کے جنازہ میں شریک تھے، عباد بن عوام بھی ہمارے ساتھ تھے، میں نے ان کو یہ کہتے سنا کہ اہلِ اسلام کو چاہیے کہ ابو یوسف کی وفات پر ایک دوسرے کی تعزیت کریں۔

☆☆☆☆☆

کتابیات

(۱)"ابو زکریا الفراء ومذهبه فی النحو واللغة"، احمد مکی انصاری، القاهرة، المجلس الأعلی لرعایة الفنون والآداب،١٩٦٤ء

(۲)"اثمار التکمیل"،محمد موسیٰ، مکتبه امدادیه ملتان، ١٩٨٣ء،

(۳)"ارشاد الفحول الی تحقیق الحق من علم الأصول"، محمد بن علی بن محمد بن عبد الله الشوکانی الیمنی، دارالکتاب العربی،١٩٩٩ء

(٤)"اصول التشریع الاسلامی"، علی حسب الله ، دار الفکر العربی،١٩٩٧ء

(٥)"اصول السرخسی"، سرخسی، ابوبکر محمد بن احمد، بیروت، دار المعرفة،١٤١٨ھ

(٦)"اصول الفقه الاسلامی"، زکی الدین شعبان، مطبع دار التألیف،١٩٦١ء

(٧)"الاجماع فی الشریعة الاسلامیه"، رشدی علیان،الجامعة الاسلامیة،١٩٧٧ء

(٨)"الامام مالك"، امین الخولی، دارالکتب الحدیثة مصر، ١٩٥١ء

(٩)"البدایة والنهایة"، ابو الفداء اسماعیل بن عمر بن کثیر القرشی البصری ثم الدمشقی، دارالفکر،١٩٨٦ء

(١٠)"التاج المکلل"، نواب صدیق حسن خان، مکتبه دارالسلام ریاض،١٤١٦ھ،

(١١)"الجامع المسند الصحیح المختصر من أمور رسول الله صلی الله علیه وسلم وسننه وأیامه =صحیح البخاری"، محمد بن إسماعیل أبو عبدالله البخاری الجعفی، دار طوق النجاة ،١٤٢٢ھ،

(١٢)"الجامع لأحکام القرآن" المعروف ب "تفسیر قرطبی"، ابو عبد الله محمد بن احمد بن ابی بکر بن فرح الأنصاری الخزرجی شمس الدین القرطبی، دارالکتب المصریة القاهرة،١٩٦٤ء،

(١٣)"الخیرات الحسان"، احمد بن حجر الهیثمی، مطبع السعادة بجوار محافظة مصر، ١٣٢٤ھ،

(١٤)"الرسالة"،الشافعی أبو عبد الله محمد بن إدریس بن العباس بن عثمان بن شافع بن عبد المطلب بن عبد مناف المطلبی القرشی المکی ،مکتبه الحلبی، مصر ،١٣٥٨ھ،١٩٤٠ء،

(۱۵)"الروض الباسم فی الذب عن سنة ابی القاسم"، محمد بن ابراهیم ابن الوزیر، دار عالم الفوائدللنشر والتوزیع،

(١٦)"السنن الکبرى"، أحمد بن الحسین بن علی بن موسى الخُسْرَوْجِردی الخراسانی، أبو بكر البیهقی، دار الكتب العلمیة، بیروت -لبنان،١٤٢٤ هـ ٢٠٠٣ء

(۱۷)"السنة قبل التدوین"، محمد عجاج الخطیب، دارالفکر،١٤٠٠ھ ،

(۱۸)"السنة ومكانتها فی التشریع الاسلامی"، مصطفیٰ السباعی، دار الوراق المكتب الاسلامی،۲۰۰۰ء

(۱۹)"الطبقات الکبریٰ" ، ابو عبد الله محمد بن سعد بن منیع الهاشمی بالولاء، البصری، البغدادی المعروف بابن سعد ، دارالكتب العلمیة بیروت،١٩٩٠ء

(۲۰)"الفقه الاسلامی فی ثوبه الجدید"، مصطفیٰ الزرقاء، دار القلم دمشق، ۱۹۹۸ء

(۲۱)"الفقیه و المتفقه"،أبو بكر أحمد بن علی بن ثابت بن أحمد بن مهدی الخطیب البغدادی ،دار ابن الجوزی - السعودیة،١٤٢١ھ،

(۲۲)"الفكر السامی فی تاریخ الفقه الاسلامی"، محمد بن حسن الحجوی، دارالكتب العلمیة بیروت لبنان، ۱۹۹۵ء

(۲۳)"الكامل فی التاریخ" ، ابن اثیرالجزری ، دارالكتب العلمیة بیروت،١٤٠٧ھ،

(٢٤)"المحصول"، أبو عبد الله محمد بن عمر بن الحسن بن الحسین التیمی الرازی الملقب بفخر الدین الرازی خطیب الری ، مؤسسة الرسالة،١٤١٨ ھ١٩٩٧ء،

(۲۵)"المدخل إلى دراسة المذاهب الفقهیة"، علی جمعة محمد عبد الوهاب، دار السلام -القاهرة،١٤٢٢ھ ٢٠٠١ء،

(٢٦)"المستصفى"، أبو حامد محمد بن محمد الغزالی الطوسی ، دار الكتب العلمیة،١٤١٣ھ ١٩٩٣ء،

(۲۷)"المسند"، احمد، احمد بن حنبل، عالم الكتب، بیروت، ۱۹۹۸ء

(۲۸)"المقاصد الحسنة فی بیان كثیر من الأحادیث المشتهرة على الألسنة"، شمس الدین أبو الخیر محمد بن عبد

الرحمن بن محمد السخاوی، دار الكتاب العربی -بیروت،١٤٠٥ هـ ١٩٨٥ء،

(٢٩)"الموافقات للشاطبی"، ابو اسحاق ابراهيم بن موسى الغرناطی الشهير بالشاطبی، دار ابن عفان ،،١٩٩٧ء

(٣٠)"الْأَشْبَاهُ وَالنَّظَائِرُ عَلَى مَذْهَبِ أَبِيْ حَنِيْفَةَ النُّعْمَانِ"، زين الدين بن إبراهيم بن محمد، المعروف بابن نجيم المصری ،دار الكتب العلمية، بیروت -لبنان،١٤١٩ هـ ١٩٩٩ء،

(٣١)"الإتقان فی علوم القرآن"، عبد الرحمن بن أبی بكر، جلال الدين السيوطی ،الهيئة المصرية العامة للكتاب، ١٣٩٤هـ-١٩٧٤ء،

(٣٢)"أحكام القرآن"، أحمد بن علی أبو بكر الرازی الجصاص الحنفی ، دار الكتب العلمية بيروت لبنان،١٤١٥هـ-١٩٩٤ء،،

(٣٣)"بدائع الصنائع فی ترتيب الشرائع"، علاء الدين، أبو بكر بن مسعود بن أحمد الكاسانی الحنفی ،دار الكتب العلمية،١٤٠٦هـ ١٩٨٦ء،

(٣٤)"تاريخ التشريع الاسلامی"، مناع بن خليل القطان،مكتبة وهبة،٢٠٠١ء

(٣٥)"تاريخ الدولة العباسية"، ابو بكر محمد بن يحی بن عبد الله الصولی، مطبعة الصاوی مصر،١٩٣٥ء،

(٣٦)"تاريخ الطبری =تاريخ الرسل والملوك، وصلة تاريخ الطبری"، محمد بن جرير بن يزيد بن كثير بن غالب الآملی، أبو جعفر الطبری، دار التراث -بيروت،١٣٨٧ هـ،

(٣٧)"تاريخ الإسلام السياسی و الدينی و الثقافی والإجتماعی"، حسن ابراهيم حسن، دار الجيل ، بيروت١٩٩٦ء،

(٣٨)"تاريخ بغداد"،أبو بكر أحمد بن علی بن ثابت بن أحمد بن مهدی الخطيب البغدادی، دار الغرب الإسلامی - بيروت،١٤٢٢هـ ٢٠٠٢ء،

(٣٩)"تذكرة الحفاظ"، شمس الدين أبو عبد الله محمد بن أحمد بن عثمان بن قَايْماز الذهبی، دار الكتب العلمية بيروت-لبنان،١٤١٩هـ ١٩٩٨ء،

(٤٠)"تقريب التهذيب"،أبو الفضل أحمد بن على بن محمد بن أحمد بن حجر العسقلانى ، دار الرشيد - سوريا،١٤٠٦هـ

(٤١)"توالى التأسيس لمعالى محمد بن إدريس"، أحمد بن على بن حجر العسقلانى أبو الفضل شهاب الدين، دار الكتب العلمية،١٩٨٦ء،

(٤٢)"تهذيب التهذيب"، أبو الفضل أحمد بن على بن محمد بن أحمد بن حجر العسقلانى، مطبعة دائرة المعارف النظامية، الهند،١٣٢٦هـ،

(٤٣)"جامع مسانيد الامام الاعظم"، محمد بن محمود خوارزمى، مطبع مجلس دائرة المعارف جامعه كيليفورنيا ، اگست ٢٠٠٩ء،

(٤٤)"حجة الله البالغة"، أحمد بن عبد الرحيم بن الشهيد وجيه الدين بن معظم بن منصور المعروف بـ الشاه ولى الله الدهلوى، دار الجيل، بيروت -لبنان،١٤٢٦ هـ٢٠٠٥ء،

(٤٥)"سنن الترمذى"،محمد بن عيسى بن سَوْرة بن موسى بن الضحاك، الترمذى، أبو عيسى ،شركة مكتبة ومطبعة مصطفى البابى الحلبى -مصر،١٣٩٥ هـ١٩٧٥ء،

(٤٦)"سير الصحابه"، مولانا شاه معين الدين احمد ندوى، دارالاشاعت اردو بازار كراچى، ٢٠٠٤ء،

(٤٧)"سير أعلام النبلاء "،شمس الدين أبو عبد الله محمد بن أحمد بن عثمان بن قَايْماز الذهبى ،مؤسسة الرسالة، ١٤٠٥هـ -١٩٨٥ء،

(٤٨)"سيرة النعمان"، علامه شبلى نعمانى،مطبع مفيد عام آگره، ١٩٨٢ھ،

(٤٩)"شذرات الذهب فى أخبار من ذهب "، عبد الحى بن أحمد بن محمد ابن العماد العكرى الحنبلى، أبو الفلاح، دار ابن كثير، ١٤٠٦هـ

(٥٠)"شرح السنة"، حسن بربهارى، مكتبة الغرباء الارثة،١٩٩٣ء،

(٥١)"طبقات الفقهاء"، ابو اسحاق ابراهيم بن على الشيرازى، دار الرائد العربى، بيروت، لبنان،١٩٧٠ء

(٥٢)"علمائے احناف کے حیرت انگیز واقعات"، عبدالقيوم حقانى، القاسم اکیڈمی جامعه ابو هريره نوشهره، ٢٠٠٩ء،

(٥٣)"فجر الاسلام "، احمد امين، دارالكتب العلمية بيروت،١٩٢٩ ء

(٥٤)"فواتح الرحموت بشرح مسلم الثبوت"، عبد العلى محمد بن نظام الدين محمد السهالوى الأنصارى الكهنوى، دار الكتب العلميه بيروت، ٢٠٠٢ء،

(٥٥)"قواعد الأحكام فى مصالح الأنام"، أبو محمد عز الدين عبد العزيز بن عبد السلام بن أبى القاسم بن الحسن السلمى الدمشقى، الملقب بسلطان العلماء ،مكتبة الكليات الأزهرية -القاهرة،١٤١٤ هـ ١٩٩١ء،

(٥٦)"قواعد فى علوم الفقه"، علامه ظفر احمد عثمانى،مكتبه مطبوعات اسلاميه، ١٩٧٢ء

(٥٧)"كشف الظنون عن أسامى الكتب والفنون"، مصطفى بن عبد الله كاتب جلبى القسطنطينى المشهور باسم حاجى خليفة أو الحاج خليفة ، مكتبة المثنى بغداد ،١٩٤١ء،

(٥٨)"مختصر جامع بيان العلم وفضله"، أبو عمر يوسف بن عبد الله بن محمد بن عبد البر بن عاصم النمرى القرطبى،دار ابن الجوزى، المملكة العربية السعودية،١٤١٤ هـ ١٩٩٤ء

(٥٩)"مرآة الجنان وعبرة اليقظان فى معرفة ما يعتبر من حوادث الزمان"، أبو محمد عفيف الدين عبد الله بن أسعد بن على بن سليمان اليافعى، دار الكتب العلمية، بيروت -لبنان،١٤١٧ هـ١٩٩٧ء،

(٦٠)"معجم البلدان"، شهاب الدين ابو عبدالله ياقوت بن عبد الله الرومى الحموى، دار صادر، بيروت،١٩٩٥ء

(٦١)"مقدمه ابن خلدون"، عبدالرحمن بن محمد بن محمد ابن خلدون ابوزيد ولى الدين الحضرمى، دار الفكر، بيروت،١٤٠٨ هـ ١٩٨٨ء

(٦٢)"مقدمه انوار البارى "، محمد انور شاه ,احمد رضا بجنورى، اداره تاليفات اشرفيه،١٣٥٢ ه،

(٦٣)"مقدمه كتاب السير الكبير"، امام محمد بن حسن الشيبانى، مطبع جامعه القاهره، ١٩٥٨ ء

(٦٤)"مناقب موفق "، مؤفق بن احمد المكى، دائرة المعارف النظامية، ١٩٠٣ء،

(٦٥)"منهج النقد فى علوم الحديث"، عتر، نور الدين، دار الفكر، دمشق، ١٩٩٧ء،

(٦٦)"موارد الظمآن لدروس الزمان، خطب وحكم وأحكام وقواعد ومواعظ وآداب وأخلاق حسان"، عبد العزيز بن محمد بن عبد المحسن السلمان،١٤٢٤ھ،

(٦٧)"ميزان الاعتدال فى نقد الرجال"،شمس الدين أبو عبد الله محمد بن أحمد بن عثمان بن قَايْماز الذهبى ، دار المعرفة للطباعة والنشر، بيروت -لبنان،١٣٨٢ ھ١٩٦٣ء .

(٦٨)"نشر العرف"، محمد امين بن عمرابن عابدين، مكتبة الحرمين رياض، ١٨٨٣ء،

(٦٩)"نيل الاوطار"، محمد بن على بن محمد عبد الله الشوكانى اليمنى، دار الحديث، مصر، ١٩٩٣ء

(٧٠)"وفيات الاعيان و أنباء أنباء الزمان" ،ابو العباس شمس الدين احمد بن محمد بن ابراهيم بن ابى بكر ابن خلكان،دار صادر بيروت،١٩٩٤ء

(٧١)"إعلام الموقعين عن رب العالمين"، محمد ابن ابى بكر بن أيوب سعد شمس الدين ابن قيم الجوزية،دارالكتب العلمية بيروت ١٩٩١ء

Abstract

A Research into Imam Abu Yusuf's Services for Knowledge and Religion

ImamAbu Yusuf was an eminent scholar of Hanafi School of Thought. Yaqub ibn Ibrahim al-Ansari, better known as Abu Yusuf (أبو يوسف) (d.798) was a student of legist Abu Hanifah (d.767) who helped spread the influence of the Hanafi school of Islamic law through his writings and the government positions he held. He served as the chief judge (*qadi al-qudat*) during reign of Harun al-Rashid. His most famous work was *Kitab al-Kharaj*, a treatise on taxation and fiscal problems of the state. This thesis consists on his Services for Knowledge and Religion.

The problem face while writing thesis:

Each student certainly faces certain problems while writing a thesis; however, being a unique research work, this was not an easy task to accomplish and the task of this research. In the first instance, There are no sources in Urdu language about his life and services. The only fragmented work on his personal life and services for knowledge and religion is available in Arabic language. Therefore, it tremendously difficult to pick up pen on this topic. However, the importance of the topic encouraged me to take it despite the odds it was encompassing.

Research Methodology:

The whole thesis has been divided into four chapters. Chapter one deals mainly with the life in Kuffah and its fertile soil for the growth of Islamic Jurisprudence. The second chapter reads his early life and the way he got attracted toward Islamic Jurisprudence and became a devotee of Imam Abu Hanifa. The third chapter gives an insight into Imam Abu Yusuf's services for development of Islamic Jurisprudence and his role as a justice under Abbasid caliphs. Chapter four throws light how and why he accepted the office of justice and how he discharged his duties. The detailed review of these chapters has been given as under.

Chapter 1

The history of Jurisprudence and Activities in Kuffah before Imam Qazi Abu Yusuf

The Holy Prophet was not only supposed to convey the revelation to people but also to elaborate the obscure and unexplained verses of the Holy Quran. It is incumbent upon us to follow the ijtihad (judgment) by the Holy Prophet (SAW). The Holy Prophet's sayings, deeds and silent approvals are essential sources of enacting Islamic laws. It is out of question that Allah Almighty would ever let the Holy Prophet keep repeating a mistake. The Holy Prophet (SAW) made ijtihad (judgment) and so did the companions of the Holy Prophet (SAW) in his presence and even after him. However, their ijtihad (judgments) were confined to certain specific issues. Ijtihad by Holy Prophet and his companions neither caused any differences regarding injunctions nor created a hindrance toward various opinions. Hazrat Abu Bakr (RA) sent an army to conquer the Roman and the Iranian Empires, but, before the army would achieve its holy purpose, he passed away. Even after the demise of HazratUmer (RA) the trail of conquests continued.

By the end of the first century of Hijra the Islamic armies had penetrated as far as North Africa. They had crossed the **Mediterranean** after the conquest of **Anatolia.** Thus, on the eastern front they had reached as far as Samarkand. In the course of these conquests, Muslims had to interact with other nations and a great many of them entered in the fold of Islam, too. As a result, the Muslims came across such novel issues that the companions of the Holy Prophet (SAW) had not had to face in the era of the Holy Prophet (SAW). The companions of the Holy Prophet (SAW) were supposed to observe such novel issues to decide the matters in proper manners.

Hazrat Abdullah Bin Masud (RA) stayed in Kuffah since its inception till the end of the caliphate of Hazrat Usman (RA) (101). He taught the Kufis the Holy Quran and teachings of Islam. The Kufis learnt Islamic jurisprudence (fiqh) from him and obtained fatwas for their problems. One cannot even imagine the sort of care he took in this regard. It was due to his untiring efforts that Kuffah abounded with qaris and jurists. When Hazrat

Ali (RA) shifted to Kuffah, he was more than happy to see a great number of jurists and said: 'May Allah Almighty bless Ibn Um Abd (Ibn Masud). He has enlightened the city (Kuffah) with knowledge.'

Ibrahim Nkahae was one of the leading pupils of Hazrat Abdullah Ibn Masud (RA). He was famous as an Imam and jurist of Kuffah.Ibrahim Nakhae had broadened his vision for analogy (qayas) and deduction (istnmbaat) and saved the discipline of fatwa writing from unattainable phenomenon. Despite showing flexibility toward analogy and regarding it as an essential tool for the deduction of sharia problem from primary sharia sources, he always avoided giving fatwas on the bases of assumptions or mere reasoning. He would prefer keeping quiet rather than indulging himself into a scholarly discussion until one asked him a question. Some of the scholars even hold that Hanafi school of thought is no different from that of Ibrahimi School of thought. Moreover, they feel that the successor seemed to be completely overwhelmed by the predecessor. Imam Abu Hanifa accessed to the jurisprudence of Ibrahim through his disciple, Rasheed; and his narrator, Abi Suleman. Howvere, in the realm of jurisprudence he had also benefitted from Sha'abi. In spite of living in Iraq, he happened to be closer to the ones who deduced sharia problems from Hadith (Fuqha-e-Asr) rather than the ones whose deduction was based on analogy (Ahl-e-Raye). Similarly, he finds an access to the jurisprudence of Makkah and Medina by Atta bin Abi Rabaah and Nafae Maula Ibn Omer respectively. The analytical approach, peculiar to Ibrahim Nakhae, reached its zenith under Imam Abu Hanifa. He excelled in analogical approach to such an extent that he was regarded the greatest imam in Islamic jurisprudence by Muslim Ummah. Imam Abu Hanifa was an embodiment of all the juristic trends: the Makki, Madani and Iraqi. He himself says: 'in the first instance I consult the Holy Quran. If no injunction is found therein, I consult the tradition of the Holy Prophet (SAW). Finding no lead via both the sources, I concede to the words of any of the companions of the Holy Prophet according to my inclination. However, I prefer not to consult any one vis-à-vis the companions of the Holy Prophet (SAW). But if the discourse reaches as near as Sha'abi, Ibn-e-Sireen, Hassan, Ata'a, and Ibn-e-Musayeb, I prefer to conduct ijtihad like they did. Imam Abu Hanifa never forced his pupils to accept his version

neither felt nay embarrassment to concede to the opinions of his disciples that seemed to be closer to the reality. Rather, he encouraged them in this connection and expressed his pleasure toward such arguments. He advised his pupils to resort to ijtihad (130). In 132 Hijra, the Abbasids; the descendants of the Holy Prophet's (SAW) uncle, Hazrat Abbas (RA); dethroned the Umayyad to enthrone themselves. The Abbasids were later revenged on Umayyad. They spare neither dead nor alive of them- the youths, the elders, males and females were all brutally slain.

The brutal attitude of the Abbasids posed a threat to their new-born caliphate. Abu Jaafer Mansoor played a vital role in combating all the threats that The Abbasids' dynasty faced. It is, therefore, that historians regard him the real founder of Abbasid dynasty. When people said to Imam Malik that we shackles of Abu Mansoor's allegiance, he replied that they were forced to do so. And, that allegiance under pressure is void-ab-initio (15) the Abbasids tortured Imam Malik for this fatwa against them. Imam Abu Hanifa quiet evidently announced to help the Alvis in fight against Abbasids. Imam Abu Hanifa vividly criticized the way Abu Jaafer ruled over people while delivering a sermon at his mosque in Kuffah. For this, he was tortured so much that according to some historians it was this unbearable torture that later led to Imam's death. After Abu Mansoor, when his son, Mehdi, acceded to the throne, the state treasury was full of wealth. That is why he spent mush on people. He introduced many reformations: restored the people's property taken by force, made peace with Alvis, ended the tyrannical attitude toward masses and startedpublic welfare works. According to Masoodi he was loved by all and sundry. As the Abbasids established their caliphate in the name of Islam, people, particularly slaves and laymen, got attracted toward them. It was imperative for the Abbasids to brand their rule with Islam so that they could avoid any contradiction between their politics and claim that they had come to rescue Islam. Secondly, if so, people would also dare not rebel against them. For this purpose caliphs often remained closer to jurists, too. In the early period of Abbasids knowledge and thinking started flourishing which, in the later period, matured further. This movement of befitted all the disciplines of Islamic knowledge and education including hadith, jurisprudence, tafseer,

literature and history. Iraq benefited the most of this movement and added its considerable share to it. As result, Iraq emerged as a land that was honored with matured traits of knowledge and civilization. In the formative phase of Abbasids jurisprudence thrived under an environment where the government of the time was more interested in enacting laws in anything else. The way Islamic jurisprudence progressed in this era is unmatchable. In the meantime ijtihad made considerable progress and a great number of jurists could be seen there. It is in this era that the scope of Islamic jurisprudence got widened. The first and the second centuries of Hijra abounded a great number of jurists and anybody with a query was able to find a jurist there to satisfy him. When, under the patronage of Abbasids, all the disciplines of Islamic knowledge had attained maturity to great extent (i.e. by the second quarter of third century Hijra was about to end), various religions of Islam got their final shapes and their respective jurists also pursued a particular approach in deducing sharia problems. These jurists were also carrying their coterie to defend what they inculcated in the realm of jurisprudence. Thereafter, we find different factions of Muslim Ummah following Hanafi, Shaafi and Maliki School of thoughts.

Chapter 2

The life of Imam Abu Yusuf:

The actual name of Imam Abu Yusuf was Yaqoob **alias**Abu Yusuf. He was born in 93, 94 or 113 century Hijra. In his childhood and boyhood he lived a very hard life. There are many interesting stories how he met and came closer to Imam Abu Hanifa. When he was a student, his family would wet some pieces of bread in milk that he ate in the morning before he left for his lessons. Having come home back he would eat the leftover.He never longed for any delicious food lest he missed an important lesson unlike the ones who did so. Imam Abu Yusuf had developed an intimate devotion toward his teacher, Imam Abu Hanifa.

There was nothing dearer to him than learning in the service of Imam Abu Hanifa. He would try his level bets to be the first in the service of the great Imam. Imam Abu Yusuf's teacher, Qaiz Abi Lailee, often visited

Imam Abu Hanifa to get extremely complex issued resolved. Seeing this, Imam Abu Yusuf wished to completely join Imam Abu Hanifa but due to some reasons remained unable to do so. Though in the beginning **he dared not leave Imam Abi Lailee**, for some reasons, later he left him. According to Muhammad bin Jarir Tibri Imam Abu Yusuf was a great scholar and memorizer of hadith. He was so present-minded and sharp that he would memorize sixty to seventy hadith as soon as he listened to them. He was even capable of dictating those hadith there and then. He had no match to his reasoning, memory power and wisdom.

He remained in the service of Imam Abu Hanifa for a long time and absorbed his way of deduction wholly into his mind and became a great jurist. Imam Maufiq Makki writes that Imam Abu Hanifa's juristic lessons served the purpose of a debate forum (majlis-e-shoora) where every participant was allowed to share his opinion free of any coercion. The Imam never forced his pupils to agree to his opinions. The way he taught was that he would select a topic and having lectured put that topic to an open debate to construe the mind of all the participants. Sometimes a debate took even a month or more to come to some conclusion. Thereafter, they would agree to some common point of view and Imam Abu Yusuf would pen down the same in a record-book kept for this purpose.

It was, undoubtedly, a formidable way of discussion wherein each individual would not only get a mental satisfaction of having said what he had on mind but also to come to conclusion that was nearest to the reality. Therefore, nobody felt hesitation to share or withdraw his opinion at any phase of the debate. Imam Abu Hanifa taught Imam Abu Yusuf and other pupils in a way different than other teachers. When a proposition came under discussion, it was reviewed in detail form each angle. Having discussed the pros and cons of the issue, he would ask his pupils to further criticize the proposition if they felt like. Thereupon, each participant shared his view either to criticize or appreciate the proposition and then Imam Abu Hanifa reviewed the new thesis to invite them to bring forth further antitheses. When all the participants converged to some almost agreed upon conclusion, Imam Abu Hanifa once again started a new debate by picking up further

points vis-à-vis that conclusion. Having done that he would again invite his pupils to either support or oppose the new the new thesis. This way a single proposition came under discussion in several sessions of debate before it was concluded to be recorded by Imam Abu Yusuf.

The way Imam Abu Hanifa undertook a juristic debate was unique and unmatchable to the approach the other jurists adopted for the same purpose. Once there started a debate over a certain issue between ImamAbu Yusuf and Imam Zufar. Even after several hours had passed the debate remained inconclusive. Thereupon, Imam Abu Hanifa said to Imam Zufar, 'Abu Yusuf is at home in the realm of knowledge and practical **debate** (siadat). Do not try to take them over form him.' There are a great number of pupils and beneficiaries associated with the services of Islamic jurisprudence by Imam Abu Yusuf. He taught for about **16** years i.e. from 150 to 166 Hijra. Imam Abu Yusuf was a very humble and humane. He welcomed every one with open arms and never frowned. He remained in the service of teaching for about **23**years. His disciples are found in Khuarasan, Jozjan, Balkh, Marw, Hirat, Raye, Baghdad, Kuffah, Basra, Madianh, and as far as Eastern Aqsa.

Hazrat Imam Abu Yusuf is the first person to formally**record/codify** the Islamic Jurisprudence. In the realm of knowledge he served Islamic Jurisprudence the most and made untiring efforts in inculcating this discipline. It is in the field of Islamic Jurisprudence where we find the best of Imam Abu Yusuf. Therefore, in the world of Islamic Jurisprudence his unique position is an established fact. After serving the Islamic Jurisprudence, he also earns the credit for the codification of the principles of Islamic Jurisprudence. Before Imam Abu Yusuf the principles of Islamic Jurisprudence were not formally codified. Before his codification of Islamic Jurisprudence, the companions of the Holy Prophet (SAW) and their followers had deuced solutions to certain problems in the light of the Holy Quran and traditions of the holy Prophet (SAW). Imam Abu Yusuf benefitted from the principles which the companions of the Holy Prophet (SAW) and their followers had codified in the course of deduction from the

Holy Quran and the traditions of the Holy Prophet (SAW) to codify the principle of Islamic Jurisprudence.

Imam Abu Yusuf is the first person to have inscribed the Hanafi School of Thought. Kitab-ul-Kharaj is a masterpiece of Imam Abu Yusuf. This book enjoys a unique status in its entirety, importance and utility. Imam Abu Yusuf says when the dead were allowed for me to eat; I accept the post of a judge. He never refrained from pronouncing the truth may the king of the time be there to oppose him. He never regarded the royal authorities important vis-à-vis shriah rulings.

Once Haroon-ur-Rasheed said to Imam Yusuf, 'You rarely come to see us. I am always looking forward to seeing you.' Imam Yusuf replied, 'This keenness is there until I scarcely come. Once I start coming off and on this keenness will pass into nothingness.' Haroon-ur-Rasheed appreciated this answer very much. Hassan bin Abi Malik says, 'Once Imam Abu Yusuf said, "Once I got severely ill and illness left my memoryretorted. I forgot everything except jurisprudence (fiqh)." ' People asked him how so? He answered that apart from jurisprudence all the knowledge he had depended on his memory and when the memory lost they lost too. But the knowledge of jurisprudence was there in his **nature/awareness.**He addedthathe had been close to it ever since he got senses.

Then to make it further clearer he cited an example that if somebody remained away from his homeland for a couple of years and then returned, would he forget the way to his home? Nay, rather his he would automatically step toward his home. (1) Both Imam Abu Yusuf and Imam Muhammad were great jurists and unique at deducing solutions to sharia problems. They were no less than the three great imams – Imam Malik, Imam Shafi and Imam Ahmed bin Hanbal – in this regard. Imam Shafi and Imam Muhammad even benefitted from them and felt proud of it. Therefore, Allama Marjani (1306 Hijra) writes, 'if Imam Muhammad and Imam Abu Yusuf are not greater than Imam Malik and Imam Shafi, they are not even less than them. Their words are really meaningful, elevated, effective and with reference to the context.'

Chapter 3

Imam Abu Yusuf as Jurist

The word fiqh literally means to ponder or to look into something. Terminologically, it means to exclusively argue to come to some conclusion is sharia based issues. It is not for all and sundry to conduct ijtihad or deduce solutions to sharia problems. There are four basic sources of Islamic Jurisprudence; (i) the Holy Quran, (ii) the traditions of the Holy Prophet (SAW), (iii) decided sharia matters and (iv) the matters wherein there is no room for ijtihad. Such as the matter decided by the companions of the Holy Prophet (SAW).

The verses of the Holy Quran dealing with the matters of juristic issues have been mentioned from 250 to 500 in number. Traditions of the Holy Prophet means the deeds the Holy Prophet (SAW) performed himself, his sayings and his silent approvals i.e. when somebody did something in the presence of the Holy Prophet, he did not ask him to avoid performing that action.

There is no match to the companions of the Holy Prophet (SAW) in piety, justice and sincerity. Therefore, their words are more trustworthy than anyone under the sky. There are certain matters where we can conduct ijtihad to come to some conclusion yet in some cases no one is allowed to do the same. They are the matters to be decided on the bases of the Holy Quran and the tradition of the Holy Prophet (SAW). In these matters the word of the companions of the Holy Prophet (SAW) is final. The injunctions mentioned in the previous scriptures are divided into four categories: (i) the injunctions which are not mentioned either in the Holy Quran or Hadith, it is unanimously agreed upon that such injunctions are not for the Ummah (slaves) of Muhammad (SAW) to follow; (ii) the injunctions which have been mentioned in the Holy Quran and Hadith with a clarification that they were meant for the previous people (ummahs) and such injunctions are not binding on the Ummah (slaves) of Muhammad (SAW), such injunctions are also unanimously agreed not to be followed by us; (iii) thirdly, there are those injunctions which have not only been mentioned in the Holy Quran

and the traditions of the Holy Prophet (SAW) but also told that they are binding on people (ummah) of Muhammad (SAW), thses injunctions are surely to be followed by us too; and fourthly, though some of the injunctions have been mentioned in the Holy Quran and the traditions of the Holy Prophet (SAW) but it has not been told whether they are binding on us or not. Regarding such injunctions there are two theories. According to one theory they are binding on us also, Hanafi school of thought believes in the same, while the theory hold them not binding on us. Consensus (Ijma) means that after the demise of the Holy Prophet (SAW) great jurists unanimously got agreed on certain issues. If the Holy Quran and Hadith remain silent regarding some problem, jurists derive an answer to that problem on the bases of some other problem of similar nature already decided in the Holy Quran or Hadith. Deriving solutions to sharia problems in such a manner is known as analogy (qiyas). There are some sources also which are other than primary shriah sources: istehsan, Husaleh Mursalah, istashab, urf (norms) and zariah.

If somebody disregards fiqh and thinks that he can manage to live merely on the basis of the Holy Quran and Hadith, he attempts to go against consensus (ijma). Secondly, to derive solutions for sharia based problems, one need not only to consult the Holy Quran and Hadith in entirety but will have to consult some other sources, too, as the Quranic verses and Hadith themselves remain unclear at certain places. In addition, some of the Hadith explain the same deed differently at differently places. Sometimes, the Quranic verses or words of Hadith do not mean what they seem to mean. Each discipline of knowledge evolves to its maturity. Similarly, the discipline of Islamic Jurisprudence (fiqh) has made progress under certain stages.

At the times of the holy Prophet (SAW) Islamic Jurisprudence wholly depended on the revelation be it the word of Quran or Hadith. After the demise of the Holy Prophet (SAW), the period of the four pious caliphs starts from 11 Hijra and ends in 40 Hijra. The third period of Islamic Jurisprudence starts from the second half of the first century and goes as far as the first half of the fourth century. It was in this era that principles of

Islamic Jurisprudence and art of fatwa writing were ascertained and codified. The terms and terminologies were also coined in this era. Such as permissible, impermissible, prohibited, allowed, recommended, disgusting, wajib and farz (mandatory) etc, although these categories were already there but in this age they were made clearer in terms of definitions. It was in this age that four great schools of thought came into being and their respective books were compiled. Among the great four Imams, Imam Abu Hanifa preceded them all in his age and knowledge. All the other Imams directly or indirectly benefitted from Imam Abu Hanifa. Imam Abu Hanifa also enjoys the status of being a taabi (the one who saw the companion of the Holy Prophet in his life). No other Imam has this privilege.

According to Imam Abu Hanifa sources of Islamic Jurisprudence and deduction are seven in number: (i) The Holy Quran, (ii) the traditions of the Holy Prophet (SAW), (iii) sayings of the companions of the Holy Prophet (SAW), (iv) Consensus (ijma) of Muslim Ummah, (v) analogy (qiyas), (vi) **istehsan (common sense),** and (vii) norms (urf). The fourth period of Islamic Jurisprudence is the strts with imitation in which Muslim ummmah has unanimously decided that it is incumbent upon each individual of ummah to follow one of the four great imams: Imam Abu Hanifa, Imam Malik, Imam Shafi and Imam Ahmed bin Hanbal.The fifth period of Islamic Jurisprudence starts form the second half of the fourth century of Hijra and continues till today.

The number of the problems discussed and compiled in the company of Imam Abu Hanifa

There is a difference of opinion as to what was the exact number of the problems discussed and complied in the company of Imam Abu Hanifa. The compiler of Masanid Imam Abu Hanifa, Allama Khwarzmi records the total number as many as 83000. The Out of which 38000 dealt with worships and the remaining were pertaining to the social conduct. However, some of the historians have mentioned the number of them as many as six or even twelve lac. The renowned research scholar, Maulana Manzir Ahsan Gilani, proposes that probably such historians have also included thefatwas which were issued on the bases of the principles laid down by Imam Abu

Hanifa. This era has also begotten a number of great scholars who exposure was astonishing. Some of the great scholars formally laid the foundations of juristic schools of thought. Seeing their endeavors, authenticity and sincerity a considerable number of Muslims sided with them. These followers took keen interest in the juristic works of these scholars by ways of imitation, compilation and support to them. As a result permanent juristic schools of thought emerged. The greatest of these scholars were the four great imams whose work was blessed by Allah Almighty. Muslim ummah is still benefitting from their earnest efforts. In each era imminent scholars and great jurists have continuously been contributing their share to these juristic schools of thought. In each age these schools of thought have been great sources of research and they proved to be all-weather shady trees for the ones interested in juristic pursuits.

Chapter 4

A Review of Imam Yusuf's Juristic Approach

In the period of the Holy Prophet (SAW) and Hazrat Abu Bakar Siddique (RA) judiciarywashed not evolved as a separate organ of government. Rather the governor of each province or district would act as an administrator as well as a judge. However, Hazrat Omer Farooq (RA) bifurcated the two offices and assigned them their respective authorities and responsibilities. Thus, the administration was separated from judiciary and the caliph himself appointed the competent authorities in both the offices.

Hazrat Omar bin Abdul Aziz paid attention to these offices, too, like other departments of the government but he passed away before he could fully accomplish the target. Imam Yusuf made Imam Muhammad accept this office due to some reasons. However, he regretted for that for his life. He gave some of the judgments against the government of time and was sent to jail for that. Imam Yusuf accepted the post of justice unlike his teacher and colleagues which shows he did not dislike this profession. On the other hand, his friends and colleagues never liked to occupy the posts of judges. It is therefore that some people did not give a favorable opinion for him. But such an attitude is not just toward him for a couple of reasons.

Imam Yusuf belonged to a very poor family. Until Imam Abu Hanifa was alive he financially supported him and his family. However, after the demise of Imam Abu Hanifa there was no one would care him and his household. Even while facing such odds, he never went to the government officials neither did he asked any mortal for any help. He kept teaching for quite for a long time only for the sake Allah's pleasure. In the meantime he had sold all his belongings to make both the ends meet. He himself narrates that when all his belongings had been sold away, he took a chain out of his house given by his in-laws in a bid to sell it in the market but his mother-in-law did not like it. He added that the way his mother-in-law treated him really hurt his feelings. Thus, as a last resort he accepted the post of judge offered by the government. Imam Yusuf remained Qazi under the rule of three Abbasids caliphs: Mehdi, Hadi and Haroon-ur-Rasheed. Mehdi had appointed him as a judge of Eastern Baghdad. But during the rule of caliph Hadi he was upgraded to be the judge of entire Baghdad. When Haroon-ur-Rasheed acceded to the seat of caliphate, he appointed him as the Chief Justice of the whole land under his jurisdiction. Maqrezi writes that no judicial appointments took place without his consent as far as Iraq, Khurasan, Syria and Egypt. Now he was enjoying the status of a law minister. In other words, he was in full charge of legal department of the government.

There is a difference of opinion as to how long Imam Abu Yusuf held the office as a justice. Once he himself told one of his pupils that he served Imam Abu Hanifa for about seventeen years and for about the same span of time he devoted to the worldly affairs (i.e. being a judge). As it has been mentioned above that he was appointed as a justice first at the time Caliph Mehdi and he passed away being a judge in 182 Hijra. So, if his appointment is supposed to have taken place in around in 159 Hijra, then the tenure of legal office comes around twenty-two to twenty-three years. But if it is supposed that he remained a judge for seventeen years, then it would mean that he was appointed to this post in 166 Hijra. If the first assumption is true, he accepted the office of justice after nine years of Imam Abu Hnaifa's demise; and, if the second assumption is true, he accepted the office after fifteen years of his demise.

There are two basic kinds of Mujahidin: definite and indefinite. The definite mujtahid (jurist) is the one who follows no other Imam, rather he determines certain principles himself to be followed by the others to find solutions to sharia problems. In a sense, thus, nobody except the Holy Prophet (SAW) himself or his companions be definite mujtahid. However, the four great imams are included in the first category as they were the founders of their schools of thought. In other words they had no predecessors in jurisprudence to be followed. Otherwise each of these imam has benefitted either from a companion of the Holy Prophet or their disciples. The other kind of mujtahid is known as either indefinite mujtahid or a definite mujtahid in a particular religion.

Later, the scholars belonging to Hanafi school of thought categorized Imam Abu Yusuf and Imam Muhammad as mujtahids within a religion not as definite jurists. Independent Mujtahids are those jurists who derived juristic principles directly from Quran and Sunnah independently. While, on the other hand mujtahid fil madhab are those jurists who dependent on independent jurists or mutlaq mujtahids for juristic derivations, like Imam Abu Yusuf, Imam Muhammad and eminent disciples of other great jurists. At some places some of the imams have mentioned that sometimes when they differed from their great imam on certain issues that too was one of the sayings of his imam which he had already abandoned. There are similar other statements by them which shows that they were jurists within a religion. However, it would not be fair to regard them completely dependents on great imams. As a matter of fact they were worth independent but their ineptness to their teachers did not let them regard themselves in a position that their teachers enjoyed. And, especially to regard Imam Yusuf and Imam Muhammad less than the three great imams-Imam Malik, Imam Shafi, Imam Ahmed bin Hanbal-in the field ijtihad and deduction would surely be unfair. The three great imams and their pupils themselves had acknowledged that they were no less than them.

Let us first see the definition of ijtiahd and deduction and their condition to find whether these imams, especially Imam Abu Yusuf, were either dependent or independent jurists. According scholars ijtihad means to

deduce a solution for a secondary problem on the basis of primary sources. There is a difference of opinion as to what should be the terms and conditions of ijtihad. The most common of these terms and conditions are as follows:

1. One must be well-versed with Quranic text and knowledge. That is he should not only be able to understand the Holy Quran but also be capable of construe the sharia-compliant meaning of the Holy Quran. He must understand the order of the verses and the verses that cancel out the other verses.
2. He must have a good understanding of Hadith. It means he should not only be well-versed with the text of Hadith but also be an expert to understand the refence chain of Hadith. Some of the people have even tried to explain that a mujtahid must be well-versed with certain number of Quranic verses and hadith, but it is not worth paying any attention. It's must for a mujtahid to fully understand the Holy Quran and commonly accepted hadith.
3. Must be able to understand the text and the context of consensus (ijma).
4. Must be an expert to use analogy (qiyas) to deduce solution from shriah sources.

One must keep these terms in mind and then evaluate the personality of Imam Yusuf keeping in view his aforesaid understanding into the Holy Quran, Hadith, and sayings and consensus of the companions of the Holy Prophet (SAW). In the light of the terms mentioned above, is he not worth being an absolute jurist (mujtạhid mutliq). It is famous for Iraqi jurists, particularly Imam Abu Hanifa and his disciples, that they rarely consulted Hadith for deduction of sharia problems. Whereas, the books we have an access to so far negate this notion.

Imam Abu Yusuf and his teacher, Imam Abu Hanifa, approached the same sources of sharia for derivation of solutions to shriah-based problems as imams of hadith did i.e. Quran and Sunnah. Not only this but also the Hanafi jurists fully consult the word of the companions of the Holy Prophet (SAW). The Hanafi jurists resolve shriah issues in the light of Haidth and

sayings of the companions of the Holy Prophet (SAW). Even, while having a difference of opinion with other juristic schools of thought, they revolve around Hadith and the sayings of the companions of the Holy Prophet (SAW). The day he passed away he was in strange condition. He was uttering: 'Oh Allah! You know very well I have never given any verdict on the basis of my personal opinion or contrary to facts. I have always tried to decide matters as per your words and words of Your Prophet (SAW). Whenever I came across a problem, I would consult Imam Abu Hanifa to know your wish. As far as I can understand, I know Imam Abu Hanifa better understood Your orders and he never gave any verdict contrary to facts, too.' He was also saying: 'Oh Allah! You know better I have always avoided impermissible and have never deliberately consumed a single impermissible penny.' He kept teaching till his last breath. At his death bed he was resolving some sharia problem for his student. Before he would stop his voice got muted forever. He left for the hereafter on Thursday fifth Rabi-ul-Awwal, 186 Hijra in the afternoon. His death aggrieved everyone, especially Caliph Haroon-ur-Rasheed was very sad on that fateful event. The Caliph himself led the funeral prayer and buried him in the graveyard specific for his family members. After funeral rituals, the Caliph Haroon-ur-Rasheed asked people while addressing them to condole each other for the sad departure of the Imam as it was not a sad event for a single person or family but it was tragedy for the whole Muslim Ummah. Shuja bin Makhlad says that we were attending the funeral of Imam Abu Yusuf and Abaad bin Awaam was also there. He the former heard the latter saying, 'On this fateful event each member of Muslim Ummah should express condolence to each other.

After the last chapter conclusion has been presented and the conclusion precedes the bibliographical list. I pray to Allah Almighty that accept this research and grant it honor and make this thesis a light way for new researchers. Aameen